مدارج النبوۃ

جلد اوّل

تصنیف

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

علّامہ مفتی سیّد غلام معین الدّین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

* * *

شبیر برادرز
۴۰۔ اُردو بازار۔ زبیدہ سنٹر ○ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

اَللّٰہُ رَبُّ مُحَمَّدٍ صَلّٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَا
نَحْنُ عِبَادُ مُحَمَّدٍ صَلّٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَا

نام کتاب ——— مدارج النبوۃ (جلد اوّل)
تصنیف ——— حضرت شیخ محقق علامہ شیخ محمد عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ
مترجم ——— الحاج مفتی غلام معین الدین نعیمی علیہ الرحمۃ
سن اشاعت ——— جولائی 2004ء
کمپوزنگ ——— words maker Lhr.
باہتمام ——— ملک شبیر حسین
مطبع ——— اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
ناشر ——— شبیر برادرز لاہور
قیمت ——— روپے (مکمل سیٹ)

ملنے کے پتے

ادارہ پیغام القرآن زبیدہ سینٹر اُردو بازار لاہور
مکتبہ اشرفیہ مریدکے (ضلع شیخوپورہ)

فہرست مضامین

مختصر تذکرہ ۹
تعارف .... "
باب اوّل ۱۵
در بیان حسن خلقت جمال صورت یعنی سراپا مبارک ﷺ .... "
چہرۂ انور ....
چشم مبارک ۱۸
گوشہائے مبارک ۲۰
جبین مبارک .... "
حواجب شریف (بھنویں) .... "
بینی شریف ۲۱
دہن شریف .... "
لعاب دہن شریف ۲۲
تبسم شریف .... "
آواز مبارک ۲۳
بیان فصاحت شریف .... "
بیان جوامع الکلم ۲۴
اوّل حدیث .... "
سر مبارک ۲۶
موئے مبارک .... "
مسئلہ خضاب کی وضاحت ۲۸
لحیہ شریف ۲۹
عانہ شریف ۳۰
گردن شریف ۳۱
منکبین شریف ۳۱
صدر شریف .... "
قلب اطہر .... "
بطن اطہر .... "
سینہ کے موئے مبارک ۳۶
بغل شریف .... "
ظہر شریف یعنی پشت مبارک .... "
مہر نبوت .... "
دستہائے مبارک ۳۳
قدم مبارک ۳۵
پنڈلیاں شریف ۳۷
قامت زیبا .... "
بے سایہ وسائبان عالم .... "
رنگ مبارک .... "
مستی و رفتار مبارک ۳۹
اقسام رفتار ۴۰
پسینہ وفضلات کی خوشبو .... "
دست مبارک کی خوشبو ۴۱
بوقت قضائے حاجت زمین کا شق ہو جانا ۴۲
بول مبارک .... "
ازدواجی زندگی مبارک ۴۳
احتلام سے محفوظ ہونا ۴۴
تکملہ .... "

باب دوم ۴۸
در بیان اخلاقِ عظیمہ وصفاتِ کریمہ ﷺ .... "
بعض نبیوں کے بچپنے کی حالت کا بیان ۴۹
حضور ﷺ کے اخلاقِ کریمہ کی ایک جھلک ۵۱
بیان رسالت عامہ ۵۴
علم وعقل مبارک ۵۵
صبر، حمل اور عفو ۵۶
تواضع، ادب اور احترام معاشرت ۶۲
ازواجِ مطہرات کے ساتھ حسن سلوک ۶۸
کیفیت مزاح وملاعبت ۷۰
ابتداء بالسلام ۷۱
جود وسخا .... "
شجاعت اور بازوؤں کی قوت وطاقت ۷۲
حکایت .... "
حیائے مبارک ۷۷
حیا کے بارے میں مشائخ کا مذہب ۷۸
شفقت، رافت اور رحمت ۷۹
وفا وحسن عہد صلہ رحمی اور عیادت ۸۰
عدل وامانت اور عفت وصدق کلامی ۸۱
عفت ۸۳
عدل .... "
وقار ودبدبہ، خاموشی ومروّت اور راہ وروش ۸۴
زُہد ۸۷
خوف وخشیتِ الٰہی وسختی طاقت اور شدت عبادت ۸۹
قرآن پاک میں مذکورہ صفات خصائل مبارک ۹۰
باب سوم ۹۲
در بیان فضل وشرف از آیاتِ قرآنیہ واحادیث صحیحہ .... "
بیان نور وسراج ۹۴
ندا بذکر صفات ۹۶
حق تعالیٰ کا حضور ﷺ کی قسم یاد فرمانا ۹۶
شہر حرام کی قسم ۹۷
زمانہ کی قسم ۹۸
تکریم وتنزیہہ اور تعظیم الٰہی، وعدہ اعطائے نعم ۱۰۰
سورۃ النجم ۱۰۱
سورۃ طٰہٰ یٰسین ۱۰۳
درود وسلام ۱۰۴
سورۂ فتح ۱۰۵
سورۂ کوثر ۱۰۹
آیہ میثاق ۱۱۲
باہم تفصیل رسل ۱۱۴
مسئلہ فضل بشر بر ملک ۱۱۷
خصوصی قدر ومنزل ۱۱۸
ازالہ شبہات از بعض آیات مبہمات ۱۲۱
رفع وزر ۱۲۴
کفار اور منافقین کی عدم اطاعت کا مسئلہ ۱۲۶
نزول قرآن پر شک وتردد کا مسئلہ ۱۲۷
نسبت جہل کا مسئلہ ۱۲۹
تلاوت میں شیطان کی دخل اندازی کا مسئلہ ۱۳۰
حضرت ابن اُم مکتوم نابینا کا واقعہ ۱۳۱
منافقین کو اجازت دینے کا مسئلہ .... "
منافقین کی طرف میلان کا مسئلہ ۱۳۲
اسیرانِ بدر سے فدیہ لینے کا مسئلہ ۱۳۳
اظہار سطوت وغلبہ ربوبیت ۱۳۵
تفصیلی علم کا مسئلہ .... "
باب چہارم ۱۳۶
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اُمتی ہونے کی تمنا ۱۳۹
وہ خبریں جن میں یہود کو پہلے ہی سے حضور ﷺ کی نبوت کی صداقت کا علم تھا ۱۴۰

توریت وانجیل وغیرہ سے بشارتیں ۱۴۱
توریت کی دوسری بشارت ۱۴۲
انجیل کی بشارتیں .... "
زبور کی بشارتیں ۱۴۵
صحائف انبیاء میں ذکر جمیل ۱۴۶
صحیفہ ابراہیم میں ذکر جمیل .... "
کتاب حبقوق میں ذکر جمیل ۱۴۷
صحیفہ شعیاء علیہ السلام میں ذکر جمیل ۱۴۸
بشارت پر مشتمل چند روایات ۱۴۹
باب پنجم ۱۵۵
ذکر فضائل مشترکہ مابین حضور ﷺ وانبیاء کرام علیہ السلام
ودیگر فضائل مختصہ .... "
حضرت آدم اور ہمارے نبی علیہما السلام .... "
حضرت ادریس اور ہمارے نبی علیہما السلام ۱۵۶
حضرت نوح اور ہمارے نبی علیہما السلام .... "
حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ہمارے نبی علیہما السلام .... "
مقام خلت ومحبت ۱۵۷
شکست اصنام .... "
تعمیر خانہ کعبہ .... "
حضرت موسیٰ اور ہمارے نبی علیہما السلام ....
قبول دعا ۱۵۸
پانی بہانا .... "
کلام فرمانا .... "
فصاحت وبلاغت .... "
حضرت یوسف کا حسن اور ہمارے نبی علیہما السلام .... "
تعبیر خواب ۱۵۹
حضرت داؤد اور ہمارے نبی علیہما السلام .... "
حضرت سلیمان اور ہمارے نبی علیہما السلام ....
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی علیہما السلام ۱۶۰
فضائل ومعجزات مختصہ ۱۶۱
خصائص صفات واحوال ۱۶۳
اسم مبارک پر نام رکھنا ۱۸۰
بارگاہِ نبوی میں بلند آواز کی ممانعت ۱۸۱
اُمت محمدیہ ﷺ کے فضائل وخصائص ۱۹۵
عبادات میں اس اُمت کی خصوصیات ۱۹۷
اعمال میں خصوصیات ۱۹۹
اولیاء کرام اور مردان غیب ۲۰۴
قبر وحشر میں اس کے خصائص ۲۰۵
ایصال ثواب کا ثبوت ۲۰۶
ذکر معراج مبارک ۲۰۹
اثبات معراج شریف ۲۱۲
ذکر براق ۲۱۳
سدرۃ المنتہیٰ پہنچنا ۲۱۷
رویت الٰہی ۲۲۱
مراجعت از معراج شریف ۲۲۵
دیدار الٰہی میں اختلاف سلف ۲۲۶
باب ششم ۲۲۹
وہ معجزات جو رسول اللہ ﷺ کی محبت نبوت اور صداقت رسالت
پر دلیل ونشان ہیں .... "
اُمی ہونا معجزہ ہے ۲۳۰
اعظم معجزات قرآن کریم ۲۳۱
معجزہ شق قمر ۲۳۸
سورج کا لوٹانا ۲۴۰
انگشتہائے مبارک سے پانی کا چشمہ جاری کرنا ....
کم پانی کو زیادہ کرنا ۲۴۲
معجزات در طعام وغیرہ ۲۴۴
حیوانات کا کلام کرنا اور اطاعت بجالانا ۲۴۹
کلام حیوانات .... "

کلام گرگ ۵۰
کلام آہو ۲۵۱
کلام حمار ۲۵۲
تسخیر شیر ...... "
اطاعت نباتات ...... "
اطاعت جمادات ۲۵۴
حنین جذع یعنی استن حنانہ کا بیان ۲۵۶
پہاڑ کا کلام کرنا ...... "
کنکریوں کا تسبیح کرنا ۲۵۷
تسبیح طعام ۲۵۸
شیر خوار بچوں کا بولنا اور شہادت دینا ...... "
بیماروں کو تندرست کرنا اور مردوں کو زندہ کرنا ۲۵۹
احیائے موتیٰ ۲۶۰
اجابت دعا ۲۶۲
کرامات و برکات حضور ﷺ ۲۶۴
اطلاع بر علومِ غیبیہ ۲۶۷
حفظ و عصمت سید عالم ﷺ ۲۷۷
علوم و خصائص مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء ۲۸۸
تتمہ بیان معجزات ۲۸۲
عیادت مریض یعنی بیمار پرسی اور معالجہ ۲۸۴
آیاتِ شفا ۲۸۸
نادِ زہر عقرب ۲۸۹
رقیہ ہائے ماثورہ ۲۹۲
بدنظری ۲۹۳
حکایت ۲۹۴
ذکر سحر ۲۹۶
رقیہ ہائے برائے نظر اور برائے جمیع امراض و آلام و بلا ۲۹۹
خوف اور بے خوابی کی دعا ۳۰۰
کرب و غم کی دعا ...... "
لاحول ولاقوۃ کا عمل ۳۰۱
آیۃ الکرسی اور خواتیم سورۂ بقر کا عمل ...... "
جامع دعا ...... "
دعائے فقر ...... "
کیمیائے مشائخ ...... "
آگ بجھانے کی دعا ۳۰۲
مرگی کی دعا ...... "
دردسر کی دعا ...... "
دعائے درد دنداں ...... "
پتھری اور حبس بول کی دعا ۳۰۵
تپش یعنی بخار کی دعا ...... "
خراج و خارش کی دعا ۳۰۴
دعائے عسر ولادت ...... "
نکسیر کی دعا ...... "
ہر درد و بلا کی دعا ...... "
ذکر لاحول ولاقوۃ الا باللہ ۳۰۵
دعا بوقت طعام ...... "
اُم الصبیان کی دعا ...... "
دعائے حفیظ رمضان ...... "
طب نبوی ہادویہ طبیہ ۳۰۶
ذکر تعبیر رؤیا یعنی خواب ۳۰۸
سچے خواب کا وقت ۳۱۰
معبرین کو حضور ﷺ کی نصیحت ۳۱۱
آداب معبرین ...... "
خواب دیکھنے والے کے آداب ۳۱۲
رویائے نبوی اور تعبیرات نبوی ۳۱۳
روئے صحابہ اور تعبیرات نبوی ﷺ ۳۱۸
استفسار رویا کو ترک فرمانے کا سبب ۳۲۱
باب ہفتم ۳۲۴

دراسماءنبوی ﷺ ۳۲۴
اسمائے باری تعالیٰ سے حضور کو مشرف فرمانا ۳۳۰
چار سو سے زیادہ اسماء سید عالم ﷺ ۳۳۶
باب هشتم ۳۴۱
عالم آخرت کے مخصوص درجات اور فضائل و کمالات .... "
طواف فرشتگان بر قبر حضور ۳۴۲
لواء الحمد ۳۴۳
حوض کوثر ۳۴۵
فضیلت شفاعت اور مقامِ محمود ۳۴۶
حدیث شفاعت ۳۴۷
مقامات شفاعت ۳۵۰
ذکر مسافت صراط .... "
میزان کی کیفیت ۳۵۱
ذکر مقام وسیلہ فیصلہ اور حد درجہ رفیعہ ۳۵۴
باب نهم ۳۵۹
درحقوق و واجبات نبوت .... "
ایمان میں کمی وبیشی کا مسئلہ ۳۶۱
وجوب طاعت واتباع سنت واقتدائے سیرت ۳۶۲
بدعت کی بحث ۳۶۴
بدعت کے انواع .... "
حکایت براتباع سنت .... "
آداب بارگاہِ نبوت ۳۶۵
خلیفہ وقت سے امام مالک کا مناظرہ ۳۶۶
وجوب محبت اور تمام مخلوق سے محبوب تر ماننا ۳۶۸
معیت ومحبوبیت ۳۷۱
بیان رویت ۳۷۲
علامات محبت رسول ﷺ ۳۷۴
وجوب مناصحت وخیر خواہی ۳۸۱
صحابہ کرام کا تعظیم وتوقیر بجالانا ۳۸۳
تعظیم درروایۃ حدیث رسول ﷺ ۳۸۵
اہل بیت وازواج نبوی کی تعظیم وتوقیر ۳۸۶
صحابہ کرام کی تعظیم وتوقیر ۳۹۲
متعلقات نبوی یعنی اماکن ومقامات مقدسہ وغیرہ کی تعظیم وتوقیر. ۳۹۶
وجوب صلوٰۃ وسلام اور اس کی فضیلت ۳۹۷
تشہد میں درود کی کیفیت ۴۰۰
مقامات درود وسلام ۴۰۱
فضائل ونتائج درود وسلام ۴۰۷
ترک عادت درود پر وعید و مذمت ۴۱۱
اختلاف صلوٰۃ بر غیر آنحضرت ﷺ ۴۱۲
باب دهم ۴۱۶
انواع عبادات نبوی کے بیان میں .... "
مقصود آفرینش عبادت رب ہے .... "
نوع اوّل درطہارت ۴۱۷
مسواک ۴۱۸
پانی کی مقدار ۴۲۰
سر کا مسح ۴۲۳
مسح گوش ۴۲۴
پاؤں کا دھونا .... "
داڑھی میں خلال کرنا ۴۲۵
ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال .... "
انگوٹھی کو حرکت دینا .... "
گردن کا مسح .... "
اذکار وضو ۴۲۶
موزوں پر مسح کرنا ۴۲۷
مدت مسح خفین ۴۲۸
تیمّم ۴۲۹
بیان غسل شریف ۴۳۰
نوع دوم درنماز حضور اکرم ﷺ ۴۳۱

ذکر اذان ۴۳۴
افتتاح صلوٰۃ (تکبیر تحریمہ) ۴۳۷
دعاہائے ماثورہ در سجدہ ۴۴۴
تشہد میں بیٹھنا ۴۴۵
عمل کثیر کی تعریف ۴۵۱
بعد نماز ذکر و دعا ۴۵۴
سجدۂ سہو ۴۵۹
سجدۂ تلاوت ۴۶۱
سجدۂ شکر ۴۶۳
نمازِ جمعہ ۴۶۴
خصائص یوم جمعہ ۴۶۶
فضیلت یوم جمعہ در روزِ آخرت ۴۶۹
خطبہ جمعہ ۴۷۱
نمازِ تہجد ۴۷۴
سنت فجر ۴۷۷
قیام در شب برات ۴۷۸
چاشت کی نماز ۴۹۰
نمازِ عید ۴۸۳
غسل در روز عیدین ۴۸۵
نمازِ استسقاء ۴۸۷
گہن میں نماز ۴۹۱
حالت خوف کی نماز ۴۹۲
سفر میں عبادت ۴۹۴
نمازِ جنازہ ۴۹۷
سنن رواتب و مؤکدہ ۵۰۲
نوع سوم در زکوٰۃ صدقات نافلہ ۵۰۵
نوع چہارم در صوم ۵۰۸
صوم وصال ۵۱۰
اُمتی کے لئے صوم وصال کا مسئلہ ۵۱۱
نوع پنجم در حج و عمرہ ۵۱۲
نوع ششم در عبادات و اذکار، دعوات و استغفار و اقرأت ۵۱۵
ذکر رسول ﷺ .... "
قرأت نبوی ۵۲۲
مسئلہ سماع ۵۲۵
مسئلہ سماع میں نصیحت ۵۲۹
ساز و مزامیر ۵۳۰
باب یازدھم ۵۳۴
کھانے، پینے، پہننے، نکاح کرنے اور سونے میں عبادت شریف ..... "
نوع اوّل در طعام و آب .... "
غذائے مبارک ۵۳۸
گوشت مبارک ۵۳۹
ثرید ۵۴۱
کدو .... "
پیٹھا .... "
پھل ۵۴۲
کھانے کا مسنون طریقہ ۵۴۴
پانی پینا ۵۴۷
نوع دوم، در لباس مبارک ۵۵۰
عمامہ نبوی ۵۵۲
پیرہن مبارک اور تہبند مبارک ۵۵۳
انگشتری مبارک ۵۵۹
خفین شریف ۵۶۱
نعلین شریف .... "
بستر شریف ۵۶۲
نوع سوم، در نکاح مبارک ۵۶۳
وجہ حکمت کثرت الزویج رسول اللہ ﷺ ۵۶۵
خواب و استراحت رسول اللہ ﷺ .... "

مصنف کتاب

مستطاب مدارج النبوت شیخ المحققین سیّد العلماء المدققین سند الفضلاء برکات النبلاء

حضرت علامہ محمد عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا

مختصر تذکرہ

حضرت شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی محمد عبدالحق بن سیف الدین بن سعد اللہ ترک دہلوی بخاری ہے۔ آپ کی کنیت ابوالمجد تھی۔ آپ کے آباواجداد اصل میں بخارا کے رہنے والے تھے جو دہلی میں آ کر سکونت پذیر ہوئے اور آپ شہر دہلی میں سن ۹۵۸ ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے فقیہہ' محقق' محدث' مدقق' بقیۃ السلف' حجۃ الخلف' مورخ اضبطہ' فخر مسلمانان برصغیر (پاک وہند) اور جامع علوم ظاہری وباطنی تھے۔

آپ ہی وہ شیخ الکامل ہیں جنہوں نے عرب سے علم حدیث لا کر اس ملک کو مالا مال کیا اور نور مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جہان بھر کو منور فرمایا اور اپنی تصنیفات جلیلہ ورفیعہ سے فن حدیث کو تمام ممالک ہندو پاکستان کے خطہ خطہ میں پھیلایا۔ آپ کے فن حدیث میں آپ کی تصانیف وتنقیدات سے کسی موافق ومخالف کو اصلا شک وشبہ نہیں ہوسکتا۔ ان سے ہمیں سروکار نہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے چشم بینا سے بے بہرہ کردیا ہے یا آنکھوں میں تعصب کی پٹی باندھ رکھی ہے۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ عنہا۔

آپ نے بائیس سال کی عمر میں اکثر وبیشتر علوم دینیہ' عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کر کے اور حفظ قرآن کر کے مسند افادت پر تمکن واجلاس فرمایا اور عین عالم شباب میں جذبہ الٰہی نے ایسا سرشار کیا کہ دفعتاً یار و دیار سے دل اٹھا کر حرمین شریفین کو متوجہ ہو گئے اور عرصہ دراز تک وہاں قیام فرما کر وہاں کے اولیاء کبار اور اقطاب زمانہ خصوصاً شیخ عبدالوہاب متقی' خلیفہ شیخ علی متقی کی صحبت اختیار کر کے فن حدیث کی تکمیل کی اور مع برکات فراواں وطن مالوف (دہلی) مراجعت فرمائی اور باون سال کی عمر میں ظاہر و باطن کی جمعیت سے تمکنت حاصل کر کے تکمیل فرزندان وطالبان میں مصروف ہوئے۔ اخبار الاخیار مطبع مجتبائی دہلی سن ۱۳۰۹ھ صفحہ ۲۸۹ کے خاتمہ میں شیخ نے اپنا حال اس طرح لکھا ہے کہ (ترجمہ)

''میں تین چار سال کا بچہ تھا کہ والد ماجد نے اہل حقیقت کی باتیں اس فقیر کے کامِ جان میں ڈالیں اور تربیت باطنی کو ضمیمہ شفقت ظاہری فرمایا۔ ان میں سے کچھ باتیں جو اس وقت میرے گوش ہوش میں ڈالی گئی تھیں۔ اب تک خزانہ خیال میں یاد ہیں۔ جو ندرت وغرابت سے خالی نہیں ہیں اور عجیب تر بات یہ ہے کہ جس وقت میرا دودھ چھڑایا گیا تھا اور میری عمر اس وقت دو ڈھائی سال کی تھی۔ اس وقت کی بات ایسی یاد ہے کہ گویا کل کی بات ہے۔ والد ماجد قرآن مجید' سبق سبق لکھتے تھے اور میں پڑھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ دو تین مہینے میں تمام قرآن کریم میں نے پڑھ لیا اور ایک ماہ میں کتابت کی قدرت اور انشاء کا سلیقہ حاصل ہو گیا اور نظم واشعار کی کتابوں سے بھی میں

نے چیدہ چیدہ ہدایت وارشاد کو مطالعہ کیا۔ بارہ سال کا تھا کہ شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھتا تھا اور پندرھویں سال میں مختصر اور مطول ختم کی۔ بعدازاں حفظ قرآن پاک کیا اور اسی قیاس پر باقی کتابوں پر عبور حاصل کیا۔ سات آٹھ سال تک فقہا ماوراء النہر کے درس میں رہا۔ وہ فرمایا کرتے تھے ''ہم نے تجھ سے فائدہ اٹھایا ہے ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے''۔ بچپنے سے ہی میں نہیں جانتا تھا کہ کھیل کیا ہوتا ہے اور خواب وآرام کیا چیز ہے۔ تحصیل علم کے شوق میں کبھی وقت پر کھانا کھایا نہ وقت پر سویا۔ موسم گرما ہو یا موسم سرما دو میل کی مسافت طے کر کے دہلی میں روزانہ مدرسہ جایا کرتا تھا اور چراغ کی روشنی میں روزانہ ایک جز ولکھا کرتا تھا۔ باوجود تقسیم اوقات کے میں مطالعہ کتب وابحاث میں مصروف رہتا اور علم حاضر کے مطابق ان پر حواشی وشروح کو قید کتابت میں لاتا جس طرح کہ مقولہ ہے کہ ''**العلم صید' والکتابته قید' تعلیم التعلم**''.

مطالعہ کتب وغیرہ کے انہاک میں کئی مرتبہ میری دستار اور بالوں میں چراغ سے آگ لگی اور مجھے اس وقت پتہ چلتا جب کہ حرارت دماغ کو محسوس ہوتی۔ اس کے باوجود بچپنے سے ہی درود وسلام' اوراد ووظائف' شب خیزی اور مناجات میں اس قدر عملی جہد وسعی رہتی تھی کہ لوگ حیران تھے۔ اب تک تعلیم واستفادہ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہوں اور حضور وجمعیت میرے اختلاط پر موقوف نہیں اور زید وعمر کے ذکر سے بھی جو نحوی ترکیبوں میں مذکور ہوتا ہے ملال ہے اور بموجب والد ماجد کی نصیحت وصیت کے کہ ''خبردار خشک ملانہ بننا'' ہمیشہ عشق ومحبت رسول ﷺ میں سرشار رہنا۔ یہاں تک کہ حق تبارک وتعالیٰ اپنی طرف بلائے اور اپنے گھر کی طرف لے جائے اور جو کچھ حضورِ اکرم ﷺ کی بشارت سے انعام پایا ہے بیان نہیں کر سکتا انتہی۔ یہ بھی واضح کر دینا مناسب ہے کہ آپ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ جن کا اسم گرامی سیف الدین تخلص سیفی تھا وہ ہندوستان کے اجل افاضل اور اکابر علماء کرام میں سے تھے جو سلامت سخن اور درستگی زبان میں ممتاز تھے۔ حضرت شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ والد ماجد کا سر سے ظاہری سایہ کا اٹھ جانا حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے اس مرثیہ کے مطابق تھا جو انہوں نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے وقت فرمایا تھا۔

سیف از سرم گزشت ودل من دو نیم ماندہ   دریائے رواں شد و در یتیم ماندہ

آپ کی تصانیف وتالیفات کے بہت سے رسالے طریقۂ تصوف' توحید اور اشعار میں تھے۔ حضرت شیخ محقق شاہ محمد عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات وتصنیفات صغیر وکبیر کی سو جلدیں ہیں اور بحسب شمار ابیات کے پانچ لاکھ تک پہنچتی ہیں۔ آپ کی مشہور تر تصانیف یہ ہیں۔

(۱) لمعات التنیقح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح 'اسی ہزار ابیات کے قریب ہیں۔ اور عربی زبان میں ہے یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے۔ قلمی نسخے' بانکی پور' رامپور' حیدر آباد دکن' دہلی اور علی گڑھ میں موجود ہیں۔

(۲) اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ' یہ فارسی زبان میں ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات دونوں کتابوں میں فرق نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ ایک ہی کتاب ہے۔ حالانکہ لمعات التنقیح ابھی تک چھپی ہی نہیں صرف قلمی نسخے پائے جاتے ہیں۔

(۳) شرح سفر السعادۃ یا طریق القویم فی شرح صراط مستقیم یا طریق الافادہ فی شرح سفر السعادہ' (۴) اخبار الاخیار (۵) جذب القلوب الی دیار المحبوب (۶) جامع البرکات (۷) مرج البحرین فی جمع بین الطریقین در جمع بیان شریعت وطریقت (۸) زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار' در مناقب غوث اعظم رضی اللہ عنہ (۹) زاد المتقین (۱۰) فتح المنان فی مناقب النعمان (۱۱) تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہہ والتصوف (۱۲) توصیل المرید الی المراد بیان الاحکام والاضراب والاوراد (۱۳) شرح فتوح الغیب (۱۴) تکمیل الایمان وتقویت

الایقان (۱۵) ماثبت من السنتہ فی ایام السنتہ' عربی زبان میں ہے (۱۶) مدارج النبوت ومراتب الفتوۃ فارسی میں ہے جس کا ترجمہ یہ مترجم غفرلہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے بایمائے حضرت مولانا محمد اطہر صاحب نعیمی مدظلہ شائع فرمارہے ہیں۔

حضرت شیخ محقق رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات اور تصنیفات کی تفصیل ''حدائق الحنفیہ'' اور التالیف قلب الانیف بکتابتہ فہرس التوالیف میں ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ محقق کی تصنیفات پاکستان اور ہندوستان وغیرہ میں مقبول خاص وعام ہیں اور شہرت تمام رکھتی ہیں اور تمام مفید ومحققانہ ہیں۔ آپ نے حضورِ اکرم سیّد عالم ﷺ کی نعت میں ایک قصیدہ ساٹھ ابیات کا لکھا ہے اور مدینہ منورہ پہنچ کر حضور ﷺ کے حضور میں ان کو پڑھا جس کا پہلا بیت یہ ہے

بیا اے دل دے از ہستی خود ترک دعوی کن
میفکن چشم برصورت نظر درعین مفتی کن

آپ کی ولادت کی تاریخ ''شیخ اولیاء'' ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء اور تاریخ رحلت ''فخر العلماء'' ۱۰۵۲ھ اور فخر العالم ۱۰۵۲ھ ہے۔ آپ کا مقبرہ حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہرولی واقع دہلی میں حوض شمسی کے کنارہ پر واقع ہے۔

اولاد: آپ کے ایک صاحب زادے حضرت مولانا نور الحق رحمۃ اللہ علیہ بڑے فقیہہ' محدث' جامع کمالات صوری ومعنوی اور فاضل متجر اور عالم ماہر تھے جو اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے تمیذ ومرید' خلف السعید اور یگانہ روزگار تھے۔ چونکہ صاحب قران' شاہجہاں ایام شہزادگی سے آپ کے جوہر استعداد عالی سے اطلاع رکھتے تھے۔ جب وہ دکن جانے لگے تو آپ کو اکبر آباد کا قاضی مقرر کر گئے۔ چنانچہ آپ نے ایک مدت تک منصب قضاء کو باحسن وخوبی ادا کیا۔ آپ نے تصانیف بھی بہت فرمائیں جس طرح کہ آپ کے والد رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ وتشریح مشکوۃ میں دست احسان دراز فرمایا اسی طرح آپ نے ترجمہ فارسی صحیح میں صلائے فیض عام دے کر تیسیر القاری فی شرح البخاری اور نیز شرح مسلم تصنیف فرمائی اور نوے سال کی عمر میں ۱۰۷۳ھ میں دہلی میں وفات پائی ''شیخ الاسلام'' سن ۱۰۷۳ھ مادۂ تاریخ ہے (حدائق حنفیہ)

اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض وبرکات سے طابع وناشر' مترجم' کمپوزر اور تمام مسلمانوں کو مالا مال فرمائے اور صراط مستقیم پر قائم ودائم رکھے آمین

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین وبارك وسلم آمین۔

فقیر پُرتقصیر غلام معین الدین النعیمی غفرلہ المرادآبادی

بِسْمِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

وہی ذات اوّل وآخراور ظاہر وباطن ہے اور وہی ہر شے کا جاننے والا ہے۔

یہ کلمات اعجاز اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں حمد وثنا پر بھی مشتمل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنی کبریائی کے ذکر و بیان کے خطبہ میں ارشاد فرمایا اور حضورِ اکرم سیّد عالم ﷺ کی نعت وصفت کو بھی شامل ہیں کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے ان اسماء وصفات کے ساتھ آپ کی توصیف فرمائی باوجودیکہ یہ اسماء منجملہ اسماء حسنیٰ بھی ہیں۔ اور وحی متلو (جس کی تلاوت کی جاتی ہے جو کہ بواسط جبریل علیہ السلام خدا کا ارشاد ہوتا ہے) وحی غیر متلو (جس کی تلاوت نہ کی جائے جو بغیر کسی واسطہ کے القاء' خواب اور براہ راست کلامِ الٰہی کا نزول ہو) ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کا نام نامی اسم گرامی قرار دے کر آپ کے حلیہ مبارک' حسن وجمال اور کمال وخصال کا آئینہ دار بنایا۔ اگرچہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء صفات سے متخلق ومتصف ہیں اس کے باوجود خصوصیت کے ساتھ ان میں سے کچھ صفات کو نامزد کر کے گنایا۔ مثلاً نورٌ' علیمٌ' حکیمٌ' مؤمنٌ' مھیمنٌ' ولیٌّ' ھادیٌ' رؤف اور رحیمٌ وغیرہ اور یہ چاروں مذکورہ اسماء صفات یعنی اول' آخر' ظاہر' باطن بھی انہیں قبیل سے ہیں۔

حضور ﷺ کی شانِ اوّلیت: اب رہا یہ امر کہ حضورِ اکرم ﷺ کا اسم موجودات میں سب سے اوّل ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو وجود بخشا۔ ۲- یہ کہ آپ مرتبہ نبوت میں بھی اوّل ہیں چنانچہ حدیث پاک میں ہے: كُنْتُ نَبِيًّا وَاِنَّ آدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِيْ طِيْنَتِهٖ (میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم اپنے خمیر میں ہی تھے)۔ ۳- یہ کہ آپ ہی روز میثاق سارے جہان سے پہلے جواب دینے والے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں؟) قَالُوْا بَلٰى سب نے کہا: ہاں؟۔ ۴- یہ کہ آپ ہی سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں چنانچہ فرمایا: وَاَوَّلُ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (اللہ پر جو سب سے پہلے ایمان لائے اور اس کے حکم کی تعمیل کی ان میں سب سے پہلے مومن ہوں) ۵- یہ کہ جب زمین شق ہوگی اور لوگ اس سے نکلیں گے تو میرے لیے سب سے پہلے زمین شق ہوگی۔ ۶- یہ کہ (روزِ قیامت) سب سے پہلے میں ہی سجدہ کرنے کی اجازت پاؤں گا۔ ۷- یہ کہ بابِ شفاعت سب سے پہلے میرے لیے ہی کھلے گا۔ ۸- یہ کہ سب سے پہلے میں ہی جنت میں داخل ہوں گا۔

شانِ آخر: اس سبقت واولیت کے باوجود بعثت ورسالت میں آپ آخر ہیں چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (لیکن آپ اللہ کے رسول اور آخری نبی ہیں) اور ۲- یہ کہ کتابوں میں آپ کی کتاب قرآن کریم آخری اور دینوں میں آپ کا دین آخری ہے چنانچہ فرمایا: نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ تمام سبقتوں کے باوجود بعثت میں ہم آخری ہیں۔ کیونکہ بعثت میں یہ آخریت وخاتمیت اور فضیلت میں اولیت وسابقیت کا موجب ہے۔ اس لیے کہ آپ ہی گزشتہ تمام کتابوں اور دینوں کے ماحی اور ناسخ ہیں۔

شانِ ظاہر و باطن: اب رہا آپ کا ظاہر و باطن ہونا تو آپ ہی کے انوار نے پورے آفاق کو گھیر رکھا ہے جس سے سارا جہان روشن ہے کسی کا ظہور آپ کے ظہور کی مانند اور کسی کا نور آپ کے نور کے ہم پلہ نہیں اور باطن سے مراد آپ کے وہ اسرار ہیں جن کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور قریب اور بعید کے لوگ آپ کے جمال اور کمال میں کھو کر رہ گئے۔

ہر شئی کے جاننے والے: وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (وہی ہر شے کا جاننے والا ہے) کا ارشاد بلاشبہ حضورِ اکرم ﷺ ہی کے لیے ہے۔ کیونکہ: فَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ (ہر صاحب علم کے اوپر اور زیادہ جاننے والا ہے) کی صفات آپ ہی میں موجود ہیں۔ عَلَيْهِ مِنَ الصَّلٰوتِ اَفْضَلُهَا وَمِنَ التَّحِيَّاتِ اَتَمُّهَا وَاَكْمَلُهَا۔

امابعد! بعد حمد و صلوٰۃ کے بندۂ مسکین (حضرت شیخ محقق شاہ) عبدالحق (محدث) بن سیف الدین دہلوی قادریؒ ''وفقہ اللہ لما یحب ویرضاہ وجعل اخراہ خیر من اولاہ''. اس کتاب کے جمع و تالیف کے اسباب میں کہتا ہے کہ یہ کتاب جس کا نام ''مدارج النبوۃ ودرجات الفتوۃ'' ہے عرصہ سے میری روح او دل وفورِ شوق اور ایمانی ذوق اس کی خواہش کر رہے تھے کہ سیر مصطفوی ﷺ اور شرح احادیث نبوی ﷺ میں کوئی کتاب ہونی چاہیے جس کی اس بندہ نے حق خدمت ادا کر کے غلامی کی ہے اور اس کی تکمیل و تتمیم کی طرف مشغول ہونا چاہیے۔ ادھر فرزند عزیز نور نظر چشم بصر (مولانا) نور الحق ''حصہ اللہ تعالیٰ عزوجل بغیضہ المطق'' کا تاکید و اصرار برابر بڑھتا رہا مگر چونکہ ہنوز امر الٰہی مساعد نہ ہوا تھا یعنی توفیق رب شامل حال نہ ہوئی تھی۔ اس بنا پر شاہد مقصود کے جلوۂ جمال' توقف میں تھا اور جب اس دور میں فساد کی بنا پر اس زمانہ کے کچھ مغرور درویشوں کے مزاج میں انحراف و روگردانی نے راہ پکڑ لی اور صلاحیتوں کے آبگینے میں تیرگی نمودار ہوئی اور حضورِ اقدس ﷺ کے بلند و ارفع مقام کے سمجھنے میں تنگی و کوتاہی ہونے لگی اور آپ کی شان و مرتبت کے علم و معرفت میں انہیں دشواری لاحق ہونے لگی اور حق اعتقاد کی ادائیگی میں ان سے کمی و قصور سرزد ہونے لگا اور وہ جادۂ دین قویم اور صراط مستقیم سے دور ہونے لگے تو ایسے مسلمانوں کے لیے حق نصیحت ادا کرنا لازم ہو گیا۔ حالانکہ سرور انبیا ﷺ کے احوال و صفات قدسیہ کا بیان کوئی کیا کر سکتا ہے۔ تاہم بے خبروں کو حقیقت حال سے روشناس کرانا' غافلوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا' طالبان راہ حق کو راہ پر لانا اور عاشقوں کو ذوق و شوق میں برقرار رکھنا ہی ضروری تھا لہٰذا اس کتاب کو مرتب کیا جس میں حضورِ اکرم ﷺ کے فضل و کرم' حسن و جمال اور مبدأ و مآل کے احوال کا ذکر و بیان ہے۔ چونکہ اس تالیف کا منشاء و مقصد ذوق و محبت کا پیدا کرنا تھا اس بنا پر حسب عادت قلیل عرصہ میں یہ کتاب منصۂ شہود میں آ گئی اور رقم الحروف کو پتہ بھی نہ چلا کہ کب آغاز ہوا اور کب اختتام' واللہ ولی الرشاد الیہ المبدأ والمعاد۔ اس کتاب کی ترتیب پانچ قسموں پر مبنی ہے۔

قسم اوّل: حضورِ اکرم ﷺ کے فضائل و کمالات کا بیان اس میں آپ کی حسن خلقت' جمالِ صورت' اخلاقِ عظیمہ' صفاتِ کریمہ' وہ فضل و شرف جو آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں' آپ کا اور آپ کی امت مرحومہ کا وہ ذکر جو گزشتہ کتابوں میں مذکور ہے' آپ کے ان فضائل کا تذکرہ جو آپ کے اور انبیاء سابقین علیہم السلام کے درمیان مشترک ہیں' ان کمالات کا ذکر جو صرف آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً معراج وغیرہ' معجزات قاہرہ اور آیات باہرہ کا ذکر' آپ کے اسماء گرامی کا ذکر' ان فضائل و کرامات اور درجات و مقامات کا بیان جو روز آخرت آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں گے۔ جیسے عمومی شفاعت اور مخصوص وسیلہ وغیرہ' آپ کے ان حقوق کا تذکرہ جن کی رعایت و پائیداری تمام مخلوق پر واجب ہے۔ مثلاً ایمان' اطاعت اور اتباع وغیرہ' اور آپ کی ان معظم عبادتوں کا تذکرہ جو بارگاہ الٰہی میں تقرب کا موجب ہیں اور ان مکرم عادتوں کا ذکر جو حق تعالیٰ کو محبوب و پسند ہیں یہ قسم گیارہ ابواب پر منقسم ہے۔

قسم دوم: حضورِ اکرم ﷺ کے نسب شریف، حمل، ولادت، شیر خوارگی (رضاعت) کا بیان، حضرت عبدالمطلب کی کفالت اور ان کی وفات، حضرت ابوطالب کی امداد واعانت، ان کے ساتھ حضورِ اکرم ﷺ کا ملک شام کی جانب سفر کرنا، وہاں بحیرہ راہب کا آپ کو پہچاننا اور اس کا آپ کی نبوت پر ایمان لانا، ام المومنین خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح، بنائے کعبہ کا تذکرہ، ابتدائے وحی، ظہور دعوت اسلام، ابوطالب کی رحلت، کفار کی ایذا رسانی، صحابہ کی بجانب حبشہ ہجرت، حضور ﷺ کا طائف تشریف لے جانا، جنات کا بیعت کرنا، انصار مدینہ کی بیعت کرنا، مدینہ منورہ کی طرف ہجرت پر انگیز کرنا، مدینہ منورہ کی طرف تشریف لے جانا وغیرہ یہ قسم چار ابواب پر منقسم ہے۔

قسم سوم: ان ابواب کا ذکر و بیان جو باعتبار سن و سال ابتدائے ہجرت سے مرض وفات تک وقوع پذیر ہوئے۔ چونکہ ہر سال و سن کے واقعات جداگانہ ہیں اس لحاظ سے یہ قسم باعتبار معنی گیارہ ابواب پر مشتمل ہوگی مگر ابواب کے عنوانات کا ذکر نہ ہوگا۔

قسم چہارم: حدوث و امتداد مرض اور ان واقعات کا بیان جو ایام مرض اور روز وفات وقوع پذیر ہوئے اُس میں غسل، تجہیز و تکفین، نماز، دفن اور اثبات حیات انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے۔ یہ قسم تین ابواب پر مشتمل ہے۔

قسم پنجم: حضورِ اکرم ﷺ کے اولاد اطہار، ازواج مطہرات اور اہل بیت مسکن (باندیاں وغیرہ) کا ذکر اس میں آپ کے چچا، پھوپھیاں، اجداد اور دودھ شریک (رضاعی) بھائی بہن، خدام وحوائی نگہبان ودبیر، امراء، ایلچی، عمال، خطباء، شعراء، موذنین اور جنگی ساز و سامان وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس ترتیب سے یہ قسم گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔

تکملہ: نبی کریم ﷺ کے بعض صفات کاملہ کا بیان بر طریق اہل معرفت و طریقت اور آپ سے استمداد کا کرنے کا ذکر ہے۔

قسم اول: فضائل و کمالات حضورِ اکرم ﷺ اس قسم میں گیارہ باب ہیں۔

باب اوّل

در بیان حسن خلقت و جمال صورت یعنی سراپا مبارک ﷺ

چہرۂ انور: حضورِ اکرم ﷺ کا چہرۂ انور' آئینہ جمال الٰہی ومظہر انوار لامتناہی بخاری ومسلم میں حضرت براء بن عازب ؓ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوبرو اور خوش خو تھے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ

مَا رَأَیْتُ شَیْئًا اَحْسَنَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ (رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین وبہتر کسی چیز کو نہ دیکھا)۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ نے اپنے قول: مَا رَأَیْتُ شَیْئًا (کسی چیز کو نہ دیکھا) فرمایا اور مَا رَأَیْتُ اِنْسَانًا یَا رَجُلًا (کسی انسان یا مرد کو نہ دیکھا) نہیں فرمایا کیونکہ اس میں بہت زیادہ مبالغہ ہے مطلب یہ کہ آپ کی خوبی وحسن ہر چیز پر فائق تھی اور انہوں نے فرمایا کہ چہرۂ انور ایسا روشن وتاباں تھا کہ گویا آفتاب آپ کے رخِ انور میں تیر رہا تھا۔

تاشب نیست روزِ ہستی زاد   آفتابے چوتو ندارد یاد

یعنی کسی رات کے بعد ایسا دن طلوع نہ ہوا جیسا آپ کا چہرۂ انور روشن وتاباں تھا۔ مقصود یہ ہے کہ آپ کے چہرۂ انور' روئے روشن کی آب وتاب بہت ہی زیادہ تھی۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضرت براء بن عازب ؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا حضورِ اکرم ﷺ کا روئے روشن صفائی وتابانی میں شمشیر کی مانند تھا؟ فرمایا نہیں بلکہ چاند کی مانند تھا۔ کیونکہ شمشیر کی تشبیہہ میں گولائی مفقود ہے اس لیے انہوں نے چاند سے تشبیہہ دی۔ چاند میں چمک دمک بھی ہے اور گولائی بھی۔

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے جواب دیا نہیں! بلکہ آفتاب وماہتاب کی مانند تھا یعنی متدیر اور گولائی میں' اگرچہ ماہتاب کے مقابلہ میں آفتاب میں چمک دمک زیادہ ہے لیکن ماہتاب میں جو ملاحت ہے وہ آفتاب میں نہیں اور ملاحت ایسی خوبی ہے جو دیکھنے میں پرلطف اور دل نشین ہے جس کا ذوقِ سلیم ہی ادراک کر سکتا ہے۔

شاہد آں نیست کہ موئے دمیانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

اہل سیر صباحت وملاحت کے درمیان فرق کرتے ہیں کہ صباحت حضرت یوسف علیہ السلام کی صفت تھی اور ملاحت حضورِ انور ﷺ کی نسبت مبارکہ ہے چنانچہ حضور ﷺ نے فرمایا: اَنَـا اَمْـلَـحُ وَاَخِـیْ اَصْبَـحُ (مجھ میں ملاحت ہے اور میرے بھائی یوسف میں صباحت)

نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کے متدیر (گول) ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دائرہ کی مانند گول تھا کیونکہ دائرہ کی مانند گولائی حسن

وجمال کے برخلاف ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یک گونہ مستدیر تھا طویل وپردراز نہ تھا۔ یہ خوبی حسن وجمال اور عظمت وہیبت میں داخل ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ آپ کا چہرۂ انور نہ مکلثم تھا نہ مطہم وہ ہے جس کی ٹھوڑی (ذقن) چھوٹی ہو اور یہ چہرہ کی گولائی کو مستلزم ہے۔ اس لیے کہ چہرہ کی لمبائی ٹھوڑی کی لمبائی سے ہوتی ہے اور ''مطہم'' بروزن معظم اس چہرے کو کہتے ہیں جو پر گوشت اور سوجا ہوا (متورم) معلوم ہو۔ قاموس میں تدویر واجتماع کے معنی میں بھی آیا ہے اور وہیں سے معنی اخذ کیے ہیں اس کے معنی کمزور ناتواں کے بھی ہیں اور یہ دونوں معنی حسن وجمال کے منافی ہیں۔ ایک روایت میں سہل الخدین (نرم رخسار) بھی آیا ہے۔ سہل نرم وہموار زمین کو کہتے ہیں۔ بعض روایتوں میں ''سیل الخدیت'' (رواں رخسار) بھی آیا ہے جو سیلان سے ماخوذ ہے۔ ''مواہب لدنیہ'' میں ابن ایثر سے منقول ہے کہ اسالہ درخدین بمعنی استطالہ ہے یعنی رخسار مبارک ایسے لابنے تھے کہ بلند وباہر نہ تھے۔

شیخ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسی روایت کے بموجب یہ بات ہر ایک کے لیے موجب استفسار بنی کہ کیا نبی کریم ﷺ کا چہرۂ انور مثل شمشیر تھا۔ یہ مقام غور وفکر ہے۔

بعض احادیث میں تشبیہ وجہ کریم بقعۂ قمر وشقہ قمر بمعنی پارۂ قمر اور نصف قمر واقع ہوئی ہے اور اشعار میں بھی ایسی تشبیہ کا استعمال کیا گیا ہے چنانچہ مصرعہ ہے۔

ہر دیدہ جائے آں ماہ پارہ نیست!

گویا کہ یہ تشبیہ دیکھنے والوں کے لیے چاند کی بلندی' اس کے حجم کی فراوانی اور اس کی گولائی سے ہے اور یہ خوبی دیگر اشخاص کی بہ نسبت حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور میں زیادہ غالب تھی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جو کہ فصیح ترین شعراء صحابہ میں سے ہیں ان کے کلام میں یہ تشبیہ آتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی مناسب توجیہہ کی جائے۔ چنانچہ کسی نے کہا کہ یہ تشبیہ حضورِ اکرم ﷺ کے کمال توجہ والتفات یا بعض اوقات قدرے رخ انور پھیر کر توجہ فرمانے پر محمول ہے۔ اس کی تائید میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث لاتے ہیں جو طبرانی میں ہے۔ فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے ہماری جانب اس شان سے توجہ فرمائی کہ گویا چاند کا نصف پارہ ہے''۔ زیادہ عمدہ توجیہہ یہ ہے کہ یہ تشبیہ آپ کی پیشانی مبارک کی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا!

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سُرَّ اِسْتَنَارَ وَجْهُهٗ كَاَنَّهٗ قِطْعَتُهٗ قَمَرٍ

رسول اللہ ﷺ کی پیشانی پر جب شکن پڑتی تو آپ کا چہرۂ انور پارۂ قمر کی مانند چمکنے لگتا۔

کسیکہ تشنہ لب تست باز میداند
کہ عین موج حیات است چین پیشانی

اورصراح (لغت کی کتاب) میں ہے کہ سرر بفتحتین شکن پیشانی اور اس کی جمع اسرار اور جمع الجمع اساریر ہے اور حدیث میں ہے کہ كَانَ تَبْرِقُ اَسَارِيْرُ وَجْهِهٖ یعنی آپ کے چہرۂ انور کی پیشانی کی شکنیں چمکنے لگتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے کہ پارۂ قمر سے تشبیہ دینے سے چاند میں جو سیاہی اور جھائی ہے اس سے احتراز کی بنا پر ہے۔ یہ توجیہہ کمزور ہے۔ اس لیے کہ جب کسی چیز کی چاند سے تشبیہ دی جاتی ہے تو اس کی سیاہی یا جھائی سے قطع نظر محض چمک دمک سے دی جاتی ہے۔

سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ انور دائرۂ قمر کی مانند تھا''۔ دائرۂ قمر ہالہ کو کہتے ہیں جسے فارسی میں خرمن ماہ کہا جاتا ہے۔

(شیخ محقق شاہ عبدالحق دہلوی ''نور اللہ قلبہ بنور الیقین'' فرماتے ہیں) کہ چاند کے نورانی جسم سے مشابہت یا ہالہ قمر سے تشبیہ کا

صریح اشارہ آپ کے چہرۂ انور کے اس نور کی طرف ہے جو انوار واضواء کی شکل میں بمنزلہ ہالہ احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ تشبیہہ آپ کے رخ انور کے کمال ضیاء ونورانیت اور اس کی عظمت وہیبت وجلال کا طریقۂ اظہار ہے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس سے نظر ومشاہدہ میں کیا چیز آتی ہے اور اس تشبیہہ میں مشاہدہ کرنے والے کی نظر میں حضورِ اکرم ﷺ کا جمال وجلال کیسے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ آنکھوں کو سیراب کرتا اور دل کو نور عظمت ومحبت سے بھرتا ہے۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی دائرۂ قمر سے تشبیہہ موجود ہے۔ قمر کے ساتھ تشبیہہ میں بہت ظاہر ومشہور چودھویں رات کے چاند (لیلۃ البدر) کی تشبیہہ ہے۔ جسے بیہقی نے ابواسحاق سے روایت کیا۔ وہ یہ کہ ایک ہمدانی عورت نے مجھ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیا ہے میں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کی کیفیت تو بیان کر واس نے کہا!

كَالْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ

چودھویں رات کے چاند کی مانند تھا جس کی مانند نہ پہلے دیکھا نہ بعد میں۔

طالبان مشتاق ہمیشہ جمال آرا ﷺ کے مشاہدہ میں ایام بیض کی راتوں میں مشرف رہتے تھے اور اس مشاہدہ سے وہ کبھی غافل وفارغ نہ ہوتے تھے کیونکہ دیدار نقد ہے اور ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخْمًا مُّفَخَّمًا يَّتَلَأْ لَأُ وَجْهُهٗ كَتَلَأْ لُؤِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ

مشاہدہ کرنے والوں کی نظر میں حضورِ اکرم ﷺ عظیم بزرگ، معظم اور مہیب تھے۔ گویا کہ آپ کا چہرۂ انور چودھویں رات کے چاند کی مانند روشن وتاباں تھا۔

اور جمال جہاں آرا ﷺ کو آفتاب کے مقابلے میں چاند سے تشبیہہ دینے کی ترجیح میں اہل سیر فرماتے ہیں کہ چاند چونکہ اپنے نور سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور فرحت بخشتا ہے اور اس کے مشاہدہ سے دل کو انس ولذت حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ اس کی طرف نظر کرنا ممکن ہے بخلاف آفتاب کے کہ وہ آنکھوں کو خیرہ کرتا اور دل کو ذوق نہیں پہنچاتا ہے۔ ہاں حضورِ اکرم ﷺ کی ذات عظیم الصفات کو سطوت وجلالت میں آفتاب سے تشبیہہ اور فروات عالم میں آپ کے نور وظہور کو اور ذات محمدیہ ﷺ کی کنہ حقیقت کے عدم ادراک اور دور ونزدیک سے آپ کے فضل وکمال کی انتہا کے مطالعہ میں افہام وعقول کے عاجز ودرماندہ رہ جانے کی وجہ سے آفتاب سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جیسا کہ یہ شعر ہے۔

اَعْيَا الْوَرٰى فَهْمَ مَعْنَاهُ فَلَيْسَ يُرٰى   فِي الْقُرْبِ وَالْبُعْدِ فِيْهِ غَيْرُ مُنْفَحِمٍ
كَالشَّمْسِ تَظْهَرُ لِلْعَيْنَيْنِ مِنْ بُعُدٍ   صَغِيْرَةً وَّتُكِلُّ الطَّرْفَ مِنْ اُمَمٍ

مطلب یہ کہ آپ کی کنہ حقیقت فہم وادراک سے بہت بلند ہے کوئی بھی دور ونزدیک سے پوری طرح معرفت نہیں کر سکتا۔ گویا آپ آفتاب کی مانند ہیں جو دور ہو کر بھی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ اسی طرح ساری مخلوق آپکی کنہ حقیقت کے ادراک میں عاجز وسرگرداں رہی ہے۔

یہ تشبیہہ حسب حال ہے لیکن مشاہدہ عینی وحسی میں چاند سے تشبیہہ دنیا قرین ومناسب ہے۔ مواہب لدنیہ میں نہانیہ سے منقول ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ جب مسرور ہوتے تو آپ کا چہرۂ انور آئینہ کے مانند ہو جاتا جس میں درودیوار کے نقوش اور لوگوں کے چہروں کا عکس جھلکنے لگتا۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو چاندنی راتوں میں دیکھا ہے اس وقت آپ

کے جسم اطہر پر سرخ جوڑا تھا میں کبھی آپ کے روئے انور کو دیکھتا اور کبھی چاندنی کی تابانی کو خدا کی قسم میرے نزدیک چاند سے زیادہ بہتر آپ معلوم ہوتے تھے۔ ان کے الفاظ ''میرے نزدیک'' میں حضورِ اکرم ﷺ کے حسن و جمال سے لذت اندوز ہونے کا اظہار موجود ہے۔ یہ ان کا اپنا اظہار تلذذ ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ آپ کا حسن و جمال سب سے بڑھ کر حسین تھا۔

تنبیہ: حلہ کپڑے کے اس جوڑے کو کہتے ہیں جس میں چادر اور تہ بند ہوتا ہے اور حمراء سے سرخ دھاریوں والا کپڑا مراد ہے۔ یہ محدثین کی تحقیق ہے جو لوگ حلے کو ریشمی جامے اور حمراء کو محض سرخی پر محمول کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کی صفات عالیہ کو شاعرانہ انداز میں بیان کرنا شعری مزاج و عادت کے ماتحت ہے ورنہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی آپ کے اخلاقی خوبیوں اور خلقی صفتوں کے نہ تو مماثل ہو سکتی ہے اور نہ ہم پلہ۔ **سُبْحَانَ اللّٰهِ مِنْ خَلْقِهٖ وَحُسْنِهٖ وَاَجْمَلِهٖ وَاَتَمِّهٖ وَاَكْمَلِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ۔**

چشم مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کی چشم مبارک پر دو وجہوں پر بحث کی جاتی ہے پہلی وجہ خانۂ چشم اور اس کی شکل و ہیئت کے صف میں ہے چنانچہ سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے فرمایا کہ آپ کی چشم مبارک بڑی اور بھنویں دراز تھیں۔ چشم مبارک کے بڑی ہونے کا مطلب تنگی اور کوتاہی کی نفی کرنا ہے نہ کہ اتنی بڑی کہ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ آپ کے اعضائے شریف کے اظہار میں قاعدۂ کلیہ توسط و اعتدال ہے کیونکہ مدار حسن و جمال اور بنائے فضل و کمال یہی توسط و اعتدال ہے۔

ایک اور حدیث میں ''اشکل العینین'' آیا ہے یعنی آپ کی چشم مبارک سفیدی میں سرخی لیے ہوئے تھیں۔ مطلب یہ کہ آنکھوں کی باریک رگیں سرخ تھیں اور ''شہلہ'' یعنی سیاہی میں سرخی ہونا۔ یہ صفت آپ کی چشم مبارک کی تعریف میں بہت ہی کم مذکور ہے لیکن نہایہ میں کہا گیا ہے کہ

كَانَ اَشْهَلَ الْعَيْنَيْنِ وَ گفتهٔ اَشْهَلُ حُمْرَةٌ فِىْ سَوَادٍ

حضور ﷺ کی دونوں چشم مبارک اشہل تھیں اور سیاہی میں سرخی کو اشہل کہا جاتا ہے۔

یہ بھی محبوبوں کے آنکھ کے حسن کی ایک قسم ہے لیکن مشہور اشکل العینین (سفیدی میں سرخی) ہے اور اشعار میں جوانان تگ و تاز کی تعریف میں ''شہلا'' آیا ہے۔ قاموس (لغت کی کتاب) میں ہے کہ اشکل وہ ہے جس میں سرخی و سفیدی ممتزج ہو اور سفیدی میں سرخی کی جھلک نمودار ہوتی ہو اور شکلہ کو ''سحرہ'' بھی کہتے ہیں جو سحر سے مشتق ہے۔ ایسی آنکھ کو چشم سحر کار اور فسوں کار بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ دلوں کو موہ لیتی ہے اور بعض حضرات اشکل العینین کو طویل شق العینین یعنی دراز و باریکی چشم (پھٹا دیدہ) سے تفسیر کرتے ہیں۔ قاموس نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ بھی بیان کرتے ہیں۔ شمائل ترمذی میں بھی اسی قسم کی روایت ہے اور امیر المومنین سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا قول عظیم العینین (بڑی آنکھیں) بھی بظاہر اسی معنی و مراد میں ہے۔ واللہ اعلم

ایک روایت میں ''اَدْعَجُ الْعَيْنَيْنِ'' بھی آیا ہے ادعج گہری سیاہ آنکھ کو کہتے ہیں اور قاموس نے اس کے معنی فراخ و کشادگی کے بھی لیے ہیں اور ایک روایت میں اَلْكَحْلَ الْعَيْنَيْنِ ہے یعنی سرگیں آنکھیں تھیں۔

دو چشم تو کہ سیاہ ہند سرمہ نا کردہ
بساں سرمہ سیاہ کردہ خانہ مردم

یعنی آپ کی چشم مبارک بغیر سرمہ لگائے سرگیں نظر آتی تھیں۔

دوسری وجہ: حضورِ اکرم ﷺ کی بصارت و بینائی کی تعریف میں ہے چنانچہ سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم

ﷺ رات کی تاریکی میں بھی ویسا ہی دیکھتے تھے جیسا دن کی روشنی میں (رواہ البخاری) بیہقی نے بھی سیّدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایسا ہی روایت کیا ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ ''کتاب الشفا'' میں بیان کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ ثریا میں گیارہ ستارے ملاحظہ فرماتے تھے اور سہیلی کے نزدیک بارہ منقول ہیں۔ آپ کی نظریں آسمان کی نسبت زمین کی طرف زیادہ رہتی تھیں یہ حد درجہ شرم وحیا کی دلیل ہے۔ حدیثوں میں جو یہ آیا ہے کہ حضور ﷺ آسمان کی طرف نظر اٹھاتے تھے۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ! تو ایسا انتظار وحی کے سلسلے میں ہوتا تھا۔ ورنہ نظر مبارک کا زمین کی طرف رکھنا روزمرہ کے معمولات میں تھا۔ حضورِ اکرم ﷺ اکثر گوشۂ چشم سے نظر فرماتے تھے جو نظر براہ راست ہوا سے جوق وماق کہتے ہیں۔ آپ کا گوشۂ چشم سے ملاحظہ فرمانا انتہائی حیاء ووقار کے سبب تھا لیکن جب آپ کسی کی جانب التفات فرماتے تو مکمل طور پر گھوم جاتے تھے۔ دائیں بائیں پہلو بدلنے یا محض گردن گھما لینے اور دزدیدہ نظری سے آپ گریز فرماتے تھے۔ کیونکہ یہ متکبروں اور سہل انگاروں کا شیوہ ہے آپ کی نظر مبارک سامنے اور پس پشت یکساں تھی۔ چنانچہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے کہ آپ مقتدیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ رکوع وسجود میں مجھ سے پہل نہ کیا کرو کیونکہ میں تمہیں اپنے آگے اور پیچھے سے یکساں دیکھتا ہوں اور مجھ سے تمہارا رکوع وسجود پوشیدہ نہیں ہے۔ اس روایت کی حقیقت کو خدا ہی جانتا ہے کہ کیا تھی۔ یہی نہیں بلکہ آپ کے تمام اعضائے شریفہ کا یہی حال ہے۔ کیونکہ ان کی کنہ حقیقت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا اور ان کی کنہ تک جاننے کا دعویٰ ایسا ہی ہے جیسا کہ متشابہات کی تاویل وتفسیر کا حکم ہے۔ عقل وقیاس اور فکر ونظر کی رو سے یہ آپ کی فضیلت ہے لیکن آپ کی یہ بینائی چشم رخ سے ہے یا دل کی آنکھ سے؟ یا تو یہ حالت نماز کے ساتھ مخصوص ہوگی جو محل انکشاف نام اور موجب ازدیار نور ہے یا پھر یہ صفت تمام احوال واوقات میں عام ہوگی اور یہ روایت بصری چہرہ مبارک کی چشم میں ہی ہوگی۔ ورنہ پروردگار عالم اس پر بھی قادر ہے کہ قوت بصر یہ بدن کے ہر حصہ اور جزو میں پیدا فرما دے یا یہ کہ یہ بینائی آپ کو بطریق اعجاز بلاشرط مقابلہ حاصل تھی۔

بعض کہتے ہیں کہ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان سوئی کے ناکہ کی مانند دو آنکھیں تھیں جن سے آپ پس پشت بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ آپ اسے کپڑوں سے نہیں ڈھانپتے تھے یا یہ کہ قبلہ کی دیوار پر مثل آئینہ مقتدیوں کی صورتیں منعکس ہو جاتی تھیں اور آپ ان کے افعال کا مشاہدہ فرما لیتے تھے۔ یہ دونوں باتیں عجیب وغریب ہیں۔ اگر یہ کسی صحیح روایت میں ہوں تو ہم ان پر ایمان لے آئیں گے ورنہ محل تامل ہے کیونکہ اہل سیر کے نزدیک باسناد صحیحہ ثابت نہیں ہیں۔

اگر یہاں رویت قلبی مراد ہے تو یہ وہ علم ہے جو بطریق وحی واعلام اور کشف والہام آپ کو حاصل تھا اہل سیر کے نزدیک درست بات یہی ہے کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب اطہر کو معقولات کے علم وادراک میں وسعت اور احاطہ عنایت فرمایا ہے اسی طرح آپ کے حواس لطیف میں بھی محسوسات کے ادراک میں احاطہ مرحمت فرمایا ہو اور شش جہات کو ایک ہی جہت بنا دیا ہو۔ واللہ اعلم

کچھ لوگ اس جگہ یہ اشکال لاتے ہیں کہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں بندہ ہوں میں نہیں جانتا کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے'' اس کلام کی کوئی اصل نہیں ہے اور نہ اس قسم کی کوئی صحیح روایت وارد ہے۔ بفرض محال اگر ہو بھی تو ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ انکشاف حالت نماز کے ساتھ مخصوص ہے اور اگر علم ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بتانے اور آپ میں ایسا علم پیدا فرمانے کے ساتھ موقوف ہے جس طرح تمام غیوبات کے حال کا علم ہے۔ اس لیے ایسے موقع پر یہ لوگ اس روایت سے استدلال لاتے ہیں جو اونٹنی کی گمشدگی کے سلسلے میں منقول ہے۔ چنانچہ کچھ منافقوں نے کہا تھا کہ محمد (ﷺ) آسمان کی خبریں تو دیتے ہیں مگر (معاذ اللہ) اتنا نہیں جانتے کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے؟'' جب منافقوں کی یہ بدگوئی حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میں (از خود) نہیں

جانتا اور نہ (از خود) پاتا ہوں مگر اتنا ہی جتنا اللہ نے مجھے علم دیا اور عنایت فرمایا اور آپ برابر یہی فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کی رہنمائی فرمائی کہ اونٹنی فلاں جگہ ہے اور اس کی مہار ایک درخت سے الجھی ہوئی ہے۔ چنانچہ لوگ وہاں پہنچے تو اونٹنی کو اسی مذکورہ حال میں پایا گویا ثابت ہوا کہ حضورِ اکرم ﷺ ذاتی علم نہیں رکھتے تھے مگر اتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا خواہ یہ نماز میں ہو یا نماز کے سوا' اس میں کوئی اشکال و دشواری نہیں ہے۔

گوشہائے مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کی سماعت شریفہ کے بارے میں ایک حدیث میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں ان چیزوں کو دیکھتا ہوں جن کو تم نہیں دیکھ سکتے اور میں ان آوازوں کو سنتا ہوں جن کو تم نہیں سن سکتے۔ میں آسمان کی اطیط (خاص قسم کی آواز ہے) کو سن رہا ہوں اونٹ کے پالان کی آواز' خالی معدہ کی آواز' درد و کرب سے اونٹ کے بلبلانے کی آواز یا کسی قسم کی آواز ہو ان سب کو ''اطیطہ'' کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: آسمان کو بھی لائق ہے کہ آواز نکالے کیونکہ آسمان میں ایک بالشت (ایک روایت میں چار انگل) کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں کسی فرشتے نے سجدہ نہ کیا ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ بکثرت فرشتے سجدے میں ہیں یا قیام میں سیر کی کتابوں میں آپ کے گوش مبارک کے تمام صفات و ہیئت کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں جامع صغیر میں ایک روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے گوشہائے مبارک کامل و مکمل تھے۔

جبین مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کی جبین مبارک کی تعریف و توصیف میں سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ واضح الجبین (کشادہ پیشانی) تھی۔ ایک دوسری روایت میں ''صلت الجبین'' بمعنی کشادہ پیشانی آیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ''واسع الجبین'' ایک روایت میں ''واسع الجبہہ'' منقول ہے۔ ان سب کے معنی فراخ پیشانی ہے۔ چہرۂ انور کے تذکرہ میں حضرت کعب بن مالک ؓ سے گزر چکا ہے کہ جب آپ کی پیشانی شکن آلود ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اہل سیر بیان کرتے ہیں کہ آپ کی پیشانی مبارک سے نیک بختی' سعادتمندی اور نورانیت مترشح ہوتی رہتی تھی اور سرنوشت (جو شکم مادر میں لکھا جاتا ہے) کا مقام پیشانی ہے۔ بسا اوقات اس معنی کا مشاہدہ خانۂ کعبہ کے دروازے میں ہوتا ہے۔ جب یہاں عادتاً پیشانی کو اس سے رگڑتے اور ملتے ہیں تو پیشانی سے نیک بختی و سعادت مندی کے آثار خوب واضح طریقہ پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

حواجب شریف بھنویں: حضورِ اکرم ﷺ کے بھنوؤں کی توصیف میں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اپنی حدیث میں بیان فرمایا وَاضِحُ الْجَبِیْنِ مَقْرُوْنُ الْحَاجِبِیْنِ۔ یعنی پیشانی کشادہ اور بھنویں ملی ہوئی تھیں۔ قرن ابرو کا مطلب بھنوؤں کے بالوں کا ملا ہوا ہونا ہے لیکن ابن ابی ہالہ ؓ جو کہ واصفان حلیہ شریف میں سے ہیں ان کی حدیث میں من غیر قرن (ابرو کے بال ملے ہوئے نہ تھے) آیا ہے ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے۔

ارباب سیر کہتے ہیں کہ صحیح روایت یہ ہے کہ آپ غیر متصل ابرو تھے اور بظاہر یہ اتصال بہت گہرا نہ تھا جس سے دونوں ابرو کے بال باہم خوب پیوست ہو گئے ہوں اور نہ درمیان میں اتنی خالی جگہ تھی جسے غیر متصل کہا جائے بلکہ چند خفیف بالوں کا اتصال تھا۔ اس بنا پر اتصال و عدم اتصال کا اطلاق بادی النظر والخیال میں صحیح ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم

اہل سیر فرماتے ہیں کہ دونوں ابرو کے درمیان ایک رگ تھی جو حالت غضب میں نمودار ہوتی تھی۔ نیز ابن ابی ہالہ کی حدیث میں ''اَزَجُّ الْحَوَاجِبِ'' آیا ہے۔ ازج کے معنی لمبی کمان' کثیر بال اور کشیدہ ابرو کے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ''اَزَجُّ الْحَوَاجِبِ وَسَوَابِغَ'' (کشیدہ ابرو و گھنے بال) آیا ہے۔ قاموس اور صحاح میں زج کے معنی باریکی ابرو یا درازی ابرو کے ہیں۔ جیسے فارسی میں کمان

ابرو کہتے ہیں اور بیہقی میں بعض صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ ﷺ کو "اَحْسَنُ الْوَجْهِ عَظِيْمُ الْجَبْهَهِ دَقِيْقُ الْحَاجِبَيْنِ" دیکھا ہے یعنی آپ کا چہرہ نہایت حسین، عظیم پیشانی اور ابرو باریک تھے۔ باریکی کا مطلب یہ ہے کہ ابرو کے بالوں کا گھپا نہ تھا اور بالوں کی کثرت کا یہ مطلب ہے کہ بال کم اور کہیں کہیں نہ تھے۔ یہ نہ تو پراگندہ تھے نہ چھدرے۔

بنی شریف: حضورِ اکرم ﷺ کی بنی مبارک کے بارے میں "اَقْنَى الْاَنْفِ وَاَقْنَى الْعِرَنِيْنِ" وارد ہے۔ عُرَنِيْنَ (بکسر عین مہملہ وسکون راء وکسر نون) بمعنی بلندی جو موئے ابرو کے اتصال کے نیچے ہے اور اقنی کی تفسیر "سائل الحاجبین" یعنی مرتفع الوسط سے کی گئی ہے۔ سائل سیلان سے مشتق ہے جس کے معنی ناک کی لمبائی اور باریکی میں یک گونہ ہمواری کے بھی منقول ہیں اور لفظ دقت (باریکی) سیلان کے ہم معنی بھی آتا ہے جس کا مطلب ناک کے موٹاپے کی نفی کرنا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کی بنی مبارک ایسی نورانی اور روشن تھی کہ دیکھنے والا جب تک بغور نہ دیکھے یہی گمان کرتا تھا کہ آپ کی بنی شریف بلند ہے حالانکہ بلند نہ تھی بلکہ یہ بلندی نور کی تھی جو ہر ایک شئے کو نمایاں دکھاتا تھا۔ نیز اس خوبی میں سے نیک بختی اور سعادت مندی کی نشانی بھی ہے۔

دہن شریف: حضورِ اکرم ﷺ کے دہن مبارک کے بارے میں صحیح مسلم میں سیّدنا جابر ؓ کی حدیث ہے کہ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَلِيْعُ الْفَمِ رسول اللہ ﷺ فراخ دہان تھے۔ اس طرح حضرت ابن ابی ہالہ ؓ نے بیان کیا ہے جو شمائل ترمذی میں حلیۂ مبارک کی طویل حدیث میں مذکور ہے۔ اہل عرب مردوں کے لیے فراخ دہنی کو قابل تعریف اور تنگ دہنی کو لائق مذمت ٹھہراتے تھے۔ عرب کے شعراء، تنگ دہن کو معشوق اور محبوب سے نسبت دیتے تھے۔ گویا کہ ان کے نزدیک وہ عورتوں کے حکم میں تھے۔ لیکن بعضوں نے کہا کہ یہ کم سخنی اور محبوبی سے کنایہ ہے۔ دوسری حدیث میں لفظ "ضیلع الفم" (فراخ دہنی) کے بعد یہ عبارت زیادہ کی ہے جس سے فراخ دہن مراد لیتے ہیں۔ "يَفْتَحُ الْكَلَامَ وَيَخْتِمُهٗ بِاَشْدَاقِهٖ یعنی حضورِ اکرم ﷺ کلام کو کشادگی دہن سے آغاز فرماتے اور اپنے شدق سے اسے ختم کرتے۔ شدق بکسر شین کنج دہاں اور شدق بتحریک فراخی دہاں کو کہتے ہیں۔ "خطیب اشدق" تالو کشادہ اور متشدق فصاحت سے بولنے والے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ آپ کے دہن مبارک سے کلام، تام، کامل اور بھرا ہوا نکلتا تھا۔ شکستہ و ناقص الفاظ نہ نکلتے تھے۔ لہٰذا اس بیان سے فصاحت اور اثبات فصاحت دونوں کا اجتماع حاصل ہوگیا اور معلوم ہوا کہ آپ فصیح کامل تھے۔ ایسا تشدق لسانی مذموم وقبیح ہے جو بطریق تکلف، بناوٹ اور ناحق ہو۔ بعض اہل سیر نے کشادگی دہن سے ہونٹوں کی نزدیکی مراد لی ہے۔

آپ "مُفْلِجُ الْاِسْنَان" تھے یعنی سامنے کے دانت کشادہ تھے۔ صراح میں فلج کے معنی سامنے کے دانتوں کی کشادگی ہے۔ ایک اور حدیث میں "اشنب مفلج الثنايا" یعنی سامنے کے دانت روشن تر، آبدار اور کشادہ مروی ہے۔ اشنب کے معنی دانتوں کی آبداری وتابانی کے ہیں اور قاموس میں اشنب بحرکتہ باء "ورقه وبرد غذدبته فی الاسنان" کے معنی بیان کیے ہیں۔ علی مرتضٰی کی حدیث میں مبلج الثنايا (سامنے کے دانت روشن وتاباں) آیا ہے اور حضرت ابن عباس ؓ کی حدیث میں ہے انہوں نے بیان کیا کہ آپ کے لبہائے مبارک کشادہ تھے جب گفتگو فرماتے تو ایسا دیکھا جاتا کہ گویا سامنے کے دندانہائے مبارک کی کشادگی کے درمیان سے نور نکل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ بوصیری پر رحم فرمائے کیا خوب شعر کہا ہے

كَاَنَّمَا اللُّوْلُو الْمَكْنُوْنِ فِيْ صَدَفٍ مِنْ مَعْدَنَ مَنْطِقٍ مِنْهُ وَمُبْتَسِمٖ

گویا کہ دندانہائے مبارک صدف میں چھپے ہوئے ہیں جو اپنے معدن میں بولتے اور تبسم فرماتے ہیں۔ طبرانی نے اوسط میں

روایت کیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے لبہائے مبارک اور دہن شریف کا مہرہ تمام لوگوں سے زیادہ حسین ولطیف تھا اور ایک روایت میں عظیم الاسنان (دندانہائے مبارک عظیم تھے) بھی آیا ہے۔ ان سب روایتوں کا مفہوم یہی ہے کہ آپ کا دہن شریف (حسن وجمال کے مطابق) درست وصحیح تھا۔

لعابِ دہن شریف: حضورِ اکرم ﷺ کا لعاب دہن بیماروں اور دلفگاروں کے لیے شفائے کامل تھا۔ چنانچہ وہ حدیث جس میں روز خیبر حضرت علی مرتضیٰ ؓ کی آنکھوں کے آشوب میں لعاب دہن لگانا اور اسی وقت صحیح وتندرست ہو جانا مذکور ہے' مشہور ہے۔ آپ ﷺ کے حضور پانی کا ایک ڈول لایا گیا اور آپ نے پانی کا ایک گھونٹ لے کر اس میں کلی کر دی پھر جب اس ڈول کے پانی کو کنویں میں ڈال دیا گیا تو اس کنویں سے کستوری کی مانند خوشبو پھیل گئی تھی اور یہ کہ حضرت انس ؓ کے مکان کے کنویں میں جب آپ نے لعاب دہن ڈالا تو مدینہ طیبہ میں کوئی کنواں اس سے زیادہ شیریں نہ تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں کچھ شیر خوار بچے لائے گئے آپ نے ان کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا۔ پھر تو وہ ایسے سیراب ہوئے کہ اس دن انہوں نے دودھ ہی نہ پیا۔ ایک دن حضرت امام حسن مجتبیٰ ؓ سخت تشنگی میں تھے آپ نے اپنی زبان مبارک ان کے منہ میں دے دی۔ وہ اسے چوستے رہے پھر وہ سارے دن سیراب رہے۔ اس قسم کے بے شمار معجزات مروی ہیں۔

تبسم شریف: صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیقہ ؓ سے مروی ہے کہ میں نے کبھی بھی آپ کو اس طرح قہقہہ لگا کر ہنستے نہ دیکھا جس سے آپ کے لہوات نظر آ جائیں۔ لہوات تمام حروف کے فتح کے ساتھ لہاۃ کی جمع ہے اور فتح لام سے وہ گوشت کا ٹکڑا جو خجرے کے اوپر منہ کے آخر میں ہوتا ہے۔ (جسے اردو میں کوا کہتے ہیں)

حضورِ اکرم ﷺ ہمیشہ متبسّم رہا کرتے تھے اور یہ جو بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ آپ اتنا ہنسے کہ آپ کے نواجذ یعنی سب سے پچھلی داڑھ ظاہر ہو گئی۔ نواجذ اس آخری داڑھ کو کہتے ہیں جس کا نام عقل داڑھ ہے اور جو بعد بلوغ اور کمال عقل پر نکلتی ہے۔ اس بیان ضحک میں مبالغہ ہے۔ حقیقت کا اظہار نہیں' کیونکہ اس کو شدت ضحک کے بیان میں مثال کے طور پر بولتے ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اس جگہ نواجذ سے مراد عام داڑھ اور دانت ہیں۔ آپ کی ہنسی زیادہ تر مسکرانے تک تھی۔ ضحک کا بالکل ابتدائی مرحلہ مسکرانا ہے جس میں فرط خوشی سے دانت نمایاں ہو جاتے ہیں اگر ہنسی کی یہ آواز قلقہ سے سنی جائے تو اسے قہقہہ کہیں گے۔ ورنہ اسے ضحک کہیں گے اور اگر آواز بالکل ہی نہ ہو تو اسے تبسم یا مسکرانا کہتے ہیں اور صراح میں لبوں کے ملانے کو تبسم کہا گیا ہے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ دانتوں کی سفیدی ظاہر ہو جانے کا نام تبسم ہے۔

حضرت شیخ ابن حجر ؒ فرماتے ہیں' تمام حدیثوں سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ بڑی سے بڑی حالتوں اور اکثر اوقات میں تبسم سے آگے تجاوز نہیں فرماتے تھے۔ ممکن ہے کبھی اس سے تجاوز بھی کیا ہو مگر ضحک (تبسم) کی حد سے آگے نہ بڑھے ہوں گے لیکن یہ قہقہہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ مکروہ ہے۔ کثرت کے ساتھ ہنسنے اور اس میں زیادتی کرنے سے آدمی کا وقار جاتا رہتا ہے (بیہقی) نے بروایت حضرت ابو ہریرہ ؓ نقل کیا ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ ضحک فرماتے تھے تو دیواریں روشن ہو جاتی تھیں اور ان پر آپ کے دندانہائے مبارک کا نور آفتاب کی شعاعوں کی طرح جلوہ افروز ہوتا تھا۔ یہی حال آپ کی گریہ کا تھا۔ آواز قطعاً بلند نہ ہوتی تھی۔ البتہ! چشم مبارک سے آنسو جاری ہو جاتے اور سینۂ اطہر سے ایک مخصوص آواز سنائی دیتی تھی۔ ایسی آواز جیسے تانبے کی دیگ میں جوش آ گیا ہو۔ بعض روایتوں میں اسے چکی کی آواز کی مانند کہا گیا ہے آپ کا فعل گریہ فرمانا اللہ تعالیٰ کے جلالی صفت کی تجلی یا امت مرحومہ پر شفقت فرمانے یا میت پر طلب رحمت کی بناء پر ہوتا تھا۔ یہ کیفیت اکثر قرآن کریم سنتے وقت یا بعض اوقات رات کی نماز میں طاری ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو جماہی لینے سے محفوظ رکھا ہے۔ کیونکہ جماہی کسلمندی اور اعضاء کی سستی کی نشانی ہے۔ تاریخ بخاری اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے کہ لَمْ یَتَثَاءَ بْ نَبِیٌّ قَطُّ نبی کریم ﷺ نے کبھی جماہی نہ لی۔ بعض روایتوں میں کم تثاءب نبی قط یعنی کسی نبی نے کبھی جماہی نہ لی تھی وارد ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ جماہی شیطان کی طرف سے ہے اور اگر جماہی غلبہ کرے تو چاہیے کہ بایاں ہاتھ منہ پر رکھے یا لبوں کو دانتوں میں دبائے۔ وہ لوگ جو ہاہاہا یا آہ آہ کی آواز نکالتے ہیں۔ وہ حد درجہ فعل قبیح کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جو ایسا کرتا ہے شیطان اس کے منہ میں ہنستا ہے۔

آواز مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کی آواز مبارک غایت درجہ پیاری تھی۔ آپ کی آواز اور اس کی شیرینی تمام آوازوں سے زیادہ حسین و دلکش تھی اور کوئی شخص بھی آپ سے بڑھ کر خوش آواز و شیریں کلام نہیں گزرا۔ آپ کے کلام کی توصیف میں آیا ہے ''اَصْدَقُ النَّاسِ لَهْجَةً'' آیا ہے جس کے معنی ہیں کیونکہ آپ کی زبان مبارک مخارج سے کلام فرمانے میں جیسا کہ اس کا حق ہے سب سے بڑھ کر راست تر، درست تر اور بہتر تھی۔ آج تک کوئی ایک بھی اس پر قادر نہ ہو سکا۔ فصاحت کے ساتھ کلام فرمانے کو صدق لہجہ کہتے ہیں۔

سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہ بھیجا مگر خوش آواز اور خوش رو حتیٰ کہ ہمارے نبی ﷺ ان اوصاف میں سب سے فائق تھے۔ اسی مقام پر کسی نے کہا ہے کہ

در دل ہر امتی گر حق مزہ است   روئے آواز پیغمبر معجزہ است

جہاں تک کسی کی آواز نہ پہنچ سکتی تھی وہاں تک آپ کی آواز مبارک بے تکلف پہنچ جاتی تھی۔ خصوصاً ایسے خطبوں کی آواز جس میں نصیحت، تخویف یا خدا سے ڈرانا ہوتا تھا۔ چنانچہ پردہ میں بیٹھی ہوئی مستورات بھی آپ کی آواز سنتی تھیں۔ آپ ﷺ نے ایام حج میں منیٰ میں جو خطبہ دیا تھا اس نے تمام لوگوں کے کان کھول دیئے اور ہر ایک نے اس خطبہ کو اپنی اپنی منزلوں میں سنا۔ (منیٰ میں دور و نزدیک جو بھی تھا ہر ایک نے سنا) وہ جو دوسری حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ منیٰ میں خطبہ دیتے تھے اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ حضور ﷺ سے آگے اس کی تعبیر کرتے جاتے تھے تو اس سے مراد کلام کی تفسیر و توضیح اور شرح و بیان اور اس سے رفع اشتباہ ہے نہ کہ آواز کو سنوانا۔

بیان فصاحت شریف: حضورِ اکرم ﷺ کی زبان مبارک کی فصاحت، جوامع کلم، انوکھا اظہار بیان اور عجیب و غریب حکم و فیصلے اتنے زیادہ ہیں کہ شاید ہی کوئی فکر و اندیشہ کا محاسب اس کے حصر و احاطہ کے گرد پھر سکے۔ آپ کے اوصاف کا بیان اور ان کے بیان کا زبان کے ساتھ اظہار ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ سے زیادہ فصیح و شیریں بیان دوسرا پیدا ہی نہ فرمایا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ نہ تو آپ کہیں باہر تشریف لے گئے اور نہ آپ نے لوگوں میں نشست و برخاست رکھی پھر آپ ایسی فصاحت کہاں سے لے آئے۔ آپ نے فرمایا: حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی لغت اور اصطلاح جو ناپید اور رفنا ہو چکی تھی اسے میرے پاس جبرئیل علیہ السلام لے کر آئے جسے میں نے یاد کر لیا ہے نیز آپ نے فرمایا:

اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ   میرے رب نے مجھے ادب سکھایا تو میرے ادب کو بہت اچھا کر دیا۔

عربیت کا وہ علم جو زبان عرب اور اس کی فصاحت و بلاغت سے تعلق رکھتا ہے اسے ادب کہتے ہیں نیز آپ نے فرمایا: میری نشو و نما قبیلہ بنی سعد بن بکر میں ہوئی ہے۔ یہ آپ کی دائی حلیمہ سعدیہ کا قبیلہ ہے۔ بنی سعد کے لوگ پورے عرب میں سب سے زیادہ فصیح اللسان تھے اور یہ جو منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں ضاد کو اس کے مخرج سے ادا کرنے میں اس سے زیادہ فصیح ہوں جو ضاد کو ادا کرتا ہے''۔ اگرچہ اس حدیث کی صحت میں بعض اپنی مقرر کردہ اصطلاح حدیث کے تحت کلام کرتے ہیں لیکن اس کے معنی صحیح ہیں۔ حاصل کلام اس

طرف راجع ہے کہ آپ نے فرمایا: میں تمام عرب میں افصح ہوں کیونکہ حرف ضاد عرب کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ دنیا کی کسی دوسری زبان میں یہ حرف نہیں ہے۔ اور حضورِ اکرم کے سوا اہل عرب میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس حرف کو کما حقہ ادا کر سکے۔ اس حرف ضاد کا مخرج داہنے یا بائیں اضراس یعنی عقل داڑھ ہے۔ کہتے ہیں کہ بائیں طرف سے اس کی ادائیگی زیادہ آسان ہے لیکن صحابہ کبار میں سے کچھ حضرات اس کا دونوں جانب سے اخراج کرتے تھے۔

حضورِ اکرم ﷺ خوب واضح اور مفصل کلام کے ساتھ تکلم فرماتے تھے اور جدا جدا ان کلمات کو گنا جا سکتا تھا۔ آپ ایک کلمہ کی تین تین بار تکرار فرمایا کرتے تھے تا کہ خوب سمجھ لیا جائے۔ یہ تکرار گفتگو کے ابہام و اشتباہ کو دور کرنے کے لیے ہوتی ہوگی ورنہ آپ ہر بات اور ہر کلام میں ایسا نہ کرتے ہوں گے۔ واللہ اعلم

بیان جوامع الکلم: خاتم الانبیاء احمد مجتبےٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کے کلام مبارک کے خصائص میں آپ کا ارشاد ہے فرمایا:

اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَاُخْتُصِرَ لِیَ الْکَلَامُ مجھے جوامع الکلم دیا گیا اور میرے لیے کلام مختصر کیا گیا۔ جوامع الکلم سے مراد وہ کلمات ہیں جو غایت اختصار میں ہوں اور معانی کثیرہ کے حامل ہوں۔ علماء نے اپنی وسعت اور طاقت کے اعتبار سے بعض ایسے کلمات جمع فرمائے ہیں اور خاص کر وہ خطوط و پیغامات جن کو حضور ﷺ نے بادشاہوں، حاکموں اور بڑے بڑے امرائے وقت کو ارسال فرمایا تھا ان میں ہر قوم کو اسی کی زبان میں مخاطب فرمایا تھا۔ علماء نے انہیں جمع کر کے ان کی شرح و تفسیر بیان کی ہے۔ ان میں سے کچھ کلمات جو آپ کے حلیہ کمال اور زینت جمال کے حکم میں ہیں۔ تصور و خیال سے بیان کرتا ہوں کہ یہ کلمات آپ کی زبان مبارک سے صادر ہوئے ہوں گے۔

حرف از دہان دوست شنیدن چہ خوش بود   باز دہاں آنکہ شنید از دہان دوست

اوّل حدیث: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ   ہر عمل کا دار و مدار نیت پر ہے

یہ حدیث اصول دین سے اصل عظیم اور تمام حدیثوں میں جامع تر اور مفید ترین ہے۔ بعض حضرات تو اسے علم دین کا تہائی حصہ کہتے ہیں بایں لحاظ کہ دین، قول و عمل اور نیت پر مشتمل ہے اور بعض نے اسے نصف علم دین قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے کہ اعمال دو قسم کے ہیں ایک عمل بالقلب دوسرا عمل بالجوارح۔ اعمال قلب میں نیت سب سے زیادہ افضل ہے۔ اس بنا پر عمل، اس نصف علم (نیت) سے متعلق ہوگا۔ بلکہ دونوں نصفوں میں بہت بڑا۔ دراصل نیت ہی قلبی، جسمانی اعمال اور جملہ عبادات کی اصل بنیاد ہے اگر اس اعتبار سے اسے تمام علم کہیں تو یہ مبالغہ بھی درست ہوگا۔

(۲) مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ	جو مرد عمدہ طریق پر اسلام لایا اس نے ہر لغویت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔
(۳) اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ یَدِهٖ وَلِسَانِهٖ	مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے تمام مسلمان محفوظ رہیں۔
(٤) لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ	تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔
(٥) اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ کُلُّهٗ	دین، اوّل تا آخر نصیحت و بھلائی ہے۔
(٦) اَلْبَلَاءُ مُوَکَّلٌ بِالنُّطْقِ	گویائی مصیبتیں پیدا کرتی ہے۔
(٧) اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ	محفلوں کی باتیں امانت ہیں۔

(٨) اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ	جس سے مشورہ لیا جائے وہ بات کا امین ہے۔
(٩) تَرْكُ الشَّرِّ صَدَقَةٌ	برائی کو چھوڑنا صدقہ ہے۔
(١٠) اَلْحَيَاءُ خَيْرٌ كُلُّهٗ	حیاء کامل بھلائی ہے۔
(١١) فَضْلُ الْعِلْمِ خَيْرٌ مِّنْ فَضْلِ الْعِبَادَةِ	علم کی فضیلت، عبادت کی فضیلت سے بہتر ہے۔
(١٢) اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنَتَانِ فِيْهِمَا اَكْثَرُ النَّاسِ	صحت وفراغت خسارے کی نعمتیں ہیں ان دونوں میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔
(١٣) مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا	جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔
(١٤) اَلدَّالُ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ	نیکی کی راہ دکھانے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے نیکی کی۔
(١٥) حُبُّ الشَّيْءِ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ	کسی چیز کی محبت اسے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔
(١٦) اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ	آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔
(١٧) لَا تَرْفَعْ عَصَاكَ عَنْ اَهْلِكَ	اپنی اہل سے اپنی لاٹھی کو نہ اٹھاؤ۔
(١٨) خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ	تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی اہل کے لیے بہتر ہے۔
(١٩) مَنْ اَبْطَأَبِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ	جس کا عمل سست ہے اس کا نسب چست نہ کریگا۔
(٢٠) زُرْغِبًّا تَزْدَدْ حِبًّا	زیارت کرناغہ کے ساتھ توشہ کر محبت کے ساتھ۔
(٢١) اِيَّاكُمْ وَخَضْرَ الدِّمَنِ	بچو تم امن کی فراخیوں سے
(٢٢) لَنْ يَّشَاءَ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ	ہرگز نہیں چاہتا کوئی دین داری مگر وہ اس پر غالب ہوتا ہے۔
(٢٣) اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ	جو اپنے نفس کو دین دار بنا کر تھیلی تیار کرے وہ عمل کرے موت کے بعد کے لیے
(٢٤) اَلْفَاجِرُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهٗ وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ	فاجر وہ ہے جو اپنی خواہش کی پیروی کرے۔
(٢٥) لَيْسَ الشَّدِيْدُ مَنْ غَلَبَ النَّاسَ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ مَنْ غَلَبَ نَفْسَهٗ	لوگوں کا غالب ہونا شدید نہیں البتہ! اپنے نفس کا غالب ہونا شدید ہے۔
(٢٦) اَلثَّنَاءُ رَبِيْعُ الْمُؤْمِنِ	حمد وثناء کرنا مومن کی بہار ہے۔
(٢٧) اَلْقَنَاعَةُ كَنْزٌ لَا يَفْنٰى	قناعت ایسا خزانہ ہے جو کبھی ناپید نہیں ہوتا
(٢٨) اَلْاِقْتِصَادُ فِى النَّفْقَةِ نِصْفُ الْمَعِيْشَتِ	خرچ میں میانہ روی نصف معیشت ہے۔
(٢٩) اَلتَّوَدُّدُ اِلَى النَّاسِ نِصْفُ الْعَقْلِ	لوگوں سے محبت کا برتاؤ کرنا آدھی عقلمندی ہے۔
(٣٠) حُسْنُ السُّؤَالِ نِصْفُ الْعِلْمِ	عمدہ طریق سے پوچھنا آدھا علم ہے۔
(٣١) لَاعَقْلَ كَالتَّدْبِيْرِ	تدبیر کی مانند عقل نہیں ہے۔
(٣٢) لَا وَرْعَ كَالْكَفِّ	زبان روکنے کی مانند پارسائی نہیں ہے۔

(۳۳) لَاحُبَّ كَحُسْنِ الْخُلُقِ	خوش اخلاقی کی مانند محبت نہیں ہے۔
(۳٤) الرَّضَاعُ بِغَيْرِ الطِّبَاعِ	رضاعت غیر طبعی ہے۔
(۳٥) اَلْاِيْمَانُ يَمَانٍ	ایمان حفاظت ہے۔
(۳٦) لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ	جو امانت دار نہیں وہ ایمان دار نہیں۔
(۳٧) لَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ	جو عہد کو پورا نہ کرے وہ دیندار نہیں۔
(۳٨) جَمَالُ الرَّجُلِ فَصَاحَةُ لِسَانِهٖ	آدمی کی خوبصورتی اس کی زبان کی فصاحت ہے۔
(۳٩) لَا فَقْرَ اَشَدُّ مِنَ الْجَهْلِ	جہالت سے بڑھ کر سخت محتاجی نہیں ہے۔
(٤٠) لَامَالَ اَعَزَّ مِنَ الْعَقْلِ	عقل سے زیادہ پیاری تونگری نہیں ہے۔
(٤١) مَاجَمَعَ شَيْءٌ اَحْسَنَ مِنْ عِلْمٍ اِلٰى عِلْمٍ	کسی چیز کو کسی چیز سے جمع کرنا علم کو علم سے زیادہ اچھا نہیں ہے۔
(٤٢) كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْكَعَابِرِيْ سَبِيْلٍ وَّعُدَّ نَفْسَكَ مِنْ اَصْحَابِ الْقُبُوْرِ	دنیا میں مثل مسافر یا راہ چلنے کی مانند رہو اور اپنے آپ کو صاحب قبر شمار کرو۔
(٤٣) اَلْعَفْوُ لَا يَزِيْدُ الْعَبْدَ اِلَّا عِزًّا	درگزری بندے میں عزت کو بڑھاتی ہے۔
(٤٤) اَلتَّوَاضُعُ لَا يَزِيْدُ اِلَّا رِفْعَتَهٗ	نگونساری درجہ کی بلندی ہی کو زیادہ کرتی ہے۔
(٤٥) مَانَقَصَ مَالٌ مِّنْ صَدَقَتِهٖ	صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔
(٤٦) كُنُوْزُ الْبِرِّ كِتْمَانُ الْمَصَائِبِ	نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے۔
(٤٧) لَا تَظْهَرِ الشَّمَاتَةَ بِاَخِيْكَ فَيُعَاقِبُهُ اللّٰهُ وَيَبْلِيْكَ	اپنے بھائی کو شرمسار نہ کرو کہیں خدا تمہاری گرفت نہ کرے اور تمہیں بھی اس میں آلودہ کردے۔

ان کلمات سے ہر ایک کلمہ عجائب وغرائب اور دین ودنیا کے آداب پر مشتمل ہے اور یہ قاعدے دنیا وآخرت میں نیک بختی کو شامل ہیں۔ اس قسم کے کلمات بے شمار اور بے اندازہ ہیں۔ بالفعل اس وقت جو نظر میں آئے انہیں لکھ دیا۔ ان میں سے ہر ایک کی شرح اور تفصیل اگر بیان کی جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں لیکن کام ختم نہ ہو۔

حدیث مبارک: اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ كُلُّهٗ (دین اوّل تا آخر نصیحت وبھلائی ہے) یہ اولین وآخرین کے تمام علوم پر مشتمل ہے۔ اگر دنیا کے تمام علماء جمع ہو کر اس کی تشریح میں لب کشائی کریں تو اس کے ایک حصہ سے بھی عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کہیں گے اپنے علم وحوصلہ اور فہم کی سطح کے مطابق کہیں گے۔ فارسی کے رسالے میں اس کا اشارہ کیا گیا ہے۔

سرِ مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کے سر مبارک کی توصیف میں ابن ابی ہالہ ؓ کی حدیث میں مرقوم ہے کہ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَظِيْمُ الْهَامَةِ رسول اللہ ﷺ کا سر مبارک عظیم تھا۔ سر کی بزرگی، وفورِ عقل اور جودت فکر کی اس بنا پر دلیل ہے کہ سر جوہر دماغ کا عامل ہوتا ہے یہاں پر سر کو عظیم کہنے سے کوتاہی اور اس کی چھوٹائی کی نفی کرنا مقصود ہے۔ ورنہ آپ کے تمام اعضاء وجوارح میں وجود اعتدال کی رعایت کی گئی ہے جیسا کہ پہلے بھی اس طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اور ہر جگہ اس قاعدہ کلیہ کو یاد رکھنا چاہیے۔

موئے مبارک: حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ؓ سے رسول اللہ ﷺ کے بالوں کے بارے میں دریافت

کیا تو فرمایا آپ کے بال رَجِل (نرم) تھے۔ رجل بفتح را وکسر جیم اور فتح سے بھی آیا ہے۔ اسی طرح سبط وقطط مراد ہے۔ سبط بفتح سین وسکون باء وکسر باء بمعنی نرم و لٹکے ہوئے بال اور قطط بفتح قاف وکسر طاء وفتح طاء ایسے بال جو سخت اور پیچیدہ ہوں جیسے حبشیوں کے ہوتے ہیں اردو میں انہیں گھونگریالے بال کہا جاتا ہے۔ بعض حدیثوں میں آپ کے موئے مبارک کو ''جعد'' بمعنی سخت پیچیدہ بتایا گیا ہے حالانکہ مکمل جعد نہ تھے۔ بلکہ قطط اور جعد یعنی نرم، دراز اور کھونگریالے تھے۔ سبط وقطط کی ضد کے معنی میں جعد کا اطلاق جائز نہ ہوگا اور بعض حدیثوں میں جعد کی نفی کی گئی ہے۔ جعد بہت سخت اور بل کھائے ہوئے بالوں کو کہتے ہیں اور صراح میں جعد بمعنی مرغول اور قطط بمعنی مرغول اور بسط بمعنی لٹکے ہوئے بال لکھا ہے۔ لہٰذا حضورِ اکرم ﷺ کے بال بسط تھے نہ قطط بلکہ دونوں کے درمیان تھے جسے رجل کہتے ہیں۔

آپ کے بالوں کی لمبائی کانوں کے درمیان تک دوسری روایت میں کانوں تک اور ایک تیسری روایت کے بموجب کانوں کی لو تک تھی۔ ان کے علاوہ کندھوں کے قریب تک کی روایتیں بھی ہیں۔ ان سب روایتوں میں باہمی مطابقت اس طرح ہے کہ آپ کبھی تیل لگاتے یا کنگھی فرماتے تو بال دراز ہو جاتے ورنہ اس کے برعکس رہتے یا پھر بال ترشوانے سے پہلے اور بعد ان میں اختصار طول ہوتا رہتا تھا۔ مواہب لدنیہ میں اور اس کے موافق ''مجمع البحار'' میں یہ مذکور ہے کہ جب بالوں کے ترشوانے میں طویل وقفہ ہو جاتا تو بال لمبے اور جب ترشواتے تو چھوٹے ہو جاتے تھے۔ اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ بالوں کو ترشواتے تھے۔ مونڈواتے نہ تھے لیکن حلق (مونڈوانے) کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ آپ حج وعمرہ کے دو موقعوں کے سوا بال نہیں منڈواتے تھے۔ واللہ اعلم

اور ام ہانی رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ جب حضورِ اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں رونق افروز ہوئے تو آپ کے بالوں کی چار لٹیں تھیں اور سر کے بالوں کا چھوڑنا سنت ہے۔ زمانہ قدیم سے عربوں میں یہ عادت تھی لیکن یہ ضروری ہے کہ بالوں کی نگہداشت کی جائے۔ یعنی تیل اور کنگھی وغیرہ ہوتی رہنی چاہیے۔ حضورِ اکرم ﷺ بالوں میں کثرت سے کنگھی کیا کرتے تھے۔ آپ جس کسی کے پراگندہ اور ابتر بال دیکھتے تو کراہت سے فرماتے کہ تم میں سے کسی کو وہ نظر آیا ہے یہ اشارہ شیطان کی طرف ہے۔ اسی طرح آپ بہت زیادہ بے سنورے اور لمبے بالوں والوں سے بھی کراہت فرماتے تھے۔ اعتدال اور درمیانہ روی آپ کو بہت پسند تھی۔ جو کوئی بالوں میں تیل کنگھی نہیں کرسکتا اس کے لیے بالوں کا ترشوانا بہتر ہے۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: کہ میں نے سر کے بالوں کو اس وقت سے دشمن جانا ہے جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے کہ ہر بال کے بیچ میں جنابت یعنی ناپاکی ہے۔ ورنہ ہر اہل زمانہ خصوصاً مشائخ وزہادہ عباد میں بالوں کے ترشوانے کا جو رواج ہوا ہے اس کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ یا تو بالوں میں تیل و کنگھی کی استطاعت نہ رکھتے تھے یا انہیں اس کی فرصت نہ ملتی ہوگی۔

فائدہ: بالوں کے بارے میں سنت وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے اور سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں وارد ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ بالوں میں ''سدل'' فرماتے تھے۔ اہل کتاب بھی سدل کرتے تھے لیکن مشرکین اپنے بالوں میں ''فرق'' کرتے تھے۔ ''سدل'' سے مراد بالوں کا پیشانی کے اطراف پر لٹکانا ہے اور ''فرق'' کا مطلب بالوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اس طرح سنوارنا کہ درمیان میں مانگ نکل آئے اسے مفرق یعنی تارک سر کہتے ہیں۔ جسے مانگ کہا جاتا ہے۔ چونکہ حضورِ اکرم ﷺ ان امور میں جن کا حکم الٰہی نہ ہو اہل کتاب کی موافقت کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد حضور ﷺ ''فرق'' فرمانے لگے۔ یعنی بالوں کے درمیان سے مانگ نکالنے لگے۔ اس بناء پر علماء فرماتے ہیں کہ فرق کرنا سنت ہے کیونکہ حضور ﷺ نے ''سدل'' سے ''فرق'' کی طرف رجوع فرمایا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ آپ کو ایسا حکم دیا گیا۔ لہٰذا ''سدل'' منسوخ ہو گیا۔ اس کا بھی احتمال ہے کہ ''فرق'' کو اختیار فرمانا اجتہاد سے ہے کہ اس

صحابہ رضی اللہ عنہم کبار لبوں کے گوشوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ منہ کو نہیں ڈھانپتے اور نہ کھانے سے آلودہ ہوتے ہیں اور مونڈانے اور زیر لب جسے عنفقہ کہتے ہیں ان کے بالوں کے چھوڑنے میں بھی اختلاف ہے اور افضل ان کا چھوڑنا ہے لیکن عنفقہ کے دونوں کناروں کے مونڈنے میں مضائقہ نہیں ہے اور داڑھی کے بڑھانے کے حد میں بھی اختلاف ہے۔ مذہب حنفی میں چار انگل ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اس سے کم نہ ہو۔ لیکن ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے زائد بالوں کو کاٹنا واجب ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر علماء ومشائخ اس سے زائد بڑھائیں تو بھی درست ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ صحیح بخاری میں کتاب اللباس کے آخر میں مذکور ہے کہ سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنی داڑھی کو مٹھی میں لے کر اس سے زائد بال قطع کرا دیا کرتے تھے۔

كَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا حَجَّ اَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضَلَ اَخَذَهٗ

حضرت ابن عمر جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیتے اور جو اس سے زائد بال ہوتے قطع کرا دیتے۔

حضرت نافع نے بروایت ابن عمر حدیث نقل کی ہے کہ:

قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْهِكُوْ الشَّوَارِبَ وَاعْفُو اللُّحٰى

لبوں کے تراشنے میں مبالغہ کرو اور داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اس سے تعرض نہ کرو۔

جب داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑنا ماموربہ ہے تو پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کیوں مابعد القبضہ کترواتے تھے حالانکہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔ شارحین اس کا یہ جواب دیتے تھے کہ ان کا کتروانا حج وعمرہ کے ساتھ مخصوص تھا اور عجمیوں کی مانند عمل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے اور اس باب میں سلف کی عادت مختلف تھی۔ بیان کرتے ہیں کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی داڑھی ان کے سینوں کو بھرتی تھی۔ اسی طرح سیّدنا عمر فاروق اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہما کے بارے میں منقول ہے اور حضرت سیّدنا غوث الاعظم محی الدین شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کی داڑھی طویل وعریض تھی۔

عانہ شریف: موئے زیرناف صاف کرنے کے بارے میں بعض حدیثوں میں آیا ہے مونڈتے تھے اور بعض میں آیا ہے کہ نورہ استعمال کرتے تھے۔ دونوں جانب کی حدیثیں ضعیف ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نہ حمام تشریف لے گئے نہ اسے دیکھا۔ حمام کا ظہور آپ کی رحلت کے بعد بلادِ عجم فتح ہوتے وقت ہوا۔ لیکن حضور ﷺ نے حمام کے ہونے کی خبر دے دی تھی اور عورتوں کو حمام میں جانے کی ممانعت کر دی تھی مگر کسی ضرورت کے تحت جیسے فصد اور علاج وغیرہ ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ جمعہ کے دن بعض روایتوں میں جمعرات کے دن لبیں اور ناخونہائے مبارک ترشواتے تھے۔ ناخونوں کے کاٹنے کی کیفیت میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے لیکن انتخابات پائی جاتی ہے کہ ناخونوں کے کاٹنے کی ابتداء سبابہ یعنی انگشت شہادت سے فرماتے اور داہنے ہاتھ کے انگوٹھے پر ختم کرتے تھے اور وہ نظم جو حضرت علی مرتضیٰ سے منسوب ہے اس میں ہے کہ

قَلِّمِ الْاَظْفَارَ بِالسُّنَّةِ وَالْاَدَبِ لِمَنَهَا خواسب یسار ها او خسب

اور حضورِ اکرم ﷺ مسواک اور کنگھی کبھی جدا نہ فرماتے تھے۔ جب تیل ملتے تھے تو داڑھی شریف میں کنگھی فرماتے اور اپنے جمال شریف کو آئینہ میں ملاحظہ فرماتے تھے۔ "الحق" آئینہ دیکھنا آپ ہی کو سزاوار ہے کیونکہ آپ کا جمال جہاں آراء نور مطلع نور الٰہی اور مظہر اسرار نامتناہی ہے۔

زآئینہ حسن ترا جدائی نیست: غرض تجلی حسن است خودنمائی نیست صلی اللہ علیہ وآلہ قدر حسنہ وجمالہ۔

گردن شریف: حضورِ اکرم ﷺ کی عنق یعنی گردن شریف کے بارے میں ابن ابی ہالہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ

كَانَ عُنُقَهٗ جِيْدٌ دُمْيَةٌ فِيْ صَفَاءِ الْفِضَّةِ

آپ کی گردن مبارک چاندی کی صفائی میں چمکدار اور دمیہ کی مانند تھی۔

''دمیہ'' بضم دال وسکون میم' وہ مجسمہ جو ہاتھی دانت سے تراشا گیا ہو''کذافی النہایہ'' قاموس میں ہے وہ مجسمہ جو خام یعنی سنگ سفید سے تراشا گیا ہو۔ اگرچہ آپ کی گردن مبارک کو صنم یا مجسمہ سے تشبیہہ دینے میں شان کیخلاف نظر آتا ہے لیکن چونکہ اس کی کاریگری میں خوب آراستگی اور مبالغہ کیا جاتا ہے اس لیے اس کی تحسین میں اس سے تشبیہہ دی گئی ہے۔''کذافی النہایہ'' اور شمائل ترمذی کے حاشیہ میں ہے کہ''اَلدُّمْيَةُ الْغَزَالُ ''یعنی دمیہ غزال یعنی ہرن کو کہتے ہیں اور دوسرے حاشیہ میں دمیہ ہرن کے بچہ کو کہتے ہیں لیکن لغت کی کتابوں میں یہ معنی نہیں پائے گئے۔ واللہ اعلم

اور حدیث میں الفاظ فی صفاء الفضة (چاندی کی صفائی میں) ظاہر عبارت سے گردن کی صفت معلوم ہوتی ہے اور مواہب کی دوسری حدیث میں ہے کہ

قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ كَانَ جِيْدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَبْيَضَ كَاَنَّمَا صِيْغَ مِنْ فِضَّةٍ

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ آپ کی گردن مبارک سفید تھی گویا کہ چاندی سے بنائی گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی صفات میں سے یہ صفت علیحدہ ہے۔

منکبین شریف: منکب بفتح میم وکسر کاف بمعنی سر' شانہ اور بازو کے اجتماع کی جگہ جسے کندھا کہتے ہیں اور صراح میں منکب' بمعنی بن وبازو وشانہ ہے اس کے وصف میں واقع ہوا ہے کہ بَعِيْدٌ مَابَيْنَ الْمَنْكِبَيْنَ دونوں منکب کے درمیان دوری تھی بَعِيْدٌ کو بصیغہ تَصْغِيْرُ بَعِيْد بھی پڑھا ہے۔ اور بعضوں نے اس کی تفسیر''عریض الصدر'' (سینہ کی چوڑائی) سے کی ہے۔ حالانکہ عرض صدر ایک علیحدہ صفت ہے جوکہ مروی ہے کہ عَرِيْضُ الصَّدْرِ بَعِيْدًا مَابَيْنَ الْمَنْكِبَيْنِ اور یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم ہیں چونکہ یہ صفت دو عضو سے متعلق ہیں اس لیے جدا جدا ذکر کیے گئے ہیں۔

صدر شریف: حضورِ اکرم ﷺ کا صدر مبارک یعنی سینہ شریف سینہ کشادہ اور محسوس تھا۔ یہ صورت ظاہری کے حلیہ کے بیان میں داخل ہے اس لیے اس قدر بیان ہے ورنہ صدر معنوی وہ ہے جس کا ذکر آیت کریمہ میں یوں آیا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ اے محبوب! کیا ہم نے آپ کو شرح صدر عطا نہ فرمایا؟ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کا مقام بہت عالی ہے کیونکہ اس کا تمام وکمال' ذات بابرکات حضرت سیّد السادات ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے۔

قلب اطہر: مواہب لدنیہ میں قلب اطہر کا بھی ذکر آیا ہے (چونکہ دل باطنی اعضاء سے ہے اور یہاں اس کی ظاہری صورت سے بحث نہیں اس لیے غور وفکر کرنا چاہیے اور بعض راویتوں میں''عظیم مشاش المنكبين والكتد'' بھی آیا ہے کتد بفتح کاف وکسر تاء فوقانیہ اور فتح تاء وہ جگہ جہاں دونوں مونڈھے ملتے ہیں اور مشاش بضم میم سر کی ہڈیوں کو کہتے ہیں۔

بطن اطہر: نیز ایک روایت میں''سَوَاءُ الْبَطْنِ وَالصَّدْرِ '' بھی آیا ہے یعنی نہ شکم سے بلند اور نہ شکم سینہ سے دونوں برابر اور ہموار تھے اور حضرت ابو ہریرہ ؓ کی حدیث میں''مغاض البطن'' بیان ہوا ہے جس کی تفسیر''واسع البطن'' سے کی گئی ہے جوکہ عریض الصدر کو

لازم ہے اور بعض حضرات "مُسْتَوِی الْبَطْنِ وَلصَّدْرِ" سے تفسیر کرتے ہیں۔

حضرت ابن ام ہانی ؓ نے آپ کے بطن شریف کی توصیف میں کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے شکم اطہر کو دیکھا ہے وہ گویا کاغذ تھا جنہیں لپیٹ کر تہ کر کے ایک دوسرے پر رکھ دیا ہے۔

سینہ کے موئے مبارک: حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سینہ مبارک کے موئے مبارک کی توصیف میں فرماتے ہیں کہ "ذومسربۃ" تھے اور حدیث ابن ابی ہالہ ؓ میں دقیق مسربۃ ہے مسربۃ ان بالوں کو کہتے ہیں جو سینہ کے اوپر سے ناف تک ہوں یہ باریک تھے لہٰذا اسے خیط (ڈورا یا شاخ) سے تعبیر کرتے ہیں اور صراح میں مسربۃ بضم را' سینہ وناف کے درمیان بالوں کو لکھا ہے بظاہر "مسربۃ" کا اشتقاق سرب ہے جس کے معنی راستے کے ہیں۔ صدر شکم کے علاوہ کہیں بال نہ تھے۔ لہٰذا اسی حدیث میں کہا گیا ہے عَارِیُ الثَّدْیَیْنِ وَالْبَطْنِ سِوٰی ذٰلِكَ یعنی آپ کے سینہ پر دونوں طرف اور شکم اطہر بجز اس قدر بالوں کے جنہیں سرنبہ کہا جاتا ہے خالی تھے اور بیان کرتے ہیں کہ اَلذِّرَاعَیْنِ وَالسَّاعِدَیْنِ وَالْمَنْکِبَیْنِ وَاعَالِی الصَّدْرِ وَالسَّاقَیْنِ یعنی دونوں کلائیاں دونوں بازو' دونوں کندھے' سینہ مبارک کا بالائی حصہ' دونوں پنڈلیاں ٹخنے تک بال والے تھے اور وہ جو آپ کے وصف شریف میں "اجرد" یعنی بالوں سے خالی ہونا واقع ہے وہ اشعر کے مقابل ہے۔ یعنی اشعر اسے کہتے ہیں جس کے سارے بدن پر بال ہوں۔

بغل شریف: آپ کی بغل شریف سارے بدن مبارک کی مانند سفید تھی۔ طبری کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے ورنہ آنحضرت ﷺ کے سوا تمام لوگوں کی بغل کا رنگ جدا اور اس میں سیاہی کی جھلک ہوتی ہے۔ اسی طرح قرطبی کے بیان میں اتنا زیادہ ہے کہ آپ کی بغل میں بال ہی نہ تھے لیکن کچھ لوگ اس میں کلام کرتے ہیں کہ یہ ثابت نہیں ہے جلد کی سفیدی سے یہ لازم نہیں آتا کہ بغل میں بال ہی نہ ہوں اور بعض حدیثوں میں نَتَفَ اِبْطَیْهِ بھی آیا ہے یعنی حضور ﷺ بغل کے بالوں کو اکھیڑ ڈالا کرتے تھے۔ واللہ اعلم

اور بعض حدیثوں میں عَفَرَ اِبْطَیْهِ واقع ہوا ہے عفرہ غیر قابض سفیدی کو کہتے ہیں کَذَا قَالَ الْھَرْوِی اور صراح میں "اعفر" ایسی سرخی وسفیدی جس میں سرخی کی جھلک ہو لکھا ہے۔

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے بغل گیر ہوئے تو آپ کے بغل شریف کے پسینہ سے مشک کی مانند خوشبو مہکنے لگی۔

ظہر شریف یعنی پشت: آپ کی ظہر شریف یعنی پشت مبارک ایسی تھی جیسی پگھلی ہوئی چاندی یعنی پاک وصاف اور سفید ہموار۔

مہر نبوت: بَیْنَ کَتِفَیْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ یعنی حضور ﷺ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت تھی کیونکہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ مہر نبوت ایک ایسی ابھری ہوئی چیز تھی جو ہمرنگ بدن' مشابہ جسد اطہر اور صاف ونورانی تھی۔ اسی کو خاتم النبوۃ یا مہر نبوت کہتے ہیں۔ "خاتم" بکسر تاء ختم کا فاعل ہے جس کے معنی اتمام رسیدن بآخر یعنی آخر میں پہنچ کر مکمل کرنا اور فتح تاء سے بمعنی مہر وانگشتری کے ہیں یعنی وہ چیز جو دلیل اس پر ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور آپ کو اسی نام کے ساتھ موسوم کرنے کا سبب یہ ہے کہ کتب سابقہ میں آپ کی تعریف اسی کے ساتھ کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ وہ علامت ہے جس سے آپ پہچان لیے جائیں کہ آپ ہی وہ نبی آخر الزماں ہیں جس کی بشارت دی گئی ہے۔ مہر نبوت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں وہ عظیم نشانی ہے جس سے حضور ﷺ کو مخصوص فرمایا۔ حاکم نے "مستدرک" میں حضرت وہب بن منبہ سے روایت کیا کہ کوئی نبی مبعوث نہ ہوا مگر یہ کہ ان کے داہنے ہاتھ میں کوئی علامت

نبوت ہوتی لیکن ہمارے نبی ﷺ کی علامت نبوت' آپ کے دونوں شانوں کے درمیان تھی کیا خوب کسی شاعر نے کہا ہے

نبوت راتواں آں نامہ درمشت　　کہ از تعظیم دارد مہر بر پشت

حضرت شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں کہ آپ کی مہر نبوت میں لکھا ہوا تھا۔

اَللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ تَوَجَّہْ حَیْثُ کُنْتَ فَاِنَّکَ مَنْصُوْرٌ

اللہ یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں آپ جس حال میں بھی ہیں توجہ فرمایئے بلاشبہ آپ ہی فتحیاب ہیں۔

روایتوں میں مرقوم ہے کہ مہر نبوت نوری تھی جو چمکتی تھی۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد وہ مہر نبوت روپوش ہوگئی تھی اور اسی علامت سے معلوم ہوا کہ آپ نے وفات پائی ہے کیونکہ لوگوں میں شبہ اور اختلاف واقع ہوگیا تھا یا اس لیے کہ یہ دلیل نبوت تھی۔ اب اس کے اثبات کی حاجت نہ رہی تھی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص بھید ہو جسے وہی خوب جانتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ بعد از وفات نبوت باقی نہ رہی۔ کیونکہ نبوت و رسالت موت کے بعد بھی برقرار رہتی ہے۔

اکثر روایتوں میں ''بین الکتفین'' (یعنی دونوں شانوں کے درمیان) وارد ہے کہ عِنْدَنَا غِضِ کَتِفِہ الْیُسْرٰی یعنی مہر نبوت بائیں شانہ کے ناغض (نرم گوشت جسے غضروف کہتے ہیں) کے پاس تھی۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ دونوں قولوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس لیے کہ دونوں شانوں کے درمیان ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بالکل بیچ میں ہے اگر بائیں شانہ کے جانب بھی ہے تو ''بین الکتفین'' ہے۔ یہی حال اس روایت کا ہے جس میں عِنْدَ کَتِفِہِ الْیُمْنٰی (دائیں شانہ کے پاس) آیا ہے۔ واللہ اعلم۔ راویوں نے مہر نبوت کی صورت و شکل کا بھی ذکر کیا ہے اور سمجھانے کے لیے تشبیہہ استعمال کی ہے۔ چنانچہ کسی نے اسے بیضہ کبوتر سے اور کسی نے سرخ غدود سے جو عام طور پر جسم پر ہوتا ہے تشبیہہ دی ہے۔ ''صراح'' میں ہے کہ غدہ جس کی جمع غدود ہے گوشت کی سخت گرہ کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ غدہ کے مشابہ اور سرخ سے مطلب مائل بہ سرخی ہے۔ لہٰذا یہ اس روایت کے منافی نہیں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مہر نبوت کا رنگ جسم اطہر کے رنگ کے ہم رنگ تھا اس سے اس قول کا رد کرنا مقصود تھا جس میں ہے اس کا رنگ سیاہ یا سبز تھا جیسا کہ ابن حجر مکی نے شرح شمائل میں کہا ایک اور روایت میں ہے کہ مہر نبوت زر حجلہ کی مانند تھا۔ ''زر'' بتقدیم زاء مکسورہ برراۓ مشددہ بمعنی تکمہ (گھنڈی) جو پیرہن کے گریبان میں ہوتا ہے اور ''حجلہ'' بفتح حاء و جیم بمعنی وہ گوشہ جہاں دلہن کو (مائیوں) بٹھایا جاتا ہے اس کی جمع حجال ہے۔ ''کذاقالَ الجمھور'' اور بعض کہتے ہیں کہ حجلہ ایک مشہور پرندہ اور زر اس کا انڈہ ہے۔ یہ اس حدیث کے موافق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مہر نبوت کبوتر کے بیضہ کی مانند تھی۔ لیکن زر لغت میں بمعنی بیضہ نہیں آیا۔ بعض کہتے ہیں کہ رزایت بتقدیم راء برزاء بھی آیا ہے جس کے معنی بیضہ کے ہیں اور ترمذی کی ایک اور حدیث ہے جس میں ''شعرات مجتمعاتٌ'' ہے یعنی مہر نبوت گوشت کا ایک ٹکڑا تھا۔ ایک اور حدیث میں مشت (مٹھی) کی مانند آیا ہے جس میں ثا کیل کی مانند تل تھے۔ ثا کیل ان دانوں کو کہتے ہیں جو جلد کے نیچے چنے کے دانے کی مانند نکل آتے ہیں یہ سب کچھ مہر نبوت کی ظاہری شکل و صورت کے بارے میں تھا لیکن اس کے پیچھے خدا کا عظیم اثر کارفرما ہے جو حضور ﷺ کے ساتھ مخصوص تھا اور جو کسی نبی کو حاصل نہ تھا۔ واللہ اعلم

دستہائے مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کے دست مبارک کی توصیف میں شمائل ترمذی میں کہا گیا ہے کہ ''طویل الزندین'' یعنی پنجہ (مٹھی بند) دراز تھا۔ ''زند'' بفتح زاء و سکون نون (پنجہ) کو کہتے ہیں اور قاموس میں ہے کہ ''الزند موصل الزراع والکف وھما زندان'' یعنی کلائی اور ہتھیلی کے ملنے کی جگہ کو زند کہتے ہیں اور اس کا تثنیہ ''زندان'' ہے۔ مٹھی بند (پنجہ) کی درازی کی تفصیل واضح نہیں کی گئی باوجودیکہ

ممکن ہے کہ یہ مٹھی بند آپ کے دست مبارک میں دراز واقع ہوا ہو اور ایک روایت میں ''عبل الزراعین'' اور ایک روایت میں ''عبل العضدین'' آیا ہے یعنی دونوں بازو اور کلائیاں فربہ (موٹی) تھیں اور صراح میں ''ذرائع'' کے معنی رجب الراحۃ یعنی ہاتھ کی ہتھیلی کے ہیں اور ایک روایت ''بسط الکفین''، یعنی فراغ ہتھیلی آیا ہے۔ مطلب یہ کہ ہتھیلی بھرپور اور مکمل تھی۔ یہ ''رجب الراحۃ'' کی روایت کے موافق تھی اور صراح میں ''بسط'' بالکسر دست کشادہ کے معنی میں ہے اور قراۃ عبداللہ میں آیہ کریمہ ''بل یداہ بسطان'' آیا ہے اور ایک اور روایت میں ''سبط الکفین'' (نرم ہتھیلیاں) بتقدیم سبق بر با بمعنی نرم آیا ہے یعنی آپ کے ہاتھوں کی ہتھیلیاں نرم تھیں اور موئے مبارک کی توصیف میں پہلے گزر چکا ہے کہ ''سبط'' یعنی لٹکے ہوئے نرم بال جو کہ ''جعد'' کے مقابل ہوں۔ گویا ''سبط الکفین'' کو اس جگہ سے لیا ہے اور ''سبط الجسم'' بمعنی مرد خوش قد متناسب القامت بھی آیا ہے اور قاموس میں ''رجل'' سبط الیدین (مرد کشادہ ہاتھوں والا ہے) سبط کے معنی سخی کے ہیں یہ بھی کہا کہ سخی فراخ دست ہوتا ہے اور ''ششن الکفین'' بھی تفسیر کی گئی ہے۔ بفتح شین وسکون ثلثہ بمعنی بہت سخت جس کی سختی پکڑنے میں محسوس ہو۔ احادیث میں کف دست کی توصیف میں سین ونرم وارد ہوا ہے۔ چنانچہ ''طبرانی'' نے مستورد بن شداد سے روایت کیا ہے کہ اس نے اپنے والد سے پوچھا انہوں نے کہا کہ میں رسولِ خدا ﷺ کے حضور میں پہنچا اور میں نے آپ کے دست اقدس کو چھوا (مصافحہ کیا) آپ کا دست مبارک ریشم سے زیادہ نرم اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ اور بخاری میں حضرت انس ابن مالکؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسولِ خدا ﷺ کے دست مبارک سے زیادہ نرم حریر ودیبا کو نہ پایا۔ حالانکہ حریر تمام ریشمی کپڑوں میں سب سے زیادہ نرم ہوتا ہے اپنے ہاتھ میں درشتی اور سختی کس طرح جمع ہوسکتی ہے۔ ہاں نرمی، فربہی کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے جس طرح کہ آپ کا تمام بدن اقدس نرم، لطیف، فربہ اور قوی تھا اسی طرح دست مبارک کی ہتھیلیاں بھی نرم اور پرگوشت تھی۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ آپ کے دست مبارک کی نرمی وسختی کا انحصار وقت اور حالات پر موقوف تھا۔ چنانچہ آپ گھر میں دست مبارک سے یا جہاد میں اسلحہ استعمال کرتے یا کاروبار کرتے تو ہتھیلیاں سخت ہوتیں جب چھوڑ دیتے تو وہ اپنی اصلی اور جبلی نرمی اور ملائمت کی حالت مین آ جاتیں۔

منقول ہے کہ جب اصمعی نے جو لغت کے امام ہیں ''ششن'' کی خشونت اور سختی سے تفسیر کی تو ان سے کہا گیا کہ نبی کریم ﷺ کے دست مبارک کی توصیف میں تو نرمی وملائمت وارد ہے اور آپ نے چونکہ خشونت وسختی سے تفسیر کی ہے تو اس کے بعد اصمعی نے عہد کر لیا کہ وہ حدیث کی تفسیر ہی نہیں کرینگے مگر بعد از حزم واحتیاط اصمعی غایت درجہ منصف تھے اور رسول اکرم ﷺ کی جناب میں ادب وانصاف کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے حدیث مبارک ''لیغان علی قلبی'' (بعض وقت میرے دل پر حجابات آ جاتے ہیں) کی تفسیر دریافت کی پوچھا کہ یہ غین کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے جواب میں فرمایا کہ اگر تم رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر کے غین (حجاب) کے علاوہ کسی اور شخص کے غین (حجاب) کے بارے میں پوچھو تو میں بتا سکتا ہوں لیکن اب جو کچھ میں جانتا ہوں آپ کے سامنے اس کے بیان کرنے کی مجھ میں تاب وطاقت نہیں اس کی حقیقت بجز علام الغیوب کے کوئی نہیں جان سکتا۔

حضرت ابوعبیدہ نے ششن کی تفسیر غلظ وقصر یعنی فربہی اور کوتاہی سے کی ہے۔ قاضی عیاض (صاحب شفاء) فرماتے ہیں کہ یہ تعریف مردوں میں محمود ہے نہ کہ عورتوں میں، اس کی انہوں نے نفی کی ہے۔ یہ قول اس روایت کے بموجب ہے جس میں آیا ہے کہ ''سائل الاطراف'' یعنی اعضاء کی گرہیں دراز تھیں۔ یہ انگشت ہائے مبارک کی تعبیر ہے۔ مراد یہ کہ آپ کی انگلیاں لمبی اور رواں تھیں اور شفا میں ''طویل الاصبع (لمبی انگلیاں) اور ایک دوسری روایت میں ''شائل الاطراف'' بشین معجمہ جو کہ ''شول'' سے ماخوذ ہے جس کے

معنی پتھر کھینچنا' زمین سے بوجھ اٹھانا اور اونٹنی کا اس کی طاقت بھر بوجھ اٹھانا'' ورارد ہوا ہے اور ایک روایت میں ''شاین الاطراف'' بہ تبدیل لام بنون مثلاً جبریل کو جبرین آیا ہے اسے ابن الانباری نے بیان کیا ہے اور یہ صفت قصر (کوتاہی) کے منافی ہے ششن بمعنی غلیظ (فربہ) جو بغیر کوتاہی اور سختی کے ہے۔ اگر چہ صحاح اور قاموس سے بمعنی خشونت بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن آپ کے دست مبارک کے صفات' آثار' برکات اور معجزات اتنے زائد ہیں کہ حیطِ تحریر میں نہیں لائے جاسکتے۔ تاہم مسلم کی ایک روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے رخساروں پر دست اقدس پھیرا تو جابر رضی اللہ عنہ کو آپ کے دست اقدس سے ایسی ٹھنڈک اور خوشبو محسوس ہوئی جیسے آپ نے ابھی عطار کی ڈبیہ سے اپنا ہاتھ نکالا ہے۔ بیہقی اور طبرانی میں ہے کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب بھی حضور ﷺ سے مصافحہ کرتا ہوں تو میرا ہاتھ آپ کے جسم اطہر سے مس ہونے کی وجہ سے ایسا معطر ہو جاتا ہے کہ میں تمام دن اپنے ہاتھوں کو سونگھتا رہتا ہوں اور اس میں سے مشک نافہ سے بہتر خوشبو پاتا رہتا ہوں۔

یزید بن اسود فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے ہاتھوں میں دیا تو میں نے آپ کا دست اقدس برف سے زیادہ سرد اور مشک سے زیادہ خوشبودار پایا اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ میری عیادت کو تشریف لائے اور اپنا دست مبارک میری پیشانی پر رکھا پھر آپ نے میرے چہرے' سینہ اور شکم پر مسح فرمایا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں آج تک آپ کے دست اقدس کی ٹھنڈک اپنے جگر میں محسوس کرتا ہوں لیکن اس کو نہیں بھولنا چاہیے کہ خوشبوئے مبارک آپ ﷺ کے جسم اطہر میں موجود تھی۔ چنانچہ آپ کے پسینہ مبارک اور بول کی خوشبو کا بیان آگے آئے گا۔

اب رہا آپ کے دست اقدس سے ٹھنڈک کا محسوس ہونا اور یہ کہ اس کا مطلب کیا ہے تو یہ صحت وتندرستی کی نشانی ہے۔ کیونکہ آپ گرم ومعتدل ہیں۔ لہٰذا یہ ٹھنڈک وہ ٹھنڈک نہیں ہے جو مزاج وطبیعت کی برودت وخنکی سے ہوتی ہے اور سرد پسینہ آنے لگتا ہے اور اس کے چھونے کو لوگ ناپسند کرتے ہیں بلکہ یہ اعتدال مزاج اور عدم غلبہ حرارت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آپ کے دست اقدس کے چھو جانے سے لذت اور راحت میسر آجاتی تھی جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث اور دیگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ فافہم وباللہ التوفیق

قدم مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کے قدم مبارک کی توصیف میں بھی ''ششن القدمین'' (یعنی دونوں قدم مبارک مزید تھے) وارد ہوا ہے جس طرح ششن الکفین (دونوں دست اقدس نرم وفربہ تھے) واقع ہوا ہے لیکن مواہب میں ''غلظ اصابع'' (فربہ ونرم پاؤں کی انگلیاں) بیان ہوا ہے۔ اور ''مشارق'' میں دونوں کے معنی فخیم یعنی فربہ کے لکھے ہیں۔ ایک روایت میں ''خمصان الاخمصین'' آیا ہے۔ ''خمص'' قدم کے اس باطنی حصہ کو کہتے ہیں جو زمین پر قدم رکھتے وقت زمین سے نہ ملے اور صراح میں کف پا کی باریکی لکھا ہے اور خمصان بضم خاء خمص کا تثنیہ ہے۔ الاخمص اسے کہتے ہیں جس کے پاؤں زمین سے بہت بلند ہوں۔ اس جگہ یہ اضافت مبالغہ کے لیے ہے جیسا کہ ابن الاثیر سے منقول ہے اور ایک روایت میں ''مسیح القدمین'' آیا ہے یعنی آپ کے دونوں قدم مبارک ہموار تھے۔ جن میں آلودگی اور شکستگی بالکل نہ تھی۔ ''ینبو عنہما الماء'' اگر اس پر پانی ڈالا جائے تو اپنی لطافت وپاکیزگی کی وجہ سے بہہ جائے اور تیزی سے پانی گزر جائے اور ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ زمین پر قدم مبارک رکھ کر چلتے تو پورے قدم رکھ کر چلتے اور اخمص یعنی ابھری ہوئی جگہ نہ تھی۔ اسے بیہقی نے روایت کیا اور ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کے پائے اقدس میں اخمص یعنی ابھار نہ تھا اور

زمین پر پورا قدم مبارک رکھتے۔ اسے ابن عساکر نے بیان کیا اور مسیح القدمین (ہموار قدم) کے بھی یہی معنی و مطلب ہیں اور کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مسیح اسی معنی میں کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے پائے مبارک میں بھی اخمص یعنی ابھار نہ تھا۔ واللہ اعلم اور ان کے نزدیک ''ینبو عنہما الماء'' (تیزی سے پانی بہہ جانا) یہ جداگانہ وصف ہے۔ مسیح القدمین سے متضمن نہیں ہے۔ اس حدیث میں منافات ظاہر ہے غایت وہ کہ جو کہا گیا اور توفیق روایت اس طرح ممکن ہے کہ قدرے اخمص یعنی ابھار تھا۔ نچلا حصہ ہموار نہ تھا اور بہت بلند بھی نہ تھا لیکن بایں تقدیر کہ اخمص (ابھار) میں مبالغہ کا اعتبار کیا جائے جیسا کہ بعض شارحوں نے کیا ہے اچھا نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن بریدہ ؓ سے منقول ہے کہ فرمایا

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْسَنَ الْبَشَرِ قَدَمًا رَوَاهُ ابْنُ سَعْدٍ

رسولِ خدا ﷺ کے قدم مبارک کی ظاہری شکل بہت حسین تھی۔

اور آپ کی ایڑیوں کے بارے میں ''منہوس العقب'' مروی ہے یعنی آپ کی ایڑیوں پر گوشت کم تھا۔ اکثر لوگوں نے لفظ منہوس کو سین مہملہ سے روایت کیا ہے اور صاحب ''البحرین'' اور ''ابن الاثیر'' نے سین مہملہ اور شین معجمہ دونوں سے روایت کیا ہے۔ ''شارق'' میں بھی دونوں لکھے ہیں اور بعض حضرات نے منہوش بمعنی ابھری ہوئی ایڑی کہا ہے اور صراح میں منہوس بمعنی کم گوشت لکھا ہے۔

کاتب الحروف عفی اللہ عنہ (یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی ؒ) کا قول ہے کہ میرے پیر و مرشد سیّد الشیخ موسیٰ (پاک شہید ملتانی) الجیلانی ؒ کی ایڑیاں صفاء و لطافت میں اس حد تک تھیں کہ کسی حسین و جمیل کے رخسار بھی ایسے نہ ہوں گے اور وہ حضورِ اکرم ﷺ کے حلیہ مبارک سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔

مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ سیّدہ میمونہ ؓ بنت کرزم سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو دیکھا ہے میں آپ کے پائے اقدس میں انگشت سبابہ کی درازی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ کی انگشت سبابہ (پاؤں کے انگوٹھے کے برابر کی انگلی) پاؤں کے تمام انگلیوں سے بڑی تھی۔ اسے احمد و طبرانی نے روایت کیا ہے اور جابر بن سمرہ ؓ سے منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ رسولِ خدا ﷺ کے پاءِ اقدس کی چھنگلیا متظاہر تھی اور مروی ہے کہ یہ لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہے کہ آپ کے دست مبارک کی انگشت شہادت بہ نسبت بیچ کی انگلی کے لمبی تھی۔ اس پر حافظ ابن حجر مکی ؒ فرماتے ہیں کہ جس کسی نے بھی یہ کہا ہے غلط ہے البتہ! پاؤں کی انگلیوں میں قدم مبارک کی انگشت سبابہ دراز تھی۔ ''مقاصد حسنہ'' میں کہا گیا ہے کہ یہ غلطی ہے جو حضرت میمونہ بنت کرزم ؓ کی مطلق روایت پر بے سوچے سمجھے اعتماد کر لینے سے پیدا ہوئی ہے لیکن یہ روایت مسند امام احمد میں پاؤں کی انگشت سبابہ کے ساتھ مقید ہے۔ اسی طرح بیہقی کے نزدیک ہے۔

(حضرت شیخ) عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلوی ؒ فرماتے ہیں کہ حدیث پاک میں مروی ہے آنحضرت ﷺ نے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ بھیجا گیا ہوں میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی مانند''۔ آپ نے قیامت پر اپنی بعثت کے مقدم ہونے کو اسی قدر تفاوت کے ساتھ اشارہ فرمایا جتنا کہ ان دونوں انگلیوں کے درمیان تفاوت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بعثت اور قیامت کی معیت سے مبالغہ کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ دونوں انگلیوں کے ملانے کی کیا حاجت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں انگلیوں کے ملانے سے تقدم و تاخر کا تفاوت ظاہر ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ انگشت شہادت اور بیچ کی برابر تھی اور ایک جماعت کہتی ہے کہ بطریق معجزہ اظہار معیت و مبالغہ کے لیے اس وقت میں برابر ہو گئی ہوں گی۔ واللہ اعلم

پنڈلیاں شریف: حضورِ اکرم ﷺ کی پنڈلیوں کے بارے میں ہے کہ کَانَ فِیْ سَاقَیْہِ خَمُوْشَۃٌ یعنی آپ کی دونوں پنڈلیاں باریک ولطیف تھیں پُر گوشت نہ تھیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ نَظَرْتُ اِلٰی سَاقَیْہِ کَاَنَّھَا جُمَّارَۃٌ یعنی میں نے آپ کی پنڈلی کی طرف نظر ڈالی تو وہ گویا درخت خرما تھا۔ ''جُمَّارَۃٌ'' بضم جیم وتشدید میم بمعنی درخت خرما جسے شحم النخل بھی کہتے ہیں جو کہ ہموار صاف لطیف اور سفید ہوتی ہے ''ضخم الکرادیس'' جن کے جوڑ فربہ کردوس بفم ان دو ہڈیوں کو کہتے ہیں جو جوڑ میں پیوستہ ہوں کہتے ہیں کہ اس سے فربہی اور اعضا کا قوی ہونا مراد ہے۔ صراح میں ہے کہ کردوس جوڑوں کی دوگانہ ہڈیوں کو کہتے ہیں دوشانے' بازو اور زانو وغیرہ۔

قامت زیبا: حضورِ اکرم ﷺ کا قامت زیبا یعنی قد مبارک' باغ قدس اور بوستان انس کی شاخ تھا۔ یعنی لطیف' درست اور چست تھا' نہ کوتاہ نہ بہت دراز لیکن مائل بہ درازی تھا لہٰذا حدیث میں آیا ہے کہ کَانَ رَبْعَۃً مِنَ الْقَوْمِ قوم میں متوسط القامت تھے۔ رَبْع بفتح راء وسکون باء معنی متوسط القامت' ایک اور حدیث میں ہے کہ اَطْوَلُ مِنَ الْمَرْبُوْعِ وَاَقْصَرُ مِنَ الْمُشَذَّبِ پستہ قد سے طویل قامت اور طویل قامت سے کوتاہ تھے۔ مطلب یہ کہ پستہ قد سے درازتر اس بنا پر کہ مائل بجانب درازی تھے۔

''مشذب'' بضم میم وفتح شین وذال معجمہ باتشدید بمعنی بسیار دراز جس کے کھڑے ہونے میں خوف واضطراب لاحق رہے اور ابن ابی ہالہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ لَمْ یَکُنِ الطَّوِیْلُ الْمُمَغَّطُ بہت زیادہ دراز قد نہ تھے۔ الممغط بضم میم اوّل وبفتح میم ثانی' مشدد وکسر غین معجمہ' نیز مہملہ سے بھی آیا ہے اور بغین مشددہ ومعجمہ طاء مہملہ بروزن اسم مفعول از باب تفعیل بھی پڑھا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں جو دراز قد میں غایت درجہ طویل ہے۔ وَلَا بِالْقَصِرِ الْمُتَرَدِّدِ نہ متردد کی مانند کوتاہ قد' متردد اسے کہتے ہیں جس کے جسم کے کچھ اعضاء باہر نکل آئیں مثلاً کوبڑ وغیرہ' بعض حضرات اس عبارت سے اثبات قصر بھی کرتے ہیں مگر زیادہ نہیں جتنا کہ توسط واعتدال کو لازم ہے اور ایک اور حدیث میں ہے: لَمْ یَکُنْ بِالطَّوِیْلِ الْبَائِنِ یَعْنِیْ مُفْرَطٌ یعنی طول میں سب سے جدا اور دراز قد نہ تھے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے ''لَیْسَ بِالذَّاھِبِ طُوْلًا وَفَوْقَ الرَّبْعَۃِ اِذَا جَاءَ مَعَ الْقَوْمِ غَمَرَھُمْ یعنی آپ بہت زیادہ دراز قد نہ تھے لیکن مائل بطول ہونے کے اعتبار سے ''ربعہ'' سے بلند تھے۔ جب آپ کسی قوم میں تشریف لاتے تو انہیں چھپا لیتے اور ان کے پست وکوتاہ قد لوگ آپ کے قریب چھپ جاتے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ جب تنہا ہوتے تو ''ربعہ'' یعنی متوسط القامت معلوم ہوتے اور جب قوم کے درمیان ہوتے تو سب سے بلند وبالا معلوم ہوتے اور اس وقت منسوب بہ طویل القامت کہلاتے اور اگر دو آدمی داہنے بائیں ہوتے تو آپ دونوں سے بلند نظر آتے اور جب ان کے درمیان سے جدا ہو جاتے تو پھر منسوب بہ متوسط القامت (ربعہ) ہوتے نیز مجلس میں آپ کے دونوں شانے مبارک بلند سے بلندتر ہوتے۔ ﷺ

بے سایہ وسائبان عالم: حضورِ اکرم ﷺ کا سایہ نہ تھا' نہ آفتاب کی روشنی میں نہ چاند کی طلعت میں' اسے حکیم ترمذی نے ذکوان سے ''نوادر الاصول'' میں روایت کیا ہے۔ ان بزرگوں پر تعجب ہے کہ چراغ کی روشنی کا ذکر نہ فرمایا ''نور'' آپ کے اسماء مبارکہ میں سے ایک نام ہے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا (مولانا جامی نے خوب کہا ہے)

امی ودقیقہ دان عالم بے سایۂ وسائبان عالم

رنگ مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کا رنگ مبارک روشن وتاباں تھا۔ جمہور صحابہ کا اتفاق ہے کہ آپ کا رنگ مبارک مائل بہ سفیدی تھا۔ سفیدی کے ساتھ ہی آپ کی تعریف وتوصیف کی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ''کان ابیض ملیحا'' ایک اور روایت میں ''ابیض ملیح الوجہ''

آیا ہے یعنی سپید رنگ، ملیح بشرہ تھا۔ اس توصیف سے مراد سفیدی و ملاحت ہے حالانکہ ملاحت، آپ کے حسن و جمال اور دیدار جانفزا کی دلربائی و لذت بخشی کے اظہار بیان کے لیے علیحدہ صفت ہے۔ یا خالص سفیدی بغیر نمکینی جسے ابہق کہتے ہیں اسے سے بچنے کے لیے ہو اور ابہق کی تفسیر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ابہق وہ سفیدی ہے جس میں نہ سرخی ہو نہ زردی اور نہ گندم گوں ہو اور اس سفیدی کے مشابہ ہے جو برص کے مریضوں کے چہرہ پر ہوتی ہے اور جست کے ہم رنگ ہو۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ کا چہرۂ انور بہت سفید اور آپ کے موئے ہائے مبارک سخت سیاہ تھے۔ ابوطالب کے اس شعر میں جو انہوں نے آپ کی مدح میں کہا ہے اس میں ہے کہ

وَاَبْيَضُ يَسْتَسْقِي الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ

یعنی آپ کے چہرۂ انور کی سفیدی سے برسنے والا سفید بادل بارش کی بھیک مانگتا ہے اور آپ یتیموں بیواؤں کی پرورش فرمانے والے ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ اَبْيَضُ مُشْرَبٌ وَاَنَّهٗ شَرَابٌ خَلَطَ لَوْنٌ بِلَوْنٍ یعنی آپ کا رنگ سفید مشربی تھا۔ مشرب اس شراب کو کہتے ہیں جس میں ایک رنگ میں دوسرے رنگ کی آمیزش ہو۔ گویا ایک رنگ پلا کر دوسرا رنگ پلایا گیا ہو۔ اس جگہ مشرب سے مراد سرخی ہے دوسری روایت میں تصریح بھی آئی ہے۔ ابیض مشرب بحمرۃ یعنی آپ کا رنگ سرخ و سفید تھا اور بعض نے ''ازہر اللون'' کہا ہے جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ اس کی بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے ان کی مراد چمک اور تابانی ہے۔

نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ ایک روز حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے ایک بدوی ایلچی بن کر آیا اور اپنی سادگی و محبت اور تعجب سے پوچھنے لگا ''اَيْنَ ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلَبِ'' یعنی فرزند عبدالمطلب کہاں ہیں اور تم میں سے وہ کون ہیں؟ یعنی وہ ذات کریم جس کے حسن و جمال نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے اور اس کے جاہ و جلال کے غلغلہ سے سارے جہان کے کان گونج رہے ہیں۔ صحابہ فرمانے لگے **هذا الامغر المرفق** یہ مرد سرخ و سفید رو جو اپنی کہنی کو تکیہ بنا کر ٹیک لگائے تشریف فرما ہیں ''اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ قَدْرَ حُسْنِهٖ وَجَمَالِهٖ'' قاموس میں امغر بغین معجمہ بمعنی وہ شخص جس کے چہرے پر سرخی و سفیدی ہو اور مرفق وہ ہے جو اپنی کہنی کو تکیہ بنا کر ٹیک لگائے ہوئے ہو۔ بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ''**لیس بابیض ابهق**'' وہ برص کی مانند سفید نہ تھے۔ ابہق کے معنی گزر چکے ہیں از روئے قاموس ابہق کے معنی ہیں وہ سفیدی جس میں سرخی کی آمیزش نہ ہو اور اس میں رنگ کی چمک بھی نہ ہو۔ اس کے علاوہ آپ کے رنگ مبارک کی توصیف میں ''اسمر'' بھی آیا ہے۔ ''سمرہ'' سفیدی و سیاہی کے درمیان ایک رنگ ہوتا ہے اور سمراء گندمی رنگ کو بھی کہتے ہیں لیکن صراح میں سمرہ بمعنی گندمی رنگ لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مشربی سفیدی کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے اور اہل عرب سمراء (گندمی) کا اطلاق اسی پر کرتے ہیں اور دوسری حدیث میں ابیض آیا ہے یعنی آپ کے جسم انور کی سفیدی مائل بسمرہ (گندم گوں) کہتے ہیں کہ مشرب جب ''مبشع'' ہو تو مشابہ اسمر کے ہے لیکن ''ادمہ'' کی نفی کی گئی ہے۔ ادمہ وہ رنگ ہے جس میں سیاہی بہت گہری ہو۔ چنانچہ ترمذی کی حدیث میں آیا ہے: لَيْسَ بِالْاَبْيَضِ الْاَمْهَقِ وَلَا بِالْاٰدَمِ آپ کا رنگ نہ تو مبروص کی مانند سفید تھا اور نہ بالکل سیاہ قاموس و صراح سے معلوم ہوتا ہے کہ ''آدمہ'' بمعنی سمرہ ہے اور آدم بمعنی ''اسمر'' ہے۔ اس قول کے بموجب ''لا بالادم'' کا مطلب ادمہ یعنی سخت سیاہی ہو گی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''سمرہ'' سے مراد آمیزش شدہ سفیدی ہے اور سفیدی کے اثرات سے مراد وہ سفیدی ہے جس میں سرخی کی آمیزش ہو۔ اس خالص سفیدی کی نفی کی

ہے جسے ابہق یا مبروص کہتے ہیں۔ اس سے وہ قول ساقط ہو جاتا ہے جس حدیث میں ابن جوزی کے بقول کہا گیا ہے کہ ''کان اسمر'' یہ اس لیے غلط ہے کہ یہ مخالف احادیث ہے کیونکہ احادیث میں صریحاً ''ابیض مشرف'' (سرخی مائل سفیدی) اور لا بالآ دم واقع ہوا ہے۔ اس ادم سے اسمر (گندمی) مراد ہے اور ابن جوزی نے بیاض وسمرہ کی جمع کے سلسلے میں کہا ہے کہ آپ کے جسم اطہر کے وہ حصے جو دھوپ سے متاثر ہوتے رہتے تھے اسمر (گندم گوں) تھے اور جو حصے کپڑوں کے اندر رہتے تھے سفید تھے لیکن علماء کو اس سے اختلاف ہے کیونکہ آفتاب کی شعاعیں اور ہوا آپ کے جسم اطہر کا رنگ متغیر نہیں کرسکتی تھیں جس طرح کہ ''انوار المتجر د'' ابن ابی ہالہ ؓ کی حدیث میں واقع ہوا ہے کہ بدن اطہر کا جو حصہ باہر اور کپڑوں سے کھلا رہتا تھا وہ عام لوگوں کے برعکس روشن اور سفید تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ محبت اور شیفتگی اس در کے خادم ہیں پھر یہ کس طرح کوئی ایسی توصیف بیان کرسکتا ہے جو سرورِ دو عالم ﷺ میں موجود ہی نہ ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ آخر عمر شریف میں آپ کا رنگ مبارک پختہ ہو چکا تھا۔ اس وقت ''حمرۃ'' مائل بسمرہ ہو گیا تھا۔

مشی ورفتار مبارک: حضورِ اکرم ﷺ کی رفتار مبارک کے متعلق حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا مَشٰى تَكَفَّأَ كَاَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ	رسولِ خدا ﷺ جب چلتے تو جھک جھک کر چلتے گویا کہ اوپر سے اتر رہے ہیں۔

''تکفوء'' کی تفسیر میل کر دی بجانب مشی یعنی آگے کی جانب جھک کر چلنا سے کی ہے جس طرح پھولوں والی ٹہنی جھکتی ہے اور قدم مبارک چستی، طاقت اور سرعت کے ساتھ اٹھاتے تھے۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت کیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ زمین پر ہمیشہ پورا قدم رکھتے تھے ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ کی رفتار مجمعاً یعنی قوت سے بھرپور بے استرخاء و سستی اعضاء تھی۔ حضرت علی مرتضیٰ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ آپ چلتے میں زمین سے پورا قدم اٹھاتے اور کشادہ رکھتے اور آسان وسبک اور تیز بغیر حرکت واضطراب کے چلتے اور ان کا قول ''كَاَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ'' گویا کہ زمین کی بلندی سے اس کے نشیب وپستی میں اتر رہے ہیں۔ صبب بفتحتین وصبوب زمین منحدر کو کہتے ہیں اور ''انحدار'' بلندی سے نشیب کی طرف اترنے کو کہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تمثیل پورے قدم پاک کے اٹھانے کی قوت کے لیے ہے نہ کہ سبکی تحرک اور اضطراب کے لیے ہے۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو راہ میں رسولِ خدا ﷺ سے زیادہ تیز تر چلتے نہیں دیکھا۔ گویا کہ زمین آپ کے قدموں کے نیچے پھٹی جاتی تھی اور ہم آپ کی ہمراہی میں تکان اور محنت محسوس کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کے لیے ہمیں دوڑنا پڑتا تھا جس سے ہمارے سانس پھول جاتے تھے لیکن آپ کو کچھ بھی محسوس نہ ہوتا تھا اور آپ معمول کے مطابق بے تکلف چلتے تھے اور اصلاً اضطراب نہ فرماتے تھے۔ یہ چلنا اولوالعزم، اہل ہمت اور شجاعت کا آئینہ دار ہے اور یہ چلنا اقسام رفتار میں قوی واعتدال پر ہے۔ اس سے اعضاء کو راحت وآرام ملتا ہے۔ آپ کبھی نعلین مبارک پہن کر چلتے اور کبھی بغیر نعلین کے کبھی آپ پاپیادہ چلتے اور کبھی سواری پر، خصوصاً غزوات میں

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن بناز   آں سرو من پیادہ خوش است وسوار خوش

اور جب آپ صحابہ کرام کے ساتھ چلتے تو صحابہ کو اپنے آگے آگے چلاتے اور خود ان کے پیچھے رہتے۔ فرماتے میری پشت کو فرشتوں کے لیے خالی چھوڑ دو۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ''كَانَ يَسُوْقُ اَصْحَابَهٗ'' آپ اپنے اصحاب کو آگے چلاتے تھے۔ ''سوق'' کے معنی سواری کے جانور کو پیچھے سے ہنکانا اور ''قود'' کے معنی جانور کو آگے سے کھینچنا۔ آپ سفر میں تمام صحابہ کو بھیجنے کے بعد روانہ

ہوتے اور ناتواں وکمزوروں کو سہارا دیتے اور رہ جانے والوں کو سوار فرماتے کبھی اپنا ردیف یعنی پیچھے بٹھاتے تھے ﷺ

اقسام رفتار: فائدہ: انواع رفتار دس ہیں۔ ایک تحادت ہے۔ یہ افسردہ اور مریل مانند خشک لکڑی کے لوگوں کی مٹھی چال ہے۔ دوسری ''ازعاج'' ہے یعنی طیش وخفت سبک سری اور اضطراب وپریشانی کی چال۔ یہ دونوں مذموم وقبیح قسمیں ہیں جو مردہ دلی پر دلالت کرتی ہیں۔ تیسری چال ''ہون'' ہے جو مکمل حرکت اور قدرے سرعت کی چال ہے اور یہی حضور اکرم ﷺ کی چال تھی جو سکون ووقار اور بلاتکبر وتحادت کی علامت ہے۔ چوتھی چال ''سعی'' ہے جو تیزی سے چلی جائے۔ پانچویں چال ''رمل'' بفتح راء ہے جو جلدی جلدی قدم اٹھا کر اور مونڈھوں کو جنبش دے کر چلی جائے' جس طرح پہلوان چلتے ہیں۔ چھٹی چال ''نسلان'' ہے جو دوڑ کر تیزی سے چلی جائے۔ یہ رفتار سعی سے تیز تر ہے۔ ساتویں چال ''خوریٰ'' بفتح خاء وسکون راء بازاء آخر الف مقصورہ ہے جو پنجوں کے بل چلی جائے۔ آٹھویں چال ''قہقریٰ'' ہے جو پشت کی طرف الٹے قدم چلی جائے۔ نویں چال ''جمزیٰ'' بفتح جیمہ ہے جو کود کر چلی جائے۔ اونٹنی کو ''جمارہ'' اسی معنی میں کہا جاتا ہے۔ دسویں چال ''تبختر'' ہے جو آہستہ خرامی سے ٹہلتے ہوئے گردن اٹھا کر متکبروں کے انداز میں چلی جائے۔ رفتار کی ان دس قسموں میں سب سے اکمل وافضل ''ہون'' ہے قرآن کریم میں بھی اس رفتار کی مدح فرمائی موجود ہے چنانچہ فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا اللہ کے وہ بندے ہیں جو زمین پر ''ہون'' کی رفتار سے چلتے ہیں۔

پسینہ وفضلات کی خوشبو: حضور اکرم ﷺ کی نرالی وعجیب صفتوں میں سے ایک پاکیزہ وطیب خوشبو ہے۔ یہ آپ کی ذاتی تھی کسی قسم کی خوشبو استعمال کیے بغیر ہی دنیا کی کوئی خشبو آپ کے جسم اطہر کی خوشبو سے ہمسری نہ کر سکتی تھی۔ سیّدنا انس ؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ہر ایک خوشبو خواہ مشک ہو یا عنبر سونگھی ہے لیکن نبی اکرم ﷺ کی خوشبوئے اطہر سے زیادہ کوئی نہ تھی اور ام عاصم ؓ زوجہ عتبہ بن فرقد سلمی بیان کرتی ہیں کہ ہم چار عورتیں عتبہ کی زوجیت میں تھیں اور ہم میں سے ہر ایک یہی کوشش کرتی کہ زیادہ سے زیادہ خوشبو میں بس کر عتبہ کے قریب جائیں۔ ہم سب اس کوشش میں خوب خوشبو کا استعمال کرتیں لیکن ہم میں سے کسی کی خوشبو عتبہ کی خوشبو تک نہ پہنچتی تھی۔ حالانکہ عتبہ ؓ خوشبو کو بھی اسی حد تک استعمال کرتے تھے کہ روغن کو اپنے ہاتھوں سے چھواتے اور اسے اپنی داڑھی پر ملتے مگر اس کی خوشبو ہم سب پر غالب رہتی اور جب عتبہ ؓ باہر جاتے تو لوگ کہتے کہ ہم خوشبو استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی خوشبو عتبہ ؓ کی خوشبو سے زیادہ تیز نہیں ہے۔ ام عاصم ؓ کہتی ہیں کہ میں نے ایک دن عتبہ سے کہا ہم سب خوشبو کے استعمال میں خوب کوشش کرتی ہیں ہیں لیکن تمہاری خوشبو تک ہماری خوشبو نہیں پہنچتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ رسولِ خدا ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ مجھے ''شریٰ'' یعنی گرمی دانے جسے پت کہتے ہیں نکل آئے تھے (اس مرض میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سارے بدن میں چنگاریاں لگی ہوئی ہیں) تو میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں جا کر اپنے اس مرض کی شکایت کی تاکہ علاج فرما دیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: اپنے بدن سے کپڑے اتار دو تو میں نے کپڑے اتار کر آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر آپ نے اپنا دست مبارک میری پشت وشکم پر ملا اس وقت سے یہ خوشبو مجھ میں پیدا ہو گئی ہے۔ اسے طبرانی نے معجمہ صغیر میں روایت کیا۔

ایک شخص نے اپنی لڑکی کو اس کے شوہر کے گھر بھیجنے کے لیے خوشبو کی جستجو کی مگر اسے نہ مل سکی تو اس نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس لیے عرض حال کیا کہ حضور ﷺ کوئی خوشبو عطا فرما دیں مگر کوئی خوشبو موجود نہ تھی تو حضور ﷺ نے شیشی طلب فرمائی تاکہ اس میں خوشبو ڈال دی جائے۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے جسم اقدس سے پسینہ لے کر اس شیشی میں بھر دیا اور فرمایا: جا کر اسے اپنی لڑکی کے جسم پر مل دو جب اسے ملا گیا تو سارا مدینہ اس کی خوشبو سے مہک گیا تھا اور اس گھر کا نام ہی ''بیت المطیبین'' خوشبو کا گھر رکھ دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضورِ اکرم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے اور دوپہر کے وقت قیلولہ فرمایا چونکہ حضور ﷺ کو خواب میں بہت پسینہ آیا کرتا تھا تو میری والدہ نے جن کا نام ''ام سلیم'' ہے شیشی لے کر آپ کا پسینہ مبارک اس میں جمع کرنے لگیں۔ حضور ﷺ کی آنکھ کھل گئی۔ فرمایا: اے ام سلیم! رضی اللہ عنہا کیا کر رہی ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ آپ کا پسینہ مبارک جمع کر رہی ہوں تاکہ میں بطور خوشبو استعمال کروں کیونکہ اس کی خوشبو سب سے زیادہ بہتر ہے۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ جب کوئی صحابی بقصد حضوری آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور آپ کو کاشانۂ اقدس میں نہ پاتا تو وہ راہ میں آپ کی اس خوشبو کو سونگھتے جو آپ کی گزرگاہ ہونے کے سبب راہ میں پھیلی ہوتی۔ مدینہ منورہ کے جس کوچے میں وہ خوشبو محسوس کرتے چلتے جاتے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ اس راہ سے گزرے ہیں۔

آج بھی مدینہ منورہ کے درودیوار سے آپ کی خوشبوئے جانفزا کی لپٹیں آ رہی ہیں جس سے مجنوں کے دماغ محبت معطر ہو جاتے ہیں۔ شاید کہ ایک شمہ اس خوشبو کا بعض غریب و مشتاق اور مفلس و نادار مسافروں کے شامۂ ذوق کو بھی میسر ہو۔ ابوعبداللہ عطار مدینہ طیبہ کی مدح میں کہتے ہیں۔

بِطِیبِ رَسُوْلِ اللّٰہِ طَابَ نَسِیْمُھَا فَمَا الْمَسْکُ وَالْکَافُوْرُ الْمَنْدل الرَّطَب

یعنی رسول اللہ ﷺ کی خوشبو سے مدینہ طیبہ کی فضا مہک رہی ہے۔ مشک و کافور کیا ہیں ان کی مانند تو وہاں کھجوروں میں خوشبو ہے۔ حضرت شبلی جو علمائے صاحب وجدان میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کی خاک پاک میں خاص قسم کی خوشبو ہے جو مشک و عنبر میں قطعاً نہیں اور فرماتے ہیں کہ مدینہ میں ایسی خوشبو کا ہونا عجائب و غرائب میں سے ہے۔

ھداں زمیں کہ نسیمے درز دز طرۂ دوست چہ جائے دم زدن نافہائے تاتاریست

بروایت ابونعیم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کے چہرۂ انور پر پسینہ مبارک موتی کی مانند اور اس کی خوشبو مشک سے زیادہ ہوتی تھی۔

دست مبارک کی خوشبو: آپ کے دست مبارک کی توصیف میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے میرے رخسار پر اپنا دست اقدس پھیرا تو میں نے ایسی ٹھنڈک اور خوشبو پائی کہ گویا آپ نے ابھی عطر کی ڈبیہ سے اپنا دست اقدس نکالا ہے جو کوئی بھی آپ سے مصافحہ کرتا وہ تمام دن اپنے ہاتھوں میں خوشبو پاتا۔ آپ جس بچے کے سر پر دست شفقت رکھتے وہ آپ کی خوشبو کی وجہ سے تمام بچوں میں ممتاز و معروف ہو جاتا۔

فائدہ: بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے پسینہ مبارک سے گلاب کا پھول پیدا ہوا ہے۔ ایک اور جگہ مروی ہے آپ نے فرمایا: گل سفید یعنی چنبیلی میرے پسینے سے شب معراج پیدا ہوئی' گل سرخ گلاب جبریل علیہ السلام کے پسینہ سے اور گل زرد یعنی چمپا براق کے پسینہ سے' نیز مروی ہے کہ فرمایا معراج سے واپسی پر میرے پسینہ کا قطرہ زمین پر گرا تو اس سے گلاب کی روئیدگی ہوئی جو کوئی میری خوشبو سونگھنا چاہے وہ گلاب کو سونگھے ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جب میرے پسینے کا قطرہ زمین پر گرا تو زمین ہنسی اور گلاب کے پھول کو اگایا لیکن محدثین ان حدیثوں کو اپنی ان اصطلاحوں کے بموجب جو وہ رکھتے ہیں کلام کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ میں ابوالفرح نہروانی سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ان حدیثوں میں جو کچھ آیا ہے وہ نبی مختار ﷺ کے دریائے فضل و کرم کا ایک قطرہ ہے اور ان کثرت میں سے بہت تھوڑا ہے جن سے پروردگار نے اپنے حبیب کو مکرم فرمایا' محدثین کا ان میں کلام

کرنا اپنی ان اصطلاحات وضاعت کے مطابق ہے جوانہوں نے اسناد کی تحقیق وتصحیح میں منضبط فرمائے ہیں ایسا استبعاد ومحال یا ناممکن ہونے کی بنا پر نہیں ہوا ہے۔ واللہ اعلم

بوقت قضائے حاجت زمین کا شق ہو جانا: جب حضور اکرم ﷺ قضائے حاجت کا ارادہ فرماتے تو زمین میں شگاف پڑ جاتا اور زمین آپ کا بول و براز اپنے اندر سمو لیتی اور اس جگہ ایک خوشبو پھیل جاتی تھی۔ آپ کے براز کو کسی نے بھی نہ دیکھا۔ سیّدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ استنجا کر کے بیت الخلا سے تشریف لاتے تو میں جا کر دیکھتی تو اس جگہ از قسم براز کچھ نہ دیکھتی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! (رضی اللہ عنہا) تم نہیں جانتیں، انبیاء کرام علیہم السلام سے جو کچھ ان کے بطن اطہر سے نکلتا ہے زمین اسے نگل جاتی ہے چنانچہ اسے دیکھا نہیں جاتا۔

ایک صحابی سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ میں ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھا۔ آپ قضائے حاجت کے لیے ایک جگہ تشریف لے گئے جب آپ واپس تشریف لے گئے تو میں اس جگہ گیا جہاں حضور ﷺ نے فراغت فرمائی تھی۔ میں نے اس جگہ بول و براز شریف کا کوئی نشان تک نہ دیکھا۔ البتہ! چند ڈھیلے وہاں پڑے تھے میں نے اسے اٹھالیا تو اس سے نہایت لطیف و پاکیزہ خوشبو آ رہی تھی۔ ﷺ

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے شفا میں فرمایا ہے کہ اہل علم کی جماعت حضورِ اکرم ﷺ کے ''حدثین'' یعنی بول یا براز فرمانے کے بعد وضو کرنے کے قائل ہے اور یہی قول بعض اصحاب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

بول مبارک: اب رہی بول مبارک کی کیفیت تو اس کا بکثرت صحابہ نے مشاہدہ کیا ہے اور حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا جو آپ کی خدمت میں رہا کرتی تھیں انہوں نے اسے پیا بھی ہے چنانچہ منقول ہے کہ رات کے وقت حضور ﷺ کے تخت مبارک کے نیچے پیالہ رکھا جاتا کہ رات میں اس میں بول مبارک فرما دیں۔ چنانچہ ایک رات جب آپ نے اس میں بول مبارک فرمایا اور صبح ہوئی تو حضور ﷺ نے ام ایمن رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اس تخت کے نیچے ایک پیالہ ہے اسے زمین کے سپرد کر دو۔ مگر انہوں نے کچھ نہ پایا۔ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے عرض کیا خدا کی قسم رات مجھے پیاس معلوم ہوئی میں نے اسے پی لیا تھا اس پر حضور ﷺ نے تبسم فرمایا اور نہ انہیں اپنا منہ دھونے کا حکم فرمایا اور نہ دوبارہ ایسا کرنے سے منع فرمایا بلکہ یہ فرمایا کہ اب تمہیں کبھی پیٹ کا درد لاحق نہ ہوگا (خوش نصیب)

ایک عورت تھی جس کا نام برکہ رضی اللہ عنہا تھا وہ بھی آپ کی خدمت میں رہا کرتی تھی اس نے بھی آپ کا بول شریف پی لیا تھا اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ''اصحمت یا ام یوسف'' اے ام یوسف! (برکہ اس کی کنیت تھی) تم ہمیشہ کے لیے تندرست بن گئیں۔ کبھی بیمار نہ ہو گی۔ چنانچہ وہ عورت کبھی بیمار نہ ہوئی بجز اس بیماری کے جس میں اس نے دنیا سے کوچ کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کا بول شریف پی لیا تھا تو اس کے جسم سے ہمیشہ خوشبو مہکتی رہی۔ حتی کہ اس کی اولاد میں کئی نسلوں تک یہ خوشبو رہی۔ مواہب اور شفا میں یہ دونوں روایتیں مذکور نہیں ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام آپ کے بول مبارک اور لہو شریف کو تبرک گردانتے تھے۔ لہو شریف کا پینا صحابہ سے متعدد بار واقع ہوا ہے چنانچہ اس حجام نے جس نے آپ کے پچھنے لگائے تھے تو سنگھی یا چسکی سے جتنا لہو شریف نکلتا وہ اسے حلق میں اپنے شکم میں اتارتا جاتا۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم خون کا کیا کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا میں خون نکال کر اپنے شکم میں پنہاں کرتا جاتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ حضور ﷺ کا خون مبارک زمین پر بہے۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ تم نے اپنی پناہ تلاش کر لی اور اپنے نفس کو محفوظ بنا لیا یعنی بلا اور امراض سے بچ گئے۔

غزوۂ احد کے دن جب حضورِ اکرم ﷺ مجروح ہوئے تو حضرت ابوسعید خدری ؓ کے والد مالک بن سنان ؓ نے آپ کے زخموں کو اپنے منہ سے چوس کر زبان سے زخموں کو پاک وصاف کیا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ اپنے منہ سے خون باہر نکالو انہوں نے کہا نہیں! خدا کی قسم زمین پر آپ کے خون کو ہرگز نہ گرنے دوں گا۔ وہ خون کو نگل گئے اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص خواہش رکھتا ہے کہ وہ کسی جنتی شخص کو دیکھے تو وہ انہیں دیکھ لے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر ؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور ﷺ نے پچھنے لگوائے اور اپنا خون مبارک مجھے دے کر فرمایا کہ اسے کسی ایسی جگہ غائب کر دو جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ میں نے اسے پی لیا کیونکہ اس سے زیادہ پوشیدہ جگہ میں نہیں پاتا تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: وائے تمہیں لوگوں سے اور وائے لوگوں کو تم سے یہ ان کی قوت، مردانگی، شجاعت اور بہادری سے کنایہ تھا جو انہیں اس خون مبارک کے پی لینے سے حاصل ہوئی۔ یہی وہ عبداللہ بن زبیر ؓ ہیں جنہوں نے یزید پلید کی بیعت نہ فرمائی اور مکہ مکرمہ میں اقامت رکھی اور ان کے حلقہ میں حجاز و یمن اور عراق و خراساں کے لوگ آ کر جمع ہوئے لیکن عبدالملک بن مروان کے عہد امارت میں حجاج بن یوسف نے ان کو شہید کیا اور دار پر کھینچا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ عبداللہ بن زبیر ؓ سے خونِ مبارک کے پی لینے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: لَاتَمَسَّكَ النَّارُ اِلَّا قَسَمُ الْيَمِيْنِ یعنی تمہیں دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی مگر قسم کے لیے۔

یہ حدیثیں دلالت کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کا بول ودم طیب وطاہر ہے اور اسی قیاس پر آپ کے تمام فضلات کا حکم ہے اور عینی شارح صحیح بخاری فرماتے ہیں کہ امام اعظم امام ابوحنیفہ ؓ کا یہی مذہب ہے اور شیخ ابن حجر مکی ؒ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کے فضلات طہارت پر بہت زیادہ اور کثرت سے روشن دلائل ہیں اور ہمارے ائمہ کرام اسے حضور ﷺ کی خصوصیات میں شمار کرتے ہیں ﷺ

ازدواجی زندگی مبارک: اب رہا حضورِ اکرم ﷺ کا اپنی بیویوں سے مباشرت فرمانے کا ذکر، اگرچہ اس وصف کا ذکر بظاہر پشت وسینہ اور شکم کے ذکر کے بعد مناسب تھا لیکن سلسلہ وسیاق کلام اور نظم وضبط مضامین کی وجہ سے بعض ان مقامات کے سبب کہ اس ذکر کو آخر میں لے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا یہ مقام بہتر ہے۔ نکاح کے فوائد میں سے پہلا فائدہ نسل کی حفاظت، نوع انسانی کے دوام کے بعد، حصول لذت، انتفاع نعمت اور حفظ صحت ہے۔ اس لیے کہ مادۂ تولید یعنی منی کو عرصہ تک روکے رکھنے اور جماع نہ کرنے سے امراض شدیدہ کے پیدا ہونے اور قویٰ واعضاء کے ضعف کرنے کا سبب اور انسداد مجازی کا موجب ہے۔ عورتوں سے محبت کرنا اور کئی کئی نکاح کرنا از قسم کمال ہے اور ایک ان مقامات میں سے ہے جہاں کوتاہ اندیشوں کی عقل اس کمالیت کی حقیقت سے در پردہ اور محجوب ہے۔ بیویوں سے جماع ومباشرت کو عاقبت نااندیش نقصان وعیب کی صورت اور لہو ولعب کی قبیل سے شمار کرتے ہیں حالانکہ یہ فہم کی کمی اور رہبانیت کی طرف طبیعت مائل ہونے کی وجہ سے ہے اور نظر بحقیقت وجماعیت، فعل وانفعال اور تاثیر وتاثر جو کہ ظہور عالم کی علت غائیہ ہے جتنا اس میں ہے اور کسی دوسرے فعل میں نہیں ہے۔ حضور سیّد انبیاء ورسل ﷺ کا فعل مبارک اس کی سند وحجت کے لیے کافی ہے۔ اس بحث کا بقیہ حصہ انشاءاللہ تعالیٰ آخر کتاب میں ذکر ازواج مطہرات کے ضمن میں آئے گا۔

سیّدنا انس ؓ کی حدیث میں ہے کہ حضورِ انور ﷺ ایک شب میں اپنی (گیارہ) بیویوں کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے انس ؓ سے پوچھا کیا حضور اتنی طاقت رکھتے تھے؟ حضرت انس ؓ نے فرمایا: ہم آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تیس مردوں کی طاقت عطا فرمائی تھی اسے بخاری نے روایت کیا اور ایک روایت میں جنتی چالیس مردوں کی قوت بتایا گیا ہے اور مروی ہے کہ ہر جنتی مرد کی قوت سو (دنیاوی) مردوں کی قوت کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں ہے کہ

ان کوشریک فرمالیتے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپ کے مخصوص اصحاب' عام لوگوں کی ضروریات اوران کی حاجتوں کی اطلاع فرماتے پھر خواص صحابہ آپ کی مجلس مبارک کے فوائدان عام لوگوں میں پہنچاتے مطلب یہ کہ سب سے پہلے بے واسطہ فوائدان خواص کو پہنچتے۔ پھر دوبارہ ان خواص کے واسطے سے عام لوگوں کو پہنچتے تھے اورفوائد ونصائح میں سے حضور ذخیرہ کر کے اورلوگوں سے بچا کر کچھ نہیں رکھتے تھے۔ یعنی جو کچھ ان کے حال واستعداد کے مناسب ہوتا آپ انہیں پہنچا دیتے۔

حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ اور عادات کریمہ میں ایثار اوراہل فضل وعلم اورصاحبان صلاح وشرف کواجازت کے ساتھ اختیار تھا یعنی ان کو اندر آنے کی اجازت مرحمت فرماتے اوراپنی مجلس شریف کی حاضری میں مخصوص گردانتے اوران کے فضل ومرتبت کے مطابق دین میں تقسیم فرماتے۔ مطلب یہ کہ جو شخص آپ کی مجلس میں یا دین داری میں جتنا زیادہ مخصوص وممتاز ہوتا وہ اپنے نصیب میں حضور ﷺ کی عنایت ورعایت کا بہت زیادہ مستحق ہوتا تھا۔ آپ لوگوں کی حاجت روائی اوراصحاب کے مقاصد کی تحصیل میں مشغول رہتے اوران کو اپنے احوال کی درستگی واصلاح کے کاموں میں مشغول رکھتے تھے اورارشاد فرماتے کہ تم پرلازم ہے کہ جو اس مجلس مبارک میں حاضر ہوکر سنے وہ دوسرے غیر موجود لوگوں کو پہنچائے۔ آپ فرماتے تم سب پر فرض ہے کہ مجھ تک ان لوگوں کی حاجتیں پہنچاؤ جو میرے حضور حاضر ہوکر خود نہیں پہنچا سکتے۔

فائدہ: آپ نے فرمایا: جو کسی ایسے شخص کی حاجت' سلطان حاجت یعنی حاجت روا کے پاس پہنچائے جو اپنی حاجت خود اس کے سامنے نہیں پہنچا سکتا تھا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے قدم کو ثبات عطا فرمائیں گے۔ اس ارشاد میں حضور ﷺ نے اپنے حضور پیش کرنے کا ذکر نہیں فرمایا مگر چونکہ آپ کے حضور ایسی ہی حاجتیں پیش کی جاتی تھیں جن کی دنیا ودین میں ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے سوا آپ کی بزم شریف میں کوئی ذکر نہ ہوتا۔ خاص کر لغو وبیکار باتیں' لوگ آپ کی بارگاہ سے علم اور خیر وبرکت کا حصہ لے کر لوگوں میں جاتے اوران کی رہنمائی کرتے۔

سیّدنا امام حسین ؓ نے اپنے والد علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے کاشانۂ اقدس سے حضور ﷺ کے باہر تشریف لے جانے اورصحابہ کرام کے نشست فرمانے کے بارے میں دریافت کیا۔ حضرت علی ؓ نے فرمایا: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْزُنُ لِسَانَهٗ اِلَّا فِيْمَا يَعْنَيْهِ یعنی رسولِ خدا ﷺ اپنی زبان مبارک کو بند رکھتے اوراس کی حفاظت فرماتے مگر اس چیز میں اوراس بات میں جو مفید وسودمند ہوتی۔ ’’یخزن‘‘ خزن سے ہے جس کے معنی خزانہ میں مال رکھنا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ آپ کی زبان مبارک اس دل کی جو حقائق ومعرفت سے مالا مال ہے کنجی تھی۔ یعنی امت کے لیے جو سودمند ومفید ہوتا' اس کے لیے آپ زبان مبارک کھولتے ورنہ اپنی زبان کو بند رکھتے۔ آپ امت کی دلجوئی فرماتے اوراپنے قرب سے دور بھاگنے سے انہیں محفوظ رکھتے۔ درحقیقت یہ فعل الٰہی سے ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ الایة یعنی حق تعالیٰ ایسا مہربان ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں محبت فرمائی...... آپ ضعیف الایمان لوگوں پر بہت زیادہ احسان وعطا فرماتے۔ ان لوگوں کو مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر قوم کے معزز فرد کی عزت واحترام فرماتے اورانہیں کو ان پر حاکم مقرر فرماتے' اور آپ لوگوں سے بچتے اوران سے اپنا تحفظ فرماتے' اور دشمنوں سے اپنی نگہداشت فرماتے تاکہ اعداء ضرر نہ پہنچائیں۔ یہ تحفظ آیہ کریمہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اللہ تعالیٰ لوگوں سے آپ کو محفوظ رکھے گا کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ قطع نظر اس کے اس میں علم وحکمت اورامت کے لیے تعلیم وارشاد ہے۔ درحقیقت یہ اپنا رعب ودبدبہ قائم رکھنے اور لوگوں سے عدم اختلاط وانبساط کی جانب کنایہ ہے۔ تاکہ وہ بے خوف اور بے باک نہ ہوجائیں۔ باوجود اپنا تحفظ فرمانے کے اپنی کشادہ روئی اور خوش خلقی کا رویہ ترک نہ فرماتے۔ ان کے احوال کو دریافت کرتے اوراپنے اصحاب کی دلجوئی اور بازپرس فرماتے اورلوگوں سے

ایک دوسرے کے احوال پوچھتے تاکہ ہر ایک اچھے حال میں رہے اور باہم حسن سلوک کرتے رہیں اور اچھے کام و احوال پر ان کو شاباشی دیتے اور تقویت و تائید فرماتے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اصلاح فرماتے برے کاموں کی مذمت فرماتے اور باز رہنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کی عادت کریمہ ہی یہ تھی کہ اچھائی کی تعریف فرماتے اور برائی کی مذمت کرتے اور جس سے بھی یہ برائی سرزد ہوتی اس کی سرزنش فرماتے اور اس بدکار کی نہ پرواہ کرتے اور نہ اس سے خوف کرتے خواہ وہ کتنا ہی بظاہر بلند مرتبہ اور طاقتور ہوتا۔

لوگوں کے احوال ایک دوسرے سے دریافت کرنا ''تجسس'' کی قبیل سے نہ تھا۔ کیونکہ تجسس اسے کہتے ہیں کہ کسی کے پوشیدہ عیبوں کو بقصد اشاعت اور برائی پوچھا جائے۔ احوال کی یہ پرسش بقصد تربیت و اصلاح ایک دوسرے کے ظاہری احوال کی تھی' اور آپ ہر چیز میں معتدل الامر یعنی آپ کے تمام افعال کریمہ اور اوصاف شریفہ معتدل اور ہموار اور متمکن و مستقل اور پائیدار تھے۔ آپ کے کاموں میں نشیب و فراز نہ تھا' نہ اختلاف اور افراط و تفریط کی راہ پیدا ہوتی تھی' اور امت کی تعلیم و تربیت اور تادیب و تہذیب سے غافل نہ رہتے تھے' اور ہمیشہ ان کی سیاست و رہنمائی اور تدبیر کار میں مشغول رہتے' اور اس سے خوف رکھتے کہ کہیں وہ غافل نہ ہو جائیں۔ سخت شاق عبادت کا التزام دوام' اس خوف سے نہ فرماتے کہ کہیں امت پر فرض نہ کر دیئے جائیں اور حضور ﷺ ہر حال میں ہر کام کے لیے آمادہ و تیار رہتے مثلاً جنگی اسلحہ اور حربی ساز و سامان وغیرہ میں' اور ان کے مصلحتی امور کے لیے جس چیز کی ضرورت لاحق ہوتی اسے تیار کرتے اور حق میں نہ کوتاہی کرتے نہ حق سے تجاوز کرتے۔ ہمیشہ اقامت حق اور اثبات حق میں منہمک رہتے اور آپ کے تمام مقربین و ہم نشین حضرات اخیار و ابرار یعنی برگزیدہ و نیکوکار تھے۔ آپ کے حضور میں وہی فاضل تر اور مقرب تر ہوتا جو لوگوں کے لیے ناصح تر اور خیر خواہ تر ہوتا۔

سیّدنا امام حسین ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ کی مجلس مبارک کے آداب اور طور طریق کیا تھے اور ان کے ساتھ حضور ﷺ کی ہم نشینی کس طرح تھی۔ فرمایا: حضورِ اکرم ﷺ نہ بیٹھتے نہ اٹھتے مگر ذکر خدا کے ساتھ یعنی نشست و برخاست میں ہمیشہ ذکر خدا کرتے تھے اور جب مجلس مبارک میں تشریف لاتے تو جہاں بھی جگہ ہوتی بیٹھ جاتے اور کسی بلند و ممتاز جگہ کا قصد نہ فرماتے اور نہ اپنے لیے کوئی خاص جگہ متعین کر رکھی تھی' اور آپ امت کو اسی کی تلقین فرماتے اور بلند و بالا جگہ کی خواہش سے منع فرماتے تھے اور آپ اپنی عنایت اور توجہ و التفات کا حصہ تمام اہل مجلس کو مرحمت فرماتے اور کوئی بھی یہ گمان نہ کر سکتا کہ وہ ہم نشینی میں دوسرے سے بزرگ تر اور آپ سے زیادہ قریب ہے۔ ہر شخص کے ساتھ اس کے مرتبہ اور قابلیت اور اس کے حال کے مطابق عنایت فرماتے جو بھی آپ کے پاس کوئی حاجت یا ضرورت لاتا تو آپ اس وقت تک انتظار فرماتے کہ وہ شخص خود ہی واپس جائے۔ مجلس سے آپ خود اس وقت تک تشریف نہ لے جاتے جب تک کہ وہ خود اٹھ کر نہ چلا جاتا۔ آپ سے جو کوئی بھی سوال کرتا یا کسی حاجت و ضرورت کو پیش کرتا تو آپ اسے نہ منع کرتے اور نہ رد کرتے بلکہ اس کی حاجت براری فرماتے اور اگر بالفرض اس وقت کچھ موجود نہ ہوتا تو خوش خلقی سے دل جوئی کر کے میٹھی بات سے اس کو لوٹا دیتے۔ اس عادت کریمہ کی تفصیل آپ کے اخلاق شریفہ کے باب میں آپ کے جود و سخا کے ضمن میں آئے گی۔

آپ تمام لوگوں کے لیے بمنزلہ باپ کے تھے اور حق میں آپ کے نزدیک سب برابر تھے۔ آپ کی مجلس' علم' حلم' حیاء اور صبر و امانت کی مجلس تھی جہاں نہ کسی کی آواز بلند ہی ہوتی اور نہ اس میں حرام و ناشائستہ بات ہوتی تھی۔ اہل مجلس کی کسی ذلیل حرکت کو نہ تو ظاہر کیا جاتا اور نہ اسے پھیلایا جاتا۔ مطلب یہ تھا کہ بتقاضائے بشریت اگر کسی سے ذلیل یا ناشائستہ حرکت سرزد بھی ہو جاتی تو اس سے چشم پوشی کی جاتی۔ تمام اہل مجلس متساوی و موافق اور برابر تھے۔ ان میں باہم فضیلت تقوے کے اعتبار سے تھی۔ وہ باہم ایک دوسرے کی تعظیم و توقیر کرتے تھے۔ بڑے چھوٹوں پر شفقت کرتے اور چھوٹے بڑوں کی تعظیم کرتے اور محتاجوں پر ایثار کر کے اور غریب و مسافر کی رعایت کرتے تھے۔ ﷺ و رضی اللہ عنہم

باب دوم

در بیان اخلاق عظیمہ وصفات کریمہ ﷺ

اخلاق، خلق کی جمع ہے اور خلق بضم خاء، باطنی سیرت کو کہتے ہیں اور خلق بفتح خاء ظاہری صورت کو قاموس میں ہے ''خلق'' خاء اور لام کے ضمہ اور سکون کے ساتھ بمعنی خصلت وطبع ہے اور صراح میں خلق بمعنی خوئے حسن اور کبھی بمعنی جوانمردی، شگفتہ رو اور لوگوں سے حسن سلوک آتا ہے، لیکن اس کے معنی اس سے کہیں زیادہ عام اور وسیع ہیں اور نبی کریم ﷺ کے خلق شریف انہیں معنوں پر موقوف نہیں ہیں۔ بلکہ جہاں آپ مسلمانوں کے ساتھ رحیم ورفیق تھے مہربان وشفیق تھے وہاں کفار پر اقامت حق وحجت میں بہت سخت وشدید تھے اور دانشمندوں کے نزدیک خلق کے معنی ایسا ملکہ ہے جس کی وجہ سے بہ سہولت وآسانی افعال صادر ہوتے ہیں۔ خلق کی تعریف وتوضیح معقولات کی کتابوں میں مستقلاً ذکر کی گئی ہے۔ البتہ! اس میں اختلاف ہے کہ خلق غریزی یعنی طبعی اور پیدائشی خصلت ہے یا یہ اکتسابی خصلت ہے جس کو بندہ ریاضت ومجاہدے اور کسب وہنر سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ بعض علماء کا مذہب یہ ہے کہ یہ عزیزی یعنی طبعی وپیدائشی ہے ان کی دلیل سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں تمہارے اخلاق کو اسی طرح مقدر فرمایا جس طرح تمہارے رزق کو مقدر فرمایا۔ (رواہ النجاری) اور فرمایا: کہ ''اگر تمہیں یہ خبر پہنچے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے جنبش کر گیا ہے تو تم اس کی تصدیق کر دو اور اگر یہ اطلاع ملے کہ فلاں آدمی نے اپنی عادت وخصلت بدل دی ہے تو اسے قبول نہ کرو'' لیکن پھر بھی خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے۔

یہ محقق ہے کہ لوگوں کے احوال مختلف ومتفادت ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ جن کے بعض اخلاق ایسے راسخ اور پختہ ہو گئے ہیں کہ ان میں تغیر وتبدل متعذر ہے۔ بلکہ ان کا چھوڑنا ناممکن ہے ورنہ وہ مجاہدہ وریاضت کے ساتھ مامور ہیں اگر ان کے زوال کی کوشش کرے اور انہیں محمود بنانا چاہے تو ممکن ہے اور بعض اخلاق ضعیف کمزور ہیں جو ریاضت سے قوی ہو جاتے ہیں اور بعض قوت سے ضعف میں آتے ہیں اور شریعت میں اخلاق کو اچھا بنانے کا حکم آیا ہے اور انبیائے کرام صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہم کو اخلاق کو سنوارنے بنانے اور خلق کی ہدایت فرمانے کے لیے بھیجا گیا۔ اگر اخلاق میں تغیر وتبدل ممکن نہ ہوتا تو ان کو عمدہ بنانے اور نبیوں کو بھیجنے کا کیا فائدہ، دعائے ماثورہ میں مروی ہے کہ اَللّٰھُمَّ کَمَا حَسَّنْتَ خَلْقِیْ فَحَسِّنْ خُلُقِیْ یعنی اے اللہ! جس طرح تو نے میری تخلیق اچھی بنائی اسی طرح میری خصلت کو اچھا بنا۔ دوسری حدیث میں فرمایا: اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ لَایَھْدِیْ لِاَحْسَنِھَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّیْ سَیِّئَھَا وَلَا یُصْرِفُ سَیِّئَھَا اِلَّا اَنْتَ یعنی اے اللہ! مجھے اچھے اخلاق کی رہنمائی فرما۔ تیرے سوا کوئی اچھے اخلاق کی توفیق نہیں دے سکتا اور مجھے بری عادتوں سے پھیر دے تیرے سوا کوئی بری عادت سے نہیں پھیر سکتا۔ یہ سب تعلیم وتلقین کے لیے ہے۔

اور شیخ عبدالقیس کی حدیث میں مروی ہے: اِنَّ فِیْکَ الْخَصْلَتَیْنِ یُحِبُّھُمَا اللّٰہُ الْحِلْمُ وَالْاَنَاۃُ یعنی حضور ﷺ نے فرمایا: اے عبدالقیس تجھ میں دو خصلتیں ہیں جو خدا کو بہت پیاری ہیں ایک بردباری اور دوسرا وقار۔ اس نے عرض کیا ''یارسول اللہ! قدیما کان

حدیثاً'' اے اللہ کے رسول ﷺ! میری یہ خصلت ہمیشہ سے ہے یا اب نمودار ہوئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''قدیماً'' ہمیشہ سے ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ میں خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے میری جبلت وطبیعت میں ایسی دو خصلتیں پیدا فرمائی ہیں جن کو وہ محبوب رکھتا ہے۔ تو سوال میں تردید کا اشارہ اس طرف ہے کہ بعض اخلاق جبلی و پیدائشی ہیں اور بعض اکتسابی واختیاری۔

اس جگہ تطبیق کی ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ اخلاق، صحبت اور عادت کے سبب حاصل اور پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا تغیر وتبدل آسان ہے لیکن بعض اخلاق، جبلی، طبعی اور دائمی ہوتے ہیں ان کا تغیر وتبدل دشوار ہے۔ اس کے باوجود حیطۂ امکان سے باہر نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

اور یہ اعتقاد رکھنا لازم ہے کہ تمام انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صورت وسیرت میں مکارم اخلاق ومحامد صفات اور ہر قسم کے کمالات وفضائل اور محاسن موجود ہوتے ہیں اور انہیں تمام بنی نوع انسان اور افراد بشری پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ رتبوں میں ان کا رتبہ سب سے بڑا اور درجوں میں ان کا درجہ سب سے بڑا ہوتا ہے اور ان حضرات قدس کا درجہ اور مقام کتنا بلند وبالا ہوگا جن کو حق سبحانہ وتعالیٰ نے برگزیدگی میں منتخب فرمایا اور درجہ اجتہاد واصطفا سے سرفراز فرما کر اپنی کتاب میں ان کی فضیلت اور مدح وثنا بیان فرمائی۔ صلوٰت اللہ وسلامہ علیہم اجمعین۔

عقائد میں یہ ثابت شدہ ہے کہ کوئی ولی نبی کا درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ شیخ امام حافظ الدین نسفی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مدارک میں فرماتے ہیں کہ بلاشبہ بعض لوگوں کے قدم ولی کو نبی پر فضیلت دینے میں بھٹک گئے ہیں۔ حالانکہ یہ کھلا کفر ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل کو ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے چنانچہ فرماتا ہے: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ان رسولوں میں سے ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

شفائے قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ میں مذکور ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق کریمہ سب کے سب فطری، جبلی اور پیدائشی ہیں نہ کہ ملکیتی اور اعمال سے حاصل کردہ ہیں۔ بلکہ اوّل خلقت اور اصل فطرت میں بغیر اکتساب وریاضت کی محنت اٹھائے حاصل ہیں اور وہ سب وجود الٰہی کے اجتباء اور اس کے نامتناہی فضل کے فیض سے ہیں۔

تَبَارَكَ اللّٰهُ مَا وَحْيٌ بِمُكْتَسَبٍ وَلَا نَبِيٌّ عَلَى الْغَيْبِ بِمُتَّهَمِ

اللہ تعالیٰ بزرگ وبرتر ہے۔ کسی نبی کی وحی کسبی نہیں ہے اور نہ کوئی نبی غیبی خبریں بتانے پر متہم بالکذب ہے۔ اس شعر میں وحی سے مراد نبوت ورسالت ہے جو کہ وحی القاء اور حکمت کا مبداء اور سرچشمہ ہے۔ ورنہ اکتساب نفس وحی بیان کی حاجت نہیں رکھتا۔

بعض نبیوں کے بچپنے کی حالت کا بیان: اور بعض انبیاء کرام علیہم السلام سے اخلاق کریمہ اور منصب نبوت کا ظہور ان کی خورد سالی ہی میں ہوا جیسا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا یعنی ہم نے انہیں خورد سالی ہی میں حکمتیں عنایت فرمادی تھیں۔ مروی ہے کہ ان کی عمر شریف دو یا تین سال کی تھی کہ بچوں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کھیل کود کیوں نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے کھیل کود کے لیے پیدا نہیں فرمایا اور آیہ کریمہ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (اللہ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والے) کی تفسیر میں منقول ہے کہ حضرت یحییٰ نے حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تصدیق اس عمر میں فرمائی کہ ان کی عمر شریف تین سال کی تھی اور گواہی دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے کلمہ اور اس کی روح ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پنگھوڑے میں فرمایا:

اِنِّیْ عَبْدُاللّٰهِ اٰتَانِیَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِيًّا میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب عطا فرما کر نبی بنایا گیا اور حضرت سلیمان علیہ السلام

اپنا فتاویٰ ارشاد فرماتے وقت بچوں کے درمیان عمر صبی رکھتے تھے۔ طبری بیان کرتے ہیں کہ آپ عنان مملکت کو سنبھالتے وقت بارہ برس کے تھے اور آیۂ کریمہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا اِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے عقل کی پختگی عنایت فرمادی تھی کی تفسیر میں مروی ہے اَیْ هَدَيْنَاهُ الصَّغِيْرَ یعنی ہم نے انہیں بچپنے میں ہی ہدایت فرمادی تھی اور ایک قول یہ ہے کہ ابداء خلق سے پہلے ولادت کے وقت ایک فرشتے کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ کہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ دل سے مجھے پہچانو اور زبان سے میرا ذکر کرو۔ تو انہوں نے کہا بجان ودل قبول ہے اور جب نمرود نے آپ کو آگ میں ڈالا اس وقت آپ کی عمر شریف سولہ سال کی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کی داڑھی پکڑنا بھی اسی قبیل سے ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو جس وقت ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی فرمائی اور ہمارے نبی کریم ﷺ کا بوقت ولادت شریف اپنے دونوں ہاتھ اور اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھانے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے اور فرمایا: زمانۂ جاہلیت کے افعال کی طرف دو مرتبہ کے سوا میں نے کبھی قصد وارادہ نہ فرمایا تو اس وقت بھی حق تعالیٰ نے مجھے محفوظ فرمایا اور میرے دل میں شروع ہی سے بتوں اور شعر گوئی کیخلاف نفرت پیدا کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کے امور پر متمکن وگامزن فرمایا گیا اور ان پر متواتر نفحات ربانی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ مرتبہ قصویٰ یعنی غایت درجہ مقام بلند اور درجۂ کمال میں انتہا تک فائز ہوئے یہ سب بغیر محنت وکاوش اور ریاضت ومجاہدے کے تھا۔

ارشاد ربانی ہے: وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰى اٰتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا اور جب وہ عقل کے کمال پر پہنچ کر مستحکم ہوئے تو ہم نے ان کو علم وحکمت عطا فرمایا۔

بعض اولیاء کو بھی ان سے بعض صفات حاصل ہوتے ہیں لیکن تمام صفات میں نہیں اور عصمت تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خاص ہی ہے۔ (دراصل یہ اس پہلے قول کی دلیل ہے جس میں کہا تھا کہ کوئی ولی نبی کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ فافہم مترجم)

حضورِ اکرم ﷺ سیّد عالم ﷺ کی ذات بابرکات، عالی صفات، منبع البرکات اپنے تمام اخلاق وخصائل، صفات جمال وجلال میں اس قدر اعلیٰ واشرف، اتم واکمل، احسن واجمل اور خوب روشن واقوی ہیں جو حدود عدد اور حیطۂ ضبط وحصر سے باہر ہیں اور کمالات میں جو کچھ خزانۂ قدرت اور مرتبہ امکان میں متصور ہے وہ تمام آپ کو حاصل ہیں اور تمام انبیاء ومرسلین آپ کے آفتاب کمال کے چاند اور انوار جمال کے مظاہر ہیں۔ اللہ ہی کے لیے تمام خوبیاں ہیں۔ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا۔

وَكُلُّ آيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا فَاِنَّمَآ اِتَّصَلَتْ مِنْ نُّوْرِهٖ بِهِمِ
فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ
وَكُلُّهُمْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ غَرْقًا مِنَ الْبَحْرِ اَوْرَ شْغًا مِنَ الدِّيَمِ

یعنی تمام انبیاء ومرسلین جو نشانی بھی لے کر تشریف لائے وہ سب آپ ہی کے انوار جمال وجلال کا پرتو ہیں۔ بلاشبہ آپ ہی فضل کے آفتاب ہیں اور وہ سب آپ کے ستارے ہیں۔ جن کے انوار تاریکی میں لوگوں کے لیے مشعل نور بنے۔ وہ تمام رسول اللہ کے خوشہ چین ہیں اور آپ کے دریائے فضل کے ایک گھونٹ اور سمندر کے ایک قطرہ ہیں۔ وصلی اللہ علیہ وآلہ قدر حسنہ وجمالہ وکمالہ وبارک وسلم۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی ذات کریم میں مکارم اخلاق، محامد صفات اور ان کی کثرت وقوت اور عظمت جمع ہونے کے لحاظ سے قرآن کریم میں مدح وثنا فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ بلاشبہ آپ بڑے ہی صاحب اخلاق ہیں اور فرمایا: آپ پر اللہ کا

عَظِیْمًا○	بہت بڑا فضل ہے۔

اورخود حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اُکْـمَـلُ مَحَاسِنِ الْاَفْعَالِ یعنی مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے: بُـعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی اچھے کاموں کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی ذات شریف میں تمام محاسن و مکارم اخلاق جمع تھے اور کیوں نہ ہو جب کہ آپ کا معلم حق تعالیٰ سب کچھ جاننے والا۔

حضور ﷺ کے اخلاق کریمہ کی ایک جھلک

وصل: سیّدتنا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مبارک میں ہے کہ رسول خدا ﷺ کے اخلاق کریمہ کے بارے میں آپ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: کَـانَ خُـلُـقُـهُ الْقُرْآنَ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن کریم میں مکارم اخلاق اور صفات محمودہ مذکور ہیں آپ ان سب سے متصف تھے۔ ''شفا'' میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ مزید ذکر فرماتے ہیں کہ یَـرْضـی بِـرَضَـاهُ وَیَسْـخَـطُ بِسَخَطِـهٖ یعنی آپ کی خوشنودی قرآن کی خوشنودی کے ساتھ اور آپ کی ناراضگی قرآن کی ناراضگی کے ساتھ تھی۔ مطلب یہ کہ آپ کی رضا امر الٰہی کی بجا آوری میں اور آپ کی ناراضگی حکم الٰہی کی خلاف ورزی اور ارتکاب معاصی میں تھی۔ بادی النظر میں اس کے یہی معنی ہیں جو مذکور ہوئے۔ اور ''عوارف المعارف'' میں مذکور ہے کہ سیّدتنا عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ تھی کہ قرآن کریم حضور ﷺ کا مہذب اخلاق تھا۔ حضرت شیخ نے اسے طویل بیان کے ساتھ ذکر کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے قلب اطہر سے حصہ شیطان کے نکالنے کے بعد اور اسے غسل و تطہیر دے کر آپ کے نفس ذکیہ کو نفوس بشریہ کی حد پر برقرار رکھ کے اس میں بشری صفات و اخلاق اس حد تک باقی رکھے کہ اس کا ظہور نزول قرآن کا موجب بنے۔ (اس لیے کہ نبی ہوتا ہی وہ ہے جس میں صفات بشریہ علی وجہ الکمال ہوں اور جو منافی کمال بشریت صفات تھے ان کا اخراج کر دیا گیا) اور وہ صفات جو تادیب و تہذیب شان نبوی ہوں باقی رکھے گئے تاکہ موجب رحمت خلق اور تہذیب اخلاق امت ہوں (مطلب یہ کہ آپ میں بعض صفات بشریہ اس لیے باقی رکھے گئے کہ لوگ آپ کے ہم شکل و صورت اور ہم جنس جان کر انس و محبت رکھیں۔ اگر خالص ملکی صفات ہی کے حامل ہوتے تو لوگ دحشت زدہ ہو کر انس و محبت سے دور ہو جاتے گویا آپ کی صفات بشریہ رحمت خلق کا موجب اور امت کے اخلاقی تہذیب و آراستگی کا باعث ہے مترجم) اس لیے کہ انسانی نفوس میں اصل صفات بشری مزید ظلمت و کثافت کے جڑ پکڑنے اور برقرار رکھنے کا موجب بناتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ (تاکہ تمہارے دل کو اس سے ہم ثابت و برقرار رکھیں) اور ثبات قلب، اضطراب قلب کے بعد ہوتا ہے کیونکہ حرکت نفس اس کے صفات ظہور کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ قلب و نفس کے درمیان ایک تعلق و ربط ہے۔ جیسے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات شریف اس وقت حرکت میں آئی جب کہ آپ کا دندان مبارک شہید ہوا اور خون بہہ کر آپ کے چہرۂ انور پر آیا اور اس وقت آپ نے فرمایا:

کَیْفَ یَـصْلُحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِیِّهِمْ وَهُوَ یَدْعُوْا اِلٰی رَبِّهِمْ	وہ قوم کس طرح اصلاح پائیگی جس کے نبی کے چہرۂ پاک کو لہولہان کیا گیا ہو حالانکہ وہ نبی ان کو اپنے رب کی طرف بلاتا ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے ثبات قلب اطہر کے لیے نازل فرمایا:

لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ	اے محبوب! کسی معاملہ کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں

اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر نے صبر کا جامہ پہنا اور اضطراب کے بعد سکون و قرار حاصل ہوا۔ چنانچہ انہیں اسباب

وعلل کی بناپر آیات قرآنیہ مختلف اوقات میں نازل ہوتی رہیں اور حضور ﷺ کے قلب اطہر کی مہذب ومصفا بناتی رہیں اور قرآن آپ کا اخلاق بن گیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمانا کہ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ قرآن ہی آپ کا اخلاق تھا۔ اس کے یہی معنی ومطلب ہیں۔ حقیقت واقعیہ یہ ہے کہ کسی کا فہم اور کسی کا قیاس حضور سیّد عالم ﷺ کے مقام حقیقت اور آپ کے حال کی کنہ عظیم تک نہیں پہنچ سکتا اور بجز خدا کے کوئی نہیں پہچان سکتا جس طرح خدا کو حضور ﷺ کی مانند کما حقہ کوئی نہیں پہچان سکتا لَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ إِلَّا اللّٰهُ اس کی تاویل کو بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

جز خدا نشناخت کس قدر تو زانکہ　　　کس خدا را ہمچو تو نشناختہ؟

خدا کے سوا آپ کی قدر ومنزلت کوئی نہیں جان سکتا اس لیے کہ جس طرح آپ کی مانند خدا کو کوئی نہیں جان سکتا۔

جب کہ آپ کا مقام سب سے بلند تر ہے تو اس کی دریافت بھی لوگوں کے فہموں سے اونچی ہے۔

ترا چنانکہ توئی ہر نظر کجا بیند　　　بقدر دانش خود ہر کسے کند ادراک

آپ کو جیسے کچھ کہ آپ ہیں نظر کہاں دیکھ سکتی ہے۔

ہر شخص اپنی فہم ادراک کے مطابق ہی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

تحقیق معنی میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ حیطۂ ادراک سے ماوراء تھے۔ اگر آپ محسوس ہیں (یعنی ظاہری جسم شریف میں نظر بھی آتے ہیں) تو قوت باصرہ کے ادراک کی قوت سے بلند وبالا ہیں جس طرح کوہ عظیم کہ احساس باصرہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتی اور آپ عقول ہیں (یعنی نظر سے نہیں بلکہ عقل وفہم سے تعلق ہے) تو عقل آپ کے ادراک میں احاطہ کرنے سے عاجز ہے جس طرح کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا حال ہے۔ (کہ کوئی عقل اس کی کنہ حقیقت کی رسائی نہیں کر سکتی) لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے خلق کریم کو عظیم فرمایا اور جو فضیلت اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمائی اسے بھی عظیم فرمایا تو اس کے کنہ کے ادراک کرنے میں عقل قاصر ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق حمیدہ اور صفات حسنہ جبلی، فطری اور پیدائشی ہیں اور ان اخلاق عظیمہ کے حصول میں کسب وریاضت کا کوئی دخل نہیں ہے اور نہ اس کی احتیاج، خصوصاً سیّد انبیاء صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلیہم جو کہ تمام اخلاق عظیمہ اور صفات حمیدہ سے آراستہ وپیراستہ تشریف لائے ہیں۔

بتعلیم وادب اورا چہ حاجت　　　کہ او خود ز آغاز آمد مودب

ان کو تعلیم وادب کی کیا ضرورت ہے جب کہ وہ خود ہی شروع سے سیکھے ہوئے تشریف لائے۔

اور آپ کے سر پردۂ عزت کے گرد تغیر وتبدل کی کوئی راہ نہیں ہے۔ بعض احکام وآثار جبلت بشری کو ظاہر نہیں کرتے مگر وہ بھی گاہ بہ گاہ کبھی کبھی مخصوص مواضع میں تھے کہ جن پر قیاس کو دائرہ وسائر نہیں بنا سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ رب العزت جل جلالہ ہی جانتا ہے کہ ان مواضع میں بھی کسی عالم شہود اور تجلیات ربانی میں تھے۔

ادبر تراز آنست کہ آید بخیال　　　یعنی آپ اس سے برتر ہیں کہ کوئی خیال میں لا سکے۔

اسی سلسلہ میں غزوۂ احد کا قصہ مذکور ہے کہ جب آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور آپ کا سر مبارک مجروح ہو کر آپ کے چہرۂ انور پر خون جاری ہوا تو صحابۂ کرام کو آپ کی یہ حالت سخت دشوار اور ناگوار معلوم ہوئی۔ وہ عرض کرنے لگے کہ کاش آپ ان پر بددعا فرماتے تاکہ وہ اپنے کرتوت کی سزا کو پہنچتے۔ اس پر آپ نے فرمایا: مجھے لعنت وبددعا کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ مخلوق خدا کو خدا

سے ملانے اوران پر رحمت وشفقت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے اور یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَایَعْلَمُوْنَ اے خدا! میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ جانتے نہیں۔

اس جگہ خود کمال صبر وحلم اور بردباری ہے اس جگہ جزع وفزع اور اضطراب ووحشت کہاں ہے لہٰذا شیخ صاحب عوارف المعارف کا یہ کہنا کہ حضور ﷺ کی ذات شریفہ حرکت واضطراب میں آئی اور بے صبری کا ظہور ہوا پھر آیت کریمہ کے نزول نے صبر واستقامت کا جامہ پہنایا اور اضطراب کے بعد زبان حال وقال میں سکون وقرار آیا۔ یہ مسکین (شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) ان لفظوں کے اطلاق سے وحشت زدہ ہے (کیونکہ شان ادب کیخلاف ہے) اگرچہ علمی قاعدے اور قیاسی بنیاد سے یہ بات ٹھیک درست ہوسکتی ہے۔ نیز صاحب عوارف رحمۃ اللہ علیہ کا فرمانا کہ بعید نہیں ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے۔ ''کان خلقه القرآن'' اس میں اخلاق ربانی کی جانب ایک گہرا رمز اور باریک اشارہ ہے لیکن ام المومنین نے عظمت برقرار رکھی یعنی وہ چاہتی تھیں کہ یہ کہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کے اخلاق عظیمہ' اخلاق الٰہی کے مظہر تھے مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حق عزاسمہ کی جلالت شان کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا کہ ''متخلق باخلاق اللہ'' یعنی اخلاق ربانی پر پیدا فرمائے گئے۔ لہٰذا انہوں نے اسی معنی کو اس طرح ادا فرمایا کہ ''کان خلقہ القرآن'' یعنی قرآن آپ کا خلق تھا۔ یہ تعبیر حق تعالیٰ جل اسمہ سے حیاء اور حقیقت حال کو لطیف کنایہ سے مخفی کرکے بیان فرمایا۔ یہ ان کا وفور عقل اور کمال ادب ہے۔ رضی اللہ عنہا' یہ معنی حضور ﷺ کے اخلاق کی عظمت اور اس کے لامتناہی ہونے کے بیان میں بہت زیادہ داخل ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح قرآن کے معنی غیر متناہی ہیں اسی طرح حضورِ انور ﷺ کے انوار وآثار اور اخلاق واوصاف جمیلہ غیر متناہی ہیں اور آپ کے مکارم اخلاق اور محاسن جمیلہ ہر آن اور ہر حال میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہوتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ آپ پر علوم ومعارف کا افاضہ فرماتا ہے اسے بجز خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ لہٰذا آپ کے اوصاف کے جزئیات کے احاطہ کی طرف درپے ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسی چیز کی طرف جو انسان کے مقدور میں نہ ہو اور نہ وہ ممکنات عادیہ میں سے ہو۔ درپے ہو۔ واللہ اعلم

بعض عرفاء سے حدیث پاک: اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ بیشک میرے دل پر بعض اوقات حجاب غینی آجاتا ہے کے بارے میں استفسار کیا گیا کہ اس حجاب غینی اور حضورِ اکرم ﷺ سے اس حالت کی نسبت کی حقیقت کیا ہے' تو اس عارف نے فرمایا: اے سائل! اگر تو رسول کریم ﷺ کے قلب اطہر اور اس کے حجاب غینی کے علاوہ کسی دوسرے کے بارے میں دریافت کرتا تو جو کچھ میں جانتا ہوں اسے بیان کر دیتا لیکن اس جگہ غین ایسے غین یعنی ذات کے ساتھ ہے جہاں غین دم نہیں مار سکتا۔ اس حدیث کی شرح رسالہ ''مرج البحرین'' میں مفصل موجود ہے۔ ہاں نبی کریم ﷺ پر بحار قدرت کے تلاطم امواج سے تقلبات اور تجلیات وارد ہوتے تھے جو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف لے جاتے تھے۔ نیز احکام میں ناسخ ومنسوخ ہونا بھی اسی کی فرع ہے اور حضورِ اکرم ﷺ ہر حال میں ہمیشہ ترقی وکمال میں تھے اور آپ میں کسی عظیم حال سے کمی وتنزل کی راہ نہ تھی۔ لیکن بعض احوال فاضل تر اور عالی تر ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ تمام انبیاء کامل ومعصوم ہیں مگر باوجود اس کے ''فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ ان میں سے کسی کو کسی پر فضیلت بخشی گئی'' اور حضورِ اکرم کے اعمال وطاعات اور عبادات نہ سب مجرد تعلیم ومحض تشریح کے لیے تھے بغیر اس کے کہ آپ کی ذات شریف میں ان کے آثار وانوار رونما ہوں۔ (یہ صورت نہیں ہے) ہاں نبوت اور اس کے مقامات محض موہبی اور اصطفاء واجتباء تھے اور اس میں کسی کسب وریاضت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دن ورات اسرار وانوار کا ظہور' متواتر اور مسلسل اوراد واذکار پر مترتب ہے اور تمام کمالات کے حصول کی کفالت اور تمام انوار کے ظہور کی ضمانت' نزول قرآن' تعلیم ربانی' تادیب رحمانی اور الٰہی اوامر ونواہی تھے اور ذات کی خاصیت اور بشری طبیعت کا اثبات جو حسن بصری

سے تعلق رکھتا ہے یقیناً انحطاط ونقصان کا اثبات ہے جو اچھا نہیں ہے۔ (مطلب یہ کہ آپ چونکہ لباس بشری میں بحکمت الٰہی تشریف لائے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ اب اس بشری لباس کے اقتضاء پر عوارض بشریہ کے اثبات کے درپے ہونا اور بشری مقتضیات کو موضوع بحث بنانا یقیناً آپ کی شان ارفع اعلیٰ میں کمی اور اس کے گھٹانے کے درپے ہونا ہے جو کہ ایک مومن ومسلم کی شان سے بعید ہے۔ مترجم

اور اگر تہذیب سے مراد یک گونہ آگاہ وخبردار کرنا ہو۔ کسی سستی کے عارض ہونے کے سبب بایں طور کہ مقام عالیٰ میں استغراقی کیفیت ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا استغفار کرنا یا نسیان کا طاری ہونا وغیرہ' علماء فرماتے ہیں اگر ان کی یہ مراد ہے تو کوئی صورت بیان جواز کی بن سکتی ہے۔ ورنہ ایسی استغراقی کیفیتوں کا تذکرہ کرنا اور تہذیب واصلاح کے اطلاق پر مبنی سابقہ آلائش سے ہے بیان کرنا یقیناً مرتبہ ارفع کو گھٹانے اور فساد کرنے کا موجب ہے جو مناسب نہیں ہے۔

قاموس میں ہے کہ ''تہذیب'' ہذبہ سے ہے جس کے معنی لطافت' صفائی' درستگی اور اصلاح کے ہیں اور صراح میں ہے تہذیب کے معنی آدمی کو پاکیزہ کرنا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے رجل مہذب یعنی آدمی مظہر الاخلاق ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ مرتبہ کمال کے اعلیٰ واکمل پر محمول کرنا اور حقیقت حال کے ادراک سے عاجز ہونے کا اعتراف کرنا آپ کے ادب وجلالت شان کے زیادہ قریب ہے۔ واللہ الموفق

بیان رسالت عامہ: حضورِ اکرم ﷺ کے اخلاق کریمہ چونکہ اعظم الاخلاق تھے۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث فرمایا اور آپ کی رسالت کو محض انسان پر محدود ومقصود نہ گردانا بلکہ سارے عالم کے جن وانس اور سارے جہان کی مخلوق پر رسالت عام فرمائی۔ جس طرح حق تعالیٰ کی ربوبیت تما اہل عالم کو شامل ہے خلق محمدی ﷺ بھی ان سب کو شامل ہے۔ صاحب مواہب لدنیہ نے بعض علماء عظام سے یہ سب نقل فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہ بعثت اس حد تک پھیلتی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت ملائکہ کی طرف بھی ہے۔ جیسا کہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور ان کی دلیل قرآن کریم سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا تا کہ آپ سارے جہاں کے لیے نذیر یعنی ڈرانے والے ہوں۔ لفظ عالمین تمام اہل عقل کو شامل ہے اور سنت حدیث سے ثابت ومسلم ہے جسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً ''مجھے ساری مخلوق کی طرف رسول بنایا گیا''۔ بعض نے کہا کہ آپ کی رسالت بعض ملائکہ پر ہے گویا ان کی مراد بعض ملائکہ سے زمین کے فرشتے ہیں۔ تخصیص کی وجہ ظاہر نہیں ہے کیونکہ دلیل عام ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کی طرف) یہ بھی تخصیص پر دلالت نہیں کرتی۔ جیسا کہ مذہب مختار آیۂ کریمہ کے مفہوم عمومی پر ہے۔ ورنہ جنوں کی طرف بھی مبعوث نہ ہونا لازم آتا ہے۔ یہ بات اجماع کیخلاف ہے۔ بلکہ آیۂ کریمہ میں ''الناس'' کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ بعض ناس کی طرف تخصیص رسالت کے قول کی تردید ونفی مقصود ہے جس طرح کہ یہود گمان رکھتے تھے کہ آپ کی رسالت اہل عرب کے ساتھ خاص ہے۔ اسی طرح آیۃ کریمہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا اے لوگو! میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف' واللہ اعلم

(حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علی طریق الحق والیقین فرماتے ہیں) کہ بعض محققین اہل بصیرت فرماتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام اجزائے عالم کے ساتھ ہے جس میں حیوانات' نباتات اور جمادات بھی شامل ہیں لیکن اہل عقل کی طرف بھیجنا تعلیم وتکلیف اور انہیں بشارت دینے اور غضب الٰہی سے ڈرانے کے لیے ہے اور غیر ذی العقول کی طرف بر بنائے افاضہ اور اس کمال پر پہنچانا جو ان کے حال کے لائق ہے اور تمام ذی العقول کی طرف رسالت کی عمومیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ   نہیں بھیجا آپ کو مگر سارے جہان کے لیے رحمت

یہ بطریق تغلیب شامل ہے اور جمادات کا حضور ﷺ کو سلام کرنا اور ان کا کہنا کہ ''السلام علیکم یا رسول اللہ'' آپ کی رسالت پر ان کا اقرار ہے۔ ابیات

شکر فیض تو چمن چوں کند اے ابر بہار   کہ اگر خار وگل ہمہ پروردۂ تست
اے غنچۂ عروس باغ درپردۂ تست   آخر اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اگر کوئی کہے کہ رسالت کو تو امر و نہی کی دعوت اور تبشیر و انذار لازم ہے۔ اس کا وقوع ملائکہ سے کہاں ہے۔ مواہب لدنیہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے یہ دعوت شب اسریٰ (معراج کی رات) میں ہوئی ہو۔ یہ بات مخفی نہ رہنی چاہیے کہ شب اسریٰ کے ساتھ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ تمام اوقات میں احتمال رکھتا ہے کیونکہ حضورِ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں اکثر اوقات میں ملائکہ کا نزول ہوتا رہا ہے۔ نیز جس طرح جنات کو دعوت دی اور قرآن کریم میں جنات کا خاص طور پر ذکر کرنا ان کی تمرد و سرکشی کی بنا پر ہے۔ (واللہ اعلم) اور ملائکہ میں نہی و انذار کی حاجت ہی نہ تھی کیونکہ ان سے معصیت کا ارتکاب ہوتا ہی نہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۝   وہ کسی بات میں پہل نہیں کرتے وہ خدا کے امر و حکم ہی کو جانتے ہیں۔

اسی بناء پر عالم ملکوت کو عالم امر کہا جاتا ہے کہ وہاں نہی و ممانعت کی گنجائش ہی نہیں اور حضرت جبریل علیہ السلام کے سوا دیگر ملائکہ کا حاضر ہونا کتب احادیث میں اوقات النبی ﷺ کے باب میں مذکور ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ جبریل آئے اور ان کے ساتھ اسمٰعیل نامی فرشتہ تھا جو ایک لاکھ ایسے فرشتوں کا سردار ہے جن میں سے ہر فرشتہ ایک ایک لاکھ فرشتوں پر حاکم ہے اور فضائل قرآن کے باب میں اور سورۃ فاتحہ کی فضیلت میں اور سورۃ بقر کی آخری آیتوں کی فضیلت میں مروی ہے کہ ایک فرشتہ حاضر ہوا جس کے بارے میں حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا یہ وہ فرشتہ ہے جو زمین پر آج کے دن کے سوا کبھی نہیں آیا۔ سبحان اللہ اور حدیثوں میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے روضۂ انور پر تعظیم بجالانے کے لیے صبح و شام ستر ہزار فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ لہٰذا زمانہ حیات میں حضور ﷺ کے پاس کیوں نہیں آتے ہوں گے۔

علم وعقل مبارک: وصل: دربیان عقل کامل وعلم نبوی ﷺ مذکورہ دلائل سے تحقیق کے ساتھ جان لیا ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے اخلاق حمیدہ اعظم و اتم اور کامل تر اخلاق ہیں اور ان اخلاق کی اصل و منبع اور جائے نشو عقل ہے۔ کیونکہ عقل ہی سے علم و معرفت کے سوتے پھوٹتے ہیں اور اسی سے رائے کی قوت' تدبیر میں جودت' فکر و نظر میں اصابت' انجام کار پر صحیح نتیجہ کی برآمد' مصالح نفس' مجاہدہ شہوت' حسن سیاست و تدبیر' خوبیوں کی اشاعت اور رذائل سے اجتناب جیسی صفات متفرع ہوتی ہیں۔

عقل کی حقیقت میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ قاموس میں کہا گیا ہے کہ عقل چیزوں کے حسن و قبح اور اس کے کمال و نقصان کی صفات کے علم کا نام ہے اور یہ علم عقل کے نتائج و ثمرات سے حاصل ہوتا ہے اور عقل ایسی قوت ہے جو اس علم کا مبدأ اور سرچشمہ ہے اور بیان کیا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان کی حرکات و سکنات میں ہیئت محمودہ کا نام عقل ہے۔ حالانکہ یہ بھی عقل کے خواص و آثار کے قبیل سے ہے۔

قول حق جسے علماء نے بیان کیا یہ ہے کہ عقل ایک روحانی نور ہے جس سے علوم ضروریہ اور نظریہ معلوم ہوتے ہیں اور عقل کا آغاز وجود بچے کی پیدائش کے ساتھ ہے پھر وہ رفتہ رفتہ نشو و نما پاتا جاتا ہے یہاں تک کہ بلوغ کے وقت کامل ہو جاتا ہے۔

اور حضورِ اکرم ﷺ کمال عقل و علم میں اس مرتبہ پر تھے کہ کوئی بشر آپ کے سوا اس درجہ تک نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ پر

افاضہ فرمایا ان میں سے بعض پر عقول وافکار حیران ہیں اور جو بھی آپ کے احوال کی کیفیتوں اور آپ کی صفات حمیدہ اور محاسن افعال کی تلاش وجستجو کرتا ہے اور جوامع الکلم، حسن شمائل، نادر ولطیف خصائل، لوگوں کی سیاسی تدبیر، شرعی احکام کا اظہار و بیان، آداب جلیلہ کی تفصیل، اخلاق حسنہ کی ترغیب وتحریص، آسمانی کتابوں اور ربانی صحیفوں پر آپ کا علم، گزشتہ امتوں کے تاریخی حالات، ایام ماضیہ کے احوال، کہاوتوں اور ان کے وقائع واحوال کا بیان، اہل عرب جو مانند درندوں اور چوپائے کے تھے جن کے طبائع جہل و جفا اور نادانی وشقاوت کی بنا پر متنفر اور دور رہنے والی تھیں۔ ان کی اصلاح وتدبیر ان کے ظلم و جفا اور ایذا وتکلیفوں پر آپ کا صبر وتحمل، پھر ان کو علم وعمل، حسن اخلاق واعمال میں غایت درجہ تک پہنچانا، انہیں دنیا وآخرت کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنا پھر کسی طرح ان سعادتوں کو اپنے نفسوں پر ان کا اختیار کرنا اور اپنے گھروں، دوستوں، عزیزوں کو آپ کی خوشنودی کی خاطر ان کا چھوڑنا، ان سب کا اگر کوئی مطالعہ کرے تو وہ جان لے گا کہ حضور ﷺ کی عقل کامل اور آپ کا علم کس مرتبہ ومقام پر تھا۔

نگار من کہ بمکتب نرفت وخط بنوشت بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

جو بھی آپ کے احوال شریف کو ابتداء سے انتہا تک مطالعہ کرے گا دیکھے گا کہ پروردگار عالم نے آپ کو کتنا علم عطا فرمایا اور آپ پر اس کا کتنا فیضان ہے اور ما کان وما یکون یعنی گزشتہ وآئندہ کے علوم واسرار بدیہی طور پر کس طرح حاصل ہیں تو وہ بے شک وشبہہ اور بغیر وہم وخیال علم نبوت کو جان لے گا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی مدح وثنا اور وفور علم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا۝ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ حَسْبَ وَصْلِهٖ وَكَمَالِهٖ	اور جو کچھ آپ نہ جانتے تھے وہ سب نے سکھا دیا اور اللہ کا فضل آپ پر عظیم ہے۔

حضرت وہب ابن منبہ تابعی، جو ثقہ فی الاسناد، علامہ صدوق، صاحب کتب واخبار تھے فرماتے ہیں کہ میں نے متقدمین کی اکہتر کتابیں پڑھی ہیں میں نے ان تمام کتابوں میں پایا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آغاز دنیا سے انجام دنیا تک تمام لوگوں کو جس قدر عقلیں مرحمت فرمائی ہیں ان سب کی عقلیں، نبی کریم ﷺ کی عقل مبارک کے پہلو میں دنیا بھر کے ریگستانوں کے مقابلہ میں ذرہ کی مانند ہیں۔ آپ کی رائے ان سب سے افضل واعلیٰ ہے۔ اسے ابونعیم نے حلیہ میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں روایت کیا۔

عوارف المعارف میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ پوری عقل کے سو حصے ہیں ان میں سے ننانوے حصے حضور اکرم ﷺ میں ہیں اور ایک حصہ تمام مسلمانوں میں، بندۂ مسکین کہتا ہے (یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ورزقہ اللہ الثبات والیقین فرماتے ہیں) کہ اگر وہ یوں کہیں کہ عقل کے ہزار حصے ہیں جن میں سے نوسو ننانوے حصے حضور میں ہیں اور ایک حصہ تمام لوگوں میں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ اس لیے کہ جب آپ میں بے نہایت کمال ثابت ہے تو جو کچھ بھی کہا جائے گا بجا ہوگا۔

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ	بیشک ہم نے آپ کو خیر کثیر مرحمت فرمائی اور آپ کے بدگو ہی ذلیل خوار ہیں۔

اب بعض اخلاق کریمہ میں سے جو دیکھنے میں آتے ہیں اس کتاب میں لکھتا ہوں اور اکثر بیان کتاب الشفاء مواہب لدنیہ، روضۃ الاحباب اور معارج النبوۃ سے ہے۔ والتوفیق من اللہ المنعام

صبر، حلم اور عفو: وصل: یہ حضورِ اکرم ﷺ کے صبر، بردباری اور درگزر کرنے کے صفات میں ہیں۔ یہ نبوت کی عظیم صفتوں میں سے ہے اور ان صفتوں کی قوت کے بغیر بار نبوت نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا

بیشک آپ سے پہلے تمام رسول جھٹلائے گئے تو انہوں نے ان کے کذب وایذا پر صبر فرمایا۔

نیز ارشاد باری ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ

تو آپ بھی اولوالعزم رسولوں کی مانند صبر فرمائیے۔

اور ارشاد ربانی ہے:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ

تو آپ انہیں معاف فرمائیں اور درگزر فرمائیں۔

صبر کی خوبی تمام طاعات وعبادات کی جائے صدور اور تمام خیرات وحسنات کا منبع ہے کیونکہ ہر نیکی میں جب تک اس کے غیر وضد پر صبر نہ کرے اس وقت تک وجود میں نہیں آتی۔ اسی بنا پر صبر کو پورا ایمان کہا گیا ہے اور جس جگہ صبر کو نصف ایمان کہا گیا ہے۔ وہاں صبر سے معاصی کو چھوڑنا اور اس سے اجتناب کرنا مراد ہے کیونکہ اقتضائے ایمان کا نصف حصہ معاصی سے اجتناب اور دوسرا نصف حصہ طاعات بجالانا ہے اور اس جگہ صبر سے مراد لوگوں کے ایذاء پر صبر اور ان کے ظلم وجفا کو برداشت کرنا ہے اور سید الانبیاء صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ وعلیہم کا بلا وایذا پر صبر فرمانا ان سب سے بڑھ کر زیادہ اور سخت تر تھا چنانچہ فرمایا:

مَا اُوْذِيَ نَبِيٌّ مِثْلَ مَآ اُوْذِيْتُ اَوْ كَمَا قَالَ

کسی نبی کو اتنی ایذا نہ پہنچائی گئی جتنی مجھے دی گئی۔

یہ اس لیے کہ حضور ﷺ امت کے اسلام لانے پر سب سے بڑھ کر خواہش مند تھے۔ اسی بناء پر ان کی ایذا رسانی ان کے کفر سے زیادہ تر تھی۔

مروی ہے کہ جب آیت کریمہ معاف کرنے' امر بالمعروف اور جاہلوں سے درگزر کرنے کے بارے میں نازل ہوئی تو حضور اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے اس کی توضیح دریافت کی۔ انہوں نے کہا جب تک میں رب العزت عزاسمہ سے دریافت نہ کرلوں عرض نہیں کرسکتا۔ چنانچہ جبریل علیہ السلام گئے اور آئے اور کہا: اے محمد ﷺ! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو آپ سے دور ہو اس سے قریب ہوں اور جو آپ کو محروم رکھے اسے عنایت فرمائیں اور جو آپ پر ظلم وستم کرے اسے معاف فرمائیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ رسول خدا ﷺ نے کبھی بھی اپنے ذاتی معاملہ اور مال ودولت کے سلسلے میں کسی سے انتقام نہ لیا۔ مگر اس شخص سے جس نے خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا تو اس سے خدا کے لیے بدلہ لیا اور حضور ﷺ کا سب سے زیادہ اشد وسخت صبر غزوۂ احد میں تھا کہ کفار نے آپ کے ساتھ جنگ ومقابلہ کیا اور آپ کو شدید ترین رنج والم پہنچایا مگر آپ نے ان پر نہ صرف صبر وعفو پر ہی اکتفا فرمایا بلکہ ان پر شفقت ورحم فرماتے ہوئے ان کو اس جہل وظلم میں معذور گردانا اور فرمایا: اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (یعنی اے خدا! میری قوم راہ راست پر لا کیونکہ وہ جانتے نہیں) اور ایک روایت میں ہے: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ (اے خدا! انہیں معاف فرما دے) اور جب صحابہ کو بہت شاق گزرا تو کہنے لگے یا رسول اللہ! کاش ان پر بددعا فرماتے کہ وہ ہلاک ہو جاتے۔ آپ نے فرمایا: میں لعنت کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ میں حق کی دعوت اور جہان کے لیے رحمت ہو کر مبعوث ہوا ہوں۔

فائدہ: تعجب ہے کہ جس کسی نے یہ کہا کہ نفس نبوی ﷺ اس جگہ حرکت میں آئی اور بے صبری کا اظہار فرمایا اور فرمانے لگے ''كَيْفَ يَفْلَحُ قَوْمٌ (الحدیث)'' (وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جو اپنے نبی کو مجروح کرے)۔ (آخر حدیث تک) اس پر آیہ کریمہ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (آپ پر کسی معاملہ کی کوئی ذمہ داری نہیں) نازل ہوئی۔ حالانکہ حضور ﷺ کے ارشاد ''کیف یفلح'' اور حق تعالیٰ کے

فرمان: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ میں کوئی چیز ایسی نہیں جو صبر و حلم کیخلاف اور اس کے منافی ہو بلکہ حضور ﷺ کے ارشاد میں اظہار تعجب ہے جو کچھ انہوں نے سلوک کیا اور حق تعالیٰ کے ارشاد میں آپ کے لیے تسلی و تشفی ہے۔ یہ بات آپ کی ذات شریف کے حق میں خاص تھی کہ آپ نے صبر و عفو سے کام لیا لیکن کفار نے جب روز احزاب نماز سے باز رکھا تو حضور ﷺ نے ان پر دنیا و آخرت کے عذاب کی دعا کی اور فرمایا: مَلَأَ اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا اللہ تعالیٰ ان کافروں کے گھروں کو اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔ اسی طرح حضور ﷺ نے عرب کے ان قبائل پر بددعا کی جو کمزور اور ناتواں مسلمانوں کو قسم قسم کے عذاب دیتے تھے اور متفق علیہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (آپ کے اوپر کسی معاملہ کی ذمہ داری نہیں ہے) اسی موقع پر نازل فرمائی۔ اسی طرح ان کفار پر بددعا کی جو فرار ہو گئے تھے۔ کفار پر یہ بددعائیں، دین اسلام کے حق اور مسلمانوں کے حقوق کے فوت ہونے کی وجہ سے تھیں اور اسی امر الٰہی کی بجا آوری میں تھی کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اے نبی! کفار و منافقین پر جہاد کیجئے اور ان پر خوب شدت کیجئے۔

اسی طرح حضور ﷺ نے ان اشقیاء کے گروہ پر یہ دعا کی جنہوں نے نماز کی حالت میں آپ کی پشت مبارک پر اونٹ کی اوجھڑی رکھی تھی۔

احبار یعنی علمائے یہود میں سے ایک شخص ابن سعنہ تھا اس سے روایت کرتے ہیں اس نے بتایا کتب سابقہ میں سے علامات نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور میں جب کہ میں نے آپ کی طرف نظر ڈالی نہ دیکھ لی ہو لیکن دو باتوں کا میں امتحان نہ کر سکا تھا ایک یہ کہ توریت میں لکھا ہوا تھا کہ اس کا حلم اس کے جہل کو زیادہ نہیں کرے گا اور شدت جہل اس کے حلم ہی کو بڑھائے گی۔ چنانچہ میں نے آپ سے تلطف کیا۔ یہاں تک کہ میں نے معاملہ میں خلط ملط کیا۔ اس طرح میں نے آپ کے علم و حلم کو پہچانا۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں نے ایک معینہ مدت کے لیے آپ سے کھجوریں خریدیں اور اس کی قیمت مال کے قبضے سے پہلے آپ کو دے دی پھر میں وقت مقررہ سے دو تین دن پہلے آیا اور آپ کے گریبان اور چادر کو پکڑ کر غیظ و غصہ کی نظر سے آپ کو دیکھا اور میں نے کہا ''اے محمد! (ﷺ) میرا حق کیوں ادا نہیں کرتے۔ خدا کی قسم تم آل عبدالمطلب حق کی ادائیگی میں تاخیر کرتے اور ٹال مٹول کرتے ہو''۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ کہنے لگے ''او دشمن خدا! رسول اللہ ﷺ سے ایسی بات کہتا ہے۔ تیری بدتمیزی کی جو باتیں میں نے سنی ہیں اگر مجھے حضور کی نافرمانی کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو اپنی تلوار سے تیری گردن اتار دیتا''۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر ؓ کی طرف آرام و آہستگی کے ساتھ نظر فرمائی اور تبسم کناں ہو کر فرمایا: ''اے عمر ؓ! میں اور یہ شخص تمہاری زبان سے ایسی بات کے برعکس بات سننے کا متمنی تھے۔ مطلب یہ کہ مجھ سے تو حق کی عمدہ طریق سے ادائیگی کو کہتے اور اس مرد سے حسن تقاضا کی تلقین کرتے۔ اب اے عمر ؓ! جاؤ اس کا حق ادا کرو اور جو کچھ تم نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے اس کے بدلے میں اسے بیس صاع کھجوریں مزید دو''۔ چنانچہ حضرت عمر ؓ نے فرمان رسول ﷺ کے مطابق عمل کیا۔ پھر اس یہودی نے کہا: ''اے عمر ؓ! میں حضور ﷺ کے چہرۂ انور میں نبوت کی تمام علامتوں کو پہچانتا تھا مگر ان دو خصلتوں کے بارے میں نہیں جانتا جس کا میں نے ابھی امتحان کیا۔ اب تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

حضرت ابو ہریرہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک دن رسولِ خدا ﷺ نے واقعہ ارشاد فرمایا کہ حضور ﷺ اپنی مجلس مبارک سے اٹھے اور ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے قریب ایک اعرابی آیا۔ اس نے حضور ﷺ کی گردن مبارک سے چادر کو اس سختی سے کھینچا کہ چادر کی درشتی سے آپ کی گردن مبارک چھل گئی۔ پھر حضور ﷺ نے اس اعرابی کی طرف نظر اٹھائی کہ وہ کیا کہتا ہے۔

اس نے کہا میرے پاس جو دو اونٹ ہیں اس پر مال لا دو کیونکہ میں بال بچے رکھتا ہوں اور آپ نہ اپنا مال لاویں گے نہ اپنے باپ کا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ”میں ہرگز اس وقت تک مال نہیں دوں گا جب تک تو مجھے اس چادر کی گرفت سے نہ چھوڑے گا جسے تو نے کھینچ رکھا ہے“۔ اعرابی نے کہا ”خدا کی قسم میں ہرگز چادر کو نہ ڈھیل دوں گا۔ جب تک آپ میرے ان دونوں اونٹوں کو نہ لدوا دیں“۔ حضور ﷺ نے کسی شخص کو بلا کر فرمایا ”اس کے ایک اونٹ پر کھجوریں اور دوسرے پر جو لا دو“۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اس حدیث کو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا اور حضور ﷺ کی گردن مبارک میں نجرانی سخت حاشیہ دار چادر تھی ایک اعرابی نے قریب آ کر چادر کو پکڑ کر حضور ﷺ کو کھینچا اور چادر کو سخت لپیٹنے لگا۔ حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کی گردن مبارک کی طرف دیکھا تو سخت حاشیہ دار چادر کی لپیٹ نے آپ کی گردن مبارک کو چھیل دیا تھا۔ اس کے بعد اعرابی کہنے لگا ”اے محمد! (ﷺ) خدا کے اس مال میں سے جو آپ کے پاس ہے مجھے دینے کا حکم فرما دیں“۔ پھر حضور ﷺ نے اس کی طرف ملاحظہ فرمایا۔ اور تبسم فرمایا اور مجھے اسے دینے کا حکم فرمایا۔

حضورِ اکرم ﷺ کے حلم و بردباری کا یہ بیان ہے کہ کس طرح آپ اپنی جان و مال کی ایذاؤں پر صبر فرماتے اور ظلم و جفا سے درگزر کرتے تھے۔ یہ سب اس خواہش میں تالیف قلوب تھی کہ یہ لوگ اسلام لے آئیں اور آپ کے اوصاف حمیدہ میں مذکور ہے کہ آپ نہ خود سخت کلامی فرماتے تھے اور نہ کسی کی سخت کلامی کا بدلہ لیتے تھے۔ بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ نہ گالی دینے والے تھے نہ فحش کلامی اور لعنت کرنے والے تھے۔ فحش میں قول و فعل اور خصلت سب شامل ہیں لیکن اس کا استعمال اکثر قول و کلام پر ہوتا ہے اور یہ صفت بیان کرنا کہ آپ کا قول نہ فاحش ہوتا نہ متفحش۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ آپ کی عادت ایسی تھی اور نہ آپ قصد و ارادہ سے سخت کلامی فرماتے۔ ”متفحش“ اسے کہتے ہیں جو قصد و ارادہ اور کثرت و تکلف سے سخت کلامی کرے اور ”فاحش“ اس سے زیادہ عام ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حدیث پایۂ صحت کو پہنچی ہوئی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے عقبہ بن معیط اور عبداللہ بن خطل اور ان کے سوا وہ لوگ جو ایذائیں پہنچاتے تھے آپ نے ان کو قتل کرنے کا حکم فرمایا تو یہ کہنا کہ مَا انْتَقَمَ لِنَفْسِہٖ (اپنی ذات کے لیے کبھی بدلہ نہیں لیا) کیسے صحیح ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ ”اِنْتِھَاکِ حُرُمَاتِ اللّٰہِ“ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو بھی پامال کرتے تھے اور بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ ایذا رسانی کا بدلہ نہ لینے سے مراد یہ ہے کہ ایسا سبب ہو جو حد کفر کو نہ پہنچے اس میں بدلہ نہ لیتے تھے۔ مثلاً یہی مذکورہ واقعہ جس نے آپ کی چادر مبارک کھینچی اور اس کی مثل دیگر واقعات اور داؤدی نے عدم انتقام کو ان چیزوں پر محمول کیا ہے جو مال کے ساتھ خاص ہے اور عزت و ناموس کے قبیل سے نہ ہو اور آپ کے عفو و درگزر کی مثالوں میں یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے لبید بن الاعصم یہودی کو جس نے جادو کیا تھا اور خیبر کی اس یہودیہ کو جس نے زہر آلود بکری کی ران دی تھی، معاف فرمایا۔ اسی طرح آپ قیلولہ فرما رہے تھے جب حضور ﷺ نے چشم مبارک کھولی تو دیکھا کہ ایک اعرابی تلوار کھینچے آپ کے سرہانے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے اب آپ کو کون بچائے گا اور مجھ سے آپ کو کون محفوظ رکھے گا آپ نے فرمایا: ”اللہ“ اس کے بعد اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور حضور ﷺ نے تلوار اٹھا لی اور فرمایا: اب بتا تجھے اب کون بچائے گا۔ پھر وہ کانپنے اور لرزنے لگا پھر حضور ﷺ نے اسے چھوڑ دیا اور معاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم میں آیا اور کہنے لگا کہ میں تمہارے پاس سب سے زیادہ بہتر شخص کے پاس سے آیا ہوں۔ اسی طرح آپ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ شخص ارادہ رکھتا ہے کہ آپ کے دشمنوں کو قتل کر دے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا نہ ڈر، اگر تو میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو مجھ پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تمام مثالیں حضور ﷺ کے وسعت اخلاق اور آپ کے حلم پر مبنی ہیں۔

اب رہا وہ معاملہ جو منافقوں کے ساتھ حضور ﷺ کا تھا کہ غیوبیت میں وہ آپ کو ایذا پہنچاتے اور جب حاضر ہوتے تو خوشامد وچاپلوسی کرتے۔ منافقوں کی یہ حرکت ایسی ہے جس سے ہر انسان کا دل نفرت کرتا ہے مگر جسے تائید ربانی حاصل ہے۔ اگرچہ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر شدت وتغلیظ کا ارشاد آ چکا تھا چنانچہ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اے نبی! کفار ومنافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر شدت برتیے۔

مگر حضور ﷺ نے ان کے لیے عفو ورحمت اور استغفار کا دروازہ کھلا رکھا اور ان کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اے محبوب! آپ ان کے لیے استغفار کریں یا نہ کریں اللہ ہرگز انہیں نہیں بخشے گا۔

پھر حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے مختار رکھا ہے اب میں استغفار کو اختیار کرتا ہوں اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تو......

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: میں ستر مرتبہ سے بھی زیادہ ان کی بخشش کی درخواست کروں گا آپ کی یہ عادت کریمہ ان کے جرم وایذا رسانی سے چشم پوشی اور عفو ودرگزر کی بے مثل مثال ہے۔ قطع نظر اس کے کہ آیۂ کریمہ کی عبادت سے تکثیر ومبالغہ کا مفہوم بھی نکلتا ہے نہ کہ کسی خاص شمار کی تحدید وتعیین، لیکن حضور سیّد عالم ﷺ نے آیۂ کریمہ کو غایت عفو ودرگزر کی بنیاد پر ظاہر الفاظ پر ہی محمول فرمایا۔ یہاں تک کہ حضورِ اکرم ﷺ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے لڑکے کو جو کہ مخلص مسلمان تھے اپنے باپ کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم فرمایا اور جب وہ مر گیا تو حضور ﷺ نے اپنا پیرہن مبارک جسم اطہر سے اتار کر اس کو کفن بنایا اور نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا اس وقت حضرت عمر بن خطاب ؓ نے حضور ﷺ کا دامن اقدس پکڑ کر عرض کیا یا رسول اللہ ایسے منافق پر نماز پڑھ رہے ہیں جو تمام منافقوں کا سردار تھا اس پر حضور نے اپنا دامن مبارک چھڑا کر فرمایا اے عمر ؓ! تم دور رہو۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اے محبوب! آپ کسی منافق کی موت پر کبھی نماز نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

اس وقت حضور ﷺ نے یہ ارادہ ترک فرمایا۔ یہ آپ کا انتہائی صبر وحلم اور شفقت ومہربانی امت پر تھی لیکن جب بارگاہ الٰہی سے ہی ممانعت آ جائے تو کیا کریں۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ اس کے لڑکے کی دلدہی کے لیے تھا کیونکہ وہ حضور ﷺ کی بارگاہ کے مخلص وصالح صحابی تھے اور انہوں نے درخواست کی تھی جس کی پذیرائی فرمائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی منافق کو قمیص مبارک پہنانا اس بنا پر تھا کہ اس نے آپ کے چچا حضرت عباس ؓ کو اس وقت قمیص پہنائی تھی جب کہ وہ بدر کے قیدیوں میں برہنہ اسیر ہوئے تھے اور ان کے جسم پر طویل القامت ہونے کی وجہ سے کوئی قمیص نہ آتی تھی۔

غرض کہ اس بیان میں حضورِ اکرم ﷺ کے مکارم اخلاق کی عظمت کا اظہار ہے باوجودیکہ منافقین ہمیشہ آپ کو برا جانتے اور اذیتیں پہنچاتے تھے مگر اس کے مقابلہ میں حضور ﷺ ان کے ساتھ حسن سلوک ہی فرماتے تھے تو اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مخلص مسلمانوں کے ساتھ حضور ﷺ کا کیا حال ہوگا؟ اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ بلاشبہ آپ کی خو بو بہت بڑی ہے اور یہ کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مطلب یہ کہ یہ ممانعت اس بنا پر ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے باغی و سرکش ہیں۔

حضور سیّد عالم ﷺ کا امت پر شفقت و مہربانی فرمانے کے قبیل سے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کے گناہوں اور اذیتوں کی پردہ پوشی کی جائے اور فرمایا: جس سے محرمات کے ساتھ مباشرت کا گناہ سرزد ہو جائے اسے چاہیے کہ وہ گناہ کو چھپائے افشا نہ کرے اور امت پر حکم فرمایا جن لوگوں پر حد شرعی قائم ہو جائے ان کے لیے خدا سے بخشش کی دعا مانگیں اور ان پر شفقت و مہربانی کریں اور کسی پر تبرا کرنے، گالی دینے اور لعنت کرنے کی ممانعت فرمائی، چنانچہ فرمایا:

لَاتَلْعَنُوْهُ فَاِنَّهٗ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کسی مسلمان پر لعنت نہ کرو کیونکہ وہ اللہ اور اسکے رسول سے محبت کرتا ہے۔

اس میں اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باطنی حالت پر نظر فرماتا ہے اگرچہ ظاہر میں اس سے کوئی خطا یا ذلیل حرکت سرزد ہوئی ہو۔

صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیق رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے حاضر بارگاہ ہونے کی اجازت مانگی۔ حضور ﷺ نے حاضر ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جب دیکھا تو فرمایا یہ شخص اپنے قبیلہ کا برتر شخص ہے اور جب وہ بیٹھ گیا تو حضور ﷺ نے کشادہ روی فرمائی اور خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ پھر جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ جب حضور ﷺ نے اوّل نظر مبارک ڈالی تھی تو اس کے بارے میں ایسا ایسا فرمایا تھا اور جب وہ بیٹھ گیا تو حضور ﷺ نے کشادہ روئی اور اس کے ساتھ خوشی و مسرت کا اظہار فرمایا یہ کیا بات تھی۔ فرمایا: اے عائشہ! رضی اللہ عنہا تم نے مجھے ''فحاشی'' (سخت کلام) اور درشت خو کب پایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ خدا کے نزدیک وہ شخص بہت برا ہے جسے لوگ ڈر اور خوف کی بناء پر چھوڑ دیں اور اس کے شر و فساد سے بچتے رہیں۔ یہ عبارت دو معنی کا احتمال رکھتی ہے ایک یہ کہ اس میں اپنی ذات گرامی کی طرف اعتذار کے طور پر اور اس شخص سے تلطف و خوشی کے اظہار کرنے میں اشارہ فرمایا اور سخت کلامی اور درشت خوئی سے منع فرمایا تاکہ لوگ قریب آنے سے نہ گھبرائیں اور دور نہ بھاگیں اور دوسرا احتمال یہ کہ اس شخص کے مال کی طرف نسبت و اشارہ فرمایا اور بیان کیا کہ وہ ایسا برا شخص ہے جس کے شر سے لوگ ڈرتے ہیں اور اس کی برائی کو اس کے سامنے نہیں لا سکتے اور اس کے شر کے خوف سے اس کی مدارات کرتے ہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ حضور سیّد عالم ﷺ کا اس شخص کے ساتھ حسن سلوک فرمانا تالیف قلب کے لیے تھا تاکہ وہ اس کی قوم اور اس کا قبیلہ اسلام لے آئے کیونکہ وہ اپنی قوم اور قبیلہ کا سردار تھا اور حضور ﷺ کا اسے برا کہنا غیبت کے باب سے نہیں ہے اس لیے کہ شارع یعنی نبی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی امت کے عیوب اور اس کی برائیوں کو دیکھے اور اس کا اظہار کرے۔ نبی کا ایسا کرنا، امت کی نصیحت و شفقت کے زمرہ میں سے ہے۔ بخلاف امت کے کہ وہ ایک دوسرے کی غیبت کرتے اور عیب جوئی کرتے ہیں اور یہ بھی معلن مجاہر یعنی کھلے عام فسق و فجور کرنے والے کا اظہار عیب کرنا جائز ہے باوجود ان باتوں کے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی طبعی خو بو ہی ایسی بنائی ہے جو کرم و حسن خلق پر ہے اور آپ میں تلطف و بشارشت اور خندہ پیشانی ہے۔ نیز اس میں امت کے لیے تنبیہ ہے کہ جن سرکشوں کی ایسی حالت ہو ان سے بچیں اور ان کے ساتھ تواضع و مدارات سے پیش آئیں تاکہ ان کے شر و فساد سے سلامت رہیں لیکن مداہنت کی حد تک ہرگز نہ پہنچیں اور مدارت و مداہنت میں فرق یہ ہے کہ مدارت وہ ہے جو شر سے بچنے اور اپنی عزت محفوظ رکھنے کے لیے ہے اور مداہنت وہ ہے جو دنیاوی منفعت کے لیے ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ وہ اسی معنی کی طرف راجع ہے۔ مثلاً یہ کہ مدارات یہ ہے کہ دنیاوی اخراجات، دنیا کی اصلاح یا دین کی اصلاح یا دونوں کی اصلاح کے لیے ہے اور یہ مباح ہے اور بسا اوقات یہ مستحسن و ممدوح بھی

ہوتا ہے اور مداہنت یہ ہے کہ دینی تصرفات کو دنیاوی صلاح وحصول کے لیے استعمال کیا جائے (اللہ تعالیٰ مداہنت سے محفوظ رکھے) اور حضور ﷺ نے اس شخص پر اپنی ان دنیاوی معاملات سے سلوک فرمایا جو اچھے برتاؤ اور نرم گفتاری سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اپنی زبان مبارک سے اس کی مدح وتعریف نہ کی تاکہ مناقض یعنی واقعہ حال کے برخلاف نہ ہو۔ لہٰذا آپ کا قول حق کے اظہار میں تھا اور آپ کا فعل اچھے برتاؤ کے زمرہ میں، حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ شخص اس وقت مسلمان تھا یا نہیں، اگر مسلمان نہ تھا تو آپ کا قول یعنی اسے ''برا بتانا'' غیبت نہ ہوگا اور اگر وہ مسلمان تھا تو اس کا اسلام خالص اور ناصح نہ تھا تو حضور ﷺ نے چاہا کہ اس کا حال بیان کر دیا جائے تاکہ کوئی ناواقف شخص اس سے دھوکا نہ کھائے اور اس شخص کے حالات میں مرقوم ہے کہ اس شخص سے حضور ﷺ کی حیات ظاہرہ میں اور بعد وصال ایسی حرکتیں واقع ہوئی ہیں جو اس کے ایمان کی کمزوری پر دلالت کرتی ہیں۔ اس بناء پر حضور ﷺ کا فرمانا اخبار بالغیب غیبی خبر دینا اور علامات نبوت میں سے ہوگا۔ لیکن آپ کا اس سے ترقی فرمانا اور انبساط کا اظہار کرنا مذکورہ قباحت کی موجودگی میں برسبیل تالیف قلب تھا۔

تنبیہ: اس شخص کا نام عیینہ بن حصن بن حذیفہ بن بدر بن فراری تھا اور اسے لوگ ''احمق المطاع'' کہتے تھے۔ احمق اس کی حماقت اور تکبر کی بنا پر اور ''مطاع'' اس لیے کہ وہ اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب عیینہ بن حصن بن حذیفہ اپنے بھتیجے حر بن قیس بن حصین کے پاس آیا یہ حر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جو امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مقرب اور آپ کی مجلس شوریٰ کے اصحاب میں سے تھے عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا: اے بھتیجے! امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی جناب میں تمہاری قدر ومنزلت ہے۔ تو میرے لیے ان سے اپنی نزدیکی کی درخواست کرو کہ میں بھی ان کے مقربوں میں ہو جاؤں۔ انہوں نے کہا میں درخواست کروں گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حر بن قیس نے عیینہ کے بارے میں درخواست کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حاضری کا شرف بخشا اور اجازت مرحمت فرمائی۔ جب عیینہ حضرت فاروق اعظم کے پاس گیا تو وہ کہنے لگا کہ اے خطاب کے فرزند! ہمیں بھی کچھ مال ومنال دیجئے۔ خدا کی قسم آپ ہمیں بہت نہیں دیتے اور ہمارے درمیان انصاف نہیں فرماتے۔ اس پر حضرت فاروق اعظم کو غصہ آیا۔ یہاں تک کہ ارادہ فرمایا کہ اسے اس کی سزا دی جائے۔ اور تعزیری حد قائم کی جائے تو حر بن قیس نے کہا اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ارشاد فرمایا:

خُذِالْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ○

درگزر سے کام لیں اور بھلائی کا حکم دیں اور جاہلوں کی طرف التفات نہ فرمائیں۔

اور کہا کہ یہ شخص جاہلوں میں سے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں خدا کی قسم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آیت سے سر مو تجاوز نہ کیا۔

اور ''فتح الباری'' میں منقول ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عیینہ مرتد ہو گیا تھا اور اس نے مسلمانوں کیخلاف جنگ بھی کی تھی اس کے بعد وہ دوبارہ اسلام لایا اور ارتداد سے توبہ کی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں بعض فتوحات میں شریک ہوا اور اس کتاب کے آخر میں غزوات کے باب میں اس کے ایسے کوائف وحالات انشاء اللہ آئیں گے جو اس کی بدخوئی اور شدت جفا پر دلالت کریں گے۔

تواضع، ادب اور حسن معاشرت: وصل: اس سلسلہ بیان میں حضورِ اکرم ﷺ کا اہل وعیال اور خدام اور اصحاب کے ساتھ جو

تواضع ادب اور حسن معاشرت ہے اس کا ذکر ہے۔ صراح میں تواضع کے معنی انکساری دکھانے اور گردن کو جھکانے کے ہیں اور قاموس میں تواضع کے معنی تذلل وایضاع ہیں۔

اہل عرب اس کو اس وقت استعمال کرتے ہیں جب وہ اونٹ کی گردن کو نیچا کر کے اس پر پاؤں رکھ کر سوار ہوتے ہیں۔ تواضع وضع سے مشتق ہے اور وضع کے معنی نیچے رکھنے کے ہیں اور متواضع شخص چونکہ اپنے آپ کو اپنے مرتبہ اور مقام سے نیچے اتارتا ہے اس کی ضد تکبر ہے کہ متکبر خود کو اپنے مرتبہ سے بلند جانتا ہے اور جو اپنے مرتبہ سے کمتر رہے تو اسے تصنع اور بناوٹ کہتے ہیں۔ تواضع، تکبر اور تصنع کی درمیانی کیفیت کا نام ہے۔ لیکن چونکہ آدمیوں کو تکبر کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ کبھی تصنع کو تواضع کا مقام دیتے ہیں چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ تواضع کیا ہے فرمایا ”حفض الجناح ولین الجانب“ (بازوؤں کا جھکانا اور پہلو پر جھکنا) اور فرمایا: تَخَضَّعْ لِلْحَقِّ وَتَنْقَادُلَهٗ وَتَقَبَّلْهُ لِمَنْ قَالَهٗ وَتَسْمَعُ مِنْهُ (حق کے آگے جھک جائے اور اس کا فرمان بردار بن جائے جو حق کہے اسے قبول کرے اور سنے) اور آپ نے فرمایا: مَنْ رَاٰى لِنَفْسِهٖ قِيْمَةً فَلَيْسَ لَهٗ فِي التَّوَاضُعِ نَصِيْبٌ (جس نے اپنے آپ کو قیمتی جانا اس کے لیے تواضع کا کوئی حصہ نہیں ہے) عرفاء فرماتے ہیں کہ کوئی بندہ اس وقت تک تواضع کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے دل میں مشاہدۂ نور کی تابانی نہ ہو۔ کیونکہ مشاہدہ نفس کو پگھلاتا اور اسے نرم کرتا ہے اور نفس کا پگھلنا تکبر وعجب کی کھوٹ سے صفائی ہے۔ چنانچہ نفس ملائم ہو جاتا ہے۔ جمال حق مثل آئینہ منطبع اور منقش ہو جاتا ہے اور کبر وعجب کے آثار فنا اور کدورت کا غبار چھٹ جاتا ہے اس کا وافر حصہ اور بلند رتبہ حضورِ اکرم سیّد الانبیاء ﷺ کے لیے ہے کیونکہ آپ کمال کے مرتبہ اعلیٰ پر فائز تھے۔ اس کے باوجود آپ تواضع اختیار فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار مرحمت فرمایا کہ آپ یا تو نبی بادشاہ ہونا پسند فرمائیں یا نبی بندہ ہونا تو آپ نے نبی بندہ ہونا اختیار فرمایا۔ لہٰذا آپ بحکم مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ (جس نے اللہ کے لیے تواضع اختیار کی اس کا مقام بلند فرمائے گا) تمام خلائق سے افضل وبرتر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی قدر ومنزلت سب سے رفیع وبلند گردانی اور آپ کو نوع انسانی کا سردار بنایا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: میری مدح وثناء میں نہ مبالغہ کرنا اور نہ حد سے تجاوز کرنا جس طرح کہ نصاریٰ حضرت ابن مریم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا (معاذ اللہ) کہنے لگے۔ میں بایں فضل وکمال خدا کا بندہ ہی ہوں لہٰذا مجھے عبداللہ اور رسول اللہ کہو۔

حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: کہ رسولِ خدا ﷺ عصا پر ٹیک لگائے ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم آپ کے لیے کھڑے ہو گئے آپ نے فرمایا: جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس طرح تم نہ کھڑے ہوا کرو اور فرمایا: میں خدا کا بندہ ہوں اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح بندے کھاتے ہیں اور اسی طرح بیٹھتا ہوں جس طرح بندے بیٹھتے ہیں۔ آپ کا یہ فرمانا آپ کی بردباری اور متواضعانہ عادت کریمہ کی وجہ سے ہے۔

آپ کی اسی متواضعانہ شان میں سے یہ بھی ہے کہ آپ اپنے خادم کو نہ جھڑکتے اور نہ سخت وسست فرماتے بلکہ یہ بھی نہ فرماتے کہ ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا اور اہل وعیال کے ساتھ تو آپ سے بڑھ کر کوئی مہربان نہ تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کسی کو ہاتھ سے نہ مارا اور آپ نے کسی سے دین خدا کے سوا اپنا بدلہ نہ لیا۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لوگوں نے دریافت کیا کہ جب رسولِ خدا ﷺ اپنے گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو آپ کی خلوت کی کیا حالت تھی۔ فرمایا: آپ لوگوں میں سب سے زیادہ نرم گفتار اور بہت زیادہ متبسم وخوش اطوار تھے اور کسی نے کبھی بھی آپ کو اپنے صحابہ کے

درمیان قدم مبارک دراز کرتے نہ دیکھا اور آپ کے صحابہ میں سے کوئی یا آپ کے اہل خانہ میں سے کوئی آپ کو مخاطب کرتا تو آپ لبیک (حاضر ہوں) کہہ کر جواب دیتے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے حسن معاشرت میں یہ ہے کہ آپ لوگوں کی دلجوئی فرماتے اور ان سے بیزاری کا اظہار نہیں فرماتے تھے اور آپ ہر قوم کے سردار کی عزت کرتے اور ان کو انہیں پر حاکم مقرر فرماتے آپ اپنے صحابہ کے احوال کی جستجو فرماتے اور ان کی دلجوئی کرتے اور اپنی التفات وعنایت کا حصہ اپنے تمام ہم نشینوں کو مرحمت فرماتے اور کوئی بھی یہ گمان نہ کر سکتا تھا کہ آپ کے قرب میں اس سے زیادہ اور کوئی بزرگ ہے۔ گویا مجلسی حق سب کو برابر دیا جاتا تھا اور جو خود بھی آپ کے پاس حاضر ہوتا اور آپ کی خدمت میں کچھ عرصہ ٹھہرتا تو آپ اس وقت تک اس کے پاس سے نہ اٹھتے جب تک کہ وہ خود نہ اٹھتا اور جب کوئی آپ کے گوش مبارک میں راز کی بات کرتا تو آپ سر مبارک نہ ہٹاتے یہاں تک کہ وہ خود نہ ہٹا لے اور جو کوئی آپ کے دست مبارک کو تھام لیتا تو آپ اپنا دست مبارک ڈھیلا چھوڑ دیتے اور اس کے ہاتھ سے نہ کھینچتے۔ جب تک وہ خود آپ کا دست مبارک نہ چھوڑے اور آپ لوگوں سے حذر کرتے اور اپنا بچاؤ کرتے۔ بغیر اس کے کہ کسی سے آپ کی پیشانی میں شکن آئے یا آپ کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی میں فرق آئے اور آپ کی کشادہ روی اور خوش خلقی سے لوگ سیراب ہو جاتے تھے اور آپ سب کے لیے بمنزلہ باپ کے تھے (بلکہ اس سے کہیں زیادہ شفیق و مہربان) اور آپ کے نزدیک حصول حق میں سب برابر تھے اور آپ ہمیشہ تازہ رو خوش خلق اور نرم گفتار تھے اور آپ درشت خو سخت گو بلند آواز فحش کلام اور عیب گو نہ تھے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ خوش اخلاقی میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی نہ تھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے اور مجھے کبھی اف تک نہ فرمائی اور نہ یہ فرمایا کہ ایسا کیوں کیا یا ایسا کیوں نہ کیا۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہمیشہ ہی رسول اللہ ﷺ کو تبسم کناں دیکھا ہے اور کبھی بھی آپ کو اپنے صحابہ کے سامنے اپنا زانوئے مبارک پھیلاتے نہ دیکھا اور جو بھی آپ کے پاس آتا آپ اس کا اعزاز فرماتے اور اس کے لیے اپنی چادر مبارک پھیلاتے اور اس کے لیے ایثار فرماتے اسے سرہانے بٹھاتے اور خود نچلی جانب تشریف رکھتے اور کسی بات کو نہ کاٹتے جب تک کہ وہ حد سے تجاوز نہ کر جاتا۔ اس وقت کھڑے ہو کر یا کسی اور طرح سے بات ختم فرماتے اور کبھی کسی آنے والے کی خاطر نماز کو ہلکا کر دیتے اور اس سے اس کی حاجت دریافت فرماتے اور جب اس کی حاجت روائی فرما دیتے تو نماز کی طرف مشغول ہو جاتے۔ ناداروں کی بیمار پرسی (عیادت) کرتے اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے اور غلاموں کی دعوت کو قبول فرما لیا کرتے تھے۔ ان کی دعوت میں جو کی روٹی اور پگھلی ہوئی کہنہ چربی ہوتی تھی۔ مگر آپ اسے ہی قبول فرماتے اور اپنے صحابہ کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے اور مجلس کے آخری کنارے پر جہاں جگہ ہوتی تشریف رکھتے اور کبھی دراز گوش (حمار) پر سواری فرماتے اور کسی کو ردیف بناتے۔ یعنی سواری پر اپنے پیچھے کسی کو بٹھا لیتے۔ بنی قریظہ کے دن آپ ایسے دراز گوش پر سوار تھے جس کی لگام رسن کی تھی اور پالان یعنی سواری کی نشست گاہ کھجوروں کے پوست کی تھی اور آپ نے ایسے اونٹ پر حج کیا جس کا کجاوا بہت پرانا تھا اور اس پر چار درہم قیمت کی چادر پڑی ہوئی تھی۔ یہ حج مبارک آپ کے عہد مبارک میں تھا جب کہ متعدد ممالک اور شہر مفتوح ہو چکے تھے جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا ہے اس وقت آپ نے سو اونٹوں کی قربانی کی تھی اور جب آپ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے حضور تواضع و انکسار کی یہ شان تھی کہ آپ کا سر مبارک کجاوہ کے اگلے سرے کی لکڑی کے قریب جھکا ہوا تھا حالانکہ شاہان جبابرہ فتح کے وقت سر کو اونچا کرتے اور اکڑ کر چلتے ہیں۔

حضرت قیس بن سعد انصاری ؓ جو خود بھی اور ان کے والد بھی اکابر انصار میں سے تھے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن حضورِ اکرم ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے۔ واپسی کے لیے حضرت سعد ؓ نے دراز گوش پیش کیا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اس پر سوار ہوئے اور حضرت سعد نے کہا اے قیس حضور کی ہمرکابی میں جاؤ قیس کہتے ہیں کہ حضور نے فرمایا اے قیس سوار ہو جاؤ۔ میں نے ادب کی خاطر انکار کیا۔ فرمایا: یا تو تم سوار ہو جاؤ یا واپس چلے جاؤ۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میرے آگے سوار ہو جا کیوں کہ جانور کے مالک کا حق ہے کہ وہ آگے رہے۔

ایک اور مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صحابی سوار جا رہے تھے۔ جب انہوں نے حضور کو دیکھا تو اتر پڑے اور حضور ﷺ کو سوار کیا۔ حضور ﷺ نے ان کو اپنے آگے بٹھایا۔ اس سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے جسے محبّ طبری نے مختصر السیر میں نقل کیا ہے کہ ایک روز حضور ﷺ بغیر پالان کے دراز گوش پر سوار قبا کی طرف تشریف لیے جا رہے تھے اور ابوہریرہ ؓ پیدل رکاب میں تھے۔ فرمایا: اے ابوہریرہ ؓ! میں تمہیں سوار کرلوں عرض کیا جیسی حضور ﷺ کی مرضی ہو۔ فرمایا: سوار ہو جاؤ انہوں نے سوار ہونے کے لیے زقند لگائی مگر چنگل حضور ﷺ پر لگا اور دونوں زمین پر آ گئے۔ پھر حضور ﷺ سوار ہوئے اور فرمایا: کیا تمہیں بھی سوار کرلوں عرض کیا جیسی حضور ﷺ کی مرضی وہ پھر سوار ہونے کی قدرت نہ پا سکے اور حضور ﷺ سے چمٹ گئے اور دوبارہ پھر زمین پر دونوں آ گئے۔ جب تیسری مرتبہ حضور ﷺ نے سوار ہونے کے لیے ان سے کہا تو وہ عرض کرنے لگے قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اب میں نہیں چاہتا کہ حضور ﷺ کو تیسری مرتبہ سواری سے زمین پر لاؤں۔

طبری بیان کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ سفر میں تھے۔ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو ایک دنبہ تیار کرنے کا حکم فرمایا صحابہ اٹھے ایک کہنے لگا میں ذبح کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں اس کی کھال اتاروں گا تیسرے نے کہا میں اسے پکاؤں گا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: لکڑیاں جمع کرنا میرا کام ہے۔ صحابہ عرض کرنے لگے یارسول اللہ ہم کافی ہیں۔ حضور ﷺ کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ فرمایا: میں جانتا ہوں تم کافی ہو لیکن میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ میں تم سے ممتاز و جدار ہوں اور تمہارے درمیان متمیز ہو کر بیٹھا رہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے ناپسند فرماتا ہے کہ کوئی بندہ اپنے ساتھیوں کے درمیان ممتاز ہو کر بیٹھے۔

ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ کی نعلین مبارک کا بند ٹوٹا ہوا تھا۔ صحابہ میں سے کسی نے کہا یارسول اللہ مجھے عنایت فرمائیے۔ میں اسے درست کردوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا میں ممتاز ہو کر رہوں اور کسی کو اپنے کام کے لیے فرماؤں (ﷺ)۔

ایک مرتبہ نجاشی بادشاہ حبشہ کے کچھ ایلچی آئے۔ حضورِ اکرم ﷺ ان کی خاطر مدارات کے لیے کھڑے ہو گئے تو صحابہ عرض کرنے لگے یارسول اللہ ان کی خدمت کی سعادت ہمیں عنایت فرمائیے فرمایا انہوں نے ہمارے صحابہ کی بڑی خدمت و تکریم کی ہے میں پسند کرتا ہوں کہ ان کا بدلہ ادا کروں۔

حضورِ اکرم ﷺ اہل خانہ کے خود کام کاج کرتے اور اپنے کپڑے خود سیتے۔ اپنی نعلین مبارک خود درست فرماتے اور اپنی بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنے کپڑوں میں جوں وغیرہ کی خود نگہداشت فرماتے تھے۔ حدیث میں ''وَیُفْلِیْ ثَوْبَہٗ'' آیا ہے۔ ''فلی'' کے معنی ہیں کپڑے اور سر میں جوں تلاش کرنا' حالانکہ اہل سیر بیان کرتے ہیں کہ آپ کے بدن مبارک میں نہ جوں پڑتی تھی اور نہ جسم اطہر پر مکھی بیٹھتی تھی۔ گویا لفظ یفلی (جوں تلاش کرنے) کے معنی یہ ہیں کہ آپ کپڑوں پر ایسی نگاہ مبارک دوڑاتے تھے جیسے جوں تلاش کر رہے ہوں اور مقصود یہ ہوتا تھا کہ کپڑوں سے گرد و غبار اور خس و خاشاک کو صاف کیا جائے۔ واللہ اعلم (نیز ایک وجہ امت کی تعلیم بھی ہو سکتی ہے

کہ وہ اپنے کپڑوں وغیرہ سے جوں کو ڈھونڈا کریں اور امت اس سنت پر عمل کر کے ثواب کی مستحق بنے مترجم غفرلہ)۔

آپ اپنی سواری کے اونٹ کو خود باندھتے اور خود ہی اس کے لیے چارہ وغیرہ ڈالتے تھے۔ آٹا گوندھنے میں خادم کی مدد فرماتے اور خادم کا ساتھ دے کر مدد فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ کھانا کھاتے۔ مواہب لدنیہ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ باتیں بعض اوقات کے ساتھ محمول ہیں یعنی کبھی کبھی ایسا بھی کیا کرتے تھے اس لیے کہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ آپ بکثرت خدام اور دس غلام رکھتے تھے۔ لہٰذا بنفس نفیس کام سرانجام دیتے اور کبھی انہیں حکم فرمادیا کرتے اور کبھی ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے اور بازار سے اپنا سامان خود اٹھا کر لاتے اور کسی دوسرے پر اٹھانے کے لیے نہ چھوڑتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بازار آیا اور ایک سرادیل (پائجامہ) کو چار درہم میں خریدا اور حضور ﷺ نے وزن کرنے والے سے فرمایا: قیمت میں مال کو خوب خوب...... کھینچ کر تولو (یعنی وزن میں کم یا برابر نہ لو بلکہ زیادہ لو) وہ شخص وزن کرنے والا حیرت زدہ ہو کر بولا میں نے کبھی بھی کسی کو قیمت کی ادائیگی میں ایسا کہتے نہیں سنا۔ اس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا افسوس ہے تجھ پر کہ تو اپنے نبی کو نہیں پہچانتا پھر تو وہ شخص ترازو کو ہاتھ سے چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور حضور اکرم ﷺ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ حضور ﷺ نے اپنا دست مبارک کھینچ کر فرمایا یہ عجمیوں کا دستور ہے وہ اپنے بادشاہوں اور سرداروں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں میں تو تم میں سے ایک شخص ہوں (یہ حضور ﷺ نے از راہ تواضع فرمایا جیسا کہ آپ کی عادت کریمہ تھی) اس کے بعد حضور ﷺ نے سرادیل کو اٹھا لیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آگے بڑھ کر ارادہ کیا کہ آپ سے سرادیل کو لے لوں مگر حضور ﷺ نے فرمایا: سامان کے مالک ہی کو حق ہے کہ وہ اپنے سامان کو اٹھائے مگر وہ شخص جو کمزور ہے اور اٹھا نہ سکے تو اپنے اس بھائی

---

[1] حضور اکرم ﷺ نے ازار پائے کو پہنا ہے۔ اگر ازار پاء سے وہی مراد ہے جو چادر کی مانند بیان کرتے ہیں تو ظاہر ہے اسے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اگر مراد سرادیل یعنی پائجامہ ہے تو حضور ﷺ کا اس کے پہننے میں اختلاف ہے۔ بعض اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آپ نے سرادیل نہیں پہنی لیکن شمنی شرح شفا میں کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے سرادیل پہنی ہے لیکن حضور ﷺ کا سرادیل خریدنا معلوم و متفق علیہ ہے چنانچہ ''جامع الاصول میں ترمذی و ابوداؤد کی حدیث میں مروی ہے کہ سرادیل کا یہ خریدنا مکہ مکرمہ میں تھا اور ابو علی موصلی اپنی مسند میں بہ سند ضعیف حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا میں حضور ﷺ کے ساتھ بازار آیا اور حضور ﷺ نے سرادیل چار درہم میں خریدی اور بازار والوں کا ایک وزان یعنی تولنے والا تھا جو قیمت کو وزن کرتا تھا تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا: خوب خوب کھینچ کر (زیادہ) تولو۔ اس شخص نے کہا میں نے کبھی بھی کسی کو ایسا کہتے نہیں سنا کہ وہ قیمت کی ادائیگی ایسا کلمہ کہہ کر کرے اس پر ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا افسوس ہے تجھ پر تو اپنے نبی کو نہیں پہنچانتا پھر وہ شخص ترازو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور حضور ﷺ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔ حضور ﷺ نے اپنا دست مبارک کھینچ کر فرمایا: یہ عجمیوں کا دستور ہے کہ وہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ از قبیل شما ہوں۔ پھر حضور ﷺ سرادیل لے کر روانہ ہوئے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ حضور ﷺ کے دست مبارک سے سرادیل کو لے لوں اور خود اٹھا کر لے چلوں۔ فرمایا: سامان کا مالک زیادہ لائق ہے کہ وہ اپنے سامان کو اٹھائے مگر وہ جو کہ کمزور و ناتواں ہو تو اسے اس کا بھائی مدد دے۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول کیا آپ سرادیل کو پہنیں گے۔ فرمایا: ہاں، میں سفر و حضر اور شب و روز پہنتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے ستر چھپانے کا حکم دیا گیا ہے اور میں اس سرادیل سے زیادہ ستر پوش کوئی جامہ نہیں پاتا اور طبرانی و دار قطنی اور عقیلی بھی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں لیکن سند ضعیف کے ساتھ اور اس حدیث کا دارومدار یوسف بن زیاد واسطی پر ہے جو کہ بہت ہی ضعیف ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضور ﷺ کا خریدنا صحیح و ثابت ہے اور ابن قیم اپنی کتاب ''ہدی النبی ﷺ'' میں کہتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ خریدنا پہننے کے لیے تھا اور روایت بھی کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے سرادیل پہنی اور آپ کے صحابہ نے بھی آپ کے زمانہ اقدس میں آپ کی اجازت سے پہنی اور امام بخاری اپنی صحیح میں ترجمہ لائے ہیں لیکن کوئی حدیث اس کے پہننے کی نہیں لائے اس لیے کہ صحیح نہ ہوگی اور اسی طریقہ اور شرط کے ساتھ جو امام بخاری کے نزدیک معتبر تھی محدثین روایت لاتے ہیں کہ امیر المومنین

کی مدد کرنی چاہیے۔

تنبیہ: سرادیل سے مراد تنبان یعنی پائجامہ ہے جو عجمیوں کا پہناوا ہے۔ اس حدیث سے حضورِ اکرم ﷺ کا خریدنا تو معلوم ہو گیا لیکن آپ کا اس کے پہننے میں اختلاف ہے چنانچہ ابن قیم جو کتاب الہدیٰ میں کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ خریدنا پہننے کے لیے ہی تھا اور ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضور ﷺ نے بھی سرادیل کو پہنا اور صحابہ کرام نے آپ کے زمانۂ مبارک میں آپ کی اجازت سے پہنا لیکن ابن قیم کی اس بات کو محدثین ضعیف قرار دیتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

بعض روایتوں میں باسناد ضعیف آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ ؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ سرادیل کو پہنیں گے فرمایا ہاں میں اسے سفر و حضر اور شب و روز پہنتا ہوں کیونکہ مجھے ستر پوشی کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش دوسرا جامہ نہیں پاتا۔ ابن حبان، طبرانی اور عقیلی بھی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں لیکن ضعیف سندوں کے ساتھ اس حدیث کا دار و مدار یوسف بن زیاد واسطی پر ہے اور وہ بہت ہی ضعیف ہے۔ منقول ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین ؓ کو جس دن شہید کیا گیا تو وہ سرادیل پہنے ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں ''شرح سفر السعادت'' میں اس سے زیادہ بحث کی گئی ہے وہاں مطالعہ کریں۔ (سفر السعادت [1] کا ترجمہ حاشیہ میں مذکور ہے)

ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں آیا تو آپ کی ہیبت سے وہ لرزنے اور کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا: اپنے پر قابو رکھو لرزو نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں بلکہ مجھے والدہ نے تولد کیا ہے اور میں قریش سے ہوں جو کہ ''قدید'' کھاتے ہیں۔ ''قدید'' اس خشک کردہ گوشت کو کہتے ہیں جو فقراء و مساکین کا کھانا ہے۔ آپ کی خدمت میں ایک ایسی عورت آئی جس کی عقل میں فتور تھا۔ وہ کہنے لگی مجھے آپ سے حاجت ہے آپ نے فرمایا: بیٹھو۔ مدینہ طیبہ کے جس کوچہ و بازار میں تو چاہے میں تیرے ساتھ بیٹھوں گا اور تیری حاجت پوری کروں گا۔ حضور ﷺ اس کے پاس بیٹھے اور اس کی جو حاجت تھی اسے پورا فرما دیا۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ مدینہ طیبہ کی باندیاں آتی تھیں اور حضورِ انور ﷺ کا دست مبارک پکڑتی تھیں جہاں وہ چاہتیں حضور ﷺ ان کے ساتھ تشریف لے جاتے تھے۔ اس جگہ تواضع میں یک گونہ مبالغہ ہے اس لیے کہ عورت ہو یا مرد، باندی ہو یا آزاد جو بھی کوئی آپ کو لے جانا چاہتا آپ تشریف لے جاتے۔ اگرچہ مدینہ کے باہر ہی لے جائے۔ اس سے زیادہ تواضع اور کبر سے تنفر و بیزاری متصور نہیں ہے اور حضورِ انور ﷺ اسے عار نہ جانتے تھے کہ کسی مسکین بیوہ کے ساتھ جائیں۔

عبداللہ بن ابی الحسماء ؓ بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے حضور ﷺ کوئی چیز خریدی کچھ رقم باقی رہ گئی۔

---

[1] سیّدنا عثمان ذی النورین ؓ جس دن شہید ہوئے وہ سرادیل پہنے ہوئے تھے اور روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سرادیل (پائجامہ) پہننے کو لازم کر لو اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ تمہارا استر پوش ہے اور عورتیں جو باہر نکلتی ہیں ان کو محصن و محفوظ بنانا ہے یعنی سرادیل ان کے لیے زیادہ لائق و مناسب ہے۔ خصوصاً گھر سے باہر نکلنے کی حالت میں، اسی طرح بعض مصنفین رحمہم اللہ بھی روایت لاتے ہیں اور اس حدیث کو علامہ امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ ''جمع الجوامع'' میں امیر المومنین سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ سے ان لفظوں کے ساتھ لائے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: میں رسولِ خدا ﷺ کے پاس بقیع میں بارش کے دن بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت گدھے پر سوار گزری اس کے ساتھ بوجھ تھا گدھے کا پاؤں زمین کے نشیب میں پھسلا اور وہ عورت زمین پر گر پڑی۔ حضورِ انور ﷺ نے اپنا رخ انور ادھر سے پھیر لیا۔ صحابہ کہنے لگے یا رسول اللہ وہ سرادیل پہنے ہوئے ہے۔ پھر دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُتَسَرْوِلَاتِ مِنْ اُمَّتِيْ يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّخِذُوْا السَّرَاوِيْلَاتِ فَاِنَّهَا مِنْ اَسْتَرِ ثِيَابِكُمْ وَحُصُّوْا بِهَا مِنْ نِسَآءِ كُمْ یعنی اے خدا! میری امت کے پائجامہ پہننے والوں کو بخش دے۔ اے لوگو! پائجامہ پہننے کو لازم کر لو۔ یہ تمہارے کپڑوں میں سب سے زیادہ ستر پوش ہے اور تمہاری عورتیں تو اسے خاص ہی کر لیں اس حدیث کو ترمذی اور العقیلی نے ''الضعفا'' میں اور ابن عدی نے ''الآداب'' میں اور دیلمی نے ''مسند الفردوس'' میں روایت کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس حدیث کو ابن جوزی ''موضوعات'' میں لائے ہیں لیکن انہوں نے یہ درست نہیں کیا کیونکہ میرے نزدیک یہ حدیث متعدد سندوں سے ثابت ہے (انتہی واللہ اعلم شرح سفر السعادت)

حضور ﷺ سے وعدہ کیا کہ اسی جگہ لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ پھر میں بھول گیا تین دن کے بعد مجھے یاد آیا میں وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور ﷺ اسی جگہ تشریف فرما ہیں۔ حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تم نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔ تین دن سے اسی جگہ تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس میں تواضع، صبر اور صدق وعدہ کی انتہا ہے۔ سیّدنا اسمٰعیل نبی اللہ علیہ السلام کے بارے میں بھی اسی طرح آیا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: **انہ کان صادق الوعد** (بلاشبہ حضرت اسمٰعیل وعدے کے سچے تھے)۔ بعض متبعین شریعت نبوی ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ حضور غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک سال کامل کسی شخص کے وعدہ کے مطابق اس کے انتظار میں اسی جگہ بیٹھے رہے اور وہ شخص خضر علیہ السلام تھے۔

دستور تھا کہ مدینہ طیبہ کی باندیاں برتنوں میں پانی لے کر آتیں اور حضورِ اکرم ﷺ اپنا دست مبارک پانی میں ڈال دیتے اور وہ اس پانی کو بیماروں پر چھڑک دیتیں اور وہ کبھی موسم سرما میں صبح کے وقت ٹھنڈا پانی لاتیں تو حضور ﷺ ان کی خاطر اپنا دست مبارک اس میں ڈال دیتے۔ یہ دلیل ہے کہ بزرگوں سے تبرک حاصل کیا جائے۔

ازواج مطہرات کے ساتھ حسن سلوک: حضورِ اکرم ﷺ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ بہت ہی بہتر سلوک فرماتے۔ ان کی پاسداری کرتے ان کے ساتھ استراحت فرماتے اور انصار کی بچیوں کو کھیلنے کے لیے حضرت عائشہ کے پاس چھوڑ دیتے۔ آپ جب پانی پیتے تو برتن کے اس جانب اپنا دہن مبارک رکھتے جس جگہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے منہ رکھ کر پانی پیا ہوتا اور حضرت عائشہ کی کلائی کو پکڑ کر برتن کے اس جانب سے پیتے جہاں سے انہوں نے پیا ہوتا اور حضور ﷺ اپنی مسواک صاف کرنے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیتے تو وہ اسے لے کر اپنے منہ میں چبا کر نرم کرتیں۔ پھر حضور ﷺ ان کے منہ سے مسواک لے کر اپنے دہن مبارک میں لے لیتے۔ یہ غایت درجہ تواضع اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے انتہائی محبت کی دلیل ہے اور حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں ٹیک لگاتے اور ان کا بوسہ لیتے۔ حالانکہ حضور ﷺ روزہ دار ہوتے اور حضور ﷺ ان کو حبشیوں کے کھیل (یعنی تیراندازی وغیرہ) دکھاتے اور وہ اپنا رخسار حضور ﷺ کے شانۂ مبارک پر رکھے ہوتیں۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صغرسنی میں تھیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسالقت فرمائی اور ایک دوسرے کے ساتھ دوڑے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دوڑ میں آگے نکل گئیں۔ پھر کچھ زمانہ بعد دوسری مرتبہ دوڑ ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ آگے نکل گئے وجہ یہ تھی کہ پہلی مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عام جسم کی تھیں دوسری مرتبہ وہ تنومند بھاری جسم کی ہوگئی تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: پہلی مرتبہ مجھ سے تمہارے آگے نکل جانے کا آج تم سے میرے آگے نکل جانے میں بدلہ ہے۔

ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف فرما تھے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کھانا بھیجا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ کھانے کے برتن میں لگ گیا برتن گر کر ٹوٹ گیا اور کھانا زمین پر بکھر گیا۔ حضور ﷺ نے برتن کے ٹکڑوں کو چنا اور کھانا اٹھا کر برتن میں رکھا اور معذرت خواہی کے طور پر حاضرین سے کہا ہمیں تمہارے اس رشک کے معاملے میں افسوس ہے۔ بیتابی کا اظہار ہوا۔ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے درست پیالہ لے کر اور ایک روایت میں ہے کھانا بھی لے کر ان کے گھر خادم کے ہاتھ بھجوایا اور فرمایا: پیالہ کے بدلہ میں پیالہ اور کھانے کے بدلہ میں کھانا ہے۔ اس حدیث میں غیرت کے موقع پر عورتوں سے مواخذہ نہ کرنے پر دلیل ہے۔ اس لیے کہ ایسی حالت میں شدت غضب کی بنا پر عقل چھپ جاتی ہے کیونکہ اس معاملے میں غیرت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ عورت رشک وغیرت کی حالت میں اونچ نیچ کو نہیں پہنچانتی۔

ایک مرتبہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی خدمت میں شوربا لائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا اسے پی لو تو انہوں نے نہ پیا۔ پھر کہا اسے پی لو ورنہ میں تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ انہوں نے پھر بھی نہ پیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے چہرہ پر مل دیا اور حضور اکرم ﷺ ہنستے رہے آپ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: تم بھی اسے کے منہ پر مل دو۔ چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے چہرہ پر مل دیا اور حضور ﷺ ہنستے رہے۔ ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کا یہ حال تھا کہ آپ ان کی غیرت و مزاج پر مواخذہ نہ فرماتے اور انہیں اس میں معذور رکھتے تھے اور جب ان پر عدل کی ترازو اور شریعت کے احکام قائم فرماتے تو نرمی و ملائمت کے ساتھ کرتے۔

اور جو شخص حضور اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ کو اہل و عیال، اصحاب، فقراء، مساکین، یتامیٰ، بیوگان، مہمان اور آنے جانے والوں کے ساتھ سلوک کو بغور و فکر دیکھے گا تو وہ جان لے گا کہ حضور ﷺ کے قلب انور میں غایت درجہ رقت، نرمی اور مہربانی تھی جو کسی مخلوق میں متصور نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حدود اور دین کے حقوق کے معاملہ میں اتنے شدید تھے کہ کوئی اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا اور حضور ﷺ کے اخلاق و اعمال تک کسی کی رسائی ممکن نہیں کیونکہ وہ سب کے سب معجزات اور آپ کی نبوت کی نشانیاں تھیں۔

حضور اکرم ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ خوش طبع، گھلے ملے اور صحابہ کے ساتھ مل جل کر باتیں کرتے تھے اور ان کے ساتھ مزاح فرماتے مگر اس سے مقصود صرف ان کی دلجوئی اور خوشنودی ہوتی تھی۔ اگر مزاح بھی فرماتے تو کلام کا مضمون و مفہوم بھی حق اور سچا ہوتا تھا۔ بچوں کے ساتھ کھیلتے اور ان کو اپنی گود میں بیٹھاتے تھے اور ہر آزاد و غلام اور باندی و مسکین کی دعوت کو قبول فرماتے اور مدینہ منورہ کے آخری کناروں تک بیماروں کی عیادت فرماتے تھے۔ بعض حدیثوں میں جو مزاح اور ملاعبت یعنی کھیل وغیرہ کی ممانعت آئی ہے وہ کثرت اور زیادتی پر محمول ہے۔ کثرت و زیادتی کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی یاد اور دین کی مہمات پر غور و فکر سے غافل کر دے اور جو اس میں صحیح و درست رہے اس کے لیے مباح ہے اور اگر اس سے مقصود کسی کی خوشی اور قلبی الفت و دل جوئی ہے جیسا کہ حضور ﷺ کا فعل مبارک تھا تو وہ مستحب ہوگا۔

درحقیقت اگر حضور اکرم ﷺ کے خلق عظیم میں تواضع و موانست اور خوش طبعی نہ ہوتی تو کس میں تاب و تواں اور قدرت و مجال ہوتی کہ آپ کے حضور بیٹھ سکتا یا آپ سے کلام کر سکتا۔ کیونکہ آپ میں انتہائی درجہ کی جلالت، ہیبت، سطوت، عظمت اور دبدبہ تھا۔ اس کی حکمت میں ارباب سیر بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ فجر کی سنت ادا فرمانے کے بعد اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیدار ہوتیں تو ان سے گفتگو فرماتے ورنہ زمین پر پہلو کے بل قدرے آرام فرماتے پھر باہر تشریف لاتے اور فرض ادا فرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے رات سے قیام، تلاوت قرآن، ذکر رحمٰن میں مشغول رہنے کی بنا پر حضرت حق جل مجدہ کی جانب سے آپ پر انوار و اسرار، قرب و اختصاص اور حضرت جبار سے سماع کلام و مناجات کی قبولیت وغیرہ سے آپ کی ایسی حالت ہوتی کہ اس کے بیان و اظہار کی کسی زبان میں تاب و طاقت نہیں۔

اور اس حالت میں کوئی شخص ملاقات کرنے یا ہم صحبت ہونے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ حضور ﷺ اپنی اس حالت کو بدلنے کے لیے یا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو فرماتے یا پہلو کے بل زمین پر استراحت فرماتے تاکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے موانست حاصل ہو جائے یا اس زمین کے ذریعہ جو خلقت کی اصل ہے۔ اس کے بعد جب اس علو مقام سے آپ باہر آتے تو مخلوق خدا کی طرف متوجہ ہوتے اور یہ اس وجہ سے تھا کہ آپ مسلمانوں کے ساتھ نرم اور مہربان تھے: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا اور آپ مسلمانوں کے ساتھ مہربان

تھے یہ نکتہ وہ ہے جو مواہب لدنیہ میں ''مدخل'' میں ابن الحاج سے نقل ہوا ہے۔

بندۂ مسکین یعنی حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ثبتہ اللہ علی الطریق والیقین فرماتے ہیں کہ یہ حال اس مقام کے ساتھ ہی خصوصیت نہیں رکھتا بلکہ حضورِ اکرم ﷺ ہمیشہ ہی ''اعلیٰ علیین'' میں ''قرب وتمکین'' کے مقام میں رہتے تھے اور باطن میں کسی مخلوق سے علاقہ واتصال نہ رکھتے تھے۔ البتہ! بحکم الٰہی دعوت وتبلیغ احکام پر مامور ہونا اور اس رحمت وشفقت کی بنا پر جو مخلوق خدا سے آپ کو تھی مقام احدیت کی بلندی سے تخصیص بشریت کی طرف نزول فرماتے تھے اور ان کے ساتھ ہم جلیس ہوتے تھے اور بمصداق اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے آپ کے سینۂ مبارک کو کشادہ نہ فرمایا) آپ میں یہ کمال ودیعت فرما دیا گیا تھا کہ حضور ﷺ حق کے ساتھ دعوت خلق بر طریق اتم واکمل جمع فرما سکیں۔ رات کا قیام اور صبح کا وقت آپ کے اوقات شریف میں ایک مخصوص وقت ہے اور یہ مقام بسبب کمال وتمام حضور سیّدنا علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے اور آپ کے سوا اولیاء کرام کو آپکی اتباع میں اس کا کچھ حصہ ملا ہے۔

کیفیت مزاح وملاعبت: حضورِ اکرم ﷺ کے مزاح وملاعبت کے آثار وبرکات حد وشمار سے باہر ہیں۔ ان کا شمار وحصر ناممکن ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ ؓ کی صاحبزادی جو کہ حضور ﷺ کی ربیبہ تھیں وہ حضور ﷺ کے پاس آئیں۔ آپ غسل فرما کر تشریف ہی لائے تھے آپ نے مزاحاً ان کے چہرے پر پانی کی چھینٹیں ماریں اس کی برکت سے آپ کے چہرے پر وہ حسن وجمال رونما ہوا جو کبھی بھی نہ ڈھلا شباب کا عالم ہمیشہ برقرار رہا۔

محمود بن ربیع جو نوعمر صحابیوں میں ہیں جب وہ پانچ برس کے تھے تو حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے ان کے گھر میں ایک کنواں تھا۔ حضور ﷺ نے ڈول سے پانی پیا اور بطریق مزاح آب دہن مبارک کو ان کے چہرے پر ڈالا۔ اس کی برکت سے ان کو ایسا حافظہ حاصل ہوا کہ اسی بنا پر ان کا شمار صحابہ میں ہوا ان کی حدیث بخاری میں مذکور ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے مزاحی واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ دیہاتیوں میں ایک شخص ''زاہر'' نام کا تھا۔ کبھی کبھی وہ حضور ﷺ کی خدمت میں دیہات کی ایسی ترکاریاں ہدیہ میں لایا کرتا جو حضور ﷺ کو پسند تھیں اور حضور ﷺ اس کی واپسی پر شہر کی چیزیں مثلاً کپڑا وغیرہ عنایت فرمایا کرتے تھے اور حضور ﷺ اس کو دوست رکھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ ''زاہر'' سے ہمارا دوستانہ ہے۔ ہم اس کے شہری دوست ہیں۔ ایک روز حضور ﷺ بازار تشریف لے گئے تو زاہر کو وہاں میں نے کھڑا دیکھا۔ حضور ﷺ نے اس کی پشت سے اپنا دست مبارک اس کی آنکھوں پر رکھ کر اسے اپنی جانب کھینچا اور لپٹا لیا اور اپنا سینہ مبارک اس کی پشت سے ملا دیا۔ وہ حضور ﷺ کو نہیں دیکھ سکا تھا کہنے لگا یہ کون ہے؟ اور جب پہچان لیا کہ حضور ﷺ ہیں تو اس نے اپنی پشت کو حضور کے سینۂ مبارک سے اور ملا دیا اور نہیں چاہا کہ وہ جدا ہو۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: کہ کوئی ہے جو اس غلام کو خریدے۔ زاہر نے کہا یا رسول اللہ آپ نے مجھے کھوٹا اور کم قیمت مال تصور کر لیا ہے۔ فرمایا: تم خدا کے نزدیک تو کھوٹے نہیں ہو اور نہ کم قیمت بلکہ گراں بہا ہو۔

آپ کی تواضع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کھانے میں کبھی عیب نہ بتاتے تھے۔ اگر چاہا تو کھا لیا ورنہ چھوڑ دیا اور یہ کبھی نہیں فرمایا کہ یہ کھانا برا ہے ترش ہے نمک زیادہ یا کم ہے شوربا گاڑھا یا پتلا ہے۔

فائدہ: اس جگہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے میں عیب نکالنا غلطی اور خلاف اتباع سنت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر طعام میں بتانے کی رو سے برائی بتائیں اور کہیں کہ برا پکا ہے اور مال ضائع کر دیا ہے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں بھی پکانے والی کی دل شکنی ہے اگر ایسا نہ کریں تو بہتر ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کے تواضع اور حسن خلق میں سے یہ بھی ہے کہ عام طور پر لوگوں کی زبانوں پر دنیا کی اہانت اور اس کی تحقیر و مذمت جاری ہے مگر حضورِ اکرم ﷺ فرماتے تھے کہ دنیا کو برا نہ کہو اسے گالی نہ دو کیونکہ دنیا اچھی سواری ہے جو مومن کو شر سے خیر و نجات کی طرف لے جاتی ہے۔

فائدہ: اسی طرح حضور ﷺ نے زمانہ (دہر) کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاَنَا الدَّهْرُ ''یعنی زمانہ کو برا نہ کہو کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں''۔

حضورِ اکرم ﷺ دربان نہ رکھتے تھے جس طرح بادشاہوں اور دنیاداروں کے ہوتے ہیں۔ ہاں! حضورِ اکرم ﷺ کے حضور میں حاضری اجازت پر موقوف تھی۔ تاکہ کوئی خلوت میں اہل وعیال میں نہ داخل ہو جائے اور آپ کی مشغولیت میں دخل انداز نہ ہو۔

حضور ﷺ کی تواضع میں سے یہ بھی تھا کہ آپ نے فرمایا: لَاتُفَضِّلُوْنِیْ عَلٰی یُوْنُسَ بْنِ مَتّٰی وَلَا تُخَیِّرُوْنِیْ عَلٰی مُوْسٰی مجھے یونس علیہ السلام ابن متی پر فضیلت نہ دو اور موسیٰ علیہ السلام پر مجھے فوقیت نہ دو (علیہم السلام) اسی کے مثل اور بھی روایتیں ہیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ انا سیّد ولد آدم (میں اولادِ آدم کا سردار ہوں) یا اس کی مانند دیگر ارشادات تو یہ بیان واقع اور تحدیث نعمت وغیرہ کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے حکم فرماں برداری میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس قسم کی حدیثیں اس کے ثابت ہونے سے پہلے کی ہیں۔ جب کہ آپ کا تمام انبیاء ومرسلین پر افضل ہونا ثابت ہوا اور اس بارے میں وحی نازل ہوئی۔ اس مبحث کی تحقیق انشاء اللہ اس کے محل میں آئے گی۔

ابتداء بالسلام: آپ کی تواضع میں یہ بھی ہے کہ جو بھی آپ کے پاس آتا آپ سلام کرنے میں سبقت فرماتے تھے اور آنے والے کو سلام کا جواب بھی دیتے تھے۔ اس جگہ حضورِ انور ﷺ کے قبرِ انور کی زیارت کرنے والوں کے لیے یہ بشارت ہے کہ جب آپ اپنی ظاہری حیات میں اس خوبی کے ساتھ متصف رہے تو اب بھی ہر زیارت کرنے والا آپ کے سلام سے مشرف ہوتا ہوگا۔ چنانچہ بعض مقربین بارگاہ عالی ایسے ہوئے ہیں جو بطریق کرامت اپنے کانوں سے حضور ﷺ کا سلام سننے سے مشرف ہوئے ہیں۔ بلاشبہ حضور ﷺ امت کے لیے اس دنیاوی حیات میں بھی رحمت ہیں اور بعد از وفات بھی رحمت۔

جود وسخاوت

جود وسخا لغت میں ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔ قاموس میں ہے جودٗ سخا ہے اور سخاٗ جود ہے۔ صراح میں جود وسخا کے معنی جوانمردی کے بیان ہوئے ہیں۔ منقول ہے کہ سخاوت صفت عزیزیہ یعنی بالطبع خوبی ہے۔ اور اس کا مقابل شح یعنی بخل ہے اور یہ طبعی لوازم میں سے ہے کیونکہ یہ شح یعنی بخل آدمی کا ذاتی اور خلقی ہے اور سخی کا اطلاق ذات باری تعالیٰ پر جائز نہیں کیونکہ وہاں غریزہ یعنی طبع ونفس نہیں ہے۔ جود کا مقابل بخل ہے اور بخل بطریق عادت اکتساب کے ذریعہ راہ پاتا ہے۔ لہٰذا ہر سخی جواد ہے اور ہر جواد سخی نہیں اور جواد کی حقیقت یہ ہے کہ بے غرض اور بدلہ طلبی کے بغیر داد و دہش ہو اور یہ صفت حق سبحانہ وتعالیٰ کی ہے کیونکہ حق تبارک وتعالیٰ بغیر کسی غرض اور بدل کے تمام ظاہری وباطنی نعمتیں اور حسی وعقلی کمالات مخلوق کو مرحمت فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کے بعد تمام جوادوں کے جواد اجود الاجودین اس کے رسول ﷺ ہیں اور آپ کے بعد امت کے علماء کرام ہیں کہ علم دین کو پھیلاتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

اَللّٰهُ اَجْوَدُ جُوْدًا ثُمَّ اَنَا اَجْوَدُ بَنِیْ اٰدَمَ وَاَجْوَدُهُمْ اللہ سب سے بڑا جواد ہے پھر میں بنی آدم میں سب سے بڑا جواد ہوں

مِنْ بَعْدِیْ رَجُلٌ عَلَّمَ عِلْمًا وَنَشَرَہٗ اِلٰی آخِرِا الحدیث اور میرے بعد بنی آدم میں وہ مرد جو علم کو سکھائے اور اسے پھیلائے......

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے تحت کرم اور سماحت کو زیادہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جود و کرم، سخاوت اور سماحت ان سب کے معانی قریب قریب ہیں مگر علماء فرق کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک ایسی چیز جو قدر و منزلت والی ہو اگر یہ خوش دلی کے ساتھ خرچ کی جائے تو یہ کرم ہے اسی کا نام ''حریت'' بھی رکھا ہے جس کے معنی مرد آزاد کے ہیں اور یہ ''نذالت'' کی ضد ہے۔ صراح میں نذالت کے معنی فرومایہ ہونا یعنی کمینہ پن ہے۔ نذل اور نذیل اسی سے ماخوذ ہیں اور قاموس میں ہے کہ اَلنَّذْلُ وَالنَّذِیْلُ الْخَسِیْسُ مِنَ النَّاسِ الْمُحْتَقِرُ فِیْ جَمِیْعِ اَحْوَالِہٖ یعنی نذل اور نذیل وہ ہے جو لوگوں میں خسیس اور اپنے تمام احوال میں ذلیل و کمینہ ہے اور کہا کہ ''سماحت'' وہ خوبی ہے جو کسی ایسی چیز کو جو اپنے زیادہ مستحق ہونے کے باوجود خوش دلی سے دوسرے کو دلوا دے۔ اس کی ضد ''شکاس'' ہے جس کے معنی سخت عادت کے ہیں جیسے کہا جاتا ہے رَجُلٌ شَکُسٌ یہ مرد سخت طبیعت کا ہے وَقَوْمٌ شُکُسٌ فلاں قوم سخت عادت کی ہے۔

منقول ہے کہ سخاوت نام ہے بآسانی خرچ کرنے اور جو چیز اچھی نہ ہو اس کے حاصل کرنے سے پرہیز کرنے کا اور یہی جود کے معنی ہیں۔ اس کی ضد ''التقتیر'' ہے جس کے معنی خرچ میں تنگی کرنے کے ہیں۔ صراح میں ہے کہ ''التقتیر'' عیال پر خرچ کی تنگی کو کہتے ہیں۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کے تمام ایسے اخلاق و صفات جن سے سب واقف ہوتے تھے اس میں کسی کے ساتھ ہمسری و برابری نہیں کی جاتی تھی۔ انتہی

بخاری و مسلم میں سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین، بہادر اور اجود تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی ذات، اشرف نفوس اور آپ کا مزاج سب سے زیادہ معتدل المزاج تھا اور جو ان خوبیوں سے متصف ہو اس کا فعل احسن افعال، اس کی صورت املح اسکال اور اس کا خلق احسن اخلاق ہوگا اور حضورِ اکرم ﷺ جملہ جسمانی و روحانی کمالات کے جامع اور خوبصورتی و خوب سیرتی پر حاوی تھے اور سب سے زیادہ کریم سب سے بڑھ کر سخی اور سب سے بڑھ کر جود والے تھے۔ ﷺ

اور احادیث صحیحہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کبھی کوئی ایسا سوال نہ کیا گیا اور نہ کوئی چیز ایسی مانگی گئی جس کے جواب میں حضور ﷺ نے لا یعنی ''نہیں'' فرمائی ہو۔ ہر شخص آپ سے جو کچھ مانگتا قبول کرتے اور مرحمت فرماتے۔ فرزدق شاعر نے آپ کی نعت میں کہا کہ

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَہُّدِہٖ لَوْلَا التَّشَہُّدُ کَانَتْ لَاؤُہٗ نَعَم

آپ نے بجز اپنی تشہد میں پڑھنے کے ''لا'' کبھی نہیں فرمایا۔ اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کی ''لا'' نعم ہوتی۔

اس بیت کا فارسی ترجمہ کسی شاعر نے کیا ہے افسوس کہ اس نے اپنے کسی ظالم کی تعریف میں کہا ہے جو اس تعریف کا مستحق نہ تھا۔ اللہ اسے معاف کرے وہ یہ ہے کہ

نرفت لا بزبان مبارکش ہرگز مگر باشھدان لاالہ الا اللہ

یعنی اس کی زبان مبارک پر کبھی ''لا'' نہیں مگر اشھدان لاالہ الااللہ میں

اگر حضور ﷺ کے پاس سائل کے سوال کے موقع پر بفرض کوئی چیز نہ ہوتی تو توقف فرماتے اور اچھی باتوں کے ساتھ سائل کی دلجوئی فرماتے اور معذرت چاہتے لیکن صراحت کے ساتھ یہ نہ فرماتے کہ میں نہیں دے سکتا۔

علماء فرماتے ہیں کہ ''لا'' کے ساتھ کلام فرمانا حضورِ اکرم ﷺ سے عطا سے منع کرنے کی ہی غرض سے نہ ہوتا تھا اور یہ بھی لازم نہیں آتا کہ معذرت خواہی کے طور پر لانہیں فرماتے تھے۔ لہٰذا ایک جماعت سے معذرت کے طور پر حضور سے ''لا'' منقول ہے۔ اس جماعت نے آپ سے غزوہ جانے کے لیے سواری مانگی تھی آپ نے فرمایا:

لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ   کوئی سواری ایسی نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں۔

باوجود اس کے علماء بیان کرتے ہیں کہ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ کوئی سواری ایسی نہیں پاتا جس پر تمہیں سوار کروں اور لَا اَحْمِلُكُمْ (میں تمہیں سوار نہیں کرتا) کے درمیان فرق ظاہر ہے۔ اگرچہ اشعریوں کے باب میں ان کے سواری کے سوال پر لَا اَحْمِلُكُمْ بھی فرمایا ہے بلکہ بعض روایتوں میں قسم بھی یاد فرمائی ہے۔ فرمایا: وَاللّٰهِ لَا اَحْمِلُكُمْ (خدا کی قسم میں سوار نہیں کروں گا) اس مقام کی خصوصیت اس کا اقتضا کرتی ہے کہ کوئی سواری موجود نہ ہوگی اور سائلوں کو بھی معلوم ہوگا کہ کوئی سواری نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی دکھاتے اور گستاخی کرتے تو ان کی طمع کو قطع کرنے کے لیے تاکید فرمائی تو یہ صورت عموم کے مقابلہ میں مستثنٰی اور مخصوص ہوگی جیسا کہ مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے۔

بندۂ مسکین یعنی حضرت شیخ محقق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین فرماتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی زبان مبارک پر کلمۂ ''لا'' جاری نہ ہونے سے مراد بخل و خست کی نفی ہے جو کہ آپ کی وسعت قلبی اور فراغ دستی سے تعلق رکھتی ہے اور جس طرح بخیل و کمزور لوگ کرتے ہیں۔ ویسے آپ نہ کرتے تھے۔ یہ عبارت یعنی عدم استعمال لفظ لاء کنایہ و اشارہ ہے اسی مفہوم کی طرف نہ یہ کہ یہ کلمہ آپ کی زبان پر کسی اور غرض کے لیے بھی نہ آیا۔

نیز یہ جو آیا ہے کہ ''ہر کوئی جو مانگتا اسے مل جاتا'' تو اس سے جود و سخا کا اثبات ہے اور اس کا یہ مطلب ہے کہ سائل کے لائق جو چیز ہوتی اس کی لیاقت کے مطابق عطا فرماتے تھے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حضور ﷺ سائل کی مصلحت کی خاطر نہ دینے میں مصلحت وقت ملاحظہ فرماتے۔ مثلاً عمل اور حکومت وغیرہ کے مانگنے کے باوجود نہ عطا فرمائی تاکہ مسلمانوں کے معاملات کے انتظام اور اس شخص کے حال کی درستگی میں کوئی خلل واقع نہ ہو جائے اور کبھی مخالفت اس غرض سے ہوتی کہ وہ شخص طمع سوال اور حرص کی ذلیل عادتوں میں مبتلا نہ ہو جائے جس طرح کہ حکیم بن حزام ؓ کا معاملہ ہے باوجودیکہ وہ مقبول بارگاہ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ ؓ کی بہن کے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے کوئی چیز مانگی حضور ﷺ نے عطا نہ فرمائی اور فرمایا: میں خود بھی دے سکتا ہوں لیکن ایک قسم کی کدورت اور کراہیت اس کے ہمراہ ہوگی اور انہیں نصیحت فرمائی کہ جہاں تک ہو سکے کسی شخص سے سوال نہ کرنا بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد حکیم بن حزام ؓ کا یہ حال ہو گیا کہ اگر کوڑا زمین پر گر جاتا تو کسی سے نہ کہتے کہ اسے اٹھا کر دے دو۔

اسی طرح حضرت ابوذر غفاری ؓ نے کسی عمل کی خواہش کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر ؓ تم ضعیف و ناتواں ہو۔ عمل کی خواہش نہ کرو اور کسی چیز کا سوال نہ کرو۔ یہاں تک کہ اگر تمہارا کوڑا زمین پر گر جائے تو اسے بھی کسی سے نہ اٹھواؤ۔ حضرت ابوذر ؓ اکابر صحابہ اور ان میں بہت بڑے زاہد تھے اور ان کا مذہب یہ تھا کہ مال جمع کرنا اور ذخیرہ اندوزی کرنا حرام ہے۔ اگرچہ ادائے زکوٰۃ کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے کوئی چیز کسی جماعت کو دینے کے لیے عطا فرمائی۔ حضرت عمر بن خطاب ؓ نے ایک ایسے شخص کے بارے میں سفارش کی جس کے حال اور اس کے مستحق ہونے کو جانتے تھے کہا کہ هُوَ مُؤْمِنٌ فِيمَا اَعْلَمُ يَا

رَسُوْلَ اللّٰہِ اے اللہ کے رسول! اس کو اپنے علم کے مطابق مومن جانتا ہوں۔ ایسا تین مرتبہ عرض کیا۔ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہت سے ایسے ہیں جن کے بارے میں پسند کرتا ہوں کہ ان کے حال کی درستگی کی خاطر جسے میں دیکھ رہا ہوں انہیں نہ دیا جائے اور دو مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے برابر وہ مومن ہے یا مسلم ہے فرمایا: تیسری مرتبہ جب اصرار حد سے گزر گیا تو وہ فرمایا جو اوپر گزرا۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ اپنا اخلاق بنانا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو جب دوست رکھتا ہے تو اسے دنیاوی آسائش سے محروم رکھتا ہے اور جس کو خدا دوست نہیں رکھتا اسے خوب دیتا ہے۔ ہاں اس کا احتمال ہے کہ ان لفظوں میں لفظ ''لا'' آپ کی زبان مبارک پر نہ آیا ہو اور کسی اور طریقے سے مدعا بیان فرما دیا ہو لیکن مفہوم و معنی پر نظر رکھنی چاہیے۔ لفظوں کا ہیر پھیر تو آسان ہے۔ واللہ اعلم

خلاصۂ کلام یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ سائل کو رد نہ فرماتے۔ اگر کوئی چیز نہ ہوتی تو فرماتے ہمارے نام پر قرض لے لو جب ہمارے پاس کچھ آ جائے گا تو ادا کر دیں گے۔ ایک مرتبہ ایک سائل آیا فرمایا میرے پاس تو کچھ نہیں ہے تم جاؤ قرض لے لو۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس چیز کا مکلّف نہیں بنایا جو آپ کی مقدرت میں نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات حضور ﷺ کو ناگوار معلوم ہوئی پھر ایک انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ خوب داد و دہش فرمایئے اور مالک عرش سے (کمی) کا خوف نہ کھایئے۔ تو حضور ﷺ نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرۂ انور پر بشاشت تازگی اور خوشحالی نمودار ہوگئی اور فرمایا: مجھے یہی حکم دیا گیا ہے۔

ترمذی روایت کرتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں نوے ہزار درہم لائے گئے آپ نے انہیں چٹائی پر رکھ کر تقسیم کرنا شروع کر دیا اور کسی سائل کو محروم نہ رکھا۔ یہاں تک کہ سب تقسیم فرما دیئے۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ''بحرین'' سے کچھ مال لایا گیا آپ نے فرمایا: اسے مسجد میں پھیلا دو' پھر آپ مسجد سے باہر تشریف لے آئے اور اس مال کی طرف نظر تک نہ ڈالی اور جب واپس تشریف لائے تو نماز سے فارغ ہو کر مال کے نزدیک تشریف فرما ہوئے اور ہر کسی کو وہ مال عطا ہوا۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے کہا یا رسول اللہ مجھے بھی اس مال میں سے عنایت فرمایئے۔ کیونکہ میں نے اپنا اور عقیل رضی اللہ عنہ کا فدیہ دیا ہے۔ حضور ﷺ نے ان کی چادر میں اتنا بھر دیا کہ وہ اٹھا نہ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ کسی کو فرمایئے کہ اسے میرے لیے اٹھا کر لے چلے فرمایا: نہیں اے چچا! جتنا تم اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے طمع کے مادہ کو فنا کرنے اور ان کی تہذیب و تادیب کے لیے تھا۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے کندھے پر اٹھا کر چل دیئے اور حضورِ اکرم ﷺ ان کی طرف دیکھتے رہے اور ان کے حرص پر تعجب فرماتے رہے۔ پھر جب حضور ﷺ اٹھے تو ایک درہم بھی باقی نہ رہا تھا۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ یہ ایک لاکھ درہم تھے جسے علاء بن حضری رضی اللہ عنہ نے بحرین کے خراج سے بھیجا تھا اور یہ پہلا مال تھا جو حضور ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تھا۔ ﷺ

حضور ﷺ کی جود و سخا کے اثر کا ظہور اور ابواب کرم و بخشش کا فتح حنین کے دن' حد و شمار اور حصر و قیاس سے زیادہ تھا کیونکہ اس دن ہر عربی کو سو سو اونٹ اور ہزار ہزار بکریاں ملی تھیں۔ اس دن کی بیشتر عطا تالیف قلب کے لیے تھی تا کہ ضعیف الایمان اشخاص دنیاوی امداد کے ذریعہ دین میں ثابت قدم ہو جائیں۔ صوان رضی اللہ عنہ بن امیہ بھی اسی زمرہ کا ایک فرد تھا۔ اسے پہلے سو بکریاں' دوبارہ سو بکریاں پھر سہ بارہ سو بکریاں دی گئیں۔ واقدی کی کتاب المغازی میں منقول ہے کہ اس دن صفوان رضی اللہ عنہ کے اونٹ بکریوں سے اس کی وادی بھر گئی تھی۔ اس پر صفوان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کے سوا بخشش و عطا میں کوئی اتنی جوانمردی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس عطا کے ساتھ حضور ﷺ نے اس کے اس کفر کا علاج فرمایا جو اس میں تھا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حرب اور اس کے بیٹے بھی انہیں مؤلفۃ القلوب میں

سے تھے۔ چنانچہ ابوسفیان ؓ آئے اور کہا یارسول اللہ! آج قریش میں سب سے زیادہ مالدار آپ ہی ہیں۔ اس مال میں سے کچھ ہمیں بھی عطا فرمائیے۔ حضور ﷺ نے تبسم فرمایا اور بلال ؓ کو حکم فرمایا کہ چالیس دقیہ چاندی اور سو اونٹ انہیں دے دو۔ ابوسفیان ؓ نے کہا میرے بیٹے یزید ؓ کا بھی حصہ عنایت فرمائیے۔ ابوسفیان ؓ کے ایک بیٹے کا نام یزید ؓ تھا اور یہ حضرت معاویہ ؓ کے بھائی تھے۔ حضرت معاویہ ؓ نے اپنے بیٹے کا نام اسی نام پر یزید ؓ رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے چالیس دقیہ چاندی اور سو اونٹ دوبارہ اسے کے حصے میں عنایت فرمائے۔ پھر ابوسفیان ؓ نے کہا کہ میرے دوسرے بیٹے معاویہ کا بھی حصہ عنایت ہو تو حضور ﷺ نے مزید اتنا ہی مال اور مرحمت فرمایا۔ حضرت ابوسفیان ؓ عرض کرنے لگے یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ خدا کی قسم جنگ کے زمانہ میں بھی آپ کریم تھے اور امن کے زمانے میں بھی آپ کریم ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جائے خیر دے۔ یہ واقعات ہوازن وحنین کے فتح کے زمانے میں بھی بیان ہوں گے جو مکہ مکرمہ کی فتح کے بعد پیش آئے اگرچہ یہ مکرر ہوں گے مگر یہ مکرر نہیں هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهُ يَتَضَوَّعُ یہ مشک نافہ ہے جتنی بار کھولا جائے خوشبو کی مہک زیادہ ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے ہوازن پر ان کی چھ ہزار باندیاں واپس کر دیں۔ اس غزوہ میں غنیمتوں کا مجموعہ یہ ہے چھ ہزار آدمی تقریباً چوبیس ہزار اونٹ تقریباً چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار دقیہ چاندی ایک دقیہ کا وزن چالیس درہم ہے۔ (اور ایک درہم کا وزن ساڑھے تین ماشہ یا سوا چار ماشے کا ہوتا ہے) صاحب مواہب لدنیہ نے حساب لگایا ہے کہ حنین کے دنوں میں حضور ﷺ نے جن لوگوں کو مال عطا فرمایا ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔

بندۂ مسکین یعنی شیخ محقق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کا جود وسخا حد وشمار اور اندازہ وقیاس سے باہر تھا اور جو کچھ موجود تھا اسی پر آپ کی جود وسخا منحصر نہ تھی لاکھ در لاکھ گنا بھی ہوتا تو بھی ان کا یہی حال ہوتا۔

حقیقت جود وسخا اور کرم وعطا کے متحقق ہونے کے لیے بالفعل صفت کا ہونا شرط نہیں ہے۔ یہ صفت ذاتی، طبعی اور پیدائشی ہے اور اس کے اثر کا ظہور اور ہے جو کچھ ہاتھ میں آتا عطا فرما دیتے اور اس شان سے عطا کرتے کہ فقر اور مال نہ رہنے کا خوف کرتے اور نہ اندیشہ رکھتے۔

جب حضور ﷺ کسی ضرورت مند محتاج کو ملاحظہ فرماتے تو اپنا کھانا پینا تک اٹھا کر عنایت فرما دیتے۔ حالانکہ اس کی آپ کو بھی ضرورت ہوتی (ﷺ) آپ عطا وتصدق میں تنوع فرمایا کرتے۔ کسی کو ہبہ فرماتے کسی کو حق دیتے، کسی کو بار قرض سے چھڑاتے، کسی کو صدقہ دیتے، کسی کو ہدیہ فرماتے اور کبھی کپڑا خریدتے اور اس کی قیمت ادا کر کے اس کپڑے والے کو وہی کپڑا بخش دیتے اور کبھی قرض لیتے اور مبلغ سے زیادہ عطا فرما دیتے اور کبھی کپڑا خرید کر اس کی قیمت سے زیادہ رقم عنایت فرما دیتے اور کبھی ہدیہ قبول فرماتے اور اس سے کئی گنا انعام عطا فرما دیتے۔

ایک عورت طباق میں ایسی کھجوریں جس پر دھاریاں اور نرم روئیں تھے لے کر آئی ایسی کھجوروں کو حضور ﷺ بہت پسند فرمایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے بحرین سے آئے ہوئے سونے کے زیورات سے اس کے دونوں ہاتھ بھر دیئے۔

بہرنوع جس طرح بھی ممکن ہے آپ طرح طرح کی صورتوں میں خیرات وعطیات تقسیم فرمایا کرتے باوجود اس کے حضور ﷺ کی اپنی زندگانی فقیرانہ طور پر بسر ہوتی، ایک ایک، دو دو مہینے گزر جاتے حضور ﷺ کے کاشانۂ اقدس میں آگ تک نہ جلتی اور بسا اوقات شدت بھوک سے اپنے شکم اطہر پر پتھر باندھ لیا کرتے۔ حضورِ اکرم ﷺ کا یہ فقر، تنگی ومجبوری اور نہ ہونے کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کا سبب زہد

اور جود وسخا تھا اور کبھی اپنی ازواج کے لیے ایک سال کا گزارہ مہیا فرما دیتے لیکن اپنے لیے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے۔

نبی کریم ﷺ بنی آدم میں علی الاطلاق سب سے زیادہ صاحب جود وسخا تھے۔ آپ کی جود وسخا کی مختلف قسمیں تھیں۔ یہ خواہ علم ومال کی عطا میں ہو یا بندوں کی ہدایت کے لیے دین حق کے اظہار میں ذاتی جہد وکوشش میں ہو۔ (وجزاہ عنا افضل ماجزی نبیا عن امتہ)

شجاعت اور بازوؤں کی قوت وطاقت: **وصل:** حضورِ اکرم ﷺ کی شجاعت اور آپ کے بازوؤں کی قوت وطاقت کا بیان صراح میں ہے کہ شجاعت' دلاوری اور خوف کی جگہ دلیری دکھانے کو کہتے ہیں۔ کتاب الشفاء میں ہے کہ شجاعت' قوت غضب کی فراوانی اور عقل کو اس کے تابع بنانے کا نام ہے۔ قاموس میں ہے کہ شجاعت' خوف کے وقت دل کو مضبوط رکھنے کا نام ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ میں یہ صفت' صفت سخاوت کے کمال کی مانند تھی۔ بسا اوقات ایسے سختی اور شدت کے موقعوں میں جہاں دلاوروں اور دلیروں کے قدم اکھڑ گئے تھے اور وہاں حضور اکرم ﷺ ثابت وقائم رہے تھے اور اپنی جگہ سے جنبش تک نہ فرمائی تھی بلکہ بڑھ بڑھ کر آگے آتے تھے اور پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ حنین کے موقع پر کفار کی تیروں کی بوچھاڑ سے صحابۂ کرام میں ایک قسم کا ہیجان' پریشانی' تزلزل اور ڈگمگاہٹ پیدا ہوگئی تھی مگر حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ فرمائی حالانکہ گھوڑے پر سوار تھے اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ بن حارث بن عبدالمطلب آپ کے گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑے تھے اور حضور ﷺ چاہتے تھے کہ حملہ کریں۔ چنانچہ آپ گھوڑے سے اترے اور خدا سے مدد مانگی اور زمین سے ایک مشت خاک لے کر دشمنوں کی طرف پھینکی تو کوئی کافر ایسا نہ تھا جس کی آنکھ اس خاک سے بھر نہ گئی ہو۔ حضور ﷺ نے اس وقت یہ رجز پڑھا:

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ
میں نبی ہوں اس میں کذب نہیں   میں عبدالمطب کی اولاد سے ہوں

اس روز آپ سے زیادہ بہادر' شجاع اور دلیر کوئی نہ دیکھا گیا۔ منقول ہے کہ جب مسلمان اور کافر باہم گتھم گتھا ہوئے اور مسلمانوں نے ہزیمت کھائی تو حضورِ اکرم ﷺ نے اس وقت حملہ کیا۔ اسی وقت انصار کو ندا دی گئی اور مسلمان واپس ہو کر حضور ﷺ کے گرد جمع ہونے لگے بالآخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ پورا واقعہ اس کے اپنے مقام پر انشاء اللہ آئے گا۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے بڑھ کر میں نے کسی کو بہادر' دلیر' سخی اور خدا سے زیادہ راضی نہ دیکھا۔ حضرت امیر المومنین سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب گرم ہوگئی جنگ کی آگ اور سرخ ہوگئیں اس کی آنکھیں (یہ کنایہ جنگ کی سختی وشدت کی طرف ہے) تو ہم رسول اللہ ﷺ کی پناہ کو ڈھونڈتے تھے۔ یعنی حضور ﷺ کی پناہ میں آجاتے تھے۔ دشمنوں کے قریب حضور ﷺ سے زیادہ کوئی نہ تھا اور جنگ میں آپ سخت ترین شخص ہوتے تھے۔

ارباب سیر فرماتے ہیں کہ لوگ اسے شجاع وبہادر شمار کرتے تھے جو دشمنوں سے نزدیکی کے اعتبار سے حضورِ اکرم ﷺ کے زیادہ قریب ہوتا تھا۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا لشکر ایسا نہ آیا مگر یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ نے سب سے پہلے اس لشکر پر حملہ نہ کیا ہو۔

حکایت: ایک رات مدینہ طیبہ میں شور وفغاں ہوا اور خوف وہراس پھیل گیا شاید کوئی چور یا دشمن گھس آیا تھا۔ آپ جلدی سے سب سے پیشتر اٹھے۔ شمشیر حمائل فرمائی اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے پر سوار ہوگئے۔ کیونکہ ان کا گھوڑا تیز رو اور سبک رفتار تھا۔ پھر جدھر سے آواز آئی تھی اس جانب تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کو واپسی میں وہ لوگ ملے جو آپ کے بعد نکل کر اس طرف جا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: لوٹ چلو کوئی بات نہیں ہے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ گھوڑا پہلے بہت سست رفتار تھا مگر حضور ﷺ کی سواری میں آنے کے

بعد اتنا تیز رفتار ہوا کہ کسی کا گھوڑا اس کے ساتھ نہ چل سکتا تھا۔ یہ حضور ﷺ کے معجزات میں سے ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ قوت، زورِ بازو اور مضبوطی میں ایسے تھے کہ جہان بھر کے کشتی گیر (پہلوان) آپ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ محمد بن اسحاق اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں مکہ مکرمہ میں ''رکانہ'' نامی ایک پہلوان تھا جو شدید القوت اور فن پہلوانی میں بے مثل ومنفرد تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے مقابلے کے لیے آتے تھے۔ وہ سب کو پچھاڑ دیتا تھا۔ اچانک مکہ کی کسی گھاٹی سے وہ حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے آ گیا۔ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا: اے رکانہ! خدا سے کیوں نہیں ڈرتا اور میری دعوت کو کیوں قبول نہیں کرتا۔ رکانہ ؓ نے کہا اے محمد! (ﷺ) اپنی صداقت پر کوئی شہادت لاؤ؟ آپ نے فرمایا: اگر میں کشتی میں تجھے پچھاڑ دوں تو کیا تو ایمان لے آئے گا؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا: پھر کشتی کے لیے تیار ہو جا۔ چنانچہ رکانہ ؓ کشتی کے لیے تیار ہو گیا۔ حضورِ اکرم ﷺ اپنے عام لباس چادر وتہہ بند ہی میں رہے۔ حضور ﷺ اس کے قریب آئے اور اسے پکڑ کر زمین پر گرا دیا۔ رکانہ ؓ حیران ومتعجب ہو کر درخواست کرنے لگا کہ چھوڑ دیا جائے۔ اس نے پھر دوبارہ اور سہ بارہ کشتی کی آپ نے اسے ہر بار گرا دیا۔ پھر تو رکانہ ؓ تعجب کے ساتھ کہنے لگا آپ کی شان عجیب ہے آپ اتنی قوت وطاقت کے حامل ہیں۔ حدیث میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ وہ ایمان لایا یا نہیں۔ (واللہ اعلم) حضورِ اکرم سے رکانہ ؓ کے علاوہ اور لوگوں نے بھی کشتی لڑی ہے اور آپ سب پر غالب رہے ہیں۔ چنانچہ ابوالاسد جمحی ایک شخص بڑا شہ زور تھا۔ وہ گائے کی کھال پر کھڑا ہو جاتا اور لوگ اس کے نیچے سے کھال کھینچنے کی پوری قوت صرف کرتے کھال پھٹ جاتی مگر اس کے نیچے سے نکال نہ سکتے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹتا تک نہ تھا۔ ایک روز اس نے حضور ﷺ کو پکارا کہ آپ اس کے ساتھ کشتی لڑیں۔ اس نے کہا کہ اگر آپ مجھے زمین پر گرا دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ تو حضور ﷺ نے اسے زمین پر چت کر دیا مگر وہ ایمان پھر بھی نہ لایا۔ یہ طویل قصہ ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔

حیائے مبارک: وصل: اس میں حضورِ اکرم ﷺ کی حیائے مبارک کا ذکر ہے۔ حیا کے معنی شرمیلا پن اور شرم رکھنے کے ہیں۔ اس کا مادہ حیات ہے۔ اسی لحاظ سے حیاء بمعنی بارش کے آتے ہیں کہ بارش حیات کا موجب وسبب ہے لیکن یہ متصور رہے اور شرم بھی دل کی زندگی اس کے اندازہ کے مطابق ہے جس میں جتنا زیادہ دل زندہ ہوگا اس میں حیا بھی اتنی ہی زیادہ قوی اور بیشتر ہوگی۔ لغت میں حیا کے معنی تغیر وانکساری کے ہیں۔ جو انسان کو خوف اور از قسم معیوب چیز سے عارض ہوتا ہے۔ شریعت میں حیا اس خوبی کا نام ہے جو برائی کے ارتکاب سے بچانے کا موجب اور حق دار کے حق میں کوتاہی سے محفوظ رکھنے کا باعث ہے۔ حیاء کو ایمان کا جز بھی کہا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے ''اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَانِ'' (حیا ایمان کا جزو ہے) اگرچہ یہ صفت غریزی یعنی طبعی وخلقی ہے لیکن اس کا استعمال بقصد علم واکتساب قانون شریعت پر لازمی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس حیا سے مراد اکتساب یعنی حاصل کرنے والی صفت ہے۔ شارع نے اسے ایمان کا حصہ بتایا ہے اور اس کے حصول پر مسلمان کو مکلف گردانا ہے۔ اگر یہ غریزی یعنی طبعی وخلقی ہوتی تو تکلیف اس میں جاری نہ ہوتی لیکن جس میں یہ خوبی غریزی اور طبعی ہے تو اسے اس کے حصول پر معاون بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ غریزی کے حکم میں لے جاتی ہے۔ واضح رہنا چاہیے کہ یہ بحث تمام صفات غریزیہ میں جاری ہوتی ہے مثلاً سخاوت اور شجاعت وغیرہ کیونکہ ان کے بجالانے کا حکم ہے اور اس کی ضد پر ممانعت واقع ہے اور ان صفتوں میں وعدہ وعید دونوں وارد ہیں اور سب ہی ایمان کی شاخیں ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ میں دونوں قسم کی حیاء بدرجہ کمال تھی۔ اس لیے کہ آپ کے قلب اطہر کی حیات اور اس کا مکروہات شرعیہ سے اجتناب سب سے زیادہ قوی، اتم، اکمل اور افضل تھا۔

صحیح بخاری میں بروایت ابوسعید خدری ؓ مروی ہے کہ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَشَدُّ حَیَاءً مِّنَ الْعَذْرَاءِ فِیْ خِدْرِھَا حضورِ اکرم ﷺ زن دوشیزہ اور اس کے حجاب سے سخت تر حیاء فرماتے تھے۔ صراح میں مخدرہ کے معنی پردہ نشین عورت کے ہیں۔ حدیث پاک میں ''خدرہا'' کا استعمال عرف و عادت کی بناء پر ہے۔ کیونکہ زن باکرہ پردہ نشین ہوتی ہے۔ بعض شراح کہتے ہیں کہ یہ قید اس بناء پر ہے کہ پردہ نشین حیاء میں بہت زیادہ ہوتی ہے یا یہ کہ باہر پھرنے والی عورت کے مقابلہ میں خلوت نشین عورت میں زیادہ شرم و حیا ہوتی ہے۔ اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ قید دیگر بھی حضور کی خوبی ہے۔ یعنی جب کوئی شخص آپ کے پاس آتا تو تشریف لے آتے ورنہ خلوت میں مقیم رہتے۔ کیونکہ خلوت میں موجب حیا نہیں ہے مگر ان تکلیفوں کا ذکر اس مقام رفیع میں بشاشت یعنی بے مزگی سے خالی نہیں ہے اور حضرت ابوسعید خدری ؓ سے اس تشبیہہ کا ذکر بھی ادب و تعظیم کے ذوق کے لحاظ سے بھلا نہیں معلوم ہوتا لیکن مقصود کے اظہار و بیان میں مبالغہ کے قصد و ارادہ سے واقع ہوا ہے۔

حیا کے بارے میں مشائخ کا مذہب: مشائخ طریقت قدس اللہ ارواحہم کے حیاء کی تشریح و تفسیر میں کچھ اقوال ہیں۔ چنانچہ حضرت ذوالنون مصری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ جو کچھ تم نے حق تعالیٰ کے حضور بھیجا ہے دل میں وحشت کے ساتھ ہیبت کے پائے جانے کا نام حیا ہے۔ فرمایا: اَلْحُبُّ یَنْطِقُ وَالْحَیَاءُ یَسْکُتُ وَالْخَوْفُ یَقْلَقُ مطلب یہ ہے کہ محبت' محبوب کی مدح و ثنا کے ساتھ محبوب کو قوت گویائی دیتی ہے اور حیاء محبوب کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کے مشاہدہ کی بنا پر ساکت بناتی ہے اور خوفزدہ اور بے آرام بناتی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی ؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص طاعت میں خدا سے شرم رکھتا ہے خدا معصیت میں اس سے شرم رکھتا ہے اور حیاء کبھی کرم اور خوف سے رونما ہوتی ہے۔ جیسے حضورِ اکرم ﷺ کا اس جماعت سے حیا فرمانا جو حضرت زینب ؓ کے ولیمہ میں حاضر ہوئی تھی۔ اور آپ کی مجلس میں وہ دیر تک ٹھہرے رہے تھے اور حضورِ اکرم ﷺ حیا فرماتے تھے کہ ان کو کیونکر اٹھائیں اس پر حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا جب تم کھانا کھا چکو تو چلے جایا کرو۔

اور فرمایا: اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیِ مِنْکُمْ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ بیشک تمہارا دیر تک بیٹھے رہنا نبی کریم کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ اور نبی تم سے حیاء فرماتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ بیان حق سے حیاء نہیں فرماتا۔''

اور کبھی حیا بندگی میں ہوتی ہے کہ معبود کی عظمت و کمال کے لائق وہ بندگی کو نہیں پاتا۔

حیا کی ایک قسم اپنی ذات کے لیے خود سے ہوتی ہے ایسی حیاء شریف و بزرگ شخصوں میں ہوتی ہے۔ جو نقص اور مرتبہ کی کمی سے راضی ہونے میں ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اپنے آپ کو حیادار بنائے یعنی وہ اپنی ذات سے شرم و حیا کرلے گویا کہ اس میں دو ذاتیں ہیں جو ایک ذات دوسری ذات سے حیا کرتی ہے۔ یہ حیا کی قسموں میں سب سے زیادہ کامل ہے اس لیے کہ آدمی جب اپنی ذات سے حیا کرتا ہے تو وہ دوسرے سے بطریق اولیٰ حیا کرے گا جیسا کہ مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اَلْحَیَاءُ لَایُعْطِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ. یعنی حیا نہیں دیتا مگر بھلائی'' ایک اور روایت میں ہے اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ۔ حیاء سراسر بھلائی ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی کو حیاء نہ کرنے کی نصیحت کرتا تھا۔ گویا کہ اس کا بھائی لوگوں سے شرم و حیا کی بنا پر اپنے حقوق نہیں مانگتا تھا۔ (اس بنا پر بھائی نصیحت کرتا تھا کہ اپنے حقوق مانگنے میں شرم و حیا نہ کرے۔) اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ حیا ایمان کا حصہ ہے۔

حیا کے آثار میں سے لوگوں کے عیبوں سے اور ان چیزوں سے جو انسان اپنے لیے ناپسند و مکروہ رکھتا ہے تغافل و چشم پوشی کرنا

ہے' اس معاملے میں حضورِ اکرم ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ شدید تھے۔

ایک روایت میں حضرت انس ؓ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ایک شخص آیا جس کے چہرے پر زرد رنگ مانند زعفران کے لگا ہوا تھا۔ جو کسی عورت سے لگا تھا۔ حضور ﷺ نے اسے کچھ نہ فرمایا (کہ وہ شرمندہ ہوگا کیونکہ حضورِ اکرم ﷺ کی عادت کریمہ تھی کہ کسی کے منہ پر ایسی بات نہ فرماتے تھے جو آپ کو ناگوار معلوم ہوتی ہو۔ اگر کسی کو کچھ کہنا ضروری ہو اور اس کہنے پر آپ مجبور ہوتے تو اشارہ کنایہ میں فرمایا کرتے) پھر جب وہ باہر گیا تو کسی سے فرمایا کہ اس سے کہو کہ چہرے کی زردی کو دھو ڈالے۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ کہہ دو اپنے جسم سے کپڑے اتار دے۔ مخفی نہ رہنا چاہیے کہ یہ ارشاد غیر واجب اور حرام میں ہوگا۔ ورنہ محض مخفی زردی کی اباحت میں روایتیں ہیں۔

منقول ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی حیاء کی یہ شان تھی کہ کسی چہرے پر بھرپور نظر نہ ڈالتے تھے۔ اگر کسی میں کوئی بات نظر آتی جو آپ کو ناپسند و مکروہ ہوتی تو آپ یہ نہ فرماتے کہ فلاں شخص ایسا کہتا ہے یا ایسا کرتا ہے بلکہ اس طرح فرماتے کہ اس قوم کی کیا حالت ہوگی جو ایسا کرتی ہے یا ایسا کہتی ہے اور اس کی مخالفت فرماتے۔ مگر کسی کرنے والے یا کہنے والے کا خاص طور پر نام نہ لیتے۔ آپ کی عادت کریمہ میں یہ عبارت قاعدہ کلیہ کا حکم بتاتی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضورِ اکرم ﷺ نہ فحش گو تھے اور نہ کسی کو برا کہتے تھے۔ اور نہ اونچی آواز سے بولتے اور نہ بازاروں میں شور و غوغا کرتے تھے۔ اور نہ بدی کا بدلہ بدی سے دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے تھے اور اسی کلام کے مطابق توریت سے حضرت عبداللہ بن سلام' اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ نقل فرماتے ہیں۔

شفقت' رافت اور رحمت: وصل: حضورِ اکرم ﷺ کی شفقت' رافت اور رحمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○	نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت۔
اور ارشاد فرمایا: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○	بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے مسلمانوں پر کمال مہربان رحمت فرمانے والے۔

شفقت مہربانی کو کہتے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ شفیق یعنی مہربانی فرمانے والے ہیں۔ اشفاق کے لغوی معنی ڈرانے کے ہیں۔ اور شفقت میں بھی یہی معنی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ مشفق اس بات سے ڈرتا ہے کہ اسے کوئی گزند یا ضرر نہ پہنچے۔ لہٰذا حضور ﷺ کی تعریف حرص سے فرمائی گئی۔ کہ آپ صلاح و درستگی کی نصیحت فرمانے والے ہیں۔ نصوح درافت اشد رحمت ہے۔ صراح میں ہے رحمت کے معنی بخشش کرنا اور مہربانی کرنا ہے اور رافت کے معنی بہت زیادہ بخشنا۔ اور مہربان ہونا ہے۔

حضورِ انور ﷺ امت پر شریعت و احکام اور اس کے ترک میں آسانی و تخفیف کا لحاظ فرماتے اور بعض افعال اس خوف سے کہ امت پر فرض نہ قرار دے دیئے جائیں ترک فرما دیتے۔ جیسے ہر نماز کے لیے مسواک کا ترک فرمانا یا عشا میں تاخیر کو ترک فرمانا یا صوم وصال (پے در پے روزے رکھنے) کو ترک فرمانا' اسی قسم کے اور احکام ہیں۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرتے کہ سب و لعن کو رحمت و قربت اور موجب طہارت بنا دے۔ جب کبھی آپ نماز باجماعت میں بچے کے رونے کی آواز سنتے اور اس کی ماں نماز میں ہوتی تو آپ نماز کو ہلکا فرما دیتے۔ تاکہ اس کی ماں فتنہ میں مبتلا نہ ہو۔ اور آپ فرمایا کرتے کہ تم میں سے کوئی شخص میرے پاس کوئی ایسی بات نہ پہنچائے جو مکروہ اور ناپسندیدہ ہو۔ اس لیے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ جب میں تمہارے پاس آؤں تو میرا سینہ پاک و صاف ہو جب قریش

نے آپ کو جھٹلایا اور حد سے زیادہ آپ کو ایذائیں پہنچائیں تو حضرت جبرائیل نے حاضر ہو کر کہا اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو حکم فرمایا ہے جو پہاڑوں پر مقرر ہے۔ اور تمام پہاڑ اس کے قبضہ وتصرف میں ہیں کہ جو کچھ محمد (ﷺ) فرمائیں ان کا حکم بجالاؤ۔ چنانچہ پہاڑوں کے فرشتے نے عرض کیا کہ اے محمد! (ﷺ) حکم فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اخبشین نامی دونوں پہاڑوں کو ان پر زیروزبر کردوں۔ اخبشین مکہ مکرمہ میں دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان آبادی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہلاک ہوں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں میں سے ایسے لوگ نکالے گا جو خدا کی عبادت کریں گے اور اس کا شریک نہ گردانیں گے۔ یہ قصہ طویل ہے جو حصہ دوم کے سال دوم میں مذکور ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جبریل علیہ اسلام نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور پہاڑوں کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کریں اور جو آپ فرمائیں اسے بجالائیں اور آپ کے دشمنوں کو ہلاک کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ میں پسند کرتا ہوں کہ صبر کروں اور اپنی امت سے عذاب کی تاخیر کروں شاید کہ حق تعالیٰ انہیں بخش دے۔ اور انہیں توبہ کی توفیق دے کر ان پر رحمت فرمائے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو باتوں کے درمیان حضورِ انور ﷺ کو اختیار نہیں دیا گیا مگر یہ کہ آپ ان دونوں باتوں میں سے آسان کو اختیار فرماتے اس قول کے معانی وتاویلات بہت ہیں۔ اظہر واقرب یہ ہے کہ آسان تر سے مراد امت کے لیے ہے۔ حضرت ابن مسعود ؓ فرماتے ہیں کہ حضورِ انور ﷺ تذکیر وموعظہ کے لیے ہماری مزاج پرسی اور تیمارداری فرماتے مطلب یہ کہ یہ کبھی کبھی کرتے ہمیشہ نہ کرتے۔

وفا وحسن عہد، صلہ رحمی اور عبادت: حضورِ اکرم ﷺ کے اخلاق وخصائل میں سے وفا، حسن عہد، صلہ رحمی اور عیادت ومزاج پرسی بھی ہے۔ حضرت انس ؓ سے مروی ہے کہ جب کوئی چیز ہدیہ میں لائی جاتی تو حضورِ اقدس ﷺ فرماتے اسے فلاں عورت کے پاس لے جاؤ۔ کیونکہ وہ حضرت خدیجہ کی سہیلی ہے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں حضرت خدیجہ ؓ سے جتنا رشک کرتی تھی اتنا کسی عورت سے میں نے رشک نہ کیا۔ کیونکہ حضور ﷺ انہیں بہت یاد کیا کرتے تھے۔ اگر حضور ﷺ کوئی بکری بھی ذبح فرماتے تو اس میں سے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو ضرور بھجوادیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں آئی۔ آپ نے اسے دیکھ کر بڑی خوشی وشادمانی کا اظہار فرمایا۔ اور اس کی خوب خاطر ومدارت فرمائی۔ جب وہ عورت چلی گئی تو فرمایا یہ عورت حضرت خدیجہ کے زمانہ میں یہاں آیا کرتی تھی۔ اور فرمایا حسن العهد من الايمان یعنی وضعداری کو عمدہ طریق سے پورا کرنا ایمان کی علامتوں میں سے ہے۔

حضورِ انور ﷺ ذوی الارحام یعنی قربتوں کا لحاظ وپاس فرماتے اور ان کی مدد فرماتے تھے۔ آپ فرماتے ابوفلاں کی آل میری دوست نہیں ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ فرمایا نہیں ہے کوئی میرا دوست بجز خدا کے اور مسلمانوں میں سے نیکوکاروں کے۔ ہاں ان لوگوں کے لیے رحم ہے کہ میں نرمی کرتا ہوں ان سے رحمی قرابت کی بنا پر۔ مطلب یہ کہ ان کے ساتھ بہت کم احسان کرتا ہوں جس طرح کہ کسی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے جائیں۔ بیان کرتے ہیں کہ ابوفلاں سے مراد ابن ابوالعاص ہے اس جماعت کا حال معلوم ہے۔

اور حضورِ اکرم ﷺ امامہ بنت زینب کو گود میں لیتے اور نماز میں اپنے کندھے پر بٹھاتے اور جب سجدہ میں جاتے تو زمین پر اتار دیتے۔ پھر جب کھڑے ہوتے تو اٹھا لیتے تھے۔ آپ کی یہ عادت کریمہ اولاد کی شفقت اور مہربانی کی وجہ سے تھی۔ اور امامہ کا اٹھانا اور ان کا زمین پر رکھنا حضور ﷺ کا اپنا فعل نہ تھا بلکہ وہ خود آتیں اور لپٹ جاتیں اور جب وہ سجدہ میں جاتے تو اتر جاتیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ نماز میں یہ فعل کثیر تھا۔ یہ نفلی نماز میں تھا واللہ اعلم۔

حضورِ انور ﷺ کی رضاعی بہن جن کا نام شیما تھا اور وہ آپ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کیساتھ حضور ﷺ کی خدمت وتربیت بجالاتی تھیں۔ ان کا ذکر ابن اثیر نے صحابیات میں کیا ہے۔ جب وہ ہوازن کی باندیوں میں حضور ﷺ کے پاس آئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو پہنچوایا تو حضور ﷺ نے ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھائی۔ اور فرمایا اگر تم پسند کرو تو ہمارے ساتھ رہو عزت واکرام سے رہوگی اور مال ومنال سے بھی بہرہ مند ہوگی۔ یا اگر تم اپنی قوم کی طرف جانا چاہتی ہو تو کہ دو انہوں نے اپنی قوم کی طرف جانا پسند کیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان کو ساز وسامان کے ساتھ بھیج دیا۔

ابوالطفیل بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو دیکھا ہے اس وقت میں بچہ تھا کہ اچانک ایک عورت حضور ﷺ کے پاس آئی۔ حضور ﷺ نے اس عورت کے لیے اپنی چادر مبارک بچھائی وہ عورت اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ عورت کون ہے۔ تو صحابہ نے کہا یہ وہ عورت ہے جس نے حضور ﷺ کو دودھ پلایا ہے ظاہر ہے کہ حلیمہ سعدیہ ہوں گی۔ اور ابن عبدالبر استیعاب میں کہتے ہیں کہ وہ حلیمہ تھیں۔ اور علماء یہ بھی بیان کرتے ہیں حضور ﷺ کو چونکہ آٹھ عورتوں نے دودھ پلایا تھا انہیں میں سے کوئی ہوگی۔ واللہ اعلم۔

عمرو بن سائب بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ ایک روز تشریف فرما تھے کہ حضور ﷺ کے رضاعی والد آئے۔ آپ نے ان کے لیے اپنی چادر مبارک بچھائی وہ اس پر بیٹھے۔ پھر آپ کی رضاعی والدہ آئیں تو چادر شریف کے ایک کونے پر انہیں بٹھا دیا۔ پھر آپ کے رضاعی بھائی آئے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں سامنے بٹھایا۔

حضورِ اکرم ﷺ ابولہب کی باندی ثوبیہ کو بطور صلہ' کھانا' اور کپڑے وغیرہ بھی بھجوایا کرتے تھے۔ کیونکہ اس نے بھی آپ کو دودھ پلایا تھا۔ ثوبیہ کا انتقال ہوگیا تو آپ نے دریافت کیا اس کا کوئی قریبی رشتہ دار باقی ہے لوگوں نے کہا کوئی باقی نہیں ہے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ کی حدیث میں مروی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے فرمایا:

اَبْشِرْ فَوَاللّٰهِ لَايُحْزِيُكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِیْ الضَّيْفَ وَتُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

اے میرے سرتاج! آپ کو بشارت ہو۔ خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی بھی غمگین نہ کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی فرماتے یتیموں کا بوجھ اٹھاتے معدوم کا کسب فرماتے۔ مہمان کو ٹھہراتے اور حق کی دستگیری فرماتے ہیں۔ ﷺ

عدل وامانت اور عفت وصدق کلامی: حضورِ اکرم ﷺ غایت درجہ عادل وامانت دار اور سب سے زیادہ مہربان اور راست گو تھے۔ جن کا اعتراف آپ کے اظہار نبوت سے پہلے آپ کے دشمن وبیگانے سب ہی کرتے تھے اور وہ آپ کو ''محمد الامین'' کہا کرتے تھے۔

ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کا اسم گرامی ''امین'' اسی بنا پر رکھا گیا کہ آپ میں تمام اخلاق صالحہ جمع کر دیے گئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ کی تفسیر میں بیشتر مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات گرامی ہے ﷺ۔ ایسا ہی شفا میں کہا گیا ہے۔

جب قریش کے چار قبیلوں میں تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کو اپنی جگہ نصب کرنے میں اختلاف رونما ہوا۔ تو سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ علی الصباح جو سب سے پہلے خانہ کعبہ میں داخل ہو وہ جو کچھ حکم کرے اس پر ہم سب راضی ہوں گے۔ تو اس وقت سب سے پہلے حضورِ اکرم ﷺ داخل ہوئے اس پر وہ سب کہنے لگے۔ یہ تو محمد ہیں' یہ امین ہیں۔ (ﷺ) یہ جو کچھ فرمائیں گے ہم سب کو منظور ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ایک چادر منگوائی اور اس کے درمیان حجر اسود کو رکھا۔ اور چادر کے چار کونوں کو چاروں قبائل کے سرداروں کو تھما

دیا اور خود اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اٹھا کر اس کی اپنی جگہ نصب فرما دیا۔ یہ واقعہ اظہار نبوت سے پہلے اور حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے تولد کے سال کا ہے۔ زمانہ اسلام سے پہلے قریش حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حکم اور ثالث بناتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَمِیْنٌ فِی السَّمَآءِ وَاَمِیْنٌ فِی الْاَرْضِ۔ خدا کی قسم! میں یقیناً آسمان میں بھی امین ہوں اور زمین میں بھی امین ہوں۔' صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ ابوجہل لعین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتا تھا ہم نہ تو آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور نہ آپ کو دروغ گو جانتے ہیں۔ اور نہ آپ ہم میں جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن ہم اسے جھٹلاتے ہیں۔ جو دین کی باتیں آپ لے کر آئے ہیں۔'' یعنی اس کی یہ بات کتنی لغو نا معقول اور متناقض ہے۔ اس لیے کہ جب تم آپ کو صادق وراست جانتے ہو تو جو کچھ وہ فرمائیں تم اس کی تصدیق کرو پھر یہ عناد و استکبار کیسا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

فَاِنَّهُمْ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ○

بیشک یہ اے محبوب! تمہاری تکذیب نہیں کرتے لیکن یہ ظالم لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی اور بھی تفسیر ہے مطلب یہ کہ اے محبوب! تم فارغ ہو اس کا غم نہ کھاؤ یہ تو مجھ پر بہتان باندھ رہے ہیں۔ میں ہی ان کو سزا دوں گا۔ جس طرح کوئی جماعت کسی کے غلام کو ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائے پھر آقا اپنے غلام سے کہے کہ یہ لوگ تمہیں آزار نہیں پہنچاتے۔ یہ مجھے ایذا پہنچاتے ہیں میں جانوں۔ میں ہی ان سے نبٹوں گا۔

منقول ہے کہ اخنس بن شریک روز بدر ابوجہل سے ملا۔ اخنس نے کہا اے ابوالحکم! (ابوجہل کی کنیت ہے) اس جگہ میرے اور تمہارے سوا کوئی نہیں ہے۔ جو کہ تمہاری باتوں کو سنے۔ مجھے بتاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صادق ہیں یا کاذب؟ تو اس معلون نے کہا ''خدا کی قسم! بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم راستی پر ہیں اور وہ صادق ہیں ہرگز دروغ گو نہیں۔''

ہرقل بادشاہ نے ابوسفیان سے اس حدیث میں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف واحوال کے بارے میں اس نے سوال کیے اور آپ کی نبوت پر اس نے استدلال کیا ہے۔ دریافت کیا۔ کیا تم ان میں سے تھے کہ اس مرد کو متہم بالکذب گردانتے تھے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے دعویٰ نبوت سے پہلے ایسا جانتے تھے۔ ابوسفیان نے جواب دیا خدا کی قسم! انہوں نے کبھی بھی دروغ گوئی نہیں کی۔ ہرقل نے کہا جب یہ بات ہے تو یہ ذات خدا پر دروغ کیسے باندھ سکتی ہے۔ ہرقل کی یہ بات علامات نبوت کی معرفت میں مفید ترین چیز ہے۔ بخاری شریف اول میں مذکور ہے اور مشکوٰۃ کی شرح میں اس کا ترجمہ اور شرح بیان کی گئی ہے۔

نضر بن حارث نے قریش سے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے سامنے ہی خورد سال سے جوان ہوئے۔ تمہارے سب کاموں میں تمہارے محبوب و پسندیدہ' قول وقرار میں تم سب سے زیادہ صادق ترین اور دیانت وامانت میں تم سب سے زیادہ عظیم ترین رہے۔ اور اب جب کہ تم ان کی کنپٹیوں کے بالوں میں آثار پیری دیکھ رہے ہو اور تمہارے پاس دین وملت کی باتیں لے کر تشریف لائے ہیں تو تم انہیں جادوگر (ساحر) کہتے ہو۔ نہیں خدا کی قسم! وہ ساحر نہیں ہیں۔ یہ نضر بن حارث کافر تھا اور اس کے دل پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ لیکن سمجھدار تھا اور انصاف رکھتا تھا۔ لیکن دوسروں کے اوپر تو غلیظ پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب کبھی یہ پردے اٹھ بھی جاتے تھے تو پہلے سے زیادہ غلیظ پردے پھر پڑ جاتے تھے۔

ولید بن مغیرہ روساء کفار قریش سے تھا اس نے بارہا قرآن پاک سنا' رویا اور کہنے لگا' یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ اس کلام میں جو شیرنی اور دل نشینی ہے وہ کسی دوسرے کلام میں نہیں۔ بیشک اس میں حلاوۃ اور طلاوۃ ہے۔ صراح میں طلاوۃ کے معنی خوبی اور دل میں اثر کرنے

کے ہیں۔

اور حارث بن عامر ان شریر لوگوں میں سے تھا جو لوگوں کے سامنے حضور ﷺ کی تکذیب کیا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ گھر والوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتا تو کہتا خدا کی قسم! محمد ﷺ جھوٹ بولنے والوں میں سے نہیں ہے۔

ایک روز ابوجہل حضور ﷺ کے پاس آیا اور مصافحہ کیا۔ لوگوں نے کہا۔ کیا تم محمد ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرتے ہو؟ کہنے لگا خدا کی قسم! میں جانتا ہوں کہ محمد ﷺ پیغمبر ہیں لیکن کیا کریں، ہم عبد مناف کی اولاد کے پیروکار کب تھے۔ اور مشرکین جب بھی حضور ﷺ کو دیکھتے تو کہتے خدا کی قسم! وہ نبی ہیں۔ یہ تھا مشرکوں کا حال۔

اور یہود و نصریٰ اہل کتاب تو خود، حضور ﷺ کی رسالت کو بہت زیادہ جاننے والے تھے۔ اور یقین کیساتھ حضور ﷺ کو پہنچانتے تھے۔ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ وہ آپ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ اور یہ پشت در پشت سے نبی آخر الزماں کے منتظر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور مرتے وقت اپنے لڑکوں کو وصیت نامے لکھ کر دے جاتے تھے کہ جب نبی آخر الزماں تشریف لائیں تو ہمارا اسلام پہنچائیں اور عرض کریں کہ ہم نے آپ کے انتظار میں جانیں دے دیں ہیں۔ ہمارے اسلام کو قبول فرمائیں اور ہمیں اپنے غلاموں میں قبول فرمائیں۔

بیان کرتے ہیں کہ شاہان یمن میں سے تبع نامی مسلمان بادشاہ تھا اور اس کی قوم کافر تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا تبع بنی تمیم تھا یا نہیں وہ اپنی جماعت کے ساتھ آخر الزماں کا نشان پہچانتے مدینہ منورہ آیا۔ اور اس شہر مکرم میں ٹھہر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے تبع سے کہا کہ انہیں اپنی صحبت سے معاف رکھیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ انصار انہیں کی اولاد سے ہیں اور جب نور مبارک نے ظہور فرمایا تو وہ سب کفر کی تاریکیوں میں بھٹکتے رہ گئے۔ نعوذ باللہ من اخذلان۔

عفت: عفت کے معنی حرام سے بچنے کے ہیں۔ اور قاموس میں ہے اَلْعِفَّةُ عَمَّا لَايَحِلُّ وَلَا يَحْمَلُ عفت اسے کہتے ہیں جو چیز حلال اور اچھی نہ ہو اس سے بچتا رہے۔ حضورِ اکرم ﷺ میں وجود عفت اور اس کے کمال کا کس زبان سے بیان ہو سکتا ہے۔ جہاں عصمت آ گئی وہاں سب کچھ آ گیا۔ حدیث مبارک میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے کسی عورت کا ہاتھ تک نہ چھوا جس کے آپ مالک نہ ہوں۔ یہ ایک عبارت ہے جسے اہل عرف و عادت عفت و پارسائی کے بیان میں کہتے ہیں ورنہ حضور ﷺ کے لیے عفت کی حقیقت ہی نہیں آپ کے تمام اخلاق و اوصاف کی حقیقت اس سے بالاتر ہے۔ جتنا کہ بیان کیا جا سکتا ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی صفت مبارک راست گوئی اور صدق کلامی بار بار بیان کی جا چکی ہیں۔

عدل: لیکن عدل کے معنی خواہ عدالت و انصاف اور دادگستری کے لیے جائیں یا اخلاق و صفات میں اعتدال توسط لیے جائیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات گرامی میں دونوں معنی تھے اور دونوں ہی متصور ہیں۔

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ مال تقسیم فرما رہے تھے تو ذوالخویصرہ تمیمی نے کہا عدل فرمائیے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا جو تقسیم فرما رہے ہیں مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا افسوس ہے تجھ پر اگر میں عدل نہیں کروں گا تو دوسرا کون کرے گا۔ یہ قصہ طویل ہے۔

ابوالعباس مبرد جو علم نحو کا امام ہے کہا کہ کسریٰ شاہ فارس نے اپنے دنوں کی تقسیم کر رکھی ہے۔ ہوا کا دن سونے کے لیے ابر آلود کا دن شکار کے لیے اور بارش والا دن شراب پینے کے لیے موزوں ہے اور روز آفتاب یعنی کھلا دن، لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اچھا ہے۔ بیان کرتے ہیں کسریٰ لوگوں کی سیاسی سوجھ بوجھ میں عقلمند نہ تھا تو وہ اپنے دین میں کہاں ہوگا۔ لیکن ہمارے نبی

سیّد عالم ﷺ نے اپنے دن کو تین جزہ پر تقسیم فرما رکھا تھا۔ دن کا ایک حصہ عبادت کے لیے اور ایک حصہ اہل وعیال کے لیے اور ایک حصہ خاص اپنے لیے پھر اس تیسرے حصے کو بھی اپنے لیے اور لوگوں کی حاجتیں پوری فرمانے کے لیے تقسیم کر دیا تھا۔ اس بیان کی تفصیل حلیہ شریف کے آخر باب میں گزر چکی ہے۔ ابو جعفر طبری سیّدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے نقل کرتے ہیں حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: میں نے کبھی دو مرتبہ کے سوا کبھی بھی جاہلیت کے اعمال کا قصد نہ کیا اور ان دو مرتبہ میں بھی ہر بار اللہ تعالیٰ میرے اور میرے ارادے کے درمیان حائل ہو گیا پھر میں نے کبھی ایسا قصد نہ کیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ میں نے ایک رات اپنے اس ساتھی سے کہا جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا کہ تم میری بکریوں کا خیال رکھنا۔ میں مکہ مکرمہ ہو آؤں اور افسانے کہوں اور سنوں۔ جس طرح نوجوان لوگ کہتے اور سنتے ہیں۔ میں وہاں سے چلا اور مکہ مکرمہ کی ایک سرائے میں آیا وہاں لوگ نشانہ بازی کر رہے تھے۔ اور دف ومزامیر بجا رہے تھے۔ اس دن کسی کے گھر میں شادی تھی۔ میں بیٹھ گیا تاکہ اسے سنوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے سلا دیا۔ اور مجھے اس وقت بیدار کیا جبکہ آفتاب کی گرمی پھیل چکی تھی میں لوٹ آیا اور دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پھر میں نے کبھی بھی اس برائی کا قصد نہ کیا۔ ﷺ

وقار ودبدبہ' خاموشی اور راہ وروش: وصل: وقار وتوءدت کے لغوی معنی آہستگی کے ہیں لیکن مراد رعب' ہیبت اور دبدبہ ہے۔ اور صمت کے معنی خاموش رہنے کے ہیں۔ اور مروت کے معنی مردمی وانسانیت کے ہیں۔ اور ہدی بمعنی سیرت اور راہ روش ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کی ذات مبارک میں حلم ووقار تھا اور آپ کی حرکات وسکنات میں بردباری وآہستگی ایسی تھی جو کسی دوسرے میں ممکن نہیں۔ حدیث مبارک میں مروی ہے آپ مجلس مبارک میں سب لوگوں سے بڑھ کر باوقار تھے۔ اور آپ کے جسم واعضاء کا کوئی عضو باہر نہ نکلتا تھا۔ جس طرح عام طور پر کوئی ہاتھوں کو گھماتا ہے کوئی پاؤں پھیلاتا ہے۔ وغیرہ۔

اکثر آپ کی نشست مبارک احتباء کے وضع پر ہوتی۔ احتباء اس نشست کو کہتے ہیں جو سرین پر بیٹھ کر گھٹنے اٹھا کر پنڈلیوں کو ملا کر بیٹھا جائے۔ آپ اس طرح کبھی چادر مبارک لپیٹ کر کبھی بغیر اس کے تشریف رکھتے۔ اور کبھی مربع (جہاں زانوں) نشست ہوتی۔ صبح کی نماز کے بعد اس وضع پر تشریف رکھ کر وظائف واوراد پڑھتے اور کبھی بوضع فرقصا تشریف رکھتے۔ اس کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ سرین پر نشست فرماتے یعنی رانوں کو اٹھاتے اور انہیں شکم اطہر سے ملاتے۔ اور دونوں ہاتھوں سے احتباء کرتے یعنی لپیٹتے۔ اور ان کو زانوں یا پنڈلیوں پر رکھتے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ رکبتین یعنی زانوؤں کا احتباء فرماتے اور رانوں کو شکم سے ملاتے۔ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اپنی بغل میں لاتے۔ احتباء کی یہ ایک خاص نوع ہے کہتے ہیں کہ ایسا بیٹھنا اعراب وعرب کا ہے۔

قیلیہ بنت مخرمہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو حالت خشوع میں بوضع فرقصا بیٹھتے دیکھا تو میں خوف سے کانپ گئی۔ مطلب یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ کو حالت خشوع میں اس طرح دیکھنے سے مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ خشوع کے معنی عاجزی کے ساتھ آنکھیں بند کرنا ہے۔ خضوع کے بھی قریب قریب یہی معنی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خشوع کا تعلق بدن سے ہے اور خضوع کا تعلق آوز وبصر سے ہے۔

اور بعض حدیثوں میں خشوع کو باطن پر اور خضوع کو ظاہر پر محمول کیا گیا ہے اور یہ دونوں لفظ سکون وتذلل کے معنی میں مشترک ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ بہت زیادہ خاموش پسند تھے اور ضرورت کے وقت ہی کلام فرمایا کرتے تھے۔ اور جو کوئی غیر جمیل یعنی بغیر حسن وخوبی کے بات کرتا آپ اس سے رخ پھیر لیا کرتے۔ آپ کا کلام قول فیصل ہوتا۔ اظہار مطلب میں الفاظ نہ زیادہ ہوتے اور نہ کم۔

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ آپ اس طرح کلام فرماتے کہ آپ کے کلمات کو شمار کیا جا سکتا تھا۔

حضرت جابر ؓ کی حدیث میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا کلام ترتیل و ترسیل کے ساتھ تھا۔ صراح میں ہے کہ ترتیل کے معنی آرام کے ساتھ ہموار اور خوب واضح لفظوں سے پڑھنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا یعنی قرآن کو خوب واضح حروف' آرام و سکون اور ہموار لفظوں سے پڑھو۔'' ترسیل کے بھی یہی معنی ہیں۔ ان کے معانی کی تحقیق ''رسالہ تجوید'' میں کی گئی ہے۔

ابن ابی ہالہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ حضورِ انور ﷺ کی خاموش پسندی کا سبب چار چیزیں تھیں۔ حلم' حذر یعنی خشیت الٰہی' تقدیر او تفکر یعنی غور و خوض' آپ کا ہنسنا مسکرانے کی حد تک تھا۔ اور آپ کے حضور ﷺ میں صحابہ کا ہنسنا بھی آپ کی پیروی اور اجتماع ہی میں تھا۔ آپ کی مجلس مبارک' حلم و حیا اور خیر و امانت کی مجلس تھی جس میں آوازیں بلند و اونچی نہ ہوتیں۔ بری باتوں سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ جب حضور ﷺ کلام فرماتے تو تمام صحابہ اپنے سروں کو جھکا لیتے۔ گویا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر سر اٹھایا تو وہ اڑ جائیں گے۔ صاحب الشفا نے صحابہ کرام کی اس حالت کو حضورِ اکرم ﷺ کے کلام فرمانے کی حالت کے ساتھ مخصوص و مقید کیا ہے۔ حالانکہ دیگر کتابوں میں مطلقاً آیا ہے کہ مجلس نبوی کی حاضری میں صحابہ کرام کی ہمہ وقت یہی حالت رہتی تھی۔

ایک اور حدیث میں کہ سیّدنا ابوبکر صدیق ؓ حضور ﷺ کی مجلس میں منہ میں سنگریزہ رکھ کر بیٹھا کرتے تھے تاکہ سانس نہ گھٹنے پائے اور بات نہ کر سکیں۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کے جمال پر محبت کی لڑی میں پرو کر نظر جمائے رکھتے تھے۔

آپ کی رفتار مبارک اور چلنے کی کیفیت حلیہ مبارک کے ضمن میں معلوم ہو گئی ہو گی۔ آپ کی مروت میں سے یہ بھی ہے کہ آپ نے کھانے پینے کو پھونک کر کھانے پینے سے منع فرمایا ہے اور سامنے رکھا ہوا سے کھانے کا حکم فرمایا اور مسواک کرنے' منہ' انگلیوں کے پوروں' گھائیوں اور جوڑوں کو خوب صاف کرنے کا حکم فرمایا۔

آپ کی سیرت مبارکہ یعنی رہ و روش بہترین سیرت تھی۔ حضرت ابن مسعود ؓ کی حدیث میں ہے کہ

خَيْرُ الْحَدِيْثِ كَلَامُ اللّٰهِ وَ خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بہترین کلام کلام اللہ ہے اور بہترین سیرت حضورِ انور کی سیرت مبارک ہے۔ ﷺ

حضورِ اکرم ﷺ خوشبو اور معطر فضا کو محبوب رکھتے۔ خود بھی استعمال فرماتے۔ اور دوسروں کو ترغیب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

حُبِّبَ اِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ اَلنِّسَآءُ وَالطِّيْبُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ.

تمہاری دنیا میں مجھے تین چیزیں محبوب کی گئی ہیں۔ بیویاں' خوشبو اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک گردانی گئی۔

مطلب یہ کہ انہیں حق تعالیٰ نے میرے لیے محبوب بنایا ہے نہ یہ کہ میں نے اپنے اعمال و اختیار سے انہیں محبوب جانا ہے۔ نماز میری آنکھوں کے لیے آرام و قرار گردانا گیا یا میری آنکھوں کی خنکی و ٹھنڈک قرار دی گئی ہے۔ بیان کرتے ہیں حضورِ اکرم ﷺ نماز میں خوشی و مسرت اور روشنی و خوشدلی پاتے اور جو ذوق و شہود حالت نماز میں آپ کو حاصل ہوتا وہ کسی دوسری عبادت اور کسی وقت نہ ہوتا۔

''قرۃ العین'' فرحت و سرور' دریافت مقصود اور انکشاف غیب سے کنایہ ہے۔ ''قرۃ'' قر سے مشتق ہے۔ جس کے معنی قرار و ثبات کے ہیں۔ چونکہ نظارہ محبوب کی دید سے قرار اور راحت و آرام حاصل ہوتا ہے۔ آپ سرور کی حالت میں دائیں بائیں دیکھتے۔ اور خوش حالی میں اپنی جگہ پر ساکن رہتے۔ محبوب کے غیر پر نظر ڈالنے سے پریشانی اور حیرانی ہوتی ہے۔ اس طرح حزن و ملا کی حالت میں بھی سرگردانی اور پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ اور آنکھیں ایسی وہ جاتی ہیں گویا ان پر موت طاری ہو گئی ہے۔'' یہ اس کی دلیل ہے۔

یا قرۃ'' قر سے مشتق ہے۔ بمعنی سردی و ٹھنڈک۔ چونکہ محبوب کے مشاہدہ سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر فرزند کو قرۃ العین کہتے ہیں اور یہ کہ فرمایا: فِي الصَّلٰوةِ (نماز میں) الصلوٰۃ (نماز) نہ فرمایا اس میں یہ اشارہ ہے کہ آنکھوں کا سرور و آرام مشاہدہ حق سے ہے کہ بحکم '' کانک تراہ'' گویا کہ تم نماز میں اسے دیکھ رہے ہو۔'' یہ مشاہدہ حق حالت نماز میں حاصل ہے۔ اور نماز حق کا غیر ہے۔ اگر چہ اسی کی نعمت اور اسی کا فضل ہے۔ اور حق کی نعت اور فضل سے خوش ہونا بھی ایک مقام بلند ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا   فرمادو اللہ کے فضل و رحمت ہی کے ساتھ انہیں چاہیے کہ وہ مسرور ہوں۔

فضل و رحمت کا مقام مفضل و منعم یعنی ذات باری تعالیٰ کے مشاہدے سے کم ہے اور فضل و رحمت کے ساتھ فرح و سرور ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ کا مقام کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ اسی بنا پر فَلْيَفْرَحُوْا (انہیں خوش ہونا چاہیے) فرمایا اور فلتفرح نہ فرمایا کیونکہ ان میں حضور ﷺ کو خطاب ہوتا ہے۔ (مطلب یہ کہ امت کو چونکہ مقام و درجہ بمقابلہ نبی کے کمتر ہوتا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت پر ہی خوشی و مسرت کرنی چاہیے۔ اور نبی کا مقام اس سے بلند ہوتا ہے۔ خاص کر سیّد عالم ﷺ کا مقام جو کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے ﷺ س لیے ان کی خوشی و مسرت مشاہدہ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ (فت برازمترجم غفرلہ)۔

تنبیہ: واضح رہنا چاہیے کہ یہ کلمہ جو مذکور ہوا اس حدیث کا جزو ہے حُبِّبَ اِلَیَّ الطِّیْبُ وَالنِّسَآءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوةِ صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد و نسائی نے حضرت انس ؓ سے روایت کیا ہے اور سخاوی ''مقاصد حسنہ'' میں فرماتے ہیں کہ طبرانی اسے ''اوسط'' اور ''الصغیر'' میں مرفوعًا لائے ہیں۔ اسی طرح خطیب ''تاریخ بغداد'' میں اور ابن عدی ''الکامل'' میں لائے ہیں۔ اور مستدرک میں بھی ہے۔ لیکن بغیر لفظ ''جعلت'' کے ہے اور کہا گیا ہے بر شرط مسلم صحیح ہے۔ نسائی کے نزدیک بروایت انس ایک اور سند سے بزیادتی لفظ ''من الدنیا'' ایک مروی ہے اور بکثرت محدثین نے اسی وجہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن قیم نے کہا کہ اسے امام احمد نے ''کتاب زہد'' میں بزیادتی لطیف روایت کیا ہے۔ وہ اضافہ یہ ہے کہ

اَصْبِرُ عَنِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَلَا عَنْهُنَّ   کھانے پینے سے رک سکتا ہوں لیکن بیویوں سے نہیں رک سکتا۔

(وجہ یہ ہے کہ کھانا پینا اپنا ذاتی حق ہے اور ازواج کے حقوق، دوسرے کا حق ہے اپنے حق کو باختیار خود چھوڑا جا سکتا ہے لیکن دوسروں کے حقوق اپنی مرضی سے کسی حال میں بھی ترک نہیں کیے جا سکتے۔ فافہم مترجم) سخاوی فرماتے ہیں کہ یہ جو مشہور ہے کہ اس حدیث میں لفظ ثلث (تین) کی زیادتی کے ساتھ ہے تو میں اس سے واقف نہیں ہوں مگر دو جگہ پر ایک ''احیا'' میں دوسرے کشاف کے سورۂ آل عمران میں۔

......اور میں نے اس اضافہ کو اسناد حدیث میں سے کسی سند میں باوجود بہت جستجو و تلاش کے نہیں دیکھا۔ زرکشی نے اس معنی کی تصریح کی ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث میں لفظ ''ثلث'' وارد نہیں ہوا ہے حالانکہ یہ اضافہ معنی میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ صلوٰۃ از قبیل اشیاء دنیا نہیں۔ اگر چہ اس کی تاویل بھی کی گئی ہے۔ شیخ حافظ ابن حجر عسقلانی نے رافعی کی روایت کردہ میں کہا ہے کہ لوگوں کی زبانوں پر لفظ ''ثلث'' مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن میں نے اس لفظ کو اسناد میں کہیں نہیں پایا۔ اور ولی الدین عراقی بھی اپنی کتاب ''امالی'' میں فرماتے ہیں کہ لفظ ثلث کسی حدیث کی کتاب میں نہیں ہے اور صلوٰۃ از امور دنیا نہیں ہے۔

(انتہی کلام سخاوی) لہٰذا معلوم ہوا کہ اصل متن حدیث جس پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے اسی لفظ کے ساتھ ہے کہ

حُبِّبَ اِلَیَّ الطِّیْبُ وَالنِّسَآءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوةِ   میرے لیے تین چیزیں محبوب کی گئی ہیں۔ خوشبو۔ ازواج اور نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور آرام بنائی گئی۔

یہ متن بغیر اشکال کے ہے۔ اور بعض روایتوں میں ''من الدنیا'' یا ''من دنیا کم'' آیا ہے۔ اور بعض کتابوں میں لفظ ثلث بھی آیا ہے۔ اگر ان دونوں میں ایک نہ ہو تو اشکال نہیں ہوتا۔ اگر دونوں ہوں جیسا کہ لوگوں کی زبانوں پر مشہور ہے تو اشکال وارد ہوتا ہے۔ اور اس کی تاول میں کوئی کہتا ہے کہ ''من الدنیا'' سے مراد دنیا میں ہوتا ہے۔

اور اس کا وجود اس جہان کی زندگانی سے ہے۔ لہٰذا حاصل معنی یہ ہوئے کہ اس جہان میں مجھے تین چیزیں اچھی لگیں۔ دو تو دنیاوی امور سے ہیں اور تیسرا امر اختیاری دینی ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ از روئے ملال' تیسرا امر امور دنیا سے ہے۔ اس کا ذکر نہیں کیا اور عدول کیا امر دینی سے بر طریق تکمیل اور دفع تو اہم اس سے کہ اس میں لذت و محبت ہے اور معاشرت ازواج میں انہاک' حق اور اس کی مناجات سے مشغولیت نہیں رکھتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ امر ثالث جس کا اس حدیث میں ذکر نہیں وہ خیل (گھوڑا) ہے۔ والعلم عند اللہ جیسا کہ دوسری حدیث میں بروایت انس وارد ہے کہ

لَمْ يَكُنْ اَحَبَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ النِّسَآءِ مِنَ الْخَيْلِ

حضور ﷺ کو ازواج کے بعد گھوڑے سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہ تھی۔

اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے کہ تیسرا امر' طعام ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔ فرمایا کہ رسولِ خدا ﷺ کو دنیا کی تین چیزیں اچھی معلوم ہوئیں۔ کھانا' ازواج اور خوشبو۔ تو آپ نے ان میں سے دو سے تو حظ اٹھایا اور ایک سے نہیں یعنی ازواج اور خوشبو سے تو محفوظ ہوئے اور کھانے سے نہیں اسے امام احمد نے روایت کیا (واللہ اعلم)۔

زُہد: حضورِ اکرم ﷺ کی صفت زہد اور اس کے کمال کا ذکر احادیث و اخبار میں کافی ووافی ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ دنیاوی ملمع کاری سے کلیتہً مجتنب رہتے تھے۔ حالانکہ آپ کے سامنے دنیا پوری چمک دمک کے ساتھ لائی گئی۔ اور پے در پے فتوحات حاصل ہوئیں مگر جب آپ کا دنیا سے کوچ کرنے کا وقت آیا تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی تھی جس سے اپنے اہل و اعیال کے نفقہ کے لیے روپیہ حاصل کیا تھا۔ حالانکہ آپ دعا فرمایا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوْتًا اے خدا! میرے اہل و عیال کے جان کی رمق باقی رہنے کے لیے رزق عطا فرما۔ وفات کے وقت تک اس زرہ کو چھڑایا نہ جا سکا۔ اور یہ سب کچھ زہد و سخاوت اور ایثار کی وجہ سے تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے کبھی مسلسل تین دن شکم سیر ہو کر روٹی نہ کھائی۔ ایک اور روایت کے مطابق کبھی مسلسل دو دن جو کی روٹی ملاحظہ نہ فرمائی۔ اگر آپ چاہتے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دیتا کہ کسی کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کے اہل و عیال نے کبھی سیر ہو کر گندم کی روٹی نہ کھائی۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ وصال بحق ہوئے۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ اور عمرو بن حارث کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ترکہ میں کچھ نہ چھوڑا بجز ہتھیار' گھوڑا اور زین کے۔ اور اسے بھی صدقہ یعنی بحق بیت المال میں دے دیا تھا۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اس حال میں رحلت فرمائی کہ گھر میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کوئی جگر والا کھا سکے مگر نصف کیل جو۔ جو گھر کے ایک طاق میں پڑے ہوئے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یقیناً مجھ پر پیش کیا گیا کہ اگر چاہیں تو مکہ کی وادی بطحا کو میرے لیے سونا کر دیا جائے۔ تو میں نے عرض کیا نہیں اے رب! بس تو اتنا کر دے کہ ایک دن تو بھوکا رہوں اور دوسرے دن کھاؤں۔ اور جس دن بھوکا رہوں تیرے حضور ﷺ یہ گریہ وزاری کروں اور تجھ سے مانگوں۔ اور جس دن کھاؤں اس دن تیرا شکر بجا لاؤں۔ اور تیری حمد و ثنا

کروں۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جبریل نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بعد سلام ارشاد فرمایا ہے کہ کیا آپ کو پسند ہے کہ ان سب پہاڑوں کو سونا کر دیا جائے۔ اور جہاں آپ تشریف فرما ہوں ساتھ جایا کریں۔ اس پر حضور ﷺ نے کچھ دیر سر مبارک کو جھکائے رکھا پھر فرمایا اے جبریل! دنیا اسکا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو اور دنیا اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو۔ اور اسے وہی جمع کرتا ہے جسے عقل نہ ہو''۔ جبریل نے حضور ﷺ سے عرض کیا اے حبیبِ خدا! اللہ تعالیٰ قول ثابت پر آپ کو قائم و ثابت رکھے۔

سیّدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ ہم حضورِ اکرم ﷺ کی آل میں سے ہیں ہمارا یہ حال تھا کہ ہم ایک ایک مہینہ آگ نہیں جلاتے تھے اور ہمارے پاس بجز کھجور اور پانی کے کوئی خوراک نہ ہوتی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک بہت بڑا طباق کھانے کا لائے۔ اس پر آپ پر گریہ طاری ہوا اور فرمانے لگے۔ ''ہلاک شد رسولِ خدا ﷺ'' اور جو کی روٹی سے خود اور آپ کی ازواج مطہرات سیر نہ ہوئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ اور آپ کی ازواجِ مطہرات مسلسل راتیں بغیر کھائے پئے گذارتے تھے۔ اور رات کا کھانا موجود نہ ہوتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضورِ انور ﷺ نے کبھی دستر خوان یا سینی پر کھانا نوش نہ فرمایا۔ اور نہ آپ کے لیے پتلی چپاتی تیار کی گئی۔ کبھی بھی گوسفند ملیمہ یعنی دم پخت بکری آپ کے سامنے نہ دیکھی گئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کبھی آسودہ خاطر نہ ہوئے اور نہ کبھی کسی سے اس کی شکایت فرمائی اور آپ کے نزدیک غنیٰ سے فاقہ کشی بہت زیادہ محبوب تھی اور حضورِ انور ﷺ فاقہ سے دن گزارتے۔ اور رات کو تمام شب بھوک سے شکم اطہر ملا کرتے۔ یہ شدت بھوک سے کنایہ ہے۔ آپ کی یہ حالت دن کے روزوں سے نہ روکتی۔ اگر آپ پروردگار سے مانگتے تو وہ آپ کو زمین کے تمام خزانے اور اس کے تمام میوے عنایت فرما دیتا۔ مجھے آپ کی محبت و شفقت کی بنا پر رونا آجاتا تھا جو کچھ کہ میں آپ کی حالت دیکھتی یا اپنے ہاتھ سے آپ کے شکم اطہر کو ملتی۔ اور بھوک سے جو کیفیت آپ پر ہوتی تو میں عرض کرتی روحی فداك یا رسول الله اے اللہ کے رسول! آپ پر میری جان قربان کاش کہ آپ دنیا سے اتنا لینا پسند فرماتے جو آپ کے کھانے کے لیے کافی ہوتا۔ اور قوت دیتا۔ اس پر آپ فرماتے: اے عائشہ! دنیا سے مجھے کیا سروکار؟ میں دنیا کا کیا کروں؟ میرے برادران جو کہ اولوالعزم رسول ہیں انہوں نے اس سے زیادہ سختیوں اور شدتوں پر صبر فرمایا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے حال سے گذر گئے۔ اور اپنے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ اور ان کی اس مراجعت ربی کو حق تعالیٰ کے گرامی قدر بنایا اور انہیں بہت کچھ ثواب و صلہ مرحمت فرمایا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو پاتا ہوں اور تن آسانی سے شرماتا ہوں کہ اپنی زندگی ایسی گزاروں۔ پھر کل کو مجھے ان سے جدا کیا جائے۔ حالانکہ میرے نزدیک اپنے بھائیوں کے زمرہ میں شامل رہنے سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہے۔ میں ہوں اور میرے محبوب برادران۔ (ﷺ) سیّدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضورِ اکرم ﷺ دنیا میں ایک ماہ سے زیادہ اقامت نہ فرمائی۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ کا کوئی خاص بستر نہ تھا۔ فقط ایک ایسا بچھونا جس میں روئی کی جگہ کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کے خانہ اقدس میں دوسوتی (پلاسی) تھی جسے میں دو تہہ کر کے بچھایا کرتی تھی۔ آپ اس پر آرام فرمایا کرتے تھے۔ ایک رات میں نے اس کی چار تہہ کر دیں تاکہ کچھ نرم ہو جائے۔ چنانچہ جب صبح بیدار ہوئی تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا: آج رات تم نے میرے لیے کیا بچھایا تھا۔ میں نے عرض کیا وہی بستر تھا جو روز بچھایا کرتی تھی۔ لیکن

آج رات میں نے اس کی چار تہہ کر دی تھیں۔ فرمایا اسے اسی حال پر رکھو اس لیے کہ اس کی نرمی مجھے رات کی نماز سے باز رکھتی ہے۔ آپ کی عادت کریمہ تھی کہ کبھی تخت پر آرام فرماتے یا کبھی اس کھجور کے پتوں کی چٹائی پر چٹائی کے نشانات آپ کے پہلوئے اقدس پر مرتسم ہو جاتے تھے۔ ﷺ

خوف وخشیتِ الٰہی وسختی طاعت اور شدتِ عبادت

وصل: حضورِ اکرم ﷺ کا خوف وخشیت الٰہی اور اس کی طاعت وعبادت حق تعالیٰ جل شانہ کے علم ومعرفت کے مطابق تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ جاننے والا اور حق تعالیٰ کے حقیقت کا شناسا ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ اس کا خائف اور اس کا عبادت گزار ہوگا۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا حقیقت یہ ہے کہ اس کی بندوں میں سے علماء ہی اللہ کی خشیت رکھتے ہیں

صحیح بخاری میں بروایت ابو ہریرہ ؓ مروی ہے رسول ﷺ نے فرمایا اگر تم وہ جانو جو کچھ کہ میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو گے اور بہت زیادہ روگے'' ترمذی کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ فرمایا میں وہ تمام کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے۔ اور میں وہ کچھ سن رہا ہوں جو تم نہیں سن سکتے۔ اور فرمایا کہ آسمان خاص قسم کی آواز نکالتا ہے اور اسی لائق ہے کہ آواز اطیط نکالے۔ ''اطیط'' پالان اور اونٹ کے درد وکرب سے کراہنے کی آواز کو کہتے ہیں اور آسمان کا ''اطیط'' کرنا ملائکہ کی کثرت واژدہام کی گراں باری کی بنا پر ہے۔ یہ کنایہ ہے اور فرمایا آسمان میں چار انگل بھی ایسی جگہ نہیں ہے۔ جہاں خدا کی حضور ﷺ فرشتے پیشانی رکھے سجدہ نہ کر رہے ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا خدا کی قسم! اگر تم وہ کچھ جانو جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو گے اور بہت زیادہ رو گے۔ اور اپنی بیویوں سے ہم بستری سے لذت نہ اٹھاؤ گے۔ اور زمینوں اور اس کی بلندیوں اور راہوں کی طرف نکل کھڑے ہو گے۔ اور خدا کے حضور ﷺ گڑگڑاؤ گے۔ اور فریاد کرو گے۔ اور دعاؤں میں اونچی آوازوں سے پکارو گے۔ مطلب یہ کہ میں صبر وتحمل کی قوت سے ان کے بوجھ کو اٹھاتا ہوں۔ اگر تم جان لو تو ہرگز وہ بوجھ نہ اٹھا سکو گے۔ حضرت ابوذر ؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں فرماتے ہیں کہ ہمہ وقت تمنا کرتا ہوں کہ کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ ڈالا جاتا۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کیا ملاحظہ فرما رہے ہیں؟ فرمایا میں دیکھ رہا ہوں بہشت ودوزخ کو۔

لہٰذا حق تعالیٰ نے آپ میں خشتیہ قلبیہ اور استحضار عظمت الٰہیہ کے ساتھ علم الیقین اور عین الیقین کو اس شان سے جمع فرمایا کہ کوئی دوسرا ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا نماز میں قیام اس طرح ہوتا کہ آپ کے پائے مبارک متورم ہو جاتے اس پر صحابہ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ اتنی محنت اور مشقت کس لیے برداشت فرماتے ہیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سبب تمام اگلوں اور پچھلوں کے گناہوں کو معاف فرمایا ہے۔ اور آپ تو مغفور ہیں ہی۔ فرمایا کہ خدا کی اس عنایت وکرم پر کہ اس نے مغفور بنایا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ ﷺ

سیّدہ عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کا ہر عمل لزوم ودوام لیے ہوئے ہے تم میں سے کس کی طاقت ہے جو حضور ﷺ جیسی مشقت برداشت کر سکے۔

حضرت عوف بن مالک ؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات میں حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ تھا۔ حضور ﷺ خواب استراحت سے بیدار ہوئے۔ مسواک کی اور وضو کر کے نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تو میں بھی حضور ﷺ کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ نے سورۂ

بقر کی تلاوت شروع فرمائی تو کوئی رحمت والی آیت ایسی نہ گزری جس میں حضور ﷺ نے توقف کر کے خدا کے حضور ﷺ رحمت کی درخواست نہ کی ہو۔ اور ایسی کوئی عذاب والی آیت نہ گزری جس میں حضور ﷺ نے توقف کر کے خدا سے اس عذاب سے پناہ نہ مانگی ہو۔ پھر آپ نے قیام کے برابر طویل رکوع فرمایا۔ اور پڑھا سُبْحَانَ ذِی الْجَبْرُوْتِ وَالْمَلَكُوْتِ وَالْعَظْمَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ۔ پھر رکوع سے سر مبارک اٹھا کر اتنا ہی قیام فرمایا۔ اور اس میں یہی کلمات پڑھے۔ اس کے بعد سجدہ کیا اس میں بھی یہی کلمات پڑھے۔ پھر دونوں سجدوں کے درمیان جلوس فرمایا۔ اس میں بھی اسی کی مانند کلمات پڑھے۔ (اس کے بعد بقیہ رکعتوں میں) سورۂ آل عمران، سورۂ نسا اور سورۂ مائدہ کی تلاوت کی۔ اور کبھی آپ ایک ہی آیت پر ساری رات قیام میں گزار دیتے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ وہ آیت یہ ہوتی۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ اگر تو ان پر عذاب فرمائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ○ تو انہیں بخش دے تو تو ہی غالب حکمت والا ہے۔

اس سے مقصود امت کا عرض حال اور ان کی مغفرت کی درخواست تھی۔ منقول ہے کہ حضور ﷺ نماز ادا فرماتے ہوتے اور آپ کا شکم اطہر دیگ کے جوش مارنے سے آواز کی مانند آواز دے رہا ہوتا۔

ابن ابی ہالہ کی ایک حدیث میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی یہ حالت تھی کہ آپ پر پے در پے غم آتے اور مسلسل آپ کو حزن و ملال پہنچتا رہتا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے رب سے روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں اور ایک روایت میں سو بار ہے یہ سارا اندوہ و غم اور استغفار امت کے لیے تھا اس کے ماسوا اور بھی وجوہ علما بیان کرتے ہیں جسے رسالہ ''مرج البحرین'' میں ذکر کیا گیا ہے۔

سیّدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ سے آپ سے وصالِ حق کے طریقے کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا میرے مال کی راس معرفت ہے۔ میرے دین کی اصل عقل ہے۔ محبت میری اساس ہے۔ شوق میری سواری ہے ذکر اللہ میرا انیس ہے شفقت میرا خزانہ ہے، غم میرا رفیق ہے، علم میرا ہتھیار ہے، صبر میری چادر ہے، رضا میری غنیمت ہے۔ فقر میرا فخر ہے۔ زہد میری حرفت ہے۔ یقین میری قوت ہے۔ صدق میرا شفیق ہے۔ طاعت میری محبت ہے۔ جہاد میری خوبو ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک و آرام نماز میں ہے۔ میرے دل کا پھل ذکر میں ہے اور میرا غم، اپنی امت کے لیے ہے اور میرا شوق اپنے رب کی طرف ہے۔ ﷺ

قرآن پاک میں مذکورہ صفات وخصائل مبارک

وصل: صحیح بخاری میں بروایت عطاء رضی اللہ عنہ ایسی حدیث منقول ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کے اکثر اخلاق کریمہ کی جامع ہے اور ان میں سے آپ کے کچھ صفات عالیہ قرآن کرم میں بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ہے:

يَاۤ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ یعنی آگاہ ہو۔ اے نبی! بیشک ہم نے آپ کو بھیجا گواہ اس کتاب پر جو ہم نے ان کی طرف بھیجی۔ ان کی تصدیق و تکذیب اور ان کی نجات و گمراہی پر گواہی دینے والا اور فرماں برداروں کو بشارت دینے والا اور نافرمانوں کو ڈرانے والا اور امیوں کے لیے یعنی اہل عرب کے لیے جو کہ حضور ﷺ کی قوم تھی ان کو پناہ دینے والا بھیجا۔ صراح میں ''حرز'' کے معنی ہموار اور اچھی جگہ کے ہیں اَنْتَ عَبْدِیْ وَرَسُوْلِیْ یعنی تم میرے بندہ خاص ہو اس مقام کی حقیقت اور اس مرتبہ خاص کا آپ کے سوا کوئی سزاوار نہیں۔ اور میں نے تمام مخلوق کی طرف رسول فرمایا: سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ۔ میں نے تمہارا نام متوکل رکھا کیونکہ تمام کار اور اپنا بار تم نے میرے سپرد کر دیا۔ اور اپنی ہر ایک قوت و طاقت سے دستکش ہو گئے۔ اور تمام کاموں میں ہی

تمہارے ہر امر کا متولی ہوا لَیْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِیْظٍ۔ میرا یہ بندہ خاص ایسا ہے کہ نہ درشت خو ہے اور نہ سخت کو وَلَا سَخَابٍ فِی الْاَسْوَاقِ نہ یہ بازاروں میں آوازیں بلند کرتا ہے۔ بازار کی قید اتفاقی ہے۔ کیونکہ بازاروں میں اکثر اونچی آوازیں ہوتی ہیں۔ اور معنوی لحاظ سے مراد یہ ہے کہ بازار میں آنے سے اجتناب فرماتے ہیں۔ کیونکہ وہ دنیاوی کاروبار کی جگہ ہے اور اہل آخرت کے لیے بلا ضرورت جانا ان کے حال کے لائق نہیں وَلَایَدْفَعُ السَّیِّئَةَ بِالسَّیِّئَةِ اور بدی کو بدی سے دور نہیں فرماتے۔ مطلب یہ ہے کہ بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔ اگر حد سے تجاوز نہ کیا جائے تو شریعت میں درست ہے وَلٰکِنْ یَعْفُوْ وَیَغْفِر لیکن وہ معاف فرماتے' چھپاتے اور بخشش کی دعا مانگتے ہیں بلکہ احسان فرماتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ خود ہی ارشاد فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ وَلَا یَقْبِضُهُ اللّٰهُ بدی سے جو بہت اچھی ہو اس سے دور کرو اور اللہ روح قبض نہیں فرمائے
حَتّٰی یُقِیْمُ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ گا جب تک آپ کے ذریعہ ٹیڑھے لوگ سیدھے نہ ہو جائیں۔

اور یہ کج رو اور ٹیڑھے لوگ کلمہ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ کر سیدھے ہو جائیں۔ وَ یَفْتَحُ بِهٖ اَعْیُنًا عُمْیًا اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اندھی آنکھوں کو بینا فرمائے گا وَاٰذِ انًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا۔ اور بہرے کان اور دلوں کے پردے کھولے گا۔ اس حدیث میں بعض روایتوں میں اتنا زیادہ مروی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: اَسُدُّهٗ بِکُلِّ جَمِیْلٍ میں نے انہیں ہر خوبو اور خصلت کے ساتھ درست فرمایا ہے۔ صراح میں سداد کے معنی راست گفتاری اور راست کرداری کے ہیں وَاهِبٌ لَّهٗ کُلَّ خُلْقٍ کَرِیْمٍ اور میں نے ان کو ہر اچھی خصلت عطا فرمائی ہے: وَاَجْعَلُ السَّکِیْنَةَ لِبَاسُهٗ وَالْبِرَّ شِعَارَهٗ اور آرام و اطمینان کو ان کا لباس بنایا۔ جو انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اور نیکی اور بھلائی کو ان کی علامت شعار بنایا۔ مانند اندرونی کپڑے کے جو آپ کے ساتھ چسپاں ہے: وَالتَّقْوٰی ضَمِیْرُهٗ اور پرہیز گاری کو ان کا ضمیر اور ان کا دل بنایا ہے۔ اس لیے کہ تقویٰ کی جڑوں میں ہوتی ہے اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا: اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا۔ سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تقوی کی جگہ یہ ہے۔ اس کو ضمیر کے ساتھ تعبیر فرمایا کیونکہ ''اضمار'' دل میں بات چھپانے کو کہتے ہیں۔ وَالْحِکْمَةَ مَعْقُوْلَهٗ اور میں نے حکمت کو ان کی عقل مبارک بنایا۔ حکمت نام ہے اشیاء کے احوال کو جس طرح نفس الامر میں ہے۔ جاننے کا اور اس کے معنی راست گفتاری اور راست کرداری میں بھی آیا ہے۔ وَالصِّدْقَ وَالْوَفَاءَ طَبِیْعَتَهٗ اور میں نے سچائی اور ایفائے عہد کو ان کی طبیعت بنائی۔ والعفو والمعروف خلقه درگزر فرمانا اور نیکی کا حکم کرنا ان کی خصلت رکھی وَالْعَدْلَ سِیْرَتَهٗ وَالْحَقَّ شَرِیْعَتَهٗ وَالْهُدٰی اِمَامَهٗ وَالْاِسْلَامَ مِلَّتَهٗ اور میں نے انصاف یا میانہ روی کو ان کی سیرت اور حق کو ان کی شریعت اور ہدایت کو ان کا امام اور اسلام ان کی ملت بنائی۔ و احمد اسمه ان کا اسم گرامی احمد ہے۔ حضور اکرم ﷺ پچھلی امتوں میں محمد و احمد دونوں ناموں سے یاد کیے جاتے تھے۔ وَاَهْدِیْ بِهٖ بَعْدَ الضَّلَالَةِ۔ اور میں نے ان کے ذریعہ گمراہی کے بعد راہ راست دکھائی وَاَعْلَمَ بِهٖ بَعْدَ الْجَهَالَةِ اور جہالت کے بعد ان کے ذریعہ مینارۂ علم روشن فرمایا وَاَرْفَعْ بِهِ الْخِمَالَةَ۔ اور ان کے ذریعہ مخلوق کو پستی سے بام عروج پر پہنچایا۔ وَاَسْمٰی بِهٖ بَعْدَ النَّکِرَةِ۔ اور ان کو بلند کیا اور شناسا کیا۔ جہالت اور ناشناسائی کے بعد ان کے ذریعہ وَاَکْثَرَ بِهٖ بَعْدَ الْقِلَّةِ۔ اور کمی کے بعد انہیں زیادہ کیا ان کے ذریعہ۔ وَاَغْنٰی بِهٖ بَعْدَ الْعَیْلَةِ۔ اور ان کے ذریعہ انہیں بے نیاز کیا۔ فقر و احتیاج کے بعد وَاَلَّفَ بِهٖ بَیْنَ قُلُوْبٍ مُّخْتَلِفَةٍ وَّاَهْوَاءٍ مُّتَشَتِّةٍ وَاُمَمٍ مُّتَفَرِّقَةٍ۔ اور مختلف دلوں' پراگندہ خیالوں اور جدا جدا ٹولوں کے درمیان ان کے ذریعہ الفت و محبت پیدا فرمائی۔ وَجَعَلَ اُمَّتَهٗ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور بنایا ان کی امت کو بہترین امت ان سب میں جتنی لوگوں میں امتیں نکالیں گئیں۔ صلی اللّٰه علیه وسلم وعلیٰ آله واصحابه اجمعین۔

باب سوم

دربیان فضل وشرف از آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ

اس باب میں حضورِ اکرم ﷺ کے ان فضل وشرف کا بیان ہے جو آیات قرآنیہ سے ثابت اور احادیث صحیحہ سے حاصل ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں نبی ﷺ کی عظمت وتعظیم امر، علوشان، توقیر ہتی، اور آپ کی مدح وثنا صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ پہلی دلیل کلمہ ''شاہد'' ہے جو رفعت مقام علوم مرتبت، عظمت شان اور حفظ ادب پر صادق ہے۔ اور دلالت کرتا ہے کہ کوئی بزرگی، آپ کی بزرگی کے برابر اور کوئی قدر آپ کی قدر کے مساوی نہیں ہے۔ کتنی عظیم قدر ومنزلت ہے جس کی مدح وثنا پروردگارِ عالم مالک عرش عظیم فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں حضورِ اکرم ﷺ کے صفات، مراتب اور درجات کی جو تفصیلات ہیں ان کو حد وشمار میں لانا ناممکن ہے۔ پہلی وہ آیۃ کریمہ جو حضور ﷺ کے وجود رسالت، شفقت اور آپ کی رحمت کی خبر دیتی ہے اور بشارت بخشتی ہے۔ وہ یہ کہ فرمایا۔

لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌO	بیشک تشریف لایا تمہیں میں سے وہ رسول جن کو تمہاری مشقت میں پڑنا گراں ہے۔ تمہاری فلاح کے خواہشمند مسلمانوں کے ساتھ بہت مہربانی ورحمت فرمانے والے ہیں۔

مطلب یہ کہ تمہارے پاس اس نبی کریم کی تشریف آوری تمہارے ہی قبیل اور تمہاری ہی جنس سے ہے۔ اور تم ان کے صدق وامانت کے مقام ومرتبہ کو خوب جانتے ہو اور تمہارے درمیان وہ کبھی بھی متہم بالکذب نہ ہوئے اور تم ان کے آباؤ واجداد کو بھی جانتے ہو کہ وہ عرب میں سب سے اشرف، افضل، ارفع اور طاہر ومطہر تھے کہ ان میں نہ سفاح (فحاشی وزناکاری وغیرہ تھی)۔ اور نہ جہالیت کی خباثتیں۔ چنانچہ فرمایا: اُخْرِجَتْ مِنَ الْاَصْلَابِ الطَّاهِرَاتِ اِلَی الْاَرْحَامِ الطَّاهِرَاتِ یعنی مجھے اصلاب طاھرہ سے ارحام طاہرہ کی طرف منتقل کر کے عالم ظہور میں لایا گیا۔ اور تم ان کے شرف ذاتی؛ محامد صفاتی، عظایم اخلاقی اور محاسن افعالی کو دیکھتے رہے ہو۔ بعد ازاں ان کے بعض صفات کریمہ کو بیان بھی کرتے رہے ہو۔ اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتا ہے ان پر تمہارا مشقت میں پڑنا اور دنیا وآخرت میں تمہارا زیاں کار ہونا سخت دشوار ہے۔ یہ تمہاری رشد وہدایت پر غایت حرص اور نہایت ہمت رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ کمال رافت ورحمت اور شفقت ومہربان رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ.	بیشک اللہ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا کہ انہیں میں سے ان میں رسول کو مبعوث فرمایا۔

اور فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ	خدا کی یہ شان ہے کہ اس نے امیوں میں انہیں میں سے رسول کو

مبعوث فرمایا۔

اور فرمایا:

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ جیسا کہ ہم نے بھیجا تم میں رسول تمہیں میں سے۔

اور انہیں کی جنس سے رسول کا بھیجنا' انسیت' تصدیق' ایمان واتباع اور امتنان میں زیادہ داخل واقرب ہے۔

سیّدنا امام جعفر صادق سلام علیہ اللہ علیہ وعلی آباء الکرام فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ اپنی معرفت وطاعت میں مخلوق کے عجز کو جانتا ہے۔ اس نے چاہا کہ معرفت کرائی جائے اور تعلیم دیجائے تو اس نے ان کے مابین ایسی مخلوق پیدا فرمائی جو انہیں جنس سے ہے۔ اور اپنی صفت میں رحمت ورافت کا لباس پہنا کر ان کا نام نبی صادق اور رسول برحق رکھا۔ اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے موافق گردانا۔ چنانچہ فرمایا: من يطع الرسول فقد اطاع الله جس نے رسول کریم کی پیروی کی اس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور نہیں بھیجا ہم نے مگر سارے جہاں کے لیے رحمت (انتہی کلام الامام)

حق تعالیٰ نے آپ کے ذاتی وجود کو اور آپ کے شمائل وصفات کو تمام مخلوق پر رحمت بنا کر بھیجا۔ لہٰذا جسے بھی رحمت کا حصہ پہنچا۔ اس کے نصیب میں دنیا وآخرت میں نجات ملی۔ اور ہر برائی سے محفوظ رہا۔ اور محبوب حقیقی سے واصل وفائز المرام ہوا۔ جیسا کہ کتاب الشفا میں ہے اس تقدیر سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا مومنوں پر رحمت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ مظہر ومصدر رحمت ہیں۔ اگر کوئی انکار وعناد اور استکبار کے مرض میں مبتلا ہو کر شقاوت وضلالت اور حرمان وخذلان میں پڑا رہے تو اس کا اپنے اوپر ہی ظلم ہوگا۔

یہ تقریر اس توجیہ کے موافق ومطابق ہے جو اس ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر میں کی گئی ہے کہ فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (ہم نے انسان کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ عبادت کریں) مفسرین فرماتے ہیں کہ ان کا اس صورت پر پیدا فرمانا کہ وہ عبادت کی طرف متوجہ ہوں گویا ان میں ایسی صلاحیت واستعداد رکھی گئی ہے کہ وہ عقلوں کے ذریعہ غور وفکر کریں۔ اور عقل ہی غلبہ غضبیہ کے لیے روک اور مانع ہے۔ اور عقل ہی اسباب وآلات اور اجسام منقادہ اور تمام اسباب عبادت کے ایجاد کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا حضورِ اکرم ﷺ مسلمانوں کے لیے بالفعل اور تمام لوگوں کے لیے بالقوہ رحمت ہیں۔ اور بعض سب کے لیے بالفعل رحمت شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مومن کے لیے رحمت ہیں ہدایت کا ذریعہ اور منافق کے لیے رحمت ہیں قتل سے امان کے سبب اور کافروں کے لیے رحمت ہیں عذاب سے تاخیر ہونے کی وجہ سے۔ دنیا میں ان پر عذاب کی جلدی کرنا اور حضور ﷺ کا ان کو قتل ونہب کرنا اور مفسدوں کو ہلاک کرنا بھی رحمت ہے۔ کیونکہ اس میں نظام عالم اور درستی واصلاح کا ترتب موقوف ہے۔ جس طرح کہ درخت سے خراب خشک شاخوں کا کاٹنا کہ وہ دیگر شاخوں کی درستگی واصلاح اور پھل لانے کا سبب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ مسلمانوں کے لیے بھی رحمت ہیں۔ اور کافروں کے لیے بھی۔ اس لیے کہ انہیں سلامت رکھا ہے اس عذاب سے جو ان کے سوا جھٹلانے والی امتوں کو پہنچا تھا۔

احادیث میں مذکور ہے کہ حضورِ اکرم خدا کی یہ شان ہے کہ اس نے امیوں میں انہیں میں سے رسول کو نے حضرت جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہیں بھی میری رحمت کا حصہ ملا ہے۔ عرض کیا ہاں! میں خوفزدہ رہتا تھا اپنے انجام سے اب میں بیخوف ہوگیا ہوں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں (جو کہ آپ پر نازل ہوا) میری تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا: ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ قوت والا عرش کے پاس مقیم' اطاعت گزار' وہاں امانتدار اور جبریل علیہ السلام کا یہ خوف' بارگاہ قدس کی شان بے نیازی کی وجہ سے ہے جو کہ مقربان بارگاہ سے کبھی بھی جدا نہیں ہوسکتا۔

عرفاء فرماتے ہیں کہ جس دن سے ابلیس ملعون راندۂ درگاہ ہوا۔ عالم ملکوت کے رہنے والوں کا سکون جاتا رہا۔ ہمیشہ خوف زدہ رہنے لگے۔ اگرچہ بموجب وعدہ صادق امن وسکون میں رہنے کا بھروسہ ہے۔ جیسا کہ صحابہ کرام کے اصحاب مشورۃ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ ''کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ ڈالا جاتا۔ اور کوئی کہتا ہے ''کاش میں گوسفند ہوتا کہ لوگ ذبح کر کے کھاجاتے''۔

فائدہ: انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے یہ اقوال کہ لَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (میں خوف نہیں کرتا اس سے جسے تم شریک گردانتے ہو مگر یہ کہ اللہ چاہے۔) اور یہ کہ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبُّنَا. (اور نہیں ہے ہمارے لیے یہ کہ ہم اس میں محفوظ رہیں مگر یہ کہ میرا رب چاہے) یہ اسی قبیل سے ہیں۔

صاحب کشاف زمخشری کا اس آیت سے حضورِ اکرم ﷺ سے جبریل کی افضلیت پر تمسک واستدلال کرنا کتنا ضعیف وکمزور ہے وہ اتنا نہ جان سکا کہ جبریل علیہ السلام کو یہ صفات حضورِ اکرم ﷺ کی رحمت کے طفیل میں حاصل ہوئی ہیں۔ اور اتنا نہ سمجھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کو جتنا کمال صفت حاصل ہے اس کے پہلو میں جبریل علیہ السلام کی یہ صفت ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مضمحل اور کم حیثیت ہے اور جبریل علیہ السلام کی صفات گنتی کی ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کی صفات کا تو احصار وشمار دشوار اور ناممکن ہے۔

نیز یہ کہ دو شخص میں سے کسی ایک میں کسی خاص صفت کے بیان کرنے سے لازم نہیں آتا کہ دوسرے شخص میں بھی وہ صفت نہیں ہے۔ ہاں اقتضائے مقام کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ ان کی فضلیت قرآن کریم میں۔ بیان کر کے ان کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ اور جب کہ نص قرآنی سے یہ ثابت ہے کہ حضور رحمۃ للعالمین ہیں اور ملائکہ بھی از زمرہ عالمیان ہیں تو ثابت وواجب ہوا کہ حضور ﷺ ان سے افضل ہیں۔ اور خود مفسرین رحمہم اللہ کی ایک جماعت ان صفات کو یعنی ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ کو حضورِ اکرم ﷺ پر محمول کرتے ہیں اور اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (یہ عزت والے رسول کا فرمان ہے) میں رسول کریم سے مراد حضورِ اکرم ﷺ کو قرار دیتے ہیں۔

بعض علماء حضورِ اکرم ﷺ کے وجود گرامی سے اجزائے عالم میں رحمت کے حاصل ہونے کے بارے میں کہتے ہیں کہ مٹی کو آپ کی رحمت یہ ملی کہ وہ مطہر یعنی پاک کرنے والی ہوگئی اور پانی کو طوفان سے روک دیا گیا۔ اور ہوا شیاطین کے راستے سے سلامت ہوگئی اور آندھی کے ذریعہ کفار کو ہلاک کرنے سے محفوظ ہوگئی اور آگ صدقات کے جلانے سے بچ گئی۔ اور آسمان شیاطین کا اس تک پہنچنے اور باتوں کو چوری چھپے سننے سے محفوظ ہوگیا۔

ایک شخص نے اس بندہ مسکین (یعنی شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ) سے دریافت کیا کہ ابلیس کو اس رحمت سے کیا چیز ملی۔ میں نے جواب دیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے دبدبہ، شوکت ہیبت اور حقانیت کے صدمے اور جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (حق آیا اور باطل نابود ہوا) ورحسب ارشاد باری تعالیٰ: فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ تو اس سے ملعون کا وجود ناپید ونابود ہو جاتا۔ اور قیامت تک اس کے باقی رہنے کے لیے انتظار کا حکم جو واقع ہے وہ متغیر ومنسوخ ہو جاتا۔ لہٰذا یہ رحمت ہی کا اثر ہے کہ وہ باقی رہا۔

بیان نور وسراج: حق سبحانہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کا اسم گرامی انتہائی روشن اور منور ہونے کی بناء پر نور اور سراج منیر رکھا۔ اس لیے کہ آپ کے ذریعہ قرب ووصال حق کا۔ طریقہ روشن وظاہر ہوا اور آپ کے جمال وکمال سے آنکھوں میں بینائی اور روشنی حاصل ہوئی۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ ○ بیشک تمہارے پاس اللہ کی جانب سے نور اور روشن کتاب آئی۔

اورفرمایا:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اے نبی! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا (حاضر و ناظر) بشارت دینے والا' ڈرانے والا' اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بھیجا۔

علماء فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو چراغ (سراج) سے تشبیہ دی۔ باوجودیکہ تشبیہ میں مبالغہ شمس وقمر سے زیادہ ہے۔ چراغ سے تشبیہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ آپ کو وجود عنصری ارضی ہے۔ دوسری حکمت یہ کہ چراغ اپنا قائم مقام بناتا ہے۔ چنانچہ ایک چراغ سے لاکھوں چراغ روشن کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے برعکس چاند وسورج قائم مقام نہیں رکھتے۔ بیت

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمن ساختہ اند

بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ حق تعالیٰ نے جو سراج سے تشبیہ دی ہے اس سے مراد تشبیہ ہے تو بعید نہ ہوگا اس لیے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آفتاب کو سراج فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: وَجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا (اور بنائے آسمان میں آفتاب و ماہتاب روشن) اور فرمایا وجعلنا سراجاً وهاجا اور بنایا آفتاب کو چمکتا دمکتا) لہٰذا جس طرح عالم اجسام میں آفتاب افادہ نور کرتا ہے اور اپنے غیر سے مستفید نہیں ہے۔ اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ کی ذات قدسی تمام نفوس بشریہ کے لیے افادہ انوار عقلیہ فرماتا ہے اور بجز ذات باری تبارک وتعالیٰ کے کسی سے استفادہ نہیں فرماتا۔ اس اعتبار سے کہ حضور ﷺ کی ذات الٰہی سے استفادہ فرماتے ہیں۔ اگر چاند سے تشبیہ دی جائے تو بھی درست ہوگا۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اور حضورِ اکرم ﷺ کو "نور" فرمانے میں اپنے اس ارشاد سے تلمیح ہے کہ "اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ لہٰذا آسمان وزمین میں نہیں ہے مگر نور الٰہی جو تمام موجودات میں ہویدا ہے اور وہی وجود حیات کا مالک ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کا جمال وکمال اس نور الٰہی کا مظہر اتم ہے اور اس کے ظہور کا واسطہ ہے چنانچہ "مَثَلُ نُوْرِهٖ الایہ" کی تفسیر میں مفسرین کہتے ہیں کہ قلب محمدی ﷺ میں میں ایمان کی مثال' اس مشکوٰۃ کی مانند ہے جس میں شمع روشن ہو۔ مشکوٰۃ' آپ کے صدر مبارک کی مثال ہے اور زجاجہ' آپ کے قلب اطہر کی مثال ہے اور مصباح' آپ کے قلب شریف میں جو نور معرفت وایمان ہے اس کی مثال ہے۔

اور فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کیا ہم نے آپ کا انشراح صدر نہ فرمایا

آپ کے انشراح صدر میں جو عظیم نعمت ہے۔ اس نعمت کے اظہار احسان کے لیے فرمایا گیا اس سے مراد حضورِ اکرم ﷺ کے سینہ مبارک کی وسعت وکشادگی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ سے تمام مناجات ودعوت خلق کے مابین' معارف کے انوار اور علوم' توحید' معرفت اور عجیب وغریب اسرار اور جہل ونکرت کی تنگی اور اعراض عن الحق اور اس کے ماسویٰ سے عدم تعلق خاطر اور القائے وحی میں آسانی اور رسالت وتبلیغ کے بارہائے گراں کے برداشت کی طاقت مرحمت فرمانے کے لیے ہے۔ چنانچہ فرمایا:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ○ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ○

اور ہم نے آپ سے اس بوجھ کو دور کر دیا جس نے آپ کی کمر دوہری کر رکھی تھی۔

انشراح صدر کی سب سے بڑی علت وغرض وہ نور ہے جو بندہ کے دل میں تاباں ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَاِذَا دَخَلَ النُّوْرُ الْقَلْبَ اِنْفَسَحَ وَانْشَرَحَ اور جب نور دل میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اسے کشادہ اور وسیع کر دیتا ہے اور اس کی بہترین خوبی یہ ہے کہ وہ دل کو صفات ذمیمہ اور بری خصلتوں سے پاک وصاف کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس صفت میں سب سے کامل واتم اور اعلیٰ وافضل'

سید السادات فخر موجودات ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ اور آپ کی متبعین میں بقدر متابعت و محبت ان کو بھی اس میں سے حصہ ملتا ہے۔ اس بحث کو تفصیل کے ساتھ کتاب ''سفر السعادۃ'' اور بعض رسائل فارسیہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ہم نے آپ کے نام اور آپ کے ذکر کو دنیا و آخرت میں نبوت و شفاعت کے ساتھ بلند فرمایا ہے۔ اور آپ کے اسم گرامی کو اپنے اسم جلالت کے ساتھ کلمہ اسلام اذان، نماز اور تمام خطبات میں شامل و جزو قرار دیا۔ کوئی خطبہ دینے والا، تشہد پڑھنے والا اور نماز ادا کرنے والا ایسا نہ ہوگا جو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ. نہ کہے۔

حضرت ابو سعید خدری ؓ کی حدیث میں ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا جبریل نے آ کر عرض کیا کہ پروردگار عالم فرماتا ہے آپ جانتے ہیں کہ کس چیز کے ساتھ آپ کے ذکر کو میں نے بلند فرمایا ہے۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے کہا اس طرح پر کہ اِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتُ مَعِيَ۔ جب آپ کا ذکر ہو تو میرے ساتھ ذکر کیا جائے۔ اور میں نے پورے ایمان کو آپ کے ذکر کے ساتھ اپنے ذکر کی معیت میں لازم کیا ہے۔ یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور کہا۔ میں نے آپ کے ذکر کو اپنا ذکر، آپ کی اطاعت میری ہی اطاعت ہوگی۔ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. جس نے رسول کی پیروی کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور آپ کی متابعت کو اپنی محبت کا مستلزم قرار دیا۔ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ فرمادو میرا اتباع کرو۔ اللہ تمہیں محبوب بنا لے گا۔

ندا بذکر صفات: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور اکرم ﷺ کی جو قدر و منزلت اور اعزاز و اکرام ہے اس کا اثر یہ ہے کہ حق تعالیٰ ندا کے وقت آپ کو وصف نبوت اور رسالت کے ساتھ مخاطب فرماتا ہے چنانچہ فرمایا: يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ (اے نبی! اے رسول! ﷺ) اور دیگر تمام نبیوں کو ان کے ناموں کے ساتھ یاد فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ یا آدم، یا نوح، یا موسیٰ یا عیسیٰ اور يَآاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (اے جھرمٹ مارنے والے! يَآاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ. (اے چادر اوڑھنے والے!) جیسے محبت آمیز الفاظ سے مخاطب فرمانا یہ ارباب ذوق اور اہل محبت پر ظاہر ہے کہ اس میں کتنی محبت، پیار اور مہربانی جلوہ گر ہے۔ ابو نعیم نے بروایت سیّدنا ابو ہریرہ ؓ، نقل کیا کہ فرمایا جب آدم علیہ السلام کو زمین ہند میں اتارا گیا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ جبریل علیہ السلام نیچے آئے۔ اور اذان شروع کی اور کہا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ دوبار اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دوبار وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ دوبار آخر حدیث تک۔ اور آپ کا اسم شریف عرش پر، ہر آسمان پر جنت میں ہر جگہ اور حوروں کی گردنوں میں لکھا ہوا ہے۔ اور جنت میں کوئی درخت ایسا نہیں ہے جس کے پتے پتے پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ نہ لکھا ہو۔

بزار بروایت سیّدنا ابن عمر ؓ نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا تو کوئی آسمان نہ گزرا مگر یہ کہ میں نے اپنا نام وہاں پایا وہاں لکھا تھا۔ ''محمد رسول اللہ'' اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اسم گرامی سے آپ کے نام کو مشتق فرمایا جیسا کہ حسان بن ثابت فرماتے ہیں۔ ع فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَّهٰذَا مُحَمَّدٌ لہٰذا صاحب عرش کا نام محمود ہے۔ اور آپ کا نام محمد ﷺ اور یہ کہ حق تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنیٰ میں سے ستر ناموں کو حضور ﷺ کے نام سے موسوم فرمایا جیسا کہ انشاء تعالیٰ اسماء شریف کے باب میں آئے گا۔

حق تعالیٰ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قسم یاد فرمانا: وصل: حضورِ اکرم ﷺ کے مناقب جلیلہ میں سے حق تعالیٰ اسمہ کا آپ کی عظمت اور قدر و منزلت کی قسم یاد فرمانا ہے۔ چنانچہ فرمایا: لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ قسم ہے آپ کی عمر کی، بے شک یہ اپنے نشے میں بہک رہے ہیں جمہور مفسرین کا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کی مدت حیات و بقا کی قسم یاد فرمائی ہے۔ اس میں انتہائی تعظیم اور غایت درجہ احسان و بزرگی ہے جس طرح محبّ اپنے محبوب کی قسم کھاتے وقت کہتا ہے تیرے سر کی قسم، تیری زندگی کی

قسم وغیرہ۔

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک کوئی ذات' حضورِ اکرم رسولِ خدا ﷺ سے زیادہ گرامی تر پیدا نہ فرمائی۔ کیونکہ اس نے آپ کی حیات طیبہ کی قسم یاد فرمائی حالانکہ کسی اور کی ذات اور اس کی حیات کی قسم نہ فرمائی۔

اور ابوالجوزاء جو کہ بزرگ ترین تابعین میں سے ہے فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کسی کی ذات کی قسم یاد فرمانا بجز سیّد عالم محمد ﷺ واقع نہیں ہے۔ اس لیے اس کے نزدیک آپ کی ذات گرامی ساری مخلوق سے بزرگ تر اور افضل ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی قسم یاد فرمانا بیان صریح ہے' ہمیں کب جائز ہے کہ ہم آپ کی حیاتِ مبارکہ کی قسم کھائیں۔

فائدہ: امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جس نے نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ کی قسم کھائی اس پر ایفا واجب ہو جاتا ہے۔ اور اس قسم کے توڑنے پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کی ذات گرامی' شہادت کے دو رکنوں میں ایک رکن ہے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذات گرامی سے قسم کا رواج آج تک جاری ہے۔ اور اہل مدینہ ہمیشہ ہی حضور ﷺ کی قسم کھایا کرتے ہیں۔ اور ان کا معمول ہے وہ کہتے ہیں کہ اسی ذات کی قسم جو اس قبر انور میں پوشیدہ ہے۔ اور اس ذات کی قسم جسے اس قبر انور نے چھپایا ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ۔

اللہ تعالیٰ نے ایک قسم اس طرح یاد فرمائی کہ اپنی ربوبیت کو اپنے حبیب ﷺ کی طرف نسبت کر کے قسم یاد کی۔ جیسے ''فَوَرَبِّكَ'' قسم ہے آپ کے رب کی۔

اور ''یٰسین والقران الحکیم'' (قسم ہے حکمت والے قرآن کی) میں مفسروں کا اختلاف ہے اکثر کا مذہب یہ ہے کہ یٰس حضور ﷺ کا اسم گرامی ہے جس طرح ''طٰہٰ'' ہے۔

سیّدنا امام جعفر صادق سلام اللہ علیہ وسلم وعلی آباءٖ واولادہ الکرام سے منقول ہے کہ یٰس سے مراد حضور کا اسم گرامی اور خطاب ہے یعنی اے سید وسردار! بعض کہتے ہیں کہ لغت بنی طے میں اس کے معنی ''اے رجل!'' یا ''اے انسان!'' ہے۔ بہر تقدیر اس سے مراد ذات پاک مصطفیٰ ﷺ ہے۔ خواہ اس سے قسم مراد ہو یا ندا۔ یہ بھی آپ کی تعظیم اور علوشان کو متضمن ہے اور قرآن حکیم کے ساتھ قسم یاد کرنا۔ آپ کی رسالت کے تحقیق اور آپ کی ہدایت پر شہادت وگواہی کے لیے ہے۔ یعنی آپ صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس میں نہ کجی ہے اور نہ حق سے انحراف۔

شہر حرام کی قسم: علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کسی نبی کی رسالت کی قسم یاد نہ فرمائی بجز نبی کریم ﷺ کے۔ اور سورۃ مبارکہ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ (قسم ہے مجھے اس شہر کی کیونکہ آپ اس شہر میں تشریف فرما ہیں۔) اس میں رسول کریم ﷺ کی تعظیم وتکریم کی زیادتی ہے کہ حق تعالیٰ نے قسم کو اس شہر سے جس کا نام بلد حرام اور بلد ایمن ہے۔ مقید فرمایا ہے اور جب حضورِ اکرم ﷺ نے اس شہر مبارک میں نزول اجلال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ شہر معزز ومکرم ہو گیا۔ اور اسی مقام سے یہ مثل مشہور ہوئی کہ ''شَرَفُ الْمَكَانِ بِالْمَكِيْنِ یعنی مکان کی بزرگی رہنے والے سے ہے۔

اور آیت کریمہ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (قسم ہے والد کی اور جو ان کے فرزند ہیں ان کی قسم) میں اگر والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور ''وَمَا وَلَدَ'' سے مران ان کی نسل ہو تو حضورِ اکرم عموم نسل میں داخل ہیں۔ اور اگر والد سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ''ما ولد'' سے ان کی اولاد ہو تو حضورِ اکرم ﷺ مراد ہوں گے۔ غرض کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کی دو مرتبہ قسم یاد

فرمائی ہے۔

مواہب مدینہ میں علماء بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضورِ اکرم ﷺ سے عرض کیا بابی انت وامی یا رسول اللہ! اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں۔ آپ کی فضلیت خدا کے نزدیک اس مرتبہ تک متحقق ہو گئی ہے کہ حق تعالیٰ آپ کی زندگانی کی قسم یاد فرماتا ہے اور کسی نبی کی زندگانی کی قسم یاد نہیں فرماتا۔ اور حق تعالیٰ کے نزدیک آپ کی فضلیت اس حد تک ہے وہ فرماتا ہے ''لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ'' قسم ہے مجھے اس شہر کی یعنی اس کے زمین کی قسم یاد فرماتا ہے۔ جو آپ کے قدموں کے نیچے پامال ہوتی ہے۔ گویا کہ آپ کے خاک پا کی قسم یاد فرمائی ہے۔ ظاہر نظر میں یہ لفظ جناب باری عزاسمہ کی نظر میں سخت معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ انہوں نے کہا ''رسالت مآب کے خاک پا کی قسم یاد فرماتا ہے'' لیکن نظر بحقیقت' ہر غبار سے یہ معنی پاک وصاف ہیں اس کی تحقیق یہ ہے کہ رب العزت جل جلالہٗ کا اپنی ذات وصفات کے سوا کسی غیر چیز کی قسم یاد فرمانا' اظہار شرف وفضلیت دیگر اشیاء کی مقابلے میں اس چیز کو ممتاز کرنے کے لیے ہے جو لوگوں میں موجود ہے۔ تا کہ لوگ جان سکیں کہ یہ چیز نہایت عظمت وشرافت والی ہے تفصیل کلام یہ ہے کہ رب العزت جل وعلا نے کئی مرتبہ معتدد چیزوں پر قسم یاد فرمائی ہے۔ کبھی اپنی ذات وصفات کے ساتھ قسم یاد فرمائی اور کبھی ان بعض مخلوقات کی قسم یا کی جو ذات وصفات باری تعالیٰ کی عظمت پر دلیل ونشان کے قبل سے ہیں۔ جیسے آسمان' زمین' دن اور رات وغیرہ کہ یہ اس کی آیاتِ عظیمہ اور دلائل قدرت خارجہ میں ہیں۔ نجوم' کواکب' شمس وقمر یہ سب مطالع انوار' مظاہر اسرار اور عالم کو روشن کرنے' نسل انسانی کی مصلحتوں کو منضبط کرنے اا ور راہ معلوم کرنے کے اسباب وعلل اور شیاطین کو مار بھگانے کے موجب ہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے اسرار کے ادراک سے کوتاہ بینوں کی نظریں عاجز وقاصر ہیں۔ پرودگار علم جل جلالہٗ نے ان کی قسم یاد فرمائی ہے۔ مثلاً وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ (الآیہ) قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی۔ کون جان سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کتنی حکمتیں ودیعت فرمائی ہیں اور کتنے اسرار پنہاں ہیں۔ یہ سب اظہار فضلیت اور بہ نسبت دیگر اشیاء کے انہیں ممتاز فرمانے کے لیے ہے۔ یہی حال آدمیوں کی قسم کا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کے ساتھ قسم یاد فرمائی۔

زمانہ کی قسم: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ قسم ہے عصر کی بلاشبہ انسان یقیناً نقصان میں ہے الآیات۔

عصر کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ عصر سے مراد زمانہ ہے لیکن صراح میں ہے کہ دن رات کی گردش کا نام عصر ہے اور اسی کو دہر یعنی زمانہ بھی کہتے ہیں۔ اور دہر عجیب وغریب واقعات وحادثات پر مشتمل ہے۔ جن کے بیان احصار سے زبان قاصر ہے۔ لَا تَسَبُّوا الدَّھْرَ فَاَنَا الدَّھْرُ. (زمانہ کو برا نہ کہو۔ کیونکہ زمانہ میں ہوں) سے دہر مشرف ہے۔ اس میں خوشی وضرر' صحت وبیماری' آفات وخطرات' برکات وکمالات توام ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُو الصّٰلِحٰتِ
بلاشبہ انسان نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک کام کیے۔

لہٰذا حق تعالیٰ نے اس جگہ رسول کریم ﷺ کے زمانے کی قسم فرمائی ہے۔ جس طرح لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ (قسم ہے مجھے اس شہر کی) میں آپ کے مکان کی اور ''لَعَمْرُكَ'' میں آپ کی زندگانی کی قسم فرمائی گئی ہے اور الم کی تفسیر میں بھی کئی قول ہیں ایک قول یہ ہے: الف سے مراد اللہ کی طرف اشارہ کرنا اور لام سے جبریل اور میم سے محمد ﷺ مراد ہیں۔ اور ''ق'' میں ایک قول کے بموجب اس سے قلب محمد ﷺ کی قوت ہے۔ اس بناء پر کہ مشاہدہ ومکالمہ میں آپ تحمل فرماتے ہیں۔ اور ''وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی'' (قسم نجم کی کہ جب اترے) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''النجم'' سے مراد قلب محمد ﷺ ہے اور ''اذھوی'' سے انشراح صدر بالانوار اور انقطاع عن غیر اللہ

مراد ہے۔ اور ہویٰ کے معنی اترنے کے بھی آتے ہیں۔

اور سورۂ ''والفجر'' (قسم ہے صبح روشن کی) تفسیر میں کہتے ہیں فجر سے مراد حضورِ اکرم ﷺ ہیں کہ آپ سے نور کی جھڑیاں برستی ہیں اور قول حق سبحانہ وتعالیٰ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (اور کچھ تم نے جانا وہ رات کو آنے والا کیا ہے خوب چمکتا ہے تارا) اس سے بھی مراد حضور ﷺ کی ذات قدسی لیتے ہیں۔ اور سورۂ نون میں نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ. (قسم ہے قلم کی اور جو وہ لکھے۔) حق تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ سے نفی جنون پر قسم یاد فرمائی ہے اور ثبوت ''اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ'' یعنی غیر مقطوع اجر یعنی نہ ختم ہونے والا اجر ثابت ہے اور خلق عظیم پر آپ کا ثبات استقرار ثابت ہے۔ ''نون'' اسماء حروف سے ہے جس طرح الم وغیرہ یا تو یہ سورتوں کے نام ہیں یا یہ اسماء الٰہی میں سے ہیں۔ جیسا کہ حروف مقطعات کی تاویل میں مفسرین کے اقوال ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نون مچھلی کا نام ہے۔ اور وہ مچھلی مراد ہے جس کے لیے اوپر زمین ہے اور اس کا نام بہموت ہے۔

سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا نون سے مراد دوات ہے لہٰذا دوات وقلم اور جو کچھ وہ لکھے کہ اس کی منفعت بہت عظیم ہے اور ایک قول یہ ہے کہ نون، نور کی ایک تختی ہے جس پر فرشتے قلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو انہیں حکم فرمائے لکھتے رہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ قلم یکے از آیات الٰہی ہے۔ اور اولین مخلوقات میں سے ہے۔ اور اس کے ذریعہ حق تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں قلم بند کرائیں۔

فائدہ: اس جہان کا قلم، اسی قلم کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کے ساتھ خدا کی شریعت اور حق تعالیٰ کی وحی لکھی جاتی ہے۔ اسی کے ذریعہ دین وملت کو احاطہ میں لایا جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ علوم کو منضبط اور تدوین کیا جاتا ہے۔ پچھلوں کی خبریں اور ان کے مقالات اس سے قلم بند کیے جاتے ہیں اور اس کے ذریعہ نازل کردہ کتابیں اور آسمانی صحیفے لکھے جاتے ہیں۔ اگر قلم نہ ہوتا تو دنیا وآخرت کے امور دینی اور دینوی برقرار نہ رہتے۔ صاحب کشاف نے تفسیر سورۂ اقراء اور دربیان عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (سکھایا قلم سے) میں لکھتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی دقیق حکمتوں اور اس کی لطیف تدبیروں پر قلم اور خط کے سوا دوسری کوئی دلیل نہ ہوتی تو یہی کافی ہوتا اور قلم کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ حمد الٰہی اور لغت مصطفوی، کتاب اللہ کی تفسیر، رسول اللہ کی حدیثوں کی شرح، اولیاء کرام کے مقالات اور ان کی نصیحتیں لکھی گئی ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ○	تو افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ ان سے کچھ رقم لے سکیں۔ افسوس ہے۔ ان کے لیے جو وہ کمائیں۔

اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا:

وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (اعاذنا من ذلك)	اور کہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ اور کہتے ہیں اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ میں رکھے۔ آمین)۔

کفار، غایت جہل وحماقت اور عناد وتکبر سے حضورِ اکرم ﷺ کی طرف جنون وغیرہ کو منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کے معارضہ ومقابلہ میں کفار کے تمام عقلاء وفصحاء عاجز آ گئے تھے۔ حبیب خدا ﷺ نے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے وہ کچھ سیکھا اور سمجھا جہاں تک تمام عالم کی عقلوں کا گزر نہ ہو سکتا تھا اور آپ وہ کتاب لے کر تشریف لائے جس کے مقابلہ ومعارضہ سے فصحاء وبلغا عاجز رہ گئے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس عطا کی تعریف وثنا فرمائی جو اس کے تمام عطیوں میں سب سے عظیم ہے۔ فرمایا: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ بلاشبہ آپ کی خو بو بہت بڑی ہے۔ یہ آپ کی نبوت ورسالت کی سب سے بڑی نشانیوں میں سے ہے۔ سیّدہ عائشہ خلق عظیم کی تفسیر میں

فرماتی ہیں: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن آپ کا خلق قرآن تھا۔

تکریم وتنزیہہ اور تعظیم الٰہی وعدہ اعطائے نعم: اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی قدر ومنزلت آپ کی تعظیم وتکریم اور تنزیہہ وپا کی پر مشتمل ہے۔ یہ اس کی نعمتوں اور رحمتوں پر دلالت کرتی ہے۔ اور نعمت غیر متناہی عطا فرمانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ''سورۃ الضحیٰ'' میں حق تعالیٰ نے دن اور رات کی قسم یاد فرمائی۔ جو کہ مظہر آیات الٰہی ہیں۔ اور اس میں اپنے حبیب ﷺ کے دنیا وآخرت میں احوال شریف کی خبر دی گئی ہے۔ فرمایا: مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى اے حبیب! آپ کو آپ کے رب نے نہ چھوڑا۔ اور نہ دشمن بنایا جب سے کہ آپ کو برگزیدہ فرمایا۔ مفسرین ''ضحیٰ'' کو آپ کے روئے عالم آراء ہے اور ''دلیل'' کو آپ کے گیسوئے عنبرین سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ امام فخر الدین نے نقل کیا ہے۔ اس سورت کے بہ سلسلہ شان نزول اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک سلسلہ وحی کسی سبب یا کسی مصلحت کے بناء پر بند رہا۔ اس پر مشرکین چہ مگوئیاں کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان کے رب نے محمد کو چھوڑ دیا اور ان کو دشمن بنا دیا (معاذ اللہ) وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى اور آپ کی مرنے کی گھڑی پچھلی سے افضل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہر آن مراتب، درجات اور وہ نعمتیں جو حق تعالیٰ نے آخرت میں رکھی ہیں مثلاً شفاعت ومقام محمود وغیرہ۔ وہ دنیا میں عطا کردہ نعمتوں سے بہتر وعالی تر ہیں۔ کیونکہ دنیا اپنی تشنگی اور گنجائش نہ رکھنے کی بنا پر اس کی جگہ نہیں رکھتی اِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا. جب آپ دیکھیں گے تو اس جگہ بڑی بڑی نعمتیں اور بہت بڑا ملک دیکھیں گے۔

یا یہ کہ آپ کے امر کی انتہا، ابتدا سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ آپ کی ہر گھڑی، مراتب کمال اور فیضان عطا کس ترقی وعروج پر ہے۔ اور دنیا وآخرت میں جود وکرم اور بخشش وعطا اور وجوہ کرامت، انواع سعادت میں یہ آیۃ کریمہ جامع ہے کیونکہ فرمایا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى. عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے حبیب ﷺ سے وعدہ کیا جا رہا ہے کہ میں آپ کو اتنا عطا کروں گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ اس کا بیان حد وشمار اور حصر واحصار سے باہر ہے۔ اور شفا شریف میں بعض اہل بیت نبوت سلام علیہ علیہم اجمعین سے منقول ہے کہ قرآن کریم میں اس آیت سے زیادہ کوئی دوسری آیت موجب رضا نہیں ہے اس لیے کہ حضورِ اکرم ﷺ اس وقت تک راضی نہ ہوں گے۔ جب تک کہ ایک ایک امتی کو آتش دوزخ سے نہ نکال لیں۔

بندہ مسکین یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو بیشک اللہ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔

بھی موجب رجا اور باعث امیدواری ہے۔

فائدہ: لیکن یہ آیت گناہوں کی مغفرت پر منحصر ہے اور وہ آیت یعنی وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى رفع درجات اور حصول مراتب کی امید رکھنے میں بہت ہے۔ بُشْرٰى لَنَا مَعْشَرَ الْاِسْلَامِ اے گروہ مسلمان! ہمارے لیے خوشی ہو۔

اِنَّ لَنَا مِنَ الْعِنَايَةِ رُكْنًا غَيْرَ مُنْهَدِمٍ بیشک ہمارے لیے عنایت کا ایسا کنارہ ہے جو غیر متزلزل ہے۔ صاحب مواہب الدنیہ پر تعجب ہے کہ انہوں نے کہا یہ جو جاہل لوگ ''حضورِ اکرم ﷺ پر افترا کرتے ہیں کہ حضور اپنے کسی امتی کو دوزخ میں داخل کیے جانے پر راضی نہ ہوں گے۔'' یہ شیطان کا دیا ہوا فریب ہے وہ ان کے ساتھ کھیل وتمسخر کرتا ہے۔ اس لیے کہ حضورِ اکرم ﷺ ہر اس چیز پر راضی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ عز وجل راضی ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ گناہ گاروں کو دوزخ میں رکھے گا۔ اور رسولِ خدا ﷺ خدا کو اور اس کے حق کو

خوب پہچانتے ہیں۔ وہ اس سے بری ہیں کہ وہ خدا سے یہ کہیں کہ میں اس پر رضا مند نہیں ہوں کہ میری امت میں سے کسی کو دوزخ میں داخل کرے یا اس کا وہاں ٹھکانہ بنا دے۔ بلکہ رب العزت حضور کو شفاعت کا اذن دے گا۔ لہٰذا حضور ہر اس شخص کی شفاعت کریں گے۔ جسے خدا چاہے گا۔ حضور اسی شخص کی شفاعت کریں گے۔ جس کے بارے میں اذن و رضا حاصل ہوگی۔ انتہی کلامہ۔

پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے کہ شفاعت والی حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ مختلف گناہگاروں لوگوں مثلاً زنا کار، چوری کرنے والے اور شراب پینے والے وغیرہ کی شفاعت کریں گے۔ پھر ان میں سے وہ لوگ باقی رہ جائیں گے۔ جنہیں رائی کے دانہ کے برابر یا حبہ کے برابر ایمان ہوگا۔ اور کوئی نیکی بجز رائی کے برابر ایمان کے نہ ہوگی۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرے بندے ہیں اور میرے خاص ہیں ان کے لیے اپنے آپ سے شفاعت کروں گا تو وہ بخشے جائیں گے اور دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ یہ سب حضور ہی کی شفاعت کبریٰ کا ثمرہ ہوگا۔ ﷺ

فائدہ: یہ ظاہر ہے کہ شفاعت باری تعالیٰ کے اذن اور رضا کے بغیر نہ ہوگی لیکن حق تعالیٰ اپنے اس وعدہ کے بموجب جو دنیا میں آپ کے راضی کرنے کا دیا ہے۔ شفاعت کا اذن اور رضا مرحمت فرمائے گا۔ اور مواہب لدنیہ جس کا قول نقل ہوا ہے اس کی مراد دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لیے ہے اور یہ مسلم ہے کہ گناہ گار ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہ رہیں گے اور اس قول میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضورِ اکرم اپنے کسی امتی کے دوزخ میں داخل ہونے سے راضی نہ ہوں گے دوسرے یہ کہ اپنے کسی امتی کے دوزخ میں باقی رہنے پر راضی نہ ہوں گے۔

اس کے بعد سورۂ ''والضحیٰ'' میں ان نعمتوں کا بیان ہے۔ جو آپ کے ابتدائی احوال کے مطابق انعام و اکرام فرمائی گئیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آخر میں بھی ایسا ہی ہے اور اسی طرح خدا کا انعام و اکرام رہے گا۔

لَقَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ فِيْمَا مَضٰى وَكَذٰلِكَ يُحْسِنُ فِيْمَا بَقِىْ بلاشبہ اللہ نے ماضی میں بہت خوب کیا اسی طرح حال و مستقبل میں بھی خوب کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ سب کے ہاتھ کھینچ جانے اور یتیمی و بیکسی کے بعد بھی اپنی شفقت و عنایت کے دامن میں پرورش فرمائی اور مقام عطا فرمایا۔

بعض کہتے ہیں کہ یتیم کے معنی بیگانہ اور بے نظیر کے ہیں۔ گویا آپ کی ذات گرامی کو ان جاہلوں کے درمیان جو جہالت کی گھاٹیوں اور گمراہی کے گڑھوں میں پڑے ہوئے تھے نفیس تر اور بے نظیر پایا۔ اور ان میں سے آپ کو نکال کر علم اور مقام ہدایت کی فضا میں داخل فرمایا۔ اور آپ کے قلب انور کو قناعت و بے نیازی کی دولت سے مالا مال کر کے اموال و غنائم عطا فرما کر غنی بنایا۔ اور جب آپ کو صغرسنی' بیکسی اور یتیمی میں مہجور اور محروم نہ چھوڑا تو نبوت و رسالت سے اختصاص کے بعد آپ کو کیوں چھوڑے گا۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ تو اپنے رب کی نعمتوں کا خوب چرچا کرو۔

اس لیے کہ اظہار نعمت اور تحدیث نعمت' شکر گذاری اور احسان شناسی کا موجب ہے۔ او شرائع و احکام کا پہنچانا اور لوگوں کی تعلیم و ہدایت فرمانا بھی تحدیث نعمت ہی کے قبیل سے ہے۔

سورۂ النجم: ''سورۂ النجم'' حضورِ اکرم ﷺ کے فضل و شرف اور آپ کی علامتوں پر اس طرح مشتمل ہے کہ ان کا شمار و احصار ناممکن ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے النجم کی قسم یاد فرمائی۔ نجم سے مراد ستاروں کی جنبش یا ثریا ہے اکثر اسے بنات یا قرآن کے نام سے بولتے ہیں۔ نجما نجما یعنی تھوڑا تھوڑا نازل ہوا یا محمد ﷺ شب معراج آسمان سے نیچے تشریف لائے یا قلب محمد ﷺ کو مشرح بانوار اور منقطع از اغیار ہے۔ اور وہ آسمان قدس سے زمین انس پر حضور کے ثبات پر نیچے آیا۔ اور ہدایت کا طریقہ بتایا۔ اور نفسانی

خواہشات سے اسے پاک وصاف فرمایا اور حق وصداقت سے لبریز کیا۔ جیسا کہ اس پر آیت کریمہ شاہد ہیں۔ اور ارادہ قلب جو کہ محل صدق وہدایت ہے۔ بہت ہی مناسب ہے کہ اس پر قسم اٹھائی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى. وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں سنائی جاتی ہے۔

اس سے مراد قرآن ہے۔ اور اگر حضور کا کلام اور حدیث مراد لی جائے جو کہ وحی خفی کہلاتی ہے تو دو تین مقامات کا استثنا کرنا ہوگا۔ مثلاً بدر کے قیدیوں کا واقعہ، ماریہ قبطیہ اور شہد کا واقعہ اور تابیر نخل کا قصہ اسی استثناء کے زمرہ میں آئیں گے۔ کیونکہ اس پر آگاہی واقع ہوئی ہے۔

نیز درست ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى. حق تعالیٰ فرماتا ہے ان کا اپنا نہیں ہے بلکہ وحی ہے۔ مواہب لدنیہ میں کہتے ہیں کہ قرآن کی طرف اعادۂ ضمیر سے یہ بہتر ہے اس سے کہ نطق یعنی گویائی قرآن وسنت دونوں کو شامل ہے۔ اور دونوں ہی وحی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (ہم نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی) کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہے۔

اوزاعی حسان بن عطیہ سے روایت کرتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں سنت لے کر اس طرح آتے ہیں جس طرح قرآن لے کر آتے۔ اور آپ کو تعلیم دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نطق قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ کا اجتہاد بھی وحی حق ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ کے بعد آپ کے فضائل میں قصہ اسریٰ یعنی شب معراج کا ذکر سورہ والنجم میں کیا گیا ہے کہ حضور ''سدرۃ المنتہیٰ'' تک پہنچے۔ یہ مقام مخلوق کے علوم کے پہنچنے کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے بصر مبارک یعنی چشم مبارک کی تشریح فرمائی کہ وہ آنکھ نہ کسی طرف پھری اور نہ حد سے بڑھی اور حضور نے جو کچھ ملاحظہ فرمایا اور جو کچھ آپ پر مقام جبروت ولاہوت سے منکشف ہوا اور جو عجائب ملکوت کا مشاہدہ فرمایا ان کو عبارت والفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ اور افہام وعقول میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کم سے کم کو بھی سن کر برداشت کر سکیں۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ایسے رمز وکنایہ اور اشارہ سے بیان فرمایا جو آپ کی عظمت وتوقیر پر دلالت کرے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى تو وحی فرمائی اپنے بندہ کو جو وحی فرمائی۔

اہل علم حضرات فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے اپنے حبیب ﷺ سے تین قسم کا کلام فرمایا ایک اس عبارت کے ساتھ جو لغت عرب پر ہے۔ اور جس کا ظاہر مخلوق کی سمجھ میں آتا ہے۔ دوسرے اشاروں میں جیسے قرآن کے حروف مقطعات جن کے سمجھنے اور تحقیق کرنے کی کسی میں صلاحیت اور طاقت نہیں اور تیسرے خالص ابہام میں کلام فرمایا جو کسی کے تصور وخیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ چنانچہ فرمایا:

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى تو وحی فرمائی اپنے بندہ کو جو وحی فرمائی۔

اب رہا رویت کا مسئلہ! جس کا اثبات اس سورۃ میں کیا گیا ہے۔ تو اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ آیا یہ رویت جبریل کی ہے یا یہ رویت حق، دل سے ہے یا آنکھ سے۔ محقق قول آخر کا ہی ہے یعنی رویت حق بچشم سر۔

کعب احبار فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے رویت اور کلام کو حضور اکرم ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقسیم فرمایا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے دو بار کلام فرمایا اور حضور اکرم ﷺ کو دو بار دیدار کروایا۔ سیّدنا ابن عباس اور اکثر صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم کا قول یہی ہے لیکن سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اس مسئلہ کے خلاف گئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: بہر تقدیر یہ سورۃ مبارکہ حضورِ اکرم ﷺ کے انتہائی فضل وکمال پر دلالت کرتی ہے۔ جو آپ کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اور سورۂ اذا الشمس کورت میں:

اِنَّـهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ٥ ذِیْ قُـوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ٥ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ٥
بیشک یہ عزت والے رسول کا پڑھنا ہے جو قوت والا ہے۔ مالک عرش کے حضور عزت والا وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیۂ کریمہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر محمول ہے۔ کیونکہ آپ ان صفات اور تمام فضائل و کرامات کے جامع ہیں۔ جس طرح کہ سورۂ ’’الحاقہ‘‘ میں اِنَّـهٗ لَقَـوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (یہ عزت والے رسول کا پڑھنا ہے) سے حضور ﷺ کی ذات شریف مراد ہے۔ ﷺ

سورۂ طٰہٰ ویٰسین: اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا: طٰـهٰ وَمَـا اَنْـزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى. اے محبوب! ہم نے قرآن اس لیے نازل نہ فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑیں۔

اس سورۂ مبارکہ کے نازل ہونے کا سبب ’’سورۂ یٰس‘‘ ہے یعنی اس کے نازل ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ کیونکہ سورۂ یٰس میں فرمایا گیا۔

یٰسٓ. وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ٥ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ.
اے سیّد عالم! قسم ہے حکمت والے قرآن کی۔ بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں۔

’’طٰہٰ‘‘ کو بھی آپ کے اسماء مبارک میں شمار کرتے ہیں۔ اور انسان اور مرد بھی مراد لیتے ہیں۔ جس طرح کہ یٰسین کو ’’یا سید‘‘ پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح طٰہٰ کو بمعنی یا طاہر یا ہادی پر محمول کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بحساب ’’ابجد‘‘ طا کے نو اور ہا کے پانچ کل چودہ عدد بنتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اے چودھویں رات کے چاند! جیسا کہ شعر ہے۔

رخت را خواندہ طہٰ رامر درگاہ چو ماہ چاردہ بل چاردہ ماہ

لیکن مفسرین اس قسم کی تفسیر وتاویل کو بدعت کہتے ہیں۔ اور طٰہٰ کو اسم الٰہی بھی شمار کرتے ہیں۔ غرض کہ دونوں سورتیں حبیب خدا ﷺ کی مدح وثنا کا افادہ کرتی ہیں۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے۔

ترا عر لولاک تمکیں بس است ثنائے تو طہٰ ویٰس بس است

’’یٰس‘‘ نبی کریم ﷺ کے صراطِ مستقیم اور دین قویم پر قسم شہادت ہے۔ اور طٰہٰ میں محبت شفقت کے طریقہ پر آپ کا اعزاز واکرام ہے۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے طاعت وعبادت اور خصوصاً تہجد اور قیام لیل میں سخت ترین مشقتیں اٹھانی شروع فرمائی کہ آپ کے پائے مبارک ورم کر جاتے اور کبھی ایک پاؤں سے قیام فرماتے اس وقت طٰہٰ اتری فرمایا:

طٰهٰ٥ مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى.
اے محبوب! ہم نے یہ قرآن اس لیے تو نازل نہ فرمایا کہ آپ مشقتیں جھیلیں۔

’’طٰہٰ‘‘ اگر آپ کا اسم ہے تو بطریق ندا ہے۔ اور اگر اسم الٰہی ہے تو بطریق قسم ہے۔ اور اگر اسے حضورِ اکرم کا اسم مبارک شمار کر کے قسم کے طور پر مان لیا جائے۔ تو بھی جائز ہے۔ اور اس التفات میں خطاب سے جہاں غیبت حاصل ہوتی ہے تو اس میں بھی خاص شفقت واکرام ہے جو محبت کی چاشنی کی طریق پر لذیذ ہے فرماتا ہے: اِلَّا تَـذْكِـرَةً لِّمَن يَّخْشٰى نہیں ہے قرآن مگر حق یاد دلانے کے لیے اسے

جوخدا سے ڈرتا ہے۔ اس سے مراد آپ کی ذات شریف ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آپ رات میں قیام فرماتے تو اپنے سینہ مبارک کو رسی سے باندھتے تاکہ نیند نہ آئے۔ اور تمام رات بیدار رہتے تھے۔

صاحب مواہب لدنیہ نے اسے بعید از قیاس بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ اس آیہ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے کو مشقت میں نہ ڈالیں اور کفار کے کفر وانکار پر غم وغصہ فرما کر خود کو تکلیف نہ دیں۔ کیونکہ ہم نے قرآن کو آپ پر اسی لیے نازل فرمایا ہے کہ آپ انہیں خدا سے ڈرائیں اور تبلیغ فرمائیں جو بھی ایمان لائے گا اپنی ہی بھلائی کے لیے لائے گا اور جو بھی کفر پر قائم رہے گا وہ اپنے ہی لیے کرے گا۔ آپ کا فرض کو حکم کا پہنچانا ہے اور بس۔ جیسا کہ دوسری جگہ بھی بطریق شفقت ومہربانی ارشاد فرمایا گیا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔ — تو کہیں تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے اور اس وہ بات پر ایمان نہ لائیں غم سے۔

مطلب یہ کہ اے محبوب! اگر وہ ایمان نہ لائیں تو کیا آپ اپنی جان کو غم وغصہ سے ان کی پیچھے ہلاکت میں ڈالدیں گے۔ ''الحدیث'' سے مراد قرآن ہے۔ اور فرمایا:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ○ — اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ آپ کا سینہ ان کی باتوں سے تنگ ہوتا ہے۔

اور یہ لوگ آپ اور حق تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور آپ کو جادوگر اور دیوانہ کہتے ہیں اور خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں اور قرآن پر طعن کرتے ہیں۔ لہٰذا صبر فرمائیے کہ کفار کا یہی حال رہا ہے۔ اور آپ خوش رہیے۔ کہ آخر کار مدد آپ ہی کی ہوئی ہے۔ اور ہم نے قرآن کو آپ پر مشقت کے لیے تو نازل نہیں فرمایا کہ آپ ہمیشہ ہی غمگین رہیں جس طرح کہ تمام انبیاء رہے ہیں۔ اس جگہ غالباً تم کو شرح صدر کے ساتھ ضیق صدر (سینہ کی تنگی) خلجان میں ڈالے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے آپ کو انشراح صدر عطا نہ فرمایا۔) ممکن ہے یہ حال اس سے آگے کا ہو باوجود اس کے تلطف، محبت اور حق کی جانب سے دل جوئی، اس حال کے اقتضاء اور اس کلام کے صدور میں باقی ہے۔

بعض ارباب ذوق ووجدان فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ عبادت اور تکالیف شرعیہ میں باوجود غایت محبت وعنایت کے جو مشقت اٹھاتے تھے یہ اس قبیل سے ہے کہ محبوب قوی وتوانا ہو اور محب ضعیف وناتواں ہے۔ محبوب سے بغلگیر ہو کر اسے دبائے تو یہ ضعیف وناتواں محب لامحالہ خاص قسم کی مشقت وتکلیف پائے گا۔ لیکن اس ضمن میں یہ جانا جا سکتا ہے کہ اس میں کس قدر ذوق ولذت پنہاں ہے۔ جاننے والا ہی جانتا اور سمجھنے والا ہی سمجھتا ہے۔ ع گرنکتہ داں عشقے خوش بشنو ایں حکایت۔

درود وسلام: وصل: اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضور اکرم ﷺ کی تعظیم وتکریم، اعلائے شان، اظہار فضل وکرامت، اور رفع قدر ومنزل کے سلسلے میں یہ ایک آیت کریمہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا○ — بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی ان پر خوب درود وسلام بھیجو۔

مسلمانو! تم اپنے خدا کی اطاعت کرو اور فرشتوں کی موافقت کرو اور اپنے نبی ﷺ پر درود وسلام بھیجو۔ تمہارا فرشتوں کا درود بھیجنا یہی ہے کہ تم اپنے پرودگارس دعا مانگو کہ ان پر درود بھیجے اور رحمت فرمادے۔ تم میں کہاں قدرت وطاقت ہے کہ تم ان پر درود بھیج سکو اور تم کو اتنی

کہاں پہچان کہ حضور ﷺ کی قدر و منزلت اور شان کو جان سکو اور اس کے مطابق درود بھیج سکو۔ ہاں پروردگار عالم تقدس شانہ پہچانتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی اَنْ تُصَلِّیَ عَلَیْہِ وَصَلِّ عَلَیْہِ کَمَا یَنْبَغِیْ اَنْ نُّصَلِّیَ عَلَیْہِ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً اَنَّہٗ لَھَا اَھْلٌ وَّھُوَ لَھَا اَھْلٌ وَّ بَارِكْ وَسَلِّمْ. لہٰذا حق تعالیٰ نے عالم علوی و سفلی سب کو حضور ﷺ کی دعا و ثنا میں مجتمع فرما کر آپ کے فضائل و مناقب کا اولین و آخرین میں اعلان فرمایا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں آپ کی محبت ایسی جاگزیں فرمائی کہ آپ کے ذکر سے ان کی روحیں راحت و سرور پاتیں اور آپ کا ذکر سننے سے خوشی میں ایسی لطف اندروز ہوتیں کہ آپ کی یاد میں جھوم جاتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپ کی اتباع میں تمام موجودات کو لبریز کر دوں گا تاکہ وہ آپ کی ثنا اور پیروی کریں۔ اور آپ پر درود و سلام بھیجیں۔ فرض نمازوں میں کوئی فرض ایسا نہیں ہے جس کو آپ نے سنت نہ بنایا ہو۔ یعنی فرض ادا کرنا آپ کی سنت کو پورا کرنا ہے۔ لہٰذا ان کی فرضیت میرے حکم سے فرض ہونے اور آپ کے حکم سے سنت ہونے میں متمسک ہے۔ حقیقت میں دونوں ہی میرے حکم اور آپ کے حکم کے ساتھ پیوست ہیں۔ یعنی ہر فرض میرے حکم اور آپ کے حکم کو شامل ہے۔ اور میں نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت‘ آپ کی بیعت کو اپنی بیعت بنایا۔ آپ کی فرامین کے لفظوں کو حفظ کریں گے۔ مفسرین میرے قرآن کے معنی تفسیر آپ سے کریں گے۔ واعظین آپ کی نصیحتوں کو لوگوں تک پہنچائیں گے۔ شاہان و سلاطین اور فقراء و مساکین دور دراز سے سفر کر کے آپ کے در پر حاضر ہو کر سلام عرض کریں گے۔ اور آپ کے روضۂ انور کی خاک پاک کو اپنے چہروں پر ملیں گے اور آپ کی شفاعت کے امیدوار ہوں گے۔ آپ کی بزرگی اور شرافت ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ و الحمد للہ رب العلمین.

اور بعض علماء حضور انور کے ارشاد مبارک: وَجُعِلَتْ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ (اور صلوٰۃ میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی) کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس سے مطلب آپ پر درود و سلام بھیجنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور فرشتے آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ لیکن محقق قول یہی ہے کہ اس سے مراد نماز ہے جیسا کہ حسن ہدیٰ اور سیرت حضور پاک کے بیان میں گزر چکا ہے۔

سورۂ فتح: بارگاہ قدس جل اسمہٗ کی جانب سے حضور اکرم ﷺ پر جو اتم نعمت اور اکمل اکمال جاہ و جلال و کرامت و برکات و مرتبت وارد و فائز ہیں۔ سورہ فتح ان سب پر مشتمل ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے رسول پاک کی مدح و ثنا کا اس میں خطبہ پڑھا ہے فرماتا ہے:

اِنَّـا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْكَ وَیَھْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝ وَّیَنْصُرَكَ اللّٰہُ نَصْرًا عَزِیْزًا ۝

بیشک ہم نے تمہارے لیے روشن فتح فرما دی تا کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے۔ تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دے اور تمہیں سیدھی راہ دکھائے اور اللہ تمہاری زبردست مدد فرمائے۔

واضح رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سبحٰنہ و عز اسمہ کی جانب سے حضور اکرم ﷺ پر فتوحات و فیوضات صوریہ و معنویہ اور کرامات و برکات ظاہرہ و باطنہ جو فائض و صادر ہیں وہ غیر متناہی اور حد و شمار سے باہر ہیں۔ ان میں سے ایک تو شہروں کی فتوحات‘ بندگان خدا کی تسخیر‘ حصول غنائم‘ تقویت دین‘ کثرت امت اور احکام اسلام کی اشاعت ہے اور سب سے بڑی مکہ مکرمہ کی فتح ہے۔ کیونکہ فتح مکہ کے بعد تمام عرب قبائل اور لوگوں کی جماعتیں فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگیں۔ اور رسول خدا ﷺ عالم قدس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سورۃ میں اس کے فتح ہونے کا وعدہ فرمایا گیا۔ اور یہ فتح یقینی طور پر واقع ہونے کا تذکرہ ماضی کے صیغہ اور ”فتح مبین“ کے ساتھ کیا گیا۔ فتح مبین کے معنی عزت و شوکت کو ظاہر کرنے والی اور دین اسلام کو غلبہ مرحمت فرمانے والی فتح بھی مروی ہے۔

اور آیہ کریمہ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کی تفسیر و تشریح میں بکثرت اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس

سے مراد وہ چیز ہے جو آپ کی بعثت نبوت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں واقع ہوئی۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ قول مردود ہے اس لیے نبی کریم ﷺ کو جاہلیت کی ہوا تک نہ لگی۔ اور یہ کہ آپ قبل از نبوت اور بعد نبوت معصوم ہیں۔ اور مجاہد نے کہا ماتقدم قبطیہ ''ماریہ'' میں اور ''مَــاتَـاَخَّــرَ'' حضرت زید کی زوجہ سے عقد کا ارادہ فرمانے کے بارے میں ہے۔ امام سبکی فرماتے ہیں یہ قول باطل ہے اس لیے کہ قبطیہ ماریہ اور حضرت زید کی زوجہ کے بارے میں اصلاً ذنب ہے ہی نہیں جو ایسا اعتقاد رکھتا ہے وہ غلطی کرتا ہے۔ زمخشری نے کشاف میں اور تبعیت میں بیضاوی نے بھی اس کو نقل فرمادیا کہ اس سے مراد وہ تمام لغزشیں ہیں جو محل عتاب ہیں۔ امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ قول بھی مردود ہے۔ اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام والصلوٰۃ کی عصمت ثابت ہے۔ البتہ ایسے صغائر جو ان کے مرتبہ وشان کو کم نہ کرنے والے ہوں۔ اس میں اختلاف ہے۔ معتزلہ اور بہت سے غیر معتزلہ اس کے جواز کی طرف گئے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک مسلک مختار ممانعت ہے۔ اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے قول وفعل کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان سے ایسا فعل کیسے ہوسکتا ہے۔ جو ناشائستہ اور ناسزا ہے اور حشویہ'' حضرات انبیاء علیہم اسلام پر جرأت وجسارت کرتے ہیں۔ اور وہ ان پر مطلقاً بغیر کیسی قید کے جائز رکھنے کے قائل ہیں۔ اگر ان حشویوں کی طرف ان کے اس قول کی نسبت صحیح ہے تو یہ مجوج یعنی لائق التفات اور صحت کے قابل نہیں ہے کیونکہ امت کا اجماع اس کے خلاف ہے اور جو لوگ انبیاء علیہم السلام پر صغائر کو جائز رکھتے ہیں ان کے پاس نہ کوئی نص ہے اور نہ کوئی دلیل۔ بلکہ وہ صرف اسی آیت کو یا اس کی دوسری آیتوں کو اپنا مآخذ ٹھہراتے ہیں اور ان کا جواب بخوبی ظاہر کر دیا گیا ہے۔

صغائر غیر رذیلہ کو جائز رکھنے کے بارے میں ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ آیا صغائر غیر رذیلہ میں سے کچھ حضور اکرم ﷺ سے واقع ہوئے ہیں یا نہیں وہ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ حضور ﷺ سے ان میں سے کچھ بھی واقع نہ ہوا۔ امام سبکی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ میں اس میں ذرّہ بھر بھی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ آپ سے کچھ واقع نہیں ہوا۔ اور آپ کے اس قول وحال کے برخلاف کوئی گمان بھی کیسے لاسکتا ہے۔ جب کہ آپ کی صفت میں حق تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىo یہ نبی اپنی خواہش سے فرماتے ہی نہیں' نہیں ہے یہ مگر وحی جو کی گئی۔

اب رہا آپ کا فعل مبارک' تو صحابہ کرام کا اجماع معلوم ہے کہ وہ آپ کی قطعیت کے ساتھ پیروی کرتے اور آپ سے جو کچھ قلیل وکثیر یا صغیر وکبیر عمل کرنا ظاہر ہوتا وہ ہر ایک میں آپ کی اقتداء کرتے تھے حتیٰ کہ حضور ﷺ پوشیدگی وخلوت میں جو عمل فرماتے اس کے علم کی بھی وہ حرص وخواہش رکھتے اور اس کی متابعت کرتے تھے خواہ حضور ﷺ کے علم میں آئے یا نہ آئے۔ جو بھی صحابہ کرام کے ان احوال پر جو رسول کریم ﷺ کی متابعت کے سلسلے میں ہے غور وفکر کرے گا۔ بخوبی جان لے گا۔ اور جو شخص بھی حضور اکرم ﷺ کے احوال مبارکہ کو اوّل سے آخر تک جانے گا اور مشاہدہ کرے گا وہ اس قسم کی بات اپنے منہ سے حضور ﷺ کے بارے میں نکالنے یا اپنے دل میں اس قسم کا وہم وخیال تک لانے میں شرم محسوس کرے گا۔ (اعیاذ نا اللہ منہا)

امام سبکی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے ایسی بات نہ کہی ہوتی تو میں اس کا ذکر نہ کرتا۔ اور اس آیت کی تفسیر میں زمخشری نے جو قول نقل کیا ہے ہم اس سے نہ صرف بیزار ہیں بلکہ خدا سے انصاف چاہتے ہیں۔ یہ امام سبکی کا کلام زمخشری کے مقالہ کے رد میں ہے جسے علامہ سیوطیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسائل میں ذکر فرمایا ہے۔ اس کے سوا اور بھی اقوال بیان کئے ہیں جو گیارہ بلکہ اس سے زیادہ تک پہنچتے ہیں۔ جسے امام سبکی نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں جب اس آیۂ کریمہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ پر تامل اور اس کے ماقبل ومابعد پر غور وفکر کرتا ہوں تو میں ایک وجہ کے سوا اور کوئی وجہ اور احتمال کی گنجائش نہیں پاتا۔ اور وہ وجہ نبی کریم ﷺ کی تعظیم وتکریم ہے بغیر اس کے اس جگہ کوئی گناہ متصور ہو۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ جب میں اس معنی ووجہ کے مآخذ کے درپے ہوا تو ابن عطیہ کو بھی اس کا قائل پایا۔ چنانچہ

کہا کہ ”آیت کے معنی اس حکم کے ساتھ حضور ﷺ کی شرافت و بزرگی کا ظاہر فرمانا ہے۔ اور اس میں کوئی گناہ مقصود نہیں ہے“۔ ابن عطیہ نے ایسا خدا کی توفیق پانے سے کہا ہے۔ انتہی۔

یہ کلام مجمل ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ آقا کبھی اپنے غلاموں کو اپنے خواص و مقربوں کے ذریعہ نوازتا اور بزرگی بخشتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے تمہیں بخشا اور تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہوں سے درگزر کیا۔ حالانکہ آقا خوب جانتا ہے کہ ان سے آگے پیچھے کسی وقت بھی کوئی گناہ اور غلطی سرزد ہی نہیں ہوئی لیکن اس کا یہ کلام غلاموں کے لیے باعث عزت و افتخار ہے۔ فافہم وباللہ التوفیق۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جگہ مغفرت کا عصمت سے کنایہ ہے اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ

لِيَغْفِرَلَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ	تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخشے
اَیْ لِيَعْصِمُكَ اللّٰـهُ فِيْمَا تَقَدَّمَ مِنْ عُمْرِكَ وَفِيْمَا تَاَخَّرَ مِنْهُ.	یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی پچھلی حیات میں بھی اور اگلی حیات میں بھی اپنی عصمت و پناہ میں رکھے۔

یہ قول انتہائی حسن قول میں ہے۔

بلاشبہ بلغاء نے قرآن کے اسلوب کو بلاغت میں شمار کیا ہے کہ تخفیف و کمی کے مقامات کو لفظ مغفرت، عفو اور توبہ سے قرآن میں کنایہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قیام لیل کے نسخ و کمی کرنے کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا:

عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ	اللہ جانتا ہے کہ اے مسلمانو! تم سے رات کا شمار نہ ہو سکے گا۔ (اور تم ضبط اوقات نہ کر سکو گے)

تو اس نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمایا۔ (یعنی شب کا قیام معاف فرمایا) اب قرآن میں سے جتنا تم پر آسان ہو اتنا پڑھو۔ نیز تقدیم صدقہ کی منسوخیت میں فرمایا:

فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ	تو جب تم نہ کر سکو تو اللہ نے اپنی مہر سے تم پر رجوع فرمایا (یعنی تقدیم صدقہ معاف فرمایا)

نیز رمضان مبارک کی راتوں میں جماع کے حرام ہونے کی منسوخیت میں فرمایا:

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ.	روزے کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال کیا گیا......
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ	تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف فرمایا۔ تو اب ان سے صحبت کرو۔

مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جس جگہ انبیاء علیہم السلام کی توبہ (مغفرت کا ذکر فرمایا ہے وہاں ان کی ان لغزشوں و خطا کا بھی ذکر فرمایا ہے جو ان سے صادر ہوئیں جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: عَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ (اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی) اور حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: اِنِّیْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (ہم نے تمہیں عطا فرمایا تم تو بے خبروں میں سے تھے) اور حضرت یونس علیہ السلام کے قصہ میں فرماتے ہیں: فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ (تو انہوں نے گمان کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پا سکیں گے) اور حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا: فَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى. (تو تم اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو۔) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى لیکن سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وسلم اجمعین کی شان میں فتح کو

مقدم رکھا۔ اور اس کے بعد گزشتہ و آئندہ کے غفران ذنوب کا ذکر فرمایا اور ذنب کو پوشیدہ رکھا۔

شیخ عزیز الدین عبد السلام اپنی کتاب المسمیٰ بہ ''نہایت السول فیما سخ من تفضل الرسول'' میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کی تمام نبیوں پر بکثرت وجوہ بخشی ہے۔ پھر انہوں نے ان وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بتائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے ہی اگلے پچھلے ذنوب کی مغفرت کی خبر دے دی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی نبی کو اس جیسی خبر نہیں دی۔ بلکہ ظاہر یہ ہے کہ انہیں سرے سے اس سے باخبر کیا ہی نہیں گیا۔ اسی بنا پر جب عرصات محشر میں امتیں ان سے شفاعت کی درخواست کریں گی تو وہ اپنی لغزشوں کا بیان کریں گے۔ اور اس مقام کی ہیبت سے شفاعت میں پہل کا اظہار نہیں فرمائیں گے۔ اور جب وہ تمام مخلوق اس مقام حضور اکرم ﷺ سے درخواست کریں گے تو حضور فرمائیں گے' ہاں یہ میرا ہی کام ہے۔ اس آیت کریمہ کی تفصیل یہ ہے کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے آپ کے لیے پہلے فتح مبین کا اثبات فرمایا کہ اس کے بعد مغفرت ذنوب کا ذکر فرمایا۔ بعد ازاں اتمام نعمت' اثبات ہدایت صراط مستقیم اور نصر عزیز یعنی غالب مدد کا ذکر فرمایا لہٰذا فرمایا ثابت اور متعین ہوا کہ مقصود اثبات ذنوب نہیں ہے بلکہ اس کی نفی ہے فافہم وباللہ التوفیق۔ یہ ساری بحث علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے۔[1]

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ (اور تم پر اپنی نعمتیں تمام وکمال فرمائیں) مخفی نہ رہنا چاہیے۔ کہ ہر قسم کے فضائل وکمالات' اور کرامات وبرکات اس کلمہ میں داخل ہیں۔ اور خاص وعام نعمتوں میں سے جتنا کچھ ذکر کیا جائے یا تصور وخیال میں آئے وہ سب اندیشہ وخیال اور عدد شمار کے محاسبہ سے عاجز وقاصر ہے اس کے ذکر وبیان سے حال وقال کی زبان گونگی ہے۔ حیطۂ اظہار وبیان میں جو کچھ ہے وہ سب اجمال ہے اور اس کی تفصیل امکانی قدرت سے باہر ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ	اگر سمندر سیاہی بنیں اپنے رب کے کلمات لکھنے کے لیے تو یقیناً
قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا.	سمندر خشک ہو جائے اور رب کے کلمات ختم نہ ہوں اگرچہ اس کی مدد
وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ	کے لیے اس کی مثل اور لائیں اور اگر زمین کے ہر شجر کو قلم بنائیں اور
يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ	سات سمندر کو روشنائی بنائیں تب بھی رب کے کلمات ختم نہ ہوں۔

ان کلمات سے مراد محققین کے نزدیک اللہ عزوجل کی طرف سے وہ فضائل وکمالات وحقائق ومعارف ہیں جو درگاہ قدس کے بندگان خاص انبیاء واصفیاء خصوصاً سید الانبیاء وسند الاصفیاء صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین پر افاضہ ہوتے ہیں۔ ورنہ جو کچھ صفت حق اور شیون ذات مطلق جل وعلا ہے۔ وہ اس تمثیل سے منزہ وپاک ہے۔ اس کا کوئی نظیر نہیں۔ اور بعد از تعمیم نعمت اور دینوی واخروی نعمتوں کی شمولیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ دو نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ ایک ہدایت صراط مستقیم ہے جو کہ اصل اصول نعیم اور مثمر فوز وفلاح اور لوگوں کی ہدایت ہے۔ کیونکہ بعثت اور رسالت کا یہی مقصد اصلی ہے۔ دوسرا دینوی ہے۔ جس کا مقصد بھی دین ہے جس طرح

---

[1] افادہ خاص از مترجم غفرلہ: اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین کرام کے یہ اقوال وتوجیہات اس بناء پر محمول ہیں کہ انہوں نے آیۂ کریمہ کے ''لیغفر لك الآیہ'' میں حروف جر لام کو تخصیص کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس لام کو اگر بجائے تخصیص کے ''تعلیل وسبب'' معنی میں لیتے تو ان بعید از کار تاویلات وتوجیہات کے جھمیلے سے بچ جاتے۔ اور لام سببیہ کو (جو کہ حرف جر لام کے معانی مشترکہ اور خواص میں سے ہے) مان لینے کے بعد حضور اکرم ﷺ کی عظمت شان اور رفعت مقام میں بے نظیر دلیل بن جاتی ہے چنانچہ لام تعلیل اور سببیہ کو صاحب تفسیر جلالین نے تسلیم کیا ہے اور اس صدی کے مجدد اعظم علحضرت مولانا مفتی شاہ احمد رضا خانصاحب' فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے اپنے قرآن المسمیٰ ''بہ کنز الایمان فی ترجمہ القرآن'' لام سببیہ ہی مان کر ترجمہ کیا ہے جیسا کہ شروع باب میں اس آیۂ کریمہ کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔

کہ پہلا ہے۔ اور جو صلاح عالم اور کارخانہ موجودات انتظام پر منتج۔ چنانچہ فرمایا:

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًاO وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًاO اور تمہیں سیدھی راہ دکھائے اور اللہ تمہاری زبردست مدد فرمائے۔

ابن عطاء فرماتے ہیں کہ اس صورت میں حضور اکرم ﷺ کے لیے متعدد عظیم نعمتیں جمع فرمائی ہیں۔ ایک کھلی فتح جو اجابت اور قبول کی نشانیوں میں سے ہے۔ دوم مغفرت جو محبت کی علامتوں میں سے ہے۔ سوم اتمام نعمت جو اختصاص کی نشانیوں میں سے ہے۔ چہارم ہدایت جو ولایت کی علامتوں میں سے ہے۔ چنانچہ مغفرت تمام نقائص و عیوب سے تبری و تنزیہہ یعنی آلائش سے پاکی و صفائی سے کنایہ ہے اور اتمام نعمت بدرجہ کامل آپ کی تبلیغ رسالت ہے۔ اور ہدایت' مشاہدہ کی طرف دعوت ہے۔ اور آپ کی شان اتنی بلند فرمائی کہ کوئی چیز قرب حق میں اس مرتبہ اونچی و فائق متصور نہیں ہے۔ اور فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ. بیشک جنہوں نے آپ سے بیعت کی ہے بلاشبہ انہوں نے اللہ سے بیعت کی ہے۔ اللہ کا ہاتھ (دست قدرت) ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

جس طرح کہ فرمایا مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهِ جس نے رسول کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ اطاعت کی۔

اگرچہ باصطلاح اہل عرب یہ از قبیل مجاز ہے۔ لیکن اہل حقیقت جانتے ہیں کہ اس میں کیا رمز ہے۔ واللہ اعلم۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں پر سکینہ' طمانیت اور آرام و یقین (جو نعمتوں کا خلاصہ ہے۔) کے نازل فرمانے کا احسان جتلایا۔ اور آخر سورۃ میں آپ کے اصحاب کامل النصاب کی مدح و ثنا حضور اکرم ﷺ کی معیت کی فضلیت کے ساتھ فرمائی۔ کیونکہ یہ محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان اصحاب کا کفار پر شدت کرنا اور ان کے خلاف چلنا اور باہم مسلمانوں کے ساتھ محبت و مؤدت کا برتاؤ کرنا کہ اس پرویں و ملت کے کارخانہ کا انتظام ہے۔ ان کی تعریف فرمائی۔ اور ان کی اس صفت کو بمصداق "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ" (وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے) بنایا۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ میں فرمایا: اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ. (مسلمانوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہیں۔) اور ان سے دنیا و آخرت میں مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا گیا۔ یہ سب موجب امتنان اور حضور کے فضل و شرف کا بیان ہے۔

سورۃ کوثر: بارگاہ رب العزت کی جانب سے جو ہر قسم کے فضائل و کمالات اور کرامات و برکات فائز ہوئے ہیں وہ سب ایک کلمہ جوامع الکلم میں داخل ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ. اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں۔

کیونکہ اَلْكَوْثَرَ سے مراد دنیا و آخرت میں خیر کثیر ہے۔ اور یہ کلمہ اپنے اس اختصار و ایجاز کے باوجود اس راز کے اظہار و بیان کو شامل ہے۔ اور اگر جہان بھر کے علماء و عرفا اس کلمہ کی شرح کریں تو اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی حقیقت کو خوب جانتا ہے۔ تاہم فی الحال جو کچھ میری نظر میں ہے۔ لکھتا ہوں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" یعنی ہم نے آپ کو بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں۔ جن میں کی ہر نعمت ساری دنیا سے بڑی ہے۔ جب ہم نے آپ کو اتنی عظیم خوبیاں عطا فرمائیں تو فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَكَ هُوَالْاَبْتَرُ. تو تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو بیشک جو تمہارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں ایک عبادت بدنی دوسرے عبادت مالی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد فَصَلِّ لِرَبِّكَ (اپنے رب کے لیے نماز پڑھو) عبادت بدنی کی طرف اور "وَانْحَرْ" (قربانی کرو) سے عبادت مالی کی طرف اشارہ فرمایا اور یہ کہ اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ (بیشک ہم نے

آپ کو عطا فرمایا) کو لفظ ماضی سے ذکر فرمایا اور لفظ مستقبل یعنی سَنُعْطِیْكَ (عنقریب آپ کو عطا فرمائیں گے۔) فرمایا تا کہ اس پر دلالت کرے کہ یہ تمام عطائیں قبل از وجود عنصری آپ کو حاصل ہو چکی ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:

كُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ   میں اس وقت بھی نبی تھا جب کہ آدم روح و جسم کے درمیان تھے۔

گویا حق تعالیٰ کہتا ہے اے محمد ﷺ آپ کے لیے تمام اسباب سعادت' آپ کے دائرہ وجود میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے عطا فرما دیے ہیں۔ تو اب آپ کو بعد از وجود کیسے بے عطا چھوڑیں گے رہا آپ کا عبادت میں مشغول رہنا تو یہ فضل عمیم آپ کی اطاعت وعبادت کے سلسلے میں نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ بغیر وجوب اور بے سبب' محض فضل واحسان ہے' یہی اجتباء (برگزیدگی) کے معنیٰ کا حاصل ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تمام نبیوں کو بلکہ تمام انسانوں کو جو کچھ بھی دیا گیا وہ ان کے وجود عنصری سے پہلے دیا گیا۔ اور ان کی تقدیر میں لکھا گیا ہے تو فضیلت تو اس میں ہونی چاہیے کہ آپ کو ان میں سب سے زیادہ عطا کیا گیا نہ یہ کہ سب سے پہلے دیا گیا تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی نبوت اور آپ کے کمالات عالم ارواح میں ظاہر کیے گئے اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح قدسیہ نے آپ سے استفاضہ کیا ہے جیسا کہ فرمایا۔

كُنْتُ نَبِیًّا الحدیث اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کی نبوت علم الٰہی میں تھی نہ کہ خارج میں۔

ایک روایت میں کہ کہ ''کوثر'' سے مراد جنت کی ایک نہر ہے جیسا کہ اس کی صفت میں احادیث میں مروی ہے کہ ''کوثر'' نام اس بناء پر ہے کہ کثرت سے لوگ جائیں گے۔ سیّدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے جنت کی سیر کو بیان کرنے کے دوران فرمایا کہ میں جنت کی سیر کر رہا تھا تو اچانک میری نظر اس کی ایک نہر پر پڑی۔ دیکھا کہ اس کے ہر طرف گنبد ہی گنبد ہیں جو کھوکھلے موتیوں کے ہیں۔ اور اس کی مٹی مشک اذخر کی ہے۔ میں نے جبریل سے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ بتایا کہ یہ کوثر ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ اسے بخاری میں روایت کیا۔ سلف کے درمیان مشہور و مستفیض یہی تفسیر ہے۔

بعض فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد آپ کی اولاد طیبہ ہے اس لیے یہ سورۃ اس شخص کے رد میں نازل ہوئی ہے جس نے حضورِ اکرم ﷺ کو ''بے اولاد' ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے تم کو ایسی اولاد مرحمت فرمائی ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔

فائدہ: بعض فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ اور کوثر لغت میں بمعنی کثرت درود ہے۔ منجملہ اس کے ایک یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی بدگویوں نے ''ابتر'' یعنی ''بے اولادہ'' ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

عین المعانی میں کہتے ہیں کہ کوثر بروزن فوعل کثرت سے ہے۔ جیسے اتفل سے توفل' جہر سے جوہر وغیرہ اور اس کے مقابلہ میں خبر آئی کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ مطلب یہ کہ جو آپ پر بے نسل ہونے کا عیب لگاتے ہیں۔ آخر کار وہی ابتر ''بے نسلے'' ہیں۔ ابتر اسے کہا جاتا ہے جس کی نسل نہ ہو۔ اور کشاف میں ہے کہ کوثر فوعل کے وزن پر ہے جس کے معنی کثرت کے ہیں۔ اور اس میں مبالغہ ہے یعنی بہت بہت۔ کسی بدوی کا لڑکا سفر سے واپس آیا تو لوگوں نے اس سے پوچھا تیرا لڑکا کس حال میں لوٹا۔ اس نے کہا ''جَاءَ بالکوثر'' یعنی خیر کثیر کے ساتھ واپس آیا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ کوثر کے معنی خیر کثیر کے کرتے ہیں اس پر ان سے حضرت سعید بن جبیر نے کہا لوگ ایسا کہتے ہیں کہ کوثر جنت میں ایک نہر کا نام ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ بھی از قسم خیر کثیر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اے محمد ﷺ ہم نے آپ کو دونوں جہاں کی اتنی بھلائیاں عطا فرمائی ہیں کہ اس کی کثرت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اور آپ کے سوا کسی کو اتنا نہیں دیا گیا۔ اور ان کا دینے والا میں ہوں۔ جو کہ اپنے تمام جہانوں کا مالک و رب ہوں۔ لہٰذا آپ کے لیے سب سے بڑھ کر بزرگی دینے

والا‘ سب سے زیادہ عطا فرمانے والا‘ اور سب سے زیادہ بخشش کرنے والا اور عظیم ترین انعام فرمانے والا میں ہوں فَصَلِّ لِرَبِّكَ تو اپنے رب کی اطاعت کیجئے کہ اس نے آپ کو اپنی عطا کا مستحق بنا کر نوازا اور ان لوگوں کے احسان سے جو اپنے گمان پر غیر خدا کو پوجتے ہیں۔ آپ کو محفوظ رکھا وَ انْحَرْ اور خدا کے لیے اس کے نام کے ساتھ قربانی دیجئے اور ان لوگوں کے برخلاف کیجئے کہ یہ لوگ بتوں کے نام سے ذبح کرتے ہیں۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ بلاشک وشبہ جو بھی اپنی قوم میں سے آپ سے دشمنی رکھے اور آپ کی خلاف ورزی کرے وہی ابتر‘ بے نسلا اور بے برکتا ہے۔ نہ کہ آپ! کیونکہ قیامت تک مسلمانوں میں سے جو بھی پیدا ہوگا۔ وہ آپ کی مصنوی اولاد اور خلف ہوں گے۔ اور آپ کا ذکر منبروں پر بلند ہے۔ اور جہاں بھر کی زبانیں قیامت تک آپ کے ذکر سے رطب اللسان رہیں گی۔ وہ ابتدا تو خدا کے نام سے کریں گے اور مَثْنٰی یعنی دوسرا آپ کے نام کو بنائیں گے۔ اور آخرت میں جو عنایت ہوں گی وہ تو قدرت بیان سے باہر ہیں آپ جیسے کو ”اَبْتَر“ (معاذ اللہ) کہنے والا درحقیقت خود ابتر ہے کہ دنیا وآخرت میں کوئی نام لینے والا تک نہیں۔ اگر کوئی لیتا بھی ہے تو لعنت بھیجتا ہے۔ ابوبکر عیاش رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوثر سے مراد امت کی کثرت ہے۔ اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ مراد قرآن ہے۔ بقول عکرمہ نبوت‘ بقول مغیرہ‘ اسلام اور بقول حسین بن الفضل قرآن کی آسانی اور شریعت کی تخفیف مراد ہے۔ بعض نے اکثر امت میں شفاعت‘ بعض نے معجزات نبوت‘ بعض نے نبوت وقرآن‘ ذکر عظیم اور دشمنوں پر مدد اور بعض نے علمائے امت مراد لیا ہے۔ کیونکہ ”اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءَ“ علماء نبیوں کے وارث ہیں۔ اسے امام احمد وابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ بعض نے کوثر سے علم مراد لیا ہے۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد فَصَلِّ لِرَبِّكَ (اپنے رب کی عبادت کیجئے) کا ذکر فرمایا ہے۔ اور جو عبادت پر مقدم ہے۔ نتیجتًا وہ علم ہے اور کوئی چیز کثرت وکشادگی میں علم کی صفت کو نہیں پہنچتی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ کوثر خلق حسن ہے۔ صحیح یہ ہے کہ کوثر کسی چیز کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ تمام صفات کمال کو شامل ہے۔ اور خیر کثیر‘ تمام معانی کو شامل ہے۔

اور ”مخاطبہ“ فرمانے کے سلسلے میں ان حضرات نے جن کے اسماء اوپر مذکور ہوئے مذکورہ معانی بیان کرنے کے بعد اور بھی اقوال فرمائے ہیں چنانچہ ابن عطاء فرماتے ہیں کہ اے محبوب! ہم نے تم کو اپنی ربوبیت کی معرفت اپنی وحدانیت کی یکتائی اور اپنی مشیت وقدرت کا اعلان عطا فرمایا۔ سہل تشتری نے فرمایا اِنَّـآ اَعْـطَيْـنٰكَ الْـكَوْثَـرَ یعنی ہم نے تمہیں وحدت کے ساتھ کثرت‘ علم توحید کی تفصیلات اور اپنی بے مثل تجلی کے ساتھ عین کثرت میں شہود وحدیت کے معرفت عطا فرمائی۔ اور یہ تجلی جنت میں اس نہر کی مانند ہے کہ جو بھی ایک مرتبہ اس سے پانی پیئے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ فَـصَـلِّ لِرَبِّكَ مطلب یہ ہے کہ جب مشاہدہ اور عین کثرت میں وحدت کو پالیا تو استقامت نماز کے ذریعہ مکمل طور پر شہود درد ح‘ حضور قلب‘ انقیاد نفس اور اطاعت بدن سے بار بار عبادات کی شکل اختیار فرما کر لطف اندوز ہوئے۔ اس لیے کہ یہی نماز کامل اور ”جمع“ وتفصیل کے حقوق ادا کرنے کا طریقہ ہے۔ وَانْـحَـرْ یعنی انانیت کے اونٹ اور گائے کو ذبح کیجئے تا کہ آپ کے شہود میں یہ انانیت تلون مزاج کی صورت میں ظاہر نہ ہو اور آپ سے مقام ”تمکین“ کو سلب نہ کرے اور حق تعالٰی کے ساتھ قضائے محض میں رہیے۔ اور اس کی بقا کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ آپ باقی رہیں۔ تا کہ اپنے وصال حق اور اپنے حال میں اور آپ کے ساتھ جو آپ کی امت کا اتصال اور آپ کی ذرّیت ہے۔ اس میں ابتری واقع نہ ہو بلاشبہ آپ سے دشمنی رکھنے والا حق سے منقطع اور پھٹکارا ہوا ہے اور وہی ابتر ہے نہ کہ آپ!

اور مولانا تاج الملت والدین اور المصدر البخاری ”حقائق میں فرماتے ہیں کہ اِنَّـآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ بلاشبہ ہم نے آپ کو اعداد وشمار سے باہر بکثرت خوبیاں اور ہر نوع کی بیشمار فضائل عطا فرمائے۔

غرض کہ کوثر کی تفسیر میں ائمہ کبار رحمہم اللہ کے اقوال وتاویلات بہت ہیں۔ جس نے اپنے نور باطن سے جتنا دیکھا بیان کر دیا۔ لیکن

تمام مخلوق کا علم کوثر کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس جمال کے پہلو میں تمام اقوال وتفصیلات ایک دفتر کے مقابلہ میں بمنزلہ ایک حرف اور اس نہر کا ایک قطرہ ہے۔ انتہی کلام فصل الخطاب واللہ اعلم۔

آیۂ میثاق: یہ آیۂ کریمہ ﷺ کے غایت فضل وکرامت پر دلالت کرتی ہے اور بتلاتی ہے کہ آپ نبی الانبیاء اور سردار انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور تمام نبی آپ کی امت کے حکم میں آیۂ کریمہ یہ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ٥ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

فرماتا ہے اے محبوب! یاد کیجئے اس وقت کو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے عہد و پیمان لیا تھا کہ جس وقت میں تم کو کتاب وحکمت دوں پھر وہ رسول تشریف لائے جو تمہارے پاس کی ہر چیز کی تصدیق کرنے والا ہو (یہ صفت تمام نبیوں کی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے اور اصول دین میں باہم اتفاق کرتے۔) تو اس وقت تم اس رسول پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔

اور حضور کو خبر دی گئی کہ ہر نبی جو آدم علیہ السلام سے حضور سیّد عالم ﷺ تک بھیجا گیا اس سے عہد و پیمان لیا گیا ہے۔ جمہور مفسرین کا مذہب یہی ہے کہ آیۂ کریمہ میں ''رسول'' سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات قدس ہے۔ اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا جس سے حضور اکرم ﷺ کے اوصاف نہ بیان کیے گئے ہوں اور اس سے آپ کے اوصاف بیان کرنے کے بعد اس پر عہد و پیمان نہ لیا گیا ہو کہ تم اگر آپ کا زمانہ پاؤ تو آپ پر ایمان لانا لازمی ہے۔ جب نبیوں سے یہ عہد و پیمان لیا گیا تو انہوں نے اپنے اپنے امتیوں سے بھی یہی عہد و پیمان ضرور لیا ہوگا۔ چونکہ انبیاء کرام اصل اور متبوع ہیں اس لیے آیت میں انہیں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا۔

سیّدنا علی ابن ابی طالب اور سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا۔ مگر یہ کہ اس پر عہد لیا گیا کہ اگر تم محمد ﷺ کو پاؤ تو آپ پر ایمان لانا اور آپ کی مدد کرنا۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عہد لیا کہ وہ نبی اپنی اپنی امتوں سے عہد لیں کہ جب محمد ﷺ مبعوث ہوں تو تم سب ان پر ایمان لے آنا۔ اور اس طرح اپنے بعد آنے والے کو بتاتے رہنا۔ یہاں تک کہ یہ عہد حضور اکرم ﷺ کے زمانے کے اہل کتاب یہودیوں تک پہنچا جب حضور اکرم مدینہ منورہ میں رونق افزا ہوئے تو یہود آپ کی تکذیب کرنے لگے۔ اس وقت حضور نے ان کو عہد و میثاق کی یاد دہانی کرانے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی اور وہ جنہوں نے یہ اخذ کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ وہ اپنی امتوں سے ایسا عہد لیں'' اس سے یہ حجت پکڑی ہے کہ حضور کے مبعوث ہونے کے بعد اہل کتاب پر فرض ہو گیا تھا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں۔ حالانکہ انبیاء علیہم السلام' حضور اکرم کی بعثت کے وقت سب کے سب دنیا سے گذر چکے تھے۔ اور میت مکلّف نہیں ہوتی۔ لہٰذا متعین ہو گیا کہ میثاق امتوں پر ماخوذ ہے۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کر رہا ہے کہ فرمایا:

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥ تو جو اس عہد سے روگردانی کرے تو وہی فاسقوں میں سے ہے۔

ایسا وصف انبیاء کے لائق نہیں ہے بلکہ امت کے لائق ہے اس کا یہ جواب دیا گیا کہ اس آیت سے مراد بر طریق فرض وتقدیر ہے۔ مطلب یہ کہ اگر بفرض وتقدیر انبیاء زندہ ہوں تو ان پر واجب ہے کہ وہ محمد ﷺ پر ایمان لائیں نہ یہ کہ اس کا وقوع ان کے وجود کے درمیان ہونے کی خبر دینا ہے اور بہت سے احکام بفرض وتقدیر آئے ہیں۔ جیسے کہ۔

لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (اگر تم نے شرک کیا تو ضرور تمہارے اعمال اکارت ہوں گے) وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ (اور اگر کوئی ہم پر اپنی موضوں کی باتوں کی نسبت کرے) وَمَنْ يَّقُلْ اِنِّىْٓ اِلٰهٌ الآیات (اور کوئی کہے میں معبود ہوں) تو یہ

سب بفرض وتقدیر کی مثالیں ہیں۔ اور حضورِ اکرم ﷺ کے فضل وشرف اور کرامت کے اظہار کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ جب کلام کی بنیاد فرض وتقدیر پر ہے تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ ''جو کوئی اس کے بعد روگردانی کرے تو وہی فاسقوں میں سے ہے'' یہ بھی درست ہے' نیز جب نبیوں کو حکم فرمایا اور ان سے یہ عہد لیا برتقدیر برحیات' تو امتیوں پر اس کا وجوب بطریق اولیٰ ہوگا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں۔ اور فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ٥ اس کی نسبت امتوں کے ساتھ ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام سے اخذ میثاق' اور ان پر تاکید وتقریر اور تشدید فرمانا مقصود میں زیادہ قوی وداخل ہے۔

امام سبکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اشارہ ہے حضورِ اکرم ﷺ برتقدیر حیات انبیاء علیہم السلام ان کے زمانہ میں ان کی طرف مرسل ہیں لہٰذا آپ کی نبوت ورسالت عام ہے۔ اور تمام مخلوق کے لیے آدم علیہ السلام کے زمانہ سے قیامت تک شامل ہے اور تمام نبی اور ان کی امتیں سب آپ کی امت ہیں۔ حضورِ انور کا یہ ارشاد کہ ''میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں'' اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ اور نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کی طرف'' تو یہ ارشادات آپ کے زمانہ مبارک سے قیامت تک ہی لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو آپ سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اور انبیاء علیہم السلام سے آپ کے لیے اخذ میثاق اس لیے فرمایا گیا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ آپ ان سب پر مقدم ومعظم ہیں۔ اور آپ ان سب کے نبی ورسول ہیں ﷺ۔ لہٰذا اے طالبان صادق! انصاف سے غور وفکر کرو کہ نبی ﷺ کی تعظیم وکریم حق تعالیٰ کی جانب سے کتنی عظیم ہے۔ جب تم اسے جان لوگے تو معلوم ہو جائے گا کہ سب محمد ﷺ کے نبی ہیں اور آپ نبی الانبیاء ہیں ﷺ۔ اور اسی جگہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد آپ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ جیسا کہ فرمایا: اٰدَمُ وَمَنْ دُوْنَهٗ تَحْتَ لِوَائِیْ. (آدم اور ان کے سوا سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔) اور بفرض اگر تمام نبی حضور کے ساتھ آپ کے زمانہ میں ہوتے یا حضور ان کے زمانہ میں ہوتے تو سب آپ پر ایمان لاتے۔ اور آپ کی مدد کرتے۔ اسی لیے تو فرمایا: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَّا وَسِعَ اِلَّا اتِّبَاعِیْ اگر موسیٰ دنیاوی حیات میں زندہ ہوتے تو ان کو بجز میری اتباع کے کوئی چارہ نہ ہوتا۔'' اور یہ اسی میثاق کی بناء پر ہوتا جو ان سے لیا گیا۔ لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانہ میں آپ کی شریعت پر تشریف لائیں گے۔ حالانکہ وہ عزت وکرامت والے اور اپنی نبوت پر باقی ہیں اور ان سے کسی چیز کی کمی نہیں کی گئی۔ اسی طرح دوسرے انبیاء کرام کی حیثیت ہے۔ وہ اپنی نبوت اور امت کے باوجود آنحضرت کی امت ہیں۔ لہٰذا آپ کی نبوت اعم۔ اشمل اور اعظم ہے۔ اس معنی میں خوب غور کرو۔ تاکہ اس جگہ انبیاء علیہم السلام سے ان کی نبوت ورسالت کی نفی کا گمان نہ لے جاؤ۔ اسی طرح صاحب مواہب لدنیہ نے کہا ہے۔ جتنا کچھ کہا گیا ہے اس سے زیادہ اس کی تحقیق وتفصیل انہوں نے بیان فرمائی ہے۔

بندۂ مسکین یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پوشیدہ نہ رہنا چاہیے کہ بقرینہ ظاہر' واضح طور پر انبیاء علیہم السلام سے اخذ میثاق ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ (جب میں تم کو کتاب وحکمت دوں تو......)

امیر المومنین سیّدنا علی مرتضیٰ اور سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تصریح سے ظاہر ہے کہ اخذ میثاق کے وقت انبیاء کرام علیہم السلام حضور علیہ السلام پر ایمان لاتے اور ان کی مدد کرتے کہ اس سے مراد' موافقت' توثیق عہد یا قصد نصرت ہے جو عالم وجود میں آیا۔ اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے وجود عنصری سے پہلے ایمان لائے تھے۔ جیسے حبیب نجار وغیرہ۔ اور زمانہ سابق میں بہت سے گزشتہ لوگ' آپ کے فضائل وکمالات اور نبوت کی خبر سننے سے مشرف ہو چکے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کی امت کے حضورِ اکرم کی امت میں ہونے کے حکم میں اتنا ہی کافی ہے کہ آپ ان کی طرف بھی رسول

ہیں اور شب اسریٰ مسجد اقصیٰ میں انبیاء علیہم السلام اور حضور اکرم ﷺ سب یکجا جمع ہوئے۔ حضور نے ان کی امامت فرمائی اور سب نے آپ کی اقتدا کی۔ اس وقت وہ سب آپ پر ایمان لائے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی حیات اور حیات حقیقی دنیاوی کے ساتھ ان کی بقاء پر امت کا اتفاق ہے۔ اگرچہ انبیائے کرام کا اپنی اپنی امتوں سے نبی آخر الزماں پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنے پر عہد و پیمان لینا بھی حضور اکرم ﷺ کا فضل و شرف ہے۔ جو کسی دوسرے نبی کو نہ حاصل تھا۔ لیکن حق تبارک وتعالیٰ کا انبیاء کرام سے اس پر عہد و میثاق لینا اعز و اعظم ہے۔ فافهم وبالله التوفيق۔

باہم تفصیل رسل: وصل: اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یہ رسول ہیں جن کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ اور بیشک ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی۔

یہ دونوں آیتیں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے مراتب کے متفاوت و مختلف ہونے میں نص ہیں کہ بعض، بعض پر افضل ہیں۔ یہاں پر معتزلہ کا رد ہے۔ وہ قائل ہیں کہ بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت نہیں ہے۔ اور وہ سب برابر ہیں۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام حق ابوت یعنی باپ ہونے کی وجہ سے افضل ہیں۔ یہ قول فاسد ہے۔ اس لیے کہ گفتگو تو بحیثیت نبوت افضل ہونے میں ہے نہ کہ باپ ہونے میں۔ بسا اوقات فرزند باپ سے کمالات میں زیادہ فاضل ہوتا ہے۔ اگرچہ باپ حق ابوت رکھتا ہے۔ اور ایک جماعت یہ کہتی ہے اس مقام پر خاموشی زیادہ مناسب ہے۔ حالانکہ نص قرآنی کے بعد جو ایک دوسرے کی فضیلت پر ناطق ہے۔ خاموشی کی کون سی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ کچھ نبیوں میں سے وہ ہیں جن سے للہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان سے بے واسطہ کلام فرمایا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کے ساتھ تخصیص نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ حضور سید المرسلین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین سے شب معراج بیواسطہ کلام فرمایا۔ مگر یہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمانا بوجہ خاص ہوا۔ اور غالباً اسی وجہ تخصیص اور اس نعمت سے نوازے جانے پر ان کا غالب نام کلیم ہو گیا۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ انہوں نے کلام نفسی سنا یا کسی جہت سے سنا۔

اور جس وقت سیّد عالم ﷺ فوق عرش گئے اور اس جگہ پہنچے جہاں مخلوق کے علوم کی حد وانتہا ہے۔ اور جہاں تک حضور ﷺ کی رسائی ہوئی وہاں تک رسائی کسی کو میسر نہ ہوئی تو وہاں آپ کلام اور ان درجات و کمالات سے نوازے گئے کہ جس قدر دوسروں کو حاصل ہوئے ان سے اعلیٰ اور اتم ہوں گے۔ اور اسی معنی کی طرف حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (اور بعض کے درجات بلند ہوئے) مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد حضور سیّد عالم ﷺ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس ابہام میں آپ کی تعظیم فضل اور اعلائے قدر و منزلت ہے۔ اور جو کلام کے اسلوب کو جانتا ہے اس پر کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔

علمائے کرام بیان کرتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے جس فضیلت کا یہاں ذکر ہے۔ اس کی تین وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے معجزات اور نشانیاں اس قدر زیادہ ظاہر، مشہور، قوی اور روشن ایسی امت کے لیے ہوں جو از کی، اعلم اور اکثر ہو۔ یا وہ اپنی ذات میں افضل و اکمل اور اظہر ہوں۔ فضل ذاتی ان خصوصیات کی طرف راجع ہوتا ہے۔ جو اس نبی میں کرامات اور مراتب علیا کلام وغیرہ سے اختصاص موجود ہو۔ یا وہ خلت یا رویت وغیرہ الطاف و تحائف سے نوازا گیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے معجزات اور نشانیاں تو بہت زیادہ ظاہر، اتم، روشن، اکثر باقی رہنے والی ہیں اور آپ کا منصب اعلیٰ، آپ کا دبدبہ اعظم و اوفر، اور آپ کی

امت ازکی، اعلم اور اکثر بحکم آیت قرآنی ہے کہ فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تم بہترین امت ہو۔ آپ کی امت اس خیر و بھلائی کے ساتھ موصوف ہے جس کا مفہوم تمام کمالات وفضائل کو شامل ہے اور آپ کی ذات قدس اکمل واطہر ہے۔ اور آپ کی خصوصیات، کرامات اور کمالات زیادہ عظیم، مشہورتر اور ظاہر ہیں اور آپ کا درجہ تمام رسولوں کے درجات سے ارفع ہے اور تمام مخلوق سے ازکی، اظہر اور افضل ہے۔ ﷺ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

شفاعت والی حدیث پر غور کیجئے کہ روز محشر ساری مخلوق خدا جمع ہو کر شفیع کی جستجو میں حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے پاس آئیں گی اور شفاعت کی التجا کریں گی اور سب ہی اس مقام کی ذمہ داری قبول کرنے میں اپنی عجز وناتوانی کا اعتراف کریں گے۔ اور فرمائیں گے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔ آخر میں یہ مخلوق سید المرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے حضور آئیں گی اور آپ فرمائیں گے یہ کام میرا ہے پھر بارگاہ قدس میں حاضری دیں گے۔ آخر حدیث تک۔ اور فرمایا: اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔ اور فرمایا: اَنَا اَكْرَمُ وُلْدِ اٰدَمَ میں اولاد آدم میں بہترین ہوں۔ گویا کہ خدا کے نزدیک میں بہترین وبزرگ ترین اولاد آدم ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ ولد ادم اور بنی ادم سے مراد عرف میں نوع انسانی ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام بھی داخل ہیں۔ چنانچہ ایک اور روایت میں ہے کہ اَنَا سَيِّدُ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ میں روز قیامت انسانوں کا سردار ہوں۔ اور سب سے بہتر استدلال اس حدیث سے ہے کہ فرمایا: اٰدَمُ وَمَنْ دُوْنَهٗ تَحْتَ لِوَائِيْ. آدم اور ان کے ماسوا سب میرے جھنڈے کے نیچے ہیں اور بعض نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ جس قدر لوگ گزرے ان میں تم سب سے بہتر امت ہو۔ اس میں شک نہیں کہ امت کی افضلیت وخیریت دین میں کمال کے اعتبار سے ہے۔ اور یہ اپنے نبی کے کمال کے تابع ہے۔ کہ امت ان کی پیروی کرتی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی تعریف اوصاف حمیدہ سے فرمائی ہے۔ چنانچہ ان میں سے حضورِ اکرم ﷺ کو فرمایا گیا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ. یہ وہ حضرات ہیں جن کی حق تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے تو آپ ان کی راہ پر چلئے۔'' لہٰذا حضور کو ان سب کی راہ پر چلنے کا حکم فرمایا تو لامحالہ امتثال امر اس کا بجالانا واجب ہوا۔ جب آپ بجالائے تو وہ تمام خوبیاں اور کمالات جو تمام نبیوں میں تھیں بلاشبہ آپ میں جمع ہو گئیں اور ہر خوبی وکمال جو متفرق اور جدا جدا تھے آپ میں یکجا ہو گئے۔ اس طرح آپ ان سب سے افضل ہوئے۔ یہ استدلال لطیف ہے۔ اگرچہ بادی النظر وہم میں ایسا آتا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی انبیاء کی اقتداء واتباع کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اور آپ مفضول ہوئے لیکن اس جگہ اقتدا واتباع سے مراد موافقت ہے۔ چونکہ انبیاء کرام آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس لیے لفظ اقتداء بولا گیا۔ اور یہی حال اس حکم کا ہے جس میں حضور کو ملت ابراہیم کے اتباع کا حکم فرمایا۔ نیز آپ کی دعوت تمام نبیوں کی دعوتوں سے زیادہ اکثر بلاد عالم میں پہنچی ہے۔ لہٰذا اہل دنیا کا آپ کی دعوت سے انتفاع کرنا بمقابلہ تمام نبیوں کی امتوں کے انتفاع دعوت، اکثر واکمل ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ تمام نبیوں سے افضل ہوئے۔ خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ بہترین وافضل ترین شخص وہ ہے جو لوگوں کو زیادہ نفع پہنچائے۔

فضائل صحابہ کے ضمن میں ایک حدیث ہے کہ سیّدنا علی مرتضیٰ ایک دروازے سے نمودار ہوئے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: هٰذَا سَيِّدُ الْعَرَبِ یہ عرب کا سردار ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا آپ سیّد العرب نہیں ہیں۔ فرمایا: اَنَا سَيِّدُ الْعٰلَمِيْنَ عَلِيٌّ سَيِّدُ الْعَرَبِ میں تمام جہانوں کا سردار ہوں اور علی عرب کے سردار ہیں۔

فائدہ: حاکم بیان کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے اور ذہبی نے اس کے وضعی ہونے کا حکم کیا

ہے۔ (واللہ اعلم)

لیکن قرآن کریم میں واقع ہوا ہے کہ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ. ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور صحیحین میں بروایت ابو ہریرہ ؓ مروی ہے کہ لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلَی الْاَنْبِیَآءِ مجھے نبیوں پر فضیلت نہ دو۔ اور ایک رویت میں ہے۔ لَا تُفَضِّلُوْ بَیْنَ الْاَنْبِیَآءِ نبیوں کے درمیان فضیلت نہ دو۔ اور حضرت ابو سعید خدری ؓ سے ہے۔ لَا تُخَیِّرُوْا بَیْنَ الْاَنْبِیَآءِ نبیوں کے درمیان فرق نہ کرو۔ اور حضرت ابن عباس ؓ کی حدیث میں ''مسلم کے نزدیک آیا ہے'' کہ کسی بندہ کو ممتاز نہ کرو کہ تم کہنے لگو کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔ تو وہ بلاشبہ جھوٹ کہتا ہے۔ مروی ہے کہ جو کوئی یہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں تو وہ بلاشبہ جھوٹ کہتا ہے۔ ان کے جواب میں علماء فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے ارشاد: لَانُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اس سے مراد ایمان میں فرق کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض پر لوگ ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ (بے شک جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کیا) وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ. (اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں) یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ. اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں) حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ اسی پر بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو محمول کیا ہے۔ اِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ. (اگر یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا ہے۔) انبیاء ومرسلین کے درمیان ایمان میں برابری اس کے منافی نہیں ہے۔ کہ بعض افضل ہوں۔ اور حدیثوں کے جوابات متعدد وجوہ سے دیئے گئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تفضیل وتخییر کی ممانعت اس سے پہلے تھی کہ وحی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ آپ سیّدنا انبیاء افضل بشر اور سید ولد آدم ہیں۔ لیکن اس کے قائل پر واجب ہے کہ اس کی تقدیم وتاخیر کو ثابت کرے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسے طریقے پر فضیلت نہ دی جائے کہ مفضول کی تنقیص واہانت لازم آئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ممانعت تفضیل' نبوت ورسالت کی اصل میں ہے اس لیے کہ تمام نبی' اصل نبوت میں حد واحد ہیں اور بعض نبی واوالعزم ہیں۔ لیکن یہ بات خطا سے خالی نہیں ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ میں اسے فضیلت دیتا ہوں جس کے درجہ کو اللہ رب العزت نے خصائص قرب سے بلند فرمایا ہے۔ اور امت کی سیاست ان کے ڈرانے' دین پر صبر کرنے' ادائے رسالت پر قائم رہنے اور گمراہوں کی ہدیات پر خواہش رکھنے پر کسی سے تعرض نہیں کرتا۔ اس لیے کہ ہر ایک نے اپنی مقدور کی حد تک' اپنی جہد وسعی کو صرف فرمایا ہے۔ اور اس سے زیادہ انہیں اللہ تعالیٰ نے مکلّف نہیں فرمایا۔ فافہم۔ بعض کہتے ہیں ہم اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے درمیان ایک کو دوسرے پر اجمالی طور پر فضیلت دی ہے۔ لیکن ہم اپنی ذاتی رائے فضیلت دینے سے باز رہتے ہیں اس لیے کہ ہم کسی کی فضیلت اپنی رائے سے نہیں بیان کر سکتے۔ بلکہ بحکم کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ فضیلت دے سکتے ہیں۔ جیسا کہ دلائل سے پہلے گذر چکا ہے۔

ابن ابی جمرہ جو کہ اعاظم علماء مالکیہ میں سے ہیں حدیث یونس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اس سے مراد جہت' تحدید' اور تکئیف کی نفی حق سبحانہ سے ہے۔ چنانچہ ابن خطیب رے یعنی امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ فرمایا مجھے حضرت یونس علیہ السلام پر فضیلت اس حیثیت سے نہیں ہے کہ مجھے آسمان پر لے جایا گیا۔ اور حضرت یونس کو دریا کی گہرائیوں میں اتارا گیا۔ اور یہ کہ میں خدا کے قریب ہوں اور وہ دور تر لہٰذا اس حیثیت سے ان پر میری فضیلت کو ثابت کرنے سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ کے لیے بھی جہت ومکان ثابت کیا جائے۔ (اور یہ باطل ہے) اگرچہ مجھے آسمان کے ساتوں طبقوں پر لے جایا گیا اور جحت خرق کی گئی۔ اور حضرت یونس کو دریا کی گہرائیوں میں اتارا گیا۔ مگر حق تعالیٰ نے میرے اور ان کے قرب کی نسبت برابر ہے۔ اور انبیاء ویونس علیہم السلام سے

افضلیت ثابت کرنے کے سوا میرے دیگر فضائل وکمالات ثابت ہیں۔ اس طرح مجھے فضیلت دینے سے جہت لازم آتی ہے۔ یہ بات امام دارالہجرۃ یعنی امام مالک رحمتہ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے اور امام الحرمین سے بھی ایسی ہی حکایت منقول ہے۔ بعض فضلا کا اس میں اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم وجود باری تعالیٰ کے لیے اثبات مکان کی جہت سے فضیلت نہیں دیتے۔ کیونکہ وجود باری تعالیٰ سے تمام جہتوں کی نسبت برابر ہے بلکہ ملاء اعلیٰ یعنی آسمانی مخلوق کو حضیض ادنیٰ یعنی اہل زمین پر جو فضیلت حاصل ہے اور اس عالم کی نسبت سے اس عالم کو جو شرف ہے اس جہت سے ہم حضورِ اکرم ﷺ کی قدر ومنزلت کو حضرت یونس علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہیں۔ گویا کہ یہ فضیلت مکانیت یعنی قدر ومنزلت سے ہے نہ کہ مکان سے۔ لہٰذا تفضیل کی ممانعت' مکان کے ساتھ مقید ہے کہ اس سے قریب مکانی کا مفہوم حاصل ہوتا ہے۔ (یہ ہمارا مقصود نہیں) فلیتامل۔

مسئلہ افضل بشر بر ملک: فرشتوں پر بشر کی افضلیت کا مسئلہ جس پر جمہور اہل سنت وجماعت کا مسلک ہے۔ اس تفصیل سے مشہور ہے کہ خواص بشر یعنی انبیاء علیہم السلام خواص ملائکہ پر یعنی حضرت جبریل۔ میکائیل' اسرافیل' عزرائیل' حاملان عرش' مقربین' کروبیاں اور روحانیین پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مواہب لدنیہ میں تفسیر بیان کی گئی ہے اور عقائد (نسفی) کی عبارت یہ ہے کہ رُسُلُ الْبَشَرِ اَفْضَلُ مِنْ رُّسُلِ الْمَلٰٓئِكَةِ یعنی رَسُوْلَان بَشَرٍ۔ فرشتوں کے رسولوں سے افضل ہیں۔ فرشتوں کی وہ جماعت جن کا ذکر ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ فرشتوں کے مرسلین ہیں۔ کیونکہ یہ مرسلین ملائکہ' فرشتوں کی جماعتوں کو تبلیغ احکام الٰہی اور تعلیم دیتے ہیں۔ اور عوام بشر جن سے مراد اولیاء وصلحاء واتقیاء ہیں۔ نہ کہ فساق وفجار (تو یہ عامہ ملک سے افضل ہیں جو کہ غیر مرسلین ملائکہ ہیں)

فائدہ: شعب الایمان میں اس پر عاصیوں' فاسقوں کی تنقیص کی گئی ہے۔ اس کی عبارت جیسا کہ نقل کیا گیا ہے۔ یہ کہ ملائکہ اور بشر کے پرانے لوگ اور آج کے لوگ بحث کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنا ہے کہ رسل بشر رسل ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور اولیاء بشر اولیاء ملائکہ سے افضل ہیں (انتہی) اور جمہور اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ بعض اشاعرہ ملائکہ کی افضلیت کی طرف گئے ہیں۔ اور قاضی ابوبکر باقلانی جو اس مذہب کے بہترین فاضل اور شیخ ابوالحسن اشعری رحمتہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے نزدیک مسلک مختار یہی ہے۔ عبداللہ حلیمی بھی اسی جانب ہیں او امام غزالی کے کلام سے بھی بعض مقامات میں یہی مفہوم نکلتا ہے اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ بحیثیت مجرد اور قرب کے ملائکہ افضل ہیں۔ اور کثرت ثواب کے لحاظ سے بشر افضل ہیں۔ اہل سنت کی افضلیت سے مراد' کثرت ثواب ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہا گیا ہے۔

شیخ تاج الدین سبکی رحمتہ اللہ جو علمائے شافعی میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں اگر کوئی شخص ساری عمر مسئلہ افضلیت کو خطرہ میں نہ لائے نہ اس کی نفی کرے اور نہ اثبات کرے تو میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن اس سلسلے میں کچھ بھی نہ پوچھا جائے گا۔

فرشتوں میں بھی بعض' بعض سے افضل ہیں۔ اور ان میں سب سے افضل حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں کہ ان کو روح الامین کہا جاتا ہے۔ وہ مظہر علم اور حامل وحی ہیں۔ ان کے علاوہ تین فرشتے تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔ تمام رسول' تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ اور بعض رسول بھی بعض سے افضل ہیں۔ اور حضورِ اکرم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ تمام انبیاء ومرسلین سے افضل ہیں۔ آپ سید المرسلین' خاتم النبیین اور تمام مخلوق سے افضل ہیں۔ **صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفْضَلَ مَا صَلّٰى عَلٰى اَحَدٍ مِّنَ الْاَنْبِيَآءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ هُدَاةِ طَرِيْقَ الْحَقِّ وَمُحْيِ عُلُوْمِ الدِّيْنِ.**

انبیاء علیہم السلام کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ اس باب میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث مشہور ہے۔ جسے ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہیں؟ فرمایا ایک سو چوبیس

ہزار۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! رسول کتنے ہیں۔ فرمایا تین سو تیرہ (والعلم عنداللہ تعالیٰ)۔

وہ نبی جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ ہیں۔ حضرت آدم، ادریس، نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، یوسف، ایوب، شعیب، موسیٰ، ہارون، یونس، داؤد، سلیمان، الیاس، الیسع، زکریا، یحییٰ عیسیٰ اسی طرح اکثر مفسرین کے نزدیک الکفل ہیں۔ اور قرآن مجید میں حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ بعض نبیوں کے قصے تو آپ پر بیان کردئے ہیں۔ اور بعض کے ہم نے نہیں بیان کیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم ﷺ پر تمام نبیوں کے قصے نہیں بیان کیے گئے۔

خصوصی قدر و منزلت وصل: اللہ رب العزت سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول سیّد عالم ﷺ کی جو منزلت و کرامت قرآن کریم میں ظاہر فرمائی گئی ہے ان میں سب سے اعظم واعلیٰ قصۂ اسریٰ (معراج) سُوْرَۂِ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی میں اور دَنٰی فَتَدَلّٰی (قریب ہوئے اور زیادہ قریب ہوئے) سورۂ والنجم میں مذکور ہے۔ یہ آپ کے اعظم قدر و منزلت اور علو درجت اور قرب و مشاہدہ آیات وعجائب قدرت جل وعلا پر مشتمل ہے۔ انہیں میں سے آپ کو اعداء خصوصاً مشرکین مکہ و مدینہ سے آپ کو محفوظ رکھنا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَ اللّٰہُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

حضورِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ کو حفاظت ونگہبانی کے لیے مقرر فرمایا کرتے تھے۔ اور اس طرح آپ دشمنوں کے شر و فساد سے اجتناب اور بچاؤ کرتے تھے۔ او یہ تحفظ بھی اگرچہ بحکم الٰہی اور اس کی حکمت بالغہ کے تحت تھا لیکن جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ دشمنوں کے مکروفریب سے بے نیاز ہوگئے۔ چنانچہ فرمایا

اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَلِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْیُخْرِجُوْكَ. جب یہ کافر لوگ آپ کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ آپ کو یا تو محبوس کردیں یا قتل کردیں یا نکال دیں......

یہ کیفیت ہجرت کے ابتدائی دنوں کی تھی اور آپ کی ہجرت اسی بناء پر تھی۔ چنانچہ اس کا قصہ مشہور ہے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰہُ. اگر یہ آپ کی مدد نہ کریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا۔

چنانچہ اس قصہ میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی جانب سے مشرکوں کی ایذاؤں کو ان کی بیعت کے بعد ان کی ہلاکت اور آپ کے بارے میں ان کی اختلاف آراء سے دفع فرمادیا۔ ان کے روبرو آپ کے نکلنے کے وقت اللہ نے کفار کی آنکھوں کو اندھا کردیا اور غار ثور میں اس یقین کے باوجود کہ حضور اس میں ہوں گے۔ آپ کی جستجو میں غفلت ڈال دی۔ اور ان کے ارادوں کو پھیر دیا۔ اور نشانیوں کا ظہور سکینہ یعنی اطمینان وسکون کا نازل ہونا اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی معیت کا مشاہدہ کرنا یہ ایسے عظیم ترین معجزات اور آیات ہیں جن کا تذکرہ اپنی جگہ پر آئے گا۔ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کی حفاظت وعصمت میں ارشاد ہے: اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا جب اپنے رفیق سے فرمارہے تھے کہ غم نہ کرو۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اس سے ملتا جلتا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جس وقت آپ بنی اسرائیل کے ساتھ نکلے اور فرعون اور اس کے لشکریوں نے ان کا پیچھا کیا تو بنی اسرائیل ڈرے کہ فرعونی انھیں پکڑ لیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ''نہ ڈرو ان معی ربی'' بیشک میرے ساتھ میرا رب ہے۔'' لیکن علماء فرماتے ہیں۔ کہ حضور کے مشاہدہ رب میں اور حضرت موسیٰ کے مشاہدہ رب میں فرق ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی اول نظر وجود باری تعالیٰ پر پڑی۔ اس کے بعد دوسری نظر اپنے آپ پر۔ کہ فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' (اللہ ہمارے ساتھ ہے۔) اور موسیٰ علیہ السلام کی اول نظر اپنے آپ پر پڑی اس کے بعد دوسری نظر وجود باری تعالیٰ پر۔ اور فرمایا: اِنَّ مَعِیَ

رَبِّیْ (میرے ساتھ میرا رب ہے۔) یہ دونوں قسمیں مشہود و قرب کے اقسام سے ہیں۔ مگر اول اتم و اقرب بمصداق مَا رَأَيْتَ شَيْئًا اِلَّا وَرَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهٗ لَاثَانِیْ مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَرَاَيْتُ اللّٰهَ یعنی میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ مگر یہ کہ سب سے پہلے اللہ کو دیکھا۔ اور دوسرے میں یہ کہ میں نے کچھ نہیں دیکھا مگر اللہ کو اس کے بعد دیکھا۔ اوّل میں طریق جذب ہے۔ اور دوسرے میں طریق سلوک۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمِ. بلاشبہ میں نے سبع مثانی اور قرآن عظیم آپ کو عطا فرمایا۔

سبع مثانی سے مراد وہ سات لمبی سورتیں ہیں جو قرآن کی سورتوں میں پہلے مذکور ہیں۔ یعنی سورۂ بقرہ سے آخر سورۂ انفال یا سورۂ توبہ تک۔ کیونکہ یہ حکم میں ایک سورۃ کے ہیں۔ اس لیے ان دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ فصل نہیں کیا گیا۔

فائدہ: قرآن عظیم کی یہ سات آیتیں ام القرآن یا سبع مثانی ان کے سوا ہیں باقی کا نام قرآن عظیم ہے۔ چونکہ اس کی تکرار یا تو ہر رکعت میں ہے یا باعتبار تکرار نزول ہے۔ اس لیے ام القرآن کا نام سبع پڑا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کے لیے ان سات آیتوں کا استثنا فرمایا اور آپ کے لیے ان کو ذخیرہ بنایا ہے۔ آپ کے سوا کسی نبی کو یہ مرحمت نہ فرمایا گای۔ اور قرآن کا ''مثانی'' سے موسوم کرنا یا تو اس بنا پر ہے کہ ان میں قصص بار بار دہرائے گئے ہیں۔ یا اس بناء پر کہ ان میں حق تعالیٰ جل جلالہ کی حمد و ثنا کی گئی ہے یا اس بناء پر کہ اس کی حمد و ثنا بلاغت و اعجاز کے ساتھ کی گئی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کے خصائص میں ارشاد فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا. اور نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کی طرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔

اور ارشاد فرمایا:

قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا. فرمادو اے لوگو! بیشک میں اللہ کی طرف سے رسول تم سب کی طرف ہوں۔

مزید ارشاد ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ اور ہم نے کسی رسول کو نہ بھیجا مگر ان کی اپنی قوم کی زبان میں تا کہ انہیں خوب
لِيُبَيِّنَ لَهُمْ. خوب بیان فرمائے۔

یعنی رسولوں کی تخصیص فرمائی گئی کہ وہ انہیں کی قوم میں سے ہوں گے۔ لیکن سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کو ساری مخلوق کی طرف بھیجا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

بُعِثْتُ اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ. مجھے عرب و عجم کی طرف بھیجا گیا۔

اسود سے مراد عجم ہیں۔ کیونکہ ان کا رنگ سبزی مائل ہے۔ اور احمر سے مراد عرب ہیں کیونکہ ان کا رنگ سرخ و سفید ہے۔ اور ارشاد فرمایا:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ نبی پاک مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔ اور آپ کی ازواج
وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ. مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نبی پاک کا حکم نافذ و جاری ہے۔ جس طرح آقا کا حکم غلاموں پر نافذ ہوتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ کے حکم کی پیروی اپنی ذاتی رائے کی پیروی سے زیادہ بہتر ہے۔ حضور ﷺ کی محبت و اتباع کے اعتبار سے وجوب کے باب میں تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ یہ حکم آپ کے بعد آپ کی خصوصیات و کرامت کی وجہ سے حرمت نکاح میں ہے اور ایسا اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ ازواج آخرت میں آپ کی بیبیاں ہیں اور ایک شاذ قرأت میں آیا ہے کہ هُوَ اَبٌ لَّهُمْ (نبی ان

کے باپ ہیں۔) حق تبارک وتعالیٰ نے آپ کی مدح وثنا میں ارشاد فرمایا:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ اور اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت نازل فرمائی اور آپ کو وہ سب کچھ
تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا٥ سکھا دیا جو آپ نہ جانتے تھے۔ اور اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے۔

فضل عظیم کے ادراک اور اس کی اصل تک رسائی کسی کے لیے ممکن نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں رویت الٰہی کی طاقت و برداشت کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ۃ اس کی تاب وطاقت نہ رکھ سکے تھے۔ ایسی آیات قرآنیہ جن میں آپ کے فضل وشرف کا بیان ہے بہت ہیں۔ درحقیقت قرآن سب کا سب بعد از احمد وثنائے الٰہی حضورِ اکرم ﷺ کے اوصاف وکمالات کے بیان کا مظہر ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے خصوصیات اور فضائل میں سے ایک یہ بھی کہ مشرکین او دشمنان دین جس جگہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کی طرف طعن وتنقیص کی نسبت کی ہے حق سبحانہ وتعالیٰ نے بذات خود متکفل ہو کر آپ سے اس کا دفعیہ فرمایا ہے۔ محبّ کی ایسی ہی عادت ہوتی ہے۔ کہ جب وہ کسی سے اپنے حبیب کی بدگوئی سنتا ہے اسے وہ اپنے اوپر لے کر اس کے جواب اور اس کے الٹ دینے کے درپے ہوتا ہے۔ اور اپنے حبیب کو نصرت بخشتا ہے۔ درحقیقت اس کا رد زیادہ بلیغ اور اس کی نصرت واعانت' زیادہ قوی وبلند ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کفار نے کہا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ. اے وہ جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے یقیناً بلاشبہ تم دیوانے ہو۔ (معاذ اللہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ٥ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ٥ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ٥ اے محبوب! آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں اور بلاشبہ آپ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور یقیناً آپ کی خو بو بڑی اور عظیم ہے۔ اور جس کسی کی یہ خوبیاں ہوں وہ دیوانہ کیسے ہو سکتا ہے۔

چنانچہ جب عاص بن وائل سہمی نے دیکھا کہ حضور مسجد حرام سے باہر تشریف لا رہے ہیں اور وہ اندر جا رہا تھا تو اس نے باب بنی سہم کے پاس حضور سے ملاقات کی اور کچھ باتیں کیں۔ اس وقت اشقیاء قریش یعنی کفار قریش مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب عاص مسجد حرام میں داخل ہوا تو وہ کفار قریش اس سے پوچھنے لگے کہ تو کس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کہا اسی ابتر (بے اولاد ے) سے۔ مطلب اس کا یہ تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کا ایک فرزند حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے تولد ہوا تھا اور اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت حضور ﷺ کی اولاد میں کوئی فرزند نہ تھا او اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ دیا کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ. جو آپ کا بدگو اور دشمن ہے وہی ابتر اور بے نسلا ہے۔ اور جب کفار نے کہا ''لَسْتَ مُرْسَلًا'' یعنی آپ رسول نہیں ہیں تو حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ يٰسٓ. وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ. اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ. اے سیّد عالم! قسم ہے حکمت والے قرآن کی بلاشبہ یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں۔ اور کفار نے کہا: اَئِنَّا لَتَارِكُوْا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ. یعنی کیا ہم دیوانے شاعر کے لیے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ تو اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ جَآءَ الْحَقُّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلُوْنَ. بلکہ حق آیا اور رسولوں نے سچ فرمایا۔ اور فرمایا: وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ ہم نے ان کو شعر گوئی نہ سکھائی اور نہ وہ ان کے لائق ہے۔ اور جب کفار نے کہا: لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ. یعنی اگر ہم چاہیں تو ایسا کہہ سکتے ہیں۔ نہیں ہے۔ مگر یہ پہلوں کی کہانیاں' اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ اے حبیب فرما دو! اگر تمام انسان اور جنات اس قرآن کی مثل لانے پر جمع ہو جائیں تو اس کی مثل نہ لا سکیں گے۔ اور جب کفار نے یہ کہا: مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ. نہیں ہے یہ رسول' یہ تو کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے ہیں۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ

الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اَنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ. اورنہیں بھیجا آپ سے پہلے کسی رسول کومگر یہ کہ وہ یقیناً کھانا کھاتے اوبازاروں میں چلتے تھے۔ اورجب کفار نے انسانوں میں سے رسول کے مبعوث ہونے کوبعید جانا تو حق تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلاً. تم فرماؤ۔ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو چین سے چلتے تو ان پر آسمان سے ہم رسول بھی فرشتہ اتارتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم جنسی میں انسیت ومحبت پیدا ہوتی ہے تو غیر جنس میں تباین اور غیریت۔ لہٰذا یہی قرین حکمت ہے کہ ملائکہ کے لیے ملک مبعوث ہواور زمین والوں کے لیے بشر مبعوث ہواور تمام نبی اپنی ذاتوں سے اپنے ہم جنس کی مدافعت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: لیس بی ضلالة. مجھ میں کج روی نہیں ہے۔ اورحضرت ہود نے فرمایا: لَيْسَ لِىْ سَفَاهَةٌ مجھ میں نادانی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ایسی مثالیں بہت ہیں۔ واللہ اعلم۔

ازالۂ شہادت ازبعض آیات مبہمات

وصل: اب ان شبہات کو دور کیا جاتا ہے۔ جوقرآن کریم کی بعض مبہم اور موہم آیتوں سے جو لاعلمی یا کجروی سے بادی النظر میں رسول مقبول ﷺ کے درجہ رفیع میں نقص وخطا کا اشتباہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ درحقیقت متشابہات کے قبیل سے ہیں اور علماء نے ان کی مناسب تاویلات اور لائق معانی کرکے حق تعالیٰ کی طرف راجع اور مؤدل ٹھہرایا ہے۔ اسی قبیل سے حق سبحانہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (اورآپ کووارفتہ پایا توراہ دی)۔

گویا اسے قبل بعثت کی (معاذ اللہ) ضلالت کی طرف منسوب کرتے۔ اور اس کا ازالہ ہدایت سے کرتے ہیں۔ حالانکہ علماء کا اتفاق ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نہ قبل ازنبوت اور نہ بعدازنبوت ہرگز ضلالت سے متصف وموسوم نہ ہوئے۔ آپ کی تخلیق اورنشو ونما، توحید، ایمان اور عصمت پر ہے۔ یہی حال تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام کا ہے۔ اور اہل اخبار میں سے کسی ایک نے بھی کسی ایسے شخص کے بارے میں بیان نہیں کیا ہے۔ جسے نبوت ورسالت اور اصطفا واجتباء کے ساتھ نوازا گیا ہواور وہ اس سے پہلے (معاذ اللہ) کفروشرک اور فسق وضلالت میں مبتلا ہو چکا ہو۔ ہاں اس میں البتہ! اختلاف ہے کہ آیا عقلاً یہ جائز ہے یا نہیں؟ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ عقلاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تنفر اور دوری کا موجب ہے لیکن ہمارے اصحاب اہل سنت کے نزدیک یہ عقلاً جائز ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ کسی کو ضلالت کے کنوئیں سے نکال کر ہدایت فرما کر مرتبہ نبوت تک پہنچا دے مگر نقل اور ''دلیل سمعی'' اسی پر ہے کہ یہ امر جائز کبھی عالم وقوع میں نہیں آیا۔ کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت بھی خدا کی ذات وصفات کے عدم عرفان یا اس میں شک وشبہ کرنے سے بھی پاک ومعصوم ہیں۔ کفرو معاصی اور ہراس چیز سے جوموجب نقص ونفرت ہو محفوظ رہے۔ نبوت سے پہلے او بعد میں سہو ونسیان، غلطی وغفلت بحالت جوش وغضب اور جملہ وہ چیزیں جوملت کی تشریع اور امت کی تبلیغ سے متعلق ہیں اور کبائر سے مطلقاً اور صغائر سے عمداً معصوم اور مامون ہیں۔ خصوصاً سید انبیاء ﷺ کہ آپ کی عصمت اتم واکمل اور آپ کا مرتبہ اعلیٰ وارفع ہے اور جوکوئی بھی آپ کی جناب میں اپنی رائے سے خلاف ادب دم مارے وہ ساقط ہے اور وہ ضلالت کے اسفل ترین تاریک گڑھے میں ہے۔ حضور کی ذات قدس تو اول سے ہی ایسی پاک اور آراستہ وپیراستہ ہے کہ عیب ونقص کا کوئی ہاتھ آپ کے عزت وجلال کے دامن سے مس ہونے کی تاب وطاقت ہی نہیں رکھتا۔ بیت ؎

بہ تعلیم وادب اوراچہ حاجت
کہ اوخودزآغازآمدمؤدب

لیکن حق تعالیٰ کی تربیت و تعلیم اور تائید قرآن بتدریج آہستہ آہستہ قوت سے فعل کی طرف لاتی ہے۔ یہاں تک کہ باری عزاسمہٗ کے وہ وعدے جو آپ سے کیے گئے تھے اوقات مخصوصہ میں جب ان کا ظہور ہوتا تو وہ موجب کمال یقین اور انکشاف تام ہوجاتا تھا۔ چنانچہ بسا اوقات ظہور معجزہ اور شہود قدرت باری عزوجل کے وقت آپ فرماتے: اَشْھَدُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) اگر کوئی یہ سوال کرے کہ تمام اہل کمال کا یہی حال ہے کہ جو کچھ ان کے ظرف واستعداد میں پیدا کیا گیا ہے۔ بتدریج اور بترتیب ظہور میں آتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ استعداد قرب وبعد کے تفاوت اور فرق کے اعتبار پر ہے کیونکہ اہل کمال کا کمال کسب ریاضت سے وجود میں آتا ہے۔ لیکن یہاں سب کا سب بالفعل موجود وثابت ہے۔ لیکن پردہ میں مستور ہے۔ (یعنی عالم غیب میں موجود ہے) جس کا ظہور وقت کے ساتھ موقوف ہے۔ اور جو بتقریب نزول قرآن بغیر سبب کسب و ریاضت ظہور میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کا حضور ﷺ کو تہذیب وادب سکھانا یہ ہے کہ وہ آپ کو نقص وعیب سے کمال کی طرف اور عدم سے وجود کی طرف نہیں لاتا ہے۔

اس گروہ کے کچھ لوگ آپ کے جوہر قدس میں صفات بشریت کی بقا اور احکامِ طبیعت اور احکامِ نفس کی جزئیات کا اثبات کرتے ہیں۔ اور اسے بے صبری وتزلزل جیسے افعال کا مبداء ومنشا قرار دیتے ہیں۔ اور حکمت تشریع اور شرف اتباع کی دریافت کو اس کا باعث سمجھتے ہیں اور نزول قرآن کو تہذیب سکھانے اور اس کے ازالہ کا موجب کہتے ہیں۔ یہ لوگ با اقتضائے ذاتی علوم وفہم سید الکونین ﷺ کے احوال کی حقیقت جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ایسا گمان رکھتے اور ایسی بات کہتے ہیں جو اس مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) کے ذوق اعتقاد پر گراں ہیں۔ حقیقتاً آپ کے احوال کو دوسروں کے احوال پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

اوبرتر از آن ست کہ آید بخیال

اس بحث کا کچھ حصہ چونکہ اخلاق شریف کے باب میں گزر چکا ہے اس لیے تکرار کی حاجت نہیں ہے۔ اس جگہ وہ باتیں بیان کی جائیں گی جو گمراہ وکجرو لوگوں کو شک وشبہ میں ڈالتی ہیں۔ ان کے ذکر سے اس مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) کی زبان وقت' اگرچہ ان کے شبہ کے ازالہ اور دفع کرنے کے طریق پر ہے پھر بھی بیزاری ہے۔ لیکن جب علماء ان کے درپے ہوئے ہوں۔ اور انہوں نے اس میں مصلحت دیکھی ہو تو ہم بھی ان کی تبیعت میں چلنے پر مجبور ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ عاقبت بخیر ہو۔

جاننا چاہیے کہ اس جگہ اس ادب وقاعدے کو جسے بعض اصفیاء اور اہل تحقیق نے بیان کیا ہے۔ ذہن میں رکھنا اور اس کی رعایت کرنا موجب حل اشکال اور سبب سلامت حال ہے وہ قاعدہ اور ادب یہ ہے اگر حضرت ربوبیت جل وعلیٰ کی جانب سے' کوئی خطاب وکوئی عتاب' کوئی دبدبہ' کوئی غلبہ' کوئی استغنا اور کوئی برتری ایسی واقع ہے جیسی کہ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ (بیشک آپ بالذات ہدایت نہیں دے سکتے۔) لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ (اور تمہارے کام ضرور باطل ہوجائیں گے۔) لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (اور نہیں ہے آپ پر کسی معاملہ کی ذمہ داری) تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (اور تم دینوی زندگی کی زیبائش کا ارادہ کرتے ہو۔) اس قسم کی اور بھی مثالیں ہیں۔ یا یہ کہ از جانب نبوت' بندگی' انکساری' احتیاجی' عاجزی اور مسکینی کا ظہور ہو جیسے: اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (میں تو تم جیسا بشر ہی ہوں) وَاَغْضَبُ کَمَا یَغْضَبُ الْعَبْدُ (اور میں غصہ کرتا ہوں جیسے لوگ غصہ کرتے ہیں) وَمَا اَدْرِیْ مَا یَفْعَلُ بِیْ وَلَابِکُمْ. (اور مجھے معلوم نہیں کے میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ خدا کیا کرے گا) وَلَا اَعْلَمُ مَا وَرَآءَ ھٰذَا الْجِدَارِ (اور میں بالذات نہیں جانتا کہ اس دیوار کے پیچھے کیا ہے) اس قسم کے تمام وہ اقوال جو وجود میں آئے ہمیں لازم نہیں ہے اور نہ ہمارا یہ مقام ہے کہ ہم اس میں دخل دیں یا اشتراک ڈھونڈیں اور خوشی کا اظہار کریں۔ بلکہ ہمیں ادب وسکوت کی حد پر رہتے ہوئے تحاشی (بیزاری) کا خاموشی کا اظہار کرنا چاہیے۔ آقا کو حق پہنچتا ہے

کہ وہ اپنے بندے کو جو کچھ چاہے کرے اور برتری وغلبہ کا اظہار فرمائے۔ اور بندہ بھی اپنے آقا کے حضور بندگی اور عاجزی کرتا ہے۔ کسی دوسرے کو کیا مجال اور کیا تاب وتواں ہے کہ وہ اس مقام میں داخل ہو۔ دخل اندازی کرے۔ اور حد ادب سے باہر ہو جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بہت سے کمزوروں، جاہلوں کے پاؤں کے ڈگمگا جانے سے خود انہیں کا نقصان ہوتا ہے۔ وَمِنَ اللّٰهِ الْعَصْمَةِ وَالْعَوْنِ. اسی کی جانب سے تحفظ اور نصرت ہے۔ اب واضح رہنا چاہیے کہ آیۂ کریمہ:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اور پایا آپ کو وارفتہ تو راہ دی۔

مفسرین نے اس کی تفسیر وتاویل میں متعدد وجوہ بیان کیے ہیں اول یہکہ پایا آپ کو معالم نبوت اور احکام شریعت سے ناواقف ووارفتہ'' یہ قول سیّدنا ابن عباس، حسن، ضحاک اور شہر بن حوشب کا ہے۔ اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا اَنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِیْمَانُ. آپ نہیں جانتے کہ کتاب وایمان کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آپ وحی سے پہلے قرآن کریم کو پڑھنا اور مخلوق کو ایمان کی دعوت دینا نہ چاہتے تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایمان سے مراد فرائض واحکام ہیں ورنہ حضورِ اکرم ﷺ وحی سے پہلے توحید حق پر ایمان رکھتے تھے اس کے بعد وہ فرائض نازل ہوئے۔ جو آپ کو دریافت نہ تھے۔ یا پھر ایمان سے مراد شریعت کی تفصیلات یا نماز مراد ہے۔ جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ. اللہ تمہارے ایمان یعنی نماز کو ضائع نہیں فرماتا۔

مطلب یہ کہ جو نمازیں تم نے تحویل قبلہ سے قبل بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی ہیں ان کو اللہ ضائع نہیں فرمائے گا۔ حدیث پاک میں مروی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ خدا کی توحید بجالاتے، بتوں کو دشمن جانتے اور زمانہ جاہلیت میں حج وعمرہ ادا کرتے تھے۔ اور حدیثوں میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے نہ تو کبھی شراب پی۔ اور نہ کبھی بتوں کو پوجا اور میں جانتا تھا کہ قریش کفر پر ہیں حالانکہ میں قرآن پاک اور ایمان کی تفصیلات سے واقف نہ تھا۔ مروی ہے کہ قریش بھی دین اسمٰعیل کے کچھ بچے کچھے احکام پر عامل تھے۔ مثلاً حج، ختنے اور غسل جنابت وغیرہ۔

دوم یہ کہ مرفوعاً مروی ہے کہ حضور نے فرمایا کہ میں اپنی صغرسنی میں اپنے دادا عبدالمطلب سے گم ہو گیا۔ اور قریب تھا کہ بھوک مجھے ہلاک کر دے تو مجھے میرے رب نے راہ دکھائی۔ اسے امام فخر الدین رازی نے ذکر کیا اور ایسا ہی ''مواہب لدنیہ'' میں بھی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ حلیمہ سعدیہ رسول کریم ﷺ کو لے کر مدینہ مکرمہ آئیں تا کہ آپ کو آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے سپرد کر دیں مگر آپ راہ میں گم ہو گئے۔

سوم یہ کہ آیۂ کریمہ میں لفظ ضلال، ضَلَّ الْمَآءُ فِي اللَّبَنْ. (دودھ میں پانی ملانا) سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ کہ جس وقت آپ پانی کو دودھ میں مغمور ومغلوب کرتے (غالباً میٹھا یا لسی بنانے کے لیے دودھ میں غالب واکثر پانی ملاتے تھے۔) یعنی آپ کفار مکہ میں مغمور ومغلوب تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو قوت بخشی تا کہ خدا کے دین کو ظاہر وغالب فرما دیں۔

چہارم یہ کہ اہل عرب، اس درخت کو جو بیابان میں یکہ وتنہا ہوتا اسے ''ضالہ'' سے موسوم کرتے تھے۔ گویا حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے کہ اے حبیب تم ان شہروں میں اس درخت کی مانند یگانہ وبے ہمتا اور منفرد تھے۔ جو بیابان میں اکیلا وتنہا ہو۔ تم نے ایمان وتوحید کے میوہ سے انہیں ثمرات بخشے۔ اور ہدایت فرمائی۔ اور حق تعالیٰ نے آپ کی طرف خلق کو راہ دکھائی۔ تا کہ وہ بہرہ ور ہوں۔ ﷺ

پنجم یہ کہ کبھی سرادر قوم اور ان کے سربراہ کو مخاطب کیا جاتا ہے اور اس سے مراد ان کی قوم ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کی قوم کو گمراہ پایا تو ہم نے ان کو آپ کے ذریعہ آپ کی شریعت کے ساتھ ہدایت کی۔

ششم یہ کہ ضال سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ کہ آپ کو محبّ اور اپنا طالب معرفت پایا (تو اپنی راہ دی) اور محبت کو ضال (وارفتہ) کہنا بکثرت مستعمل ہے۔ کیونکہ محبت' خود کو اور اپنے اختیار وقرار کو گم کر دیتی ہے۔ اور کبھی معقول نہج پر قائم نہیں رہ سکتی۔ جیسا کہ فرمایا: اِنَّـا لَـنَـرٰهَـا فِـىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (بیشک ہم انہیں کھلی وارفتگی میں رکھتے ہیں) اور فرمایا: وَاِنَّكَ لَفِـىْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ (اور آپ تو پرانی وارفتگی میں ہی ہیں۔ یہ تاویل عطاء سے مروی ہے جو کہ تابعین سے ہیں۔

ہفتم یہ کہ آپ کو ہم نے بھولا ہوا پایا تو آپ کو یاد دلایا۔ اسے شب معراج کی حالت پر محمول کرتے ہیں کہ اس مقام کی دہشت سے خود فراموشی طاری ہوگئی کہ کیا اور کیونکر عرض کریں اور حق تعالیٰ کی حمد وثنا کس طرح بجالائیں تو حق تعالیٰ نے آپ کو راہ دکھائی اور حمد وثنا کی کیفیت بتائی تو عرض کیا لَآ اُحْصِىْ ثَنَآءً عَلَيْكَ. (تیری ثنا میں گھیر نہیں سکتا۔) مفسرین بھی ایسا ہی بیان کرتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ بعض دیگر اوقات میں بھی سہو ونسیان ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور ﷺ کی خطائے اجتہادی کے ضمن میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا جاری ہونا۔ آپ پر جائز ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو حق تعالیٰ آپ کو آگاہ فرما دیتا ہے۔ اور درستگی پر قائم فرما دیتا ہے۔ یہ آیت اسی تذکرہ احسان پر نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ہشتم یہ کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو گمراہوں کے درمیان پایا تو آپ کو ان سے معصوم کر کے ان کے ایمان وارشاد کی ہدایت فرمائی۔ ہمارے نزدیک یہی توجیہہ ہے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جب حضور ﷺ نے اس گمراہ قوم سے علاقہ رکھا اور ان سے صحبت اختیار فرمائی تو ضلال میں واقع ہونے کا گمان ہوا۔ اور جہل واختلال کے بھنور میں پھنسنے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ اگر خدا کی عصمت وحفاظت آپ کے شامل حال نہ ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ كَـادُوْا لَيَـفْتِنُـوْنَكَ" (قریب تھا کہ آپ ﷺ کو فتنے میں ڈال دیتے) ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ (آپ قریب ہوگئے تھے کہ ان کی طرف جھک جائیں) تو اللہ تعالیٰ نے بطریق مبالغہ' ہدایت وعصمت کے تذکرۂ احسان میں اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا تو مراد آپ کا ضلال ہے نہ کہ آپ کی قوم کا ضلال' فافہم۔

نہم یہ کہ کتاب الٰہی کی جو چیزیں آپ کی طرف نازل فرمائی گئیں آپ کو ان کے بیان کرنے میں متحیر پایا۔ تو حق تعالیٰ نے ان کے بیان فرمانے کی ہدایت فرمائی جیسا کہ فرمایا "ثُـمَّ اِنَّ عَـلَيْـنَـا بَيَانَهٗ" (اس کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے۔) اور فرمایا: اِنَّـآ اَنْـزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ (ہم نے آپ کی طرف ذکر اُتارا)۔ یہ توجیہہ حضرت جنید بغدادی ؓ سے مروی ہے۔

دہم یہ کہ سیّدنا علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں نے کسی وقت اور کسی حال میں بھی اہل جاہلیت کے کاموں کی طرف قصد نہ کیا بجز دو مرتبہ کے۔ اور ہر بار حق تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے اس سے باز رکھا۔ اور میری عصمت میرے اور میرے ان ارادوں کے درمیان جن کا قصد کیا تھا حائل ہوگئی اس کے بعد پھر کبھی بھی اس قسم کی چیزوں کی طرف قصد نہ کیا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے سرفراز فرمایا۔ آپ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ قریش کا ایک غلام جو میرے ساتھ مکہ کی پہاڑیوں میں بکریاں چرایا کرتا تھا ملا۔ میں نے کہا اگر تم میری بکریوں کی دیکھ بھال کر لو تو میں مکہ میں جا کر ان کی قصہ کہانیاں سنوں جس طرح مکہ کے جوان کرتے ہیں۔ میں چراگاہ سے نکل کر مکہ میں آیا اور ان کے گھروں میں سے ایک گھر پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ وہ گاتے بجاتے اور کھیل کرتے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر حق تعالیٰ نے مجھ پر نیند کا غلبہ اتارا اور میں اس وقت تک سوتا رہا جب تک کہ میرے سر پر دھوپ نہ آ گئی۔ دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا اس کے بعد میں نے کبھی بھی ان کی طرف رُخ نہ کیا۔ اور کسی برائی کا قصد نہ کیا۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے مکرم فرمایا۔ لہٰذا اس آیۂ کریمہ سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

رفع وزر وصل: ازالہ شہادت کے سلسلے میں آیہ کریمہ ہے کہ

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِیْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ. اور ہم نے آپ سے اس بوجھ کو دور کیا جس نے آپ کی کمر دوہری کر دی۔

بظاہر اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اثبات بار گناہ سخت ہے۔ حتیٰ کہ فقہا، محدثین اور متکلمین کی ایک جماعت نے انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین پر صغائر کے جائز ہونے پر اس سے حجت اخذ کی ہے۔ اگر قرآن وحدیث کے ظاہر الفاظ کا التزام کیا جائے۔ اور انہیں اس کا ماخذ بنایا جائے۔ تو بکثرت لفظوں سے کبائر کا جواز اور خرق اجماع بھی لازم آتا ہے۔ اور قول کو کوئی مسلمان بھی قبول نہیں کرے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جماعت جس سے بھی محبت پکڑتی ہے ان سب کے معانی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ اور ان کے اقتضاء میں، متعارض ومتقابل احتمالات ہیں۔ اور سلف صالحین کے اقوال ہر اس چیز کے خلاف منقول ہیں جن کی یہ جماعت التزام کرتی ہے۔ اور چونکہ ان کے مذہب کے برخلاف اجماع ہے جن پر یہ جماعت مجتمع ہوئی ہے وہ سب متحمل وماؤل ہیں اور باتفاق واجماع سلف، ان کے قول کے برخلاف دلائل قائم ہیں۔ اور ان کا ظاہر متروک ہے تو ظواہر پر قول کا ترک اور اقوال سلف کی طرف رجوع لازم ہے۔ بلاشبہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اختلاف واقع ہوا ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس بوجھ کے اندازہ کی تمثیل ہے جو حضور ﷺ پر گرایا گیا ہے۔ اور اس کا ہلکا کرنا یہ ہے کہ ان پر آپ کو صبر ورضا عطا فرمائی گئی۔ مشہور یہی ہے کہ اس سے نبوت کے بوجھ کو ہلکا کرنا مراد ہے۔ کیونکہ امر نبوت کے قیام، موجبات نبوت کی حفاظت اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی محافظت نے آپ کی پشت کی طاقت کو شکستہ کر رکھا تھا۔ جسے حق تعالیٰ کی نصرت وتائید نے آپ پر آسان وسہل فرما دیا۔ اور شرح صدر عطا فرما کر دعوت خلق کے ساتھ حضور حق جمع کر کے اس کے بوجھ کو اتار دیا۔ اور انشراح صدر ایسا بلند مقام ہے جس کا تمام وکمال، حضور سید السادات علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کی ذات بابرکات کے سوا کسی اور کے لیے ثابت نہیں ہے۔ البتہ! ارباب تمکین میں سے کامل ترین اولیاء کرام کو بقدر ادراک آپ کی متابعت کے شرف سے اس میں سے کچھ حصہ حاصل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ صوفی قائم وبرقرار رہے اور اس کی ''جمع'' میں فرق کا کوئی خلل نہیں ہے۔ چنانچہ یہ محجوبوں میں ہوتا ہے اور نہ ''جمع'' کو فرق پر غلبہ ہے۔ جیسا کہ مجذوبوں کو ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''وزر'' (بوجھ) سے وہ ناپسندیدہ چیزیں مراد ہیں جو قریش حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی سنت میں تغیر وتبدل کی شکل میں کیا کرتے تھے اور وہ آپ کی ذات پر ناگوار وگراں گزرتا تھا۔ اور آپ اس سے انہیں روکنے پر قابو نہ پاتے تھے۔ یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو بعثت ورسالت اور امر وتوفیق وغیرہ سے قوی بنایا اور فرمایا: وَاتَّبِعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (آپ یکسو ہو کر ملت ابراہیم کی پیروی فرمائیں) اس اتباع سے مقصود اللہ عزوجل کی توفیق وتائید اور اس کی نصرت وقوت سے، اجراء شریعت اور اوامر واحکام الٰہی کا نفاذ ہے۔ اور سنت خلیل کے ذکر کی تخصیص، بیان واقع کے اعتبار سے ہے۔

بعض کہتے ہیں اس سے مراد، وزر وذنب سے آپ کی عصمت وحفاظت ہے۔ کیونکہ بر تقدیر وجود وزر وذنب اس کی صفت نقص ظہر یعنی پشت کی شکستگی ہے لہٰذا وضع وزر یعنی بوجھ دور کرنے کا نام مجازاً عصمت رکھا گیا۔ عصمت کے معنی وزر وذنب کے نہ ہونے کے ہیں۔ جیسا کہ مغفرت ذنوب کے معنی میں دوسری آیت میں واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ قبل از نبوت حضور ایک ولیمہ میں موجود تھے وہاں گانا ہو رہا تھا، دف اور باجے بج رہے تھے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے آپ پر نیند کا غلبہ دے دیا۔ اور آپ اس کے سننے سے محفوظ رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''وزر'' سے مراد حضور کا غور وفکر اور شریعت کی طلب میں پریشانی کا بوجھ ہے۔ یہاں تک شریعت ظاہر ہوئی اور حق تعالیٰ نے شریعت کو بیان فرما دیا۔ اور آپ کی پشت اطہر سے اس کا بوجھ اتارا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد شریعت کے حفظ میں آسانی وسہولت مراد ہے جو حضور سے طلب کی گئی ہوگی۔ اور حفظ ایک بوجھ اور مشقت ہے۔ جس کا اٹھانا طبیعت پر سخت دشوار ہے۔ اور قریب ہے کہ پشت کی طاقت کو شکستہ کر دے۔

بعض کہتے ہیں کہ حضور ان امور کا بوجھ محسوس فرماتے تھے جن کا صدور قبل از نبوت ہوا۔ اور بعد از نبوت وہ آپ پر حرام قرار دے دی گئیں۔ ان کو حضور اپنے دل کی گرانی شمار فرماتے۔ حق تعالیٰ نے اس بوجھ کو دور فرما دیا۔ اس سے اس قوم کی ظاہر مراد وہ صغائر ہیں جنکا صدور وہ قبل از نبوت جائز قرار دیتے ہیں لیکن بعد از نبوت ہرگز ہرگز نہیں۔ اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور کیا خوب گئی ہے کہ اس بوجھ سے مراد امت کے گناہ ہیں۔ جو رسول کریم رؤف الرحیم ﷺ کے قلب انور پر ایک بوجھ تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے انہیں اس دنیا میں اپنے عذاب سے محفوظ و مامون قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ.	اور نہیں ہے اللہ کہ انہیں عذاب فرمائے جب تک آپ ان میں رونق افروز ہیں۔

اور آخرت میں ان کے لیے آپ کی شفاعت قبول فرمانے کا وعدہ دیا۔ چنانچہ فرمایا۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى	اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے واللہ اعلم۔

لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ.	تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب آپ کے اگلوں اور پچھلوں کے گناہ بخشے۔

یہ آیہ کریمہ اس مطلب کے لیے عمدہ اور مشہور ہے لیکن علماء نے اس کی متعدد تاویلات بیان کی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بر تقدیر وقوع اور بالفرض بامکان عقلی نہ کہ وجود فعلی' غفران ذنوب سے مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شہود سے اس کا وقوع مراد ہے۔ یہ وہ تاویلیں ہیں جنہیں طبری نے نقل کیا اور قشیری نے اختیار کیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ماتقدم سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کا خطبہ اور ''وما تاخر'' سے مراد امت کے گناہ ہیں اسے سمرقندی نے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ذنب سے مراد ترک اولیٰ ہے۔ حالانکہ ترک اولیٰ حقیقت میں ذنب نہیں ہے۔ اس لیے اولیٰ اور ترک اولیٰ دونوں اباحت میں شریک ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ یہ کلمہ اظہارِ بزرگی وکرامت کے لیے ہے۔ بغیر اس کے کہ اس جگہ کوئی ذنب (گناہ) ہو۔ اس آیت کریمہ کی مراد اور مکمل بحث ''باب سوم میں درذکر فضل وکرامت از آیات قرآنی'' گزر چکی ہیں۔

کفار اور منافقین کی عدم اطاعت کا مسئلہ: لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَاتُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ	اے نبی اللہ سے تقویٰ کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو

اس سے عدم تقویٰ اور بمقتضائے صغیر امر ونہی وجود اطاعت کفار و منافقین کا امکان موہوم ہوتا ہے ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد تقویٰ اور عدم اطاعت پر ہمیشگی و دوام ہے جیسے کہ بیٹھنے والے کو کہتے ہیں کہ بیٹھو ہم تمہارے پاس ابھی آئے۔ یا خاموش رہنے والے سے کہا جاتا۔ خاموش رہو تمہاری خواہش پوری کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ بیٹھے رہو اور خاموش رہو۔ اس سے مقصود استقامت اور تاکید ہے نہ کہ اس کی طلب۔

بعض کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا علم و مرتبہ ہر آن بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کا پہلا حال موجودہ حال کے مقابلہ میں ماضی اور ترک اولیٰ وافضل کے حکم میں ہو جاتا تھا۔ لہٰذا آپ کا علم و مرتبہ ہر آن اور ہر گھڑی ترقی و اضافہ میں اور تقویٰ نو بنو تازہ بتازہ ہوتا رہتا تھا۔

اور بعض کہتے ہیں کہ بظاہر خطاب نبی سے ہے۔ مگر مراد اُمت سے خطاب ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آخر آیت میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. (اور اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے) اور ''بِمَا تَعْمَلُ '' (جو تم کرتے ہو) نہ فرمایا اور اسی حکم میں اس کے مشابہ یہ ارشاد باری ہے ''وَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ '' (اور جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کرو) حقیقت میں اس سے مقصود حضورِ انور کے قلب اطہر کی تقویت اور ایسے لوگوں سے خدا کا اظہار ناراضگی اور ان کی مخالفت پر قرار وثبات ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر وواضح ہے تعجب ہے۔ کہ یہ نادان ان آیتوں کو ظاہر پر محمول کر کے بارگاہ نبوی میں نقص وصدور ذنوب کی نسبت کا توہم پیدا کرتے ہیں۔ آپ کی بارگاہِ عالی ان سب سے پاک ومنزہ ہے۔

نزول قرآن پر شک وتردد کا مسئلہ: اب رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ فَاسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ٥ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ٥

اور اے سننے والے اگر تجھے کچھ شبہ ہے اس میں جو ہم نے تیری طرف اتارا تو ان سے پوچھ۔ دیکھ جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھنے والے ہیں بیشک تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے حق آیا تو ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہو اور ہرگز ان میں نہ ہونا جنہوں نے اللہ کی آیتیں جھٹلائیں۔ کہ تو خسارے والوں میں ہو جائے گا۔

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ اس کلام کا مخاطب کون ہے آیا حضور ﷺ یا دوسرے لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ خطاب حضورِ اکرم ﷺ سے ہے وہ تین وجہوں پر اختلاف کرتے ہیں اول یہ کہ خطاب اگرچہ حضور سے ہے لیکن مراد آپ کے غیر کی تعریض ہے جیسے کہ اس کا ارشاد ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (اگر تم نے خدا کا شریک ٹھہرایا تو تمہارے عمل اکارت ہو جائیں گے) یا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسےٰ ابن مریم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنانا) کلام میں ایسی روش بکثرت ہے جیسے بادشاہ اپنا گورنر کسی قوم پر مقرر کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ رعیت کو کوئی حکم دے تو خطاب میں توجہ اس قوم کے ساتھ نہیں کرتا بلکہ اپنے گورنر سے کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ایسے کرو اور ایسا نہ کرو۔ اگر ایسا کیا یا ایسا نہ کیا تو ایسا کروں گا۔ ویسا کروں گا اس کا بظاہر خطاب تو امیر وگورنر سے ہوتا ہے۔ لیکن مقصود ومراد قوم ورعیت ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حقیقت میں خطاب امت سے کرتا ہے۔

قراء فرماتے ہیں کہ خدا خوب جانتا ہے کہ اس کا رسول شک کرنے والا نہیں ہے۔ او یہ کیسے ممکن ہے کہ وحی اور تنزیل کی نورانیت کے باوجود رسول شک میں مبتلا ہو' یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے فرزند سے کہے کہ اگر تو میرا بیٹا ہے تو مجھ سے بھلائی کر (حالانکہ باپ اپنے فرزند کے بیٹا ہونے میں شک نہیں کرتا۔) یا آقا غلام سے کہے اگر تو میرا غلام ہے تو میری فرماں برداری کر' جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ خوب جانتا ہے وہ اس کا بیٹا یا اس کا غلام ہے۔ لیکن شک کے صیغہ میں کہتا ہے۔ اور ایسا کہنا فرزند غلام کی توبیخ وسرزنش کے لیے ہے۔

چنانچہ حق تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ حضورِ انور شک میں مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن خطاب میں اظہار شک فرماتا ہے۔ یہ تعریض وکنایہ کی ادائیگی کے لیے ہے۔ یہ دوسری وجہ ہے۔ پہلی میں مخاطب حضور ہیں اور دوسری میں آپ کے سوا دوسرے ہیں۔ فافہم۔

تیری وجہ یہ کہ اس جگہ شک سے مراد سینہ کی تنگی اور دل کی گرفتگی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر آپ اس سے تنگ آ گئے ہیں کہ کوئی آپ سے کافروں کی ایذا اور دشمنی کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو صبر فرمائیے اور ان لوگوں سے دریافت کر دیکھیئے جن کو کتاب دی گئی ہے

کہ نبیوں نے اپنی قوم کی ایذا و دشمنی پر کیسا صبر کیا ہے۔ اور کافروں کا انجام کیسا ہوا ہے؟ اور نبیوں پر اللہ تعالیٰ کی کیسی مدد و نصرت ہوئی ہے۔ یہ بر سبیل فرض و تقدیر ہے۔ گویا فرماتا ہے کہ اگر بغرض و تقدیر' جو کچھ آپ پر گذشتہ قصے بھیجے گئے ہیں اس میں شک واقع ہوتا ہے یا شیطان خیال میں خلل ڈالتا ہے تو ان لوگوں سے جو خدا کی سابقہ کتابیں پڑھتے ہیں پوچھ دیکھئے اس لیے کہ یہ قصے ان کے نزدیک بھی محقق و ثابت ہیں۔ اور ان کی کتابوں میں ویسا ہی ہے جیسا کہ آپ پر وحی فرمایا گیا۔ اس سے تحقیق حال اور گواہی لینا مراد ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ قرآن پاک ہر اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہے جو ان کی کتابوں میں ہے کہ اس سے رسول پاک کو انگیز کرنا اور ان کے یقین میں اضافہ کرنا مراد ہے نہ کہ امکان وقوع شک۔ لہٰذا جس وقت یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے فرمایا: لَا اَشَكُّ وَلَا اَسْـئَلُ (نہ مجھے شک ہے اور نہ میں ان سے دریافت کرتا ہوں۔) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! رسول کریم ﷺ نے پلک جھپکنے کے برابر بھی شک نہیں کیا۔ اور نہ ان میں سے کسی ایک سے کچھ پوچھا۔

بندہ مسکین عبدالحق بن سیف الدین (محدث دہلوی رحمۃ اللہ) خَصَّهُ اللّٰهُ بِمَزِيْدِ الصِّدْقِ. وَالْيَقِيْنِ وَعَصَمَهٗ عَنِ الشَّكِّ وَالتَّـخْمِيْنِ. کہتے ہیں کہ اس جگہ شک سے وہ ظاہری معنی مراد نہیں ہے جو تصدیق و یقین کے منافی و خلاف ہے۔ بلکہ وہ حالت مراد ہے جو معائنہ و مشاہدہ سے پہلے اطمینان قلب کا موجب ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت خلیل اللہ کے سوال کی حدیث کو ''شک'' نام رکھا گیا ہے کیونکہ انہوں نے عرض کیا: رَبِّ اَرِنِیْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى اے میرے رب تو مردے کو کیسے زندہ کرتا ہے اس جگہ حضور نے بطریق تواضع اور حضرت خلیل کے درجہ کی بلندی کے لیے فرمایا: نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْهُ ہم ان سے زیادہ شک کے مستحق ہیں۔

حضورِ اکرم سورۂ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِیْ کو اس سبب سے دوست رکھتے تھے کہ اس میں یہ ہے

اِنَّ هٰذَا لَفِـی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ صُـحُفِ اِبْـرَاهِيْمَ وَمُوْسٰی۝ بیشک یہ اگلے صحیفوں میں ہے ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

اور دجال کے وجود کے بارے میں تمیم داری کا خبر دینا اس ارشاد کے موافق جس کی رسول ﷺ نے خبر دی تھی اور حضور کا صحابہ کرام کو بلانا اور ان کو اس قصہ کو سنوانا اسی معنی میں ہے۔ اور بعد ظہور معجزہ حضور کا فرمانا کہ اشهد انی رسول الله (میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں) یہ بھی اسی باب سے ہے لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لَئِنْ اَشْـرَكْـتَ (اگر تم نے شرک کیا) میں خطاب رسول پاک کے سوا سامعین کے لیے ہے تو ممکن ہے اس جگہ یعنی فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ اَلآیه میں بھی خطاب سننے والوں ہی کے لیے ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ مبارک میں لوگوں کے تین فرقے تھے۔ مصدقین' مکذبین اور منافقین یا متوقفین۔ اور یہ آپ کے کام میں شک رکھتے تھے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے ان کو بطریق خطاب عام جو عام طور پر بصیغہ واحد ہوتا تھا خطاب کیا اور فرمایا اے متوقف! یعنی جو شک میں مبتلا ہے۔ اگر تو اس شک میں ہے کہ ہم نے جو اپنے نبی سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا ہے اور آپ جو دین لے کر تشریف لائے ہیں تو تو اہل کتاب سے پوچھ دیکھ تا کہ تجھے آپ کی نبوت کی صحت پر رہنمائی ہو اور امت کے لیے نزول قرآن کی نسبت ثابت ہو جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا

اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ اور ہم نے تمہاری طرف واضح نور کو نازل فرمایا۔

اور جب حق تعالیٰ نے ان کے لیے اس چیز کا ذکر فرمایا جو ان کے شک کا ازالہ کرتا ہے تو اس نے ان کو اس سے ڈرایا کہ اب وضوح حق کے بعد تم قسم ثانی یعنی مکذبین (جھٹلانے والوں) میں ہو جاؤ گے چنانچہ فرمایا۔

لَا تَـكُـوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ ان لوگوں میں سے نہ ہونا جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا کہ تو

الْخَاسِرِيْنَo

خسارے والوں میں ہوجائے۔

اورحق تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ
بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَo

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی جانتے ہیں کہ یہ تمہارے رب کی طرف سے حق نازل کیا ہوا ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔

مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اسے جانتے ہیں کہ خدا کی طرف سے رسول و نبی آتے ہیں اور کتابیں نازل ہوتیں ہیں۔ یا یہ مراد کہے ہ قُلْ يَا مُحَمَّدُ لِمَنِ افْتَرٰى لَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ. اے نبی جو شک میں ہو اس سے فرمادو' کہ تم شک کرنے والوں میں نہ ہوجانا۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اپنے سوا اوروں کو مخاطب فرمایا۔ حضور کے سوا خطاب کو محمول کرنے کی تائید حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ جو اس کے بعد کا ہے۔ غور و فکر کرو۔ فرماتا ہے۔

قُلْ يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ.

فرمادو اے لوگو! میرے دین کے بارے میں تم شک میں ہو تو......

نسب جہل کا مسئلہ: لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:

وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْجَاهِلِيْنَ.

اگر اللہ چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جاہلوں میں نہ ہونا۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مراد نہیں ہے کہ تم اس سے جاہل نہ ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انہیں ہدایت پر جمع کردیتا'' اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں ایک صفت جہل کا اثبات ہے۔ اور صفات خدا میں یا انبیاء پر جہل کا اثبات جائز نہیں ہے۔ اس سے مقصود حضور کو نصیحت ہے کہ اپنے کاموں میں جاہلوں کے طور و طریق اختیار نہ کریں۔ نیز آیت میں کسی ایسی صفت کے ہونے پر دلیل نہیں ہے۔ جس کے ہونے سے آپ کو منع کیا گیا ہے بلکہ قوم کی روگردانی اور ان کی مخالفت پر صبر کو لازم کرنے کا حکم ہے اسے ابوبکر بن فورک نے بیان کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ معناً امت کے ساتھ خطاب ہے یعنی تم لوگ جاہلوں سے نہ ہونا جیسا کہ دیگر مقامات میں کہا گیا ہے۔ اور اس کی مثالیں قرآن کریم میں بکثرت ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے کہ فرمایا:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ

اگر تم نے زمین میں بہتوں کی پیروی کی تو وہ تمہیں' اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔

یہ خطاب دوسروں سے ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ وَاِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور اگر تم لوگوں نے کافروں کی پیروی کی تو......''

اسی طرح حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ اِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (اگر اللہ چاہتا تو تمہارے دل پر مہر کردیتا اور یہ کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے عمل ضرور اکارت ہوجائیں گے۔) اس قسم کی تمام مثالوں میں ہر جگہ حضور کے ماسوا دوسرے لوگ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جس طرح چاہے امر و نہی فرمائے حالانکہ آپ سے ان کا صدور محال ہے۔ جیسا کہ فرمایا: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ. اور ان لوگوں کو جو اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اپنے قرب سے دور نہ کیجئے۔'' حالانکہ حضور ہرگز ان کو نہ اپنے قرب سے دور فرماتے اور نہ اپنے سامنے سے ہٹاتے تھے۔ کیونکہ آپ ظالموں میں سے نہ تھے۔ اور حق تعالیٰ کا ارشاد کہ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ اور یہ کہ تم اس سے پہلے یقیناً غافلوں میں سے تھے۔'' تو اس سے مراد آیات حق سے غفلت نہیں

ہے۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ سے لاعلمی مراد ہے۔ اس لیے کبھی اس کا نہ تو آپ کے دل میں خیال آیا اور نہ آپ کے کانوں نے اس سے پہلے یہ قصہ سنا تھا۔ اور نہ اسے آپ نے ازخود جانا مگر اللہ تعالیٰ کی وحی سے معلوم ہوا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ. اور اے سننے والے اگر شیطان تجھے کوئی وسوسہ دے تو اللہ کی پناہ مانگ۔

بظاہر الفاظ وہم میں ڈالتے ہیں۔ حالانکہ شیطان کا وسوسہ حضور کے لیے نہ تھا۔ لیکن اس سے مراد شیطان کا قصد وارادہ ہے کہ وہ وسوسہ میں مبتلا کرے۔ مگر حق تعالیٰ نے اسے آپ سے پھیر دیا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کسی پر ایسا غصہ آئے جو اسے ترک اعراض اور اس کے سامنے نہ آنے پر برانگیختہ کرے تو خدا سے پناہ مانگو تاکہ خدا اس سے آپ کو پناہ میں رکھے۔ نزغ شیطان کی ادنیٰ حرکت ہے۔ جیسا کہ زجاج نے کہا ہے۔ معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو حکم فرمایا ہے کہ جب آپ کو کسی دشمن پر غصہ آئے یا شیطان آپ کو ورغلانے کا ارادہ کرے یا وہ دل میں وسوسے ڈالے تو حق تعالیٰ سے پناہ مانگیں تاکہ وہ آپ کو اس کے شر سے محفوظ رکھے۔ یہ آپ کی عصمت کی تکمیل کے لیے ہے کہ حق تعالیٰ نے شیطان کو حضورِ اکرم ﷺ پر غلبہ پانے کی قدرت نہ دی۔ یہ اسی آیت کریمہ کا مدلول ہے جس میں فرمایا کہ

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ. بیشک میرے بندوں میں ایسے ہیں کہ نہیں ہے تجھے ان پر غلبہ۔

اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ٥ بیشک وہ لوگ جو خوف خدا رکھتے ہیں جب انہیں کسی شیطانی خیال کی ٹھیس لگتی ہے تو ہوشیار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

اس کا بھی یہی مطلب ہوگا۔ لیکن حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ (لیکن شیطان نے تم کو بھلا دیا) نسیان، نزع کے سوا ہے۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ شیطان رسالت سے پہلے یا رسالت کے بعد فرشتہ کی صورت وشکل میں آ کر آپ کو دھوکا دے سکے۔ اور مشیت الٰہی جس نے رسول کو صدق کے اظہار پر قائم رکھا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ نبی کے پاس جو آتا ہے وہ فرشتہ اور خدا کا بھیجا ہوا رسول ہی ہوتا ہے۔ یا اس کے علم ضروری سے معلوم ہو جاتا ہے جسے حق تعالیٰ نبی میں پیدا فرماتا ہے۔ یا اس دلیل وبرہان سے معلوم ہوتا ہے جسے حق تعالیٰ نبی میں ظاہر فرماتا ہے۔ اس بیان کی مکمل تحقیق ابتدائے وحی کے بیان میں آئے گی تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ تمہارے رب کا کلمہ سچ وانصاف کے ساتھ مکمل ہوا اور کوئی اس کے کلمات کو بدلنے والا نہیں۔

تلاوت میں شیطان کی دخل اندازی کا مسئلہ وحل: لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطَانُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِهٖ. اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر یہ واقعہ گذرا کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔

اس کی تفسیر وتشریح میں سب سے بہتر اور مشہور جمہور مفسرین کا یہ قول ہے کہ اس جگہ ''تمنیٰ'' سے مراد تلاوت ہے اور القائے شیطان کا مطلب' تلاوت کرنے والوں کے دلوں میں دنیاوی باتیں یاد دلا کر اس سے پھیرنا ہے۔ تاکہ اس میں وہم اور اس کی تلاوت میں نسیان پیدا کرے۔ یا یہ کہ سننے والوں کے فہموں میں ''تحریف اور فاسد تاویلات جیسی چیزوں کو داخل کر دے جسے اللہ تعالیٰ زائل اور منسوخ

کر دیتا ہے۔ اور التباس واشتباہ کو کھول دیتا ہے۔ اور آیات الٰہیہ کو محکم وثابت بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ مواہب لدنیہ میں ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کی بحث بہت کچھ ہے جس میں سے کچھ کا ذکر شفا میں کیا گیا ہے۔

اب رہا حضورِ اکرم ﷺ کا ''لیلہ التعریس'' کی وادی میں سونے سے متعلق ارشاد تو ''لیلتہ التعریس'' ایک وادی کا نام ہے جو شیطان کا مسکن تھی۔ حضور کے اس قول مبارک سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے آپ پر غلبہ کیا یا آپ کو وسوسہ میں ڈال دیا تھا۔ اگر یہ ممکن ہو تو ایسا حضرت بلال پر ہوا ہوگا کیونکہ حضور نے حضرت بلال کو نماز فجر کی حفاظت کے لیے مقرر فرما دیا تھا۔ شیطان نے آ کر حضرت بلال کو گہری نیند میں سلا دیا تھا جس کی تفصیل ''لیلتہ لتعریس'' کی حدیث میں مذکور ہے۔ اور یہ بھی اس تقدیر پر کہ حضور کا ارشاد' نماز کے وقت سو جانے کی وجہ پر تنبیہ کے لیے نہ ہو۔ اور اگر تنبیہ کے لیے ہے بھی تو اس وادی سے کوچ کرنے اور اس میں ترک صلوٰۃ کی علت بیان کرنے کیلیے ہے۔ لہٰذا کوئی اعتراض واشکال ہی نہیں اور نہ اس کے دفع کرنے کی حاجت۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حضرت ابن ام مکتوم نابینا کا واقعہ: اب رہا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (ترشروئی کی اور منہ پھیرا جب کہ نابینا آپ کے پاس آیا۔) کہتے ہیں کہ اس کا ظاہر مفہوم یہ وہم پیدا کرتا ہے۔ کہ جس وقت حضرت ابن ام مکتوم جو نابینا تھے اور طلب حق کے لیے آئے تھے اور وہ محل تذکرہ وخشیت تھے۔ اس وقت حضور نے ان سے ترشروئی اور اعراض کا اظہار فرمایا۔ اور وہ کفار جو حق سے روگرداں تھے اور آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ان کی طرف توجہ والتفات فرمائی۔ اس سے حضور کے لیے اثبات ذنب ہوتا ہے۔ اس پر حق تعالیٰ نے شکایت کی۔ اور اس رویہ پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا۔ تفسیر کی کتابوں میں اس سورۃ کا شان نزول یہی بیان ہوا ہے۔

اب رہا اس جگہ اثبات ذنب! تو وہم محض ہے۔ البتہ! ترک اولیٰ والیق سے بظاہر اظہار ناپسندیدگی کی صورت نکلتی ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ اگر ان دو شخصوں کی حقیقت حال آپ پر مکشوف ومعلوم ہوتی تو نابینا کو آگے بٹھاتے۔ لیکن آپ نے جو کچھ کفار کے ساتھ توجہ والتفات فرمایا وہ آپ کی عین طاعت' تبلیغ احکام شریعت' تالیف قلوب اور ایمان پر تمنا وخواہش کا اظہار تھا۔ کیونکہ آپ کی بعثت ورسالت کا مقصد ہی یہ تھا نہ کہ معصیت اور امر دین کی مخالفت اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے جو کچھ بیان کیا اور اپنے حبیب ﷺ سے یک گونہ اظہار ناپسندیدگی فرمایا اس سے مقصود تذکرہ ونصیحت ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ آپ کا انہاک دعوت وتبلیغ برائے اسلام اس درجہ کو نہیں پہنچنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے کسی مسلمان سے عدم التفات لازم آئے۔ صرف پہنچانا اور خبردار کرنا ہی کافی ہے۔ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ رسول پر صرف پہنچانا ہی ہے۔ درحقیقت حضرت ابن ام مکتوم ہی اس زجر وتادیب کے مستحق ہیں۔ اس لیے کہ وہ اگرچہ دیکھ نہیں سکتے لیکن کافروں کے ساتھ حضور کا گفتگو فرمانا تو سن رہے تھے۔ اور یہ بھی خوب جانتے تھے کہ حضور ان کی دعوت وتبلیغ میں کتنا اہتمام وانہاک فرماتے تھے۔ لہٰذا ان کے آگے بڑھتے جانے سے حضور کے کلام میں رکاوٹ آ رہی تھی۔ اور مجلس میں اژدھام ہو رہا تھا۔ اور یہ حضور ﷺ کی ایذا کا موجب تھا۔ اور حضور کو ایذا پہنچانا بہت بڑی معصیت ہے تو معلوم ہوا کہ ابن ام مکتوم کی زجر وتادیب میں قرآن میں یہ نازل ہوا۔ جس طرح رسول پاک ﷺ کے پاس زور سے بولنے اور حضور کے حجروں کے پیچھے سے آواز دینے کے بارے میں قرآن کریم میں احکام نازل ہوئے۔ لیکن نابینا اور صدق نیت ہونے کی وجہ سے انہیں معذور رکھا گیا۔ اور نرمی ومہربانی کا اظہار فرمایا۔ واللہ اعلم۔

منافقین کو اجازت دینے کا مسئلہ۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ ارشاد: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (اللہ تمہیں معاف کرے آپ نے انہیں کیوں اجازت دے دی۔ اس سے بھی رسول کریم ﷺ سے ذنب کے وقوع کا وہم ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ عفو مستدعی ہے

کہ پہلے کوئی تقصیر ہو۔ اور یہ بھی کہ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (آپ نے انہیں اجازت کیوں دی) میں استفہام انکاری ہے۔ لہٰذا منافقوں کے لیے یہ اجازت' منکر اور غیر رضائے الٰہی ہوگی۔ اگرچہ غایت تسلی وتسکین کے اظہار کے لیے انکار اذن پر عفو کو مقدم کیا۔ اور اظہار ناپسندیدگی سے پہلے عفو کی تقدیم بڑی ہی پیاری اور نادر ہے۔ جو کہ محبت واکرام کی خبر دے رہی ہے۔ وہ جماعت کہتی ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کام ایسے کیے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے پہلے نہیں دیا تھا۔ ایک یہ کہ بدر کے قیدیوں کا فدیہ لیا اور دوسرا یہ کہ منافقوں کو اجازت دے دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ پر اظہار ناپسندیدگی فرمایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ عَفَا اللّٰهُ (اللہ معاف کرے) وہ نہیں ہے جہاں وقوع ذنب کے بعد ہوتا ہے۔ بلکہ یہ عبارت ایسی ہے جو تعظیم وتوقیر کے مبالغہ پر دلالت کرتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنے ایسے دوست سے جو عظیم المرتبت ہے کہے "خدا تجھے معاف کرے کیا کام کیا ہے۔" "تو نے میرے حق میں"؟ حق تعالیٰ تجھ سے راضی ہو۔ میری بات کا کیا جواب دیا ہے؟" خدا تجھے عافیت دے۔ میرے حق کو پہچان۔؟ وغیرہ ان باتوں کی غرض بجز اس کی عزت وتکریم کی زیادتی کے کچھ نہیں ہے۔ نہ یہ کہ اس کے لیے گناہ وقصور کا ثابت کرنا مقصود ہے۔ اور اس جگہ...... بمعنی غفر نہیں ہے۔ اور اظہار ناپسندیدگی پر اس کی تقدیم' اس مذکورہ معنی کی خبر دینے' اور اس مراد پر دلالت کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ جیسا کہ حدیث میں واقع ہوا ہے عَفَا اللّٰهُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيْقِ یعنی اللہ نے تمہارے لیے گھوڑے اور غلاموں سے زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔"

حالانکہ ان میں زکوٰۃ پہلے سے ہی واجب نہ تھی۔ مراد صرف یہ ہے کہ تم پر لازم نہیں ہے۔

امام قشیری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو یہ کہتا ہے کہ گناہ سے پہلے معافی ہوتی ہی نہیں وہ کلام عرب کے اسلوب کو نہیں پہچانتا۔ اور کہتے ہیں کہ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ اَىْ لَمْ يَلْزِمَكَ ذَنْبٌ مطلب یہ کہ اللہ تمہیں معاف کرے' کے معنی یہ ہیں کہ تم پر کوئی ذنب والزام نہیں ہے۔ مواہب لدنیہ میں بھی اسی طرح ہے اب رہا دوسری بات کا جواب کہ "استفہام انکاری ہے" وہ کہتے ہیں کہ انکار وعتاب' ترک اولیٰ وافضل پر ہے۔ اس کے جواب میں بعض کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اگر آپ چاہیں تو اذن دینے میں رخصت عطا فرمائی ہے اور ارشاد ہے کہ

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ.

اب اگر تم سے کسی کے لیے وہ اجازت مانگیں تو ان میں سے جس کے لیے چاہیں اجازت دے دیں۔

تو حق تعالیٰ نے اذن کو آپ کے سپرد فرما کر آپ کو بطریق عموم دیدیا ہے اور مواہب لدنیہ میں تفطونیہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اس آیت میں حضور معاتب ہیں۔ (معاذ اللہ) حاشا وکلا ہرگز ہرگز نہیں۔ بلکہ حضور تو مختار تھے۔ جب حضور نے ان کو اذن دے دیا تو حق تعالیٰ نے آپ کو خبر دی کہ اگر آپ اذن نہ دیتے تب بھی یہ اپنے نفاق کی بنا پر بیٹھے ہی رہتے۔ آپ پر ان کو اذن دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انتہی۔

منافقین کی طرف میلان کا مسئلہ: اب رہا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلاً اِذًا لَّا ذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ.

اور اگر تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کی طرف تھوڑا سا جھکتے۔ اور ایسا ہوتا تو ہم تم کو دونی عمر اور دوچند موت کا مزہ دیتے۔

یہ آیت بھی وقوع میلان اور منافقوں کی جانب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راغب ہونے اور ان پر اشد عذاب واقع ہونے کے سلسلے میں وہم پیدا کرتی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف راغب ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ اس لیے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مجوز وقوع

ذنب ہے۔ حالانکہ یہ تو ہم ساقط ہے۔ اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثابت قدمی اور عصمت نہ ہوتی تو ان کی نزدیکی کی طرف ان کی خواہش کی پیروی میں جھک جاتے لیکن چونکہ ہماری عصمت آپ کے ساتھ تھی اس لیے اس نے آپ کو ان کی طرف مائل ہونے سے روکے رکھا۔ تو اس میں یہ بات خوب واضح ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے قبول کرنے کی طرف قصد نہ فرمایا۔ اور داعی اجابت کی قوت کے ساتھ ان کی طرف مائل نہ ہوئے۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام سے وقوع معصیت کے سلسلہ میں خود ان کی بات گزر چکی ہے کہ شرعاً اور عقلاً اس کا وقوع ان پر جائز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ عصمت سے حفاظت الٰہی میں ہے اور عصمت اختیار کو باطل نہیں کرتی۔ اور عقلاً گناہ کو ممتنع نہیں بناتی۔ اور بحفظ الٰہی اس کے صدور وقوع سے مانع ہوتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہو گیا کہ تمام انبیاء معصوم ہیں اور حضور ثابت قدم ہیں۔ اور آیت میں حضور کے کمال تطہیر و تقدیس میں مبالغہ ہے اور یہ کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حفاظت، عصمت اور محبت ہے نہ کہ تہدید و تشدید اور عتاب و تعزیر (معاذ اللہ)

اسیران بدر سے فدیہ لینے کا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کے سلسلے میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جس تک زمین میں ان کا خون نہ بہائے۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے اگر اللہ پہلے ایک بات نہ لکھ چکا ہوتا تو اے مسلمانو! تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا اس میں تم پر بڑا عذاب کرتا۔

اس آیت کو بھی ایک گروہ نے عتاب پر محمول کیا ہے کہ حضور ﷺ نے سیّدنا ابوبکر صدیق ؓ کے مشورہ سے بدر کے قیدیوں کا فدیہ لینا اختیار فرمایا۔ اور حضرت عمر فاروق ؓ کے مشورہ پر قتل کو اختیار نہ فرمایا۔ یہ اپنے اجتہاد سے تھا اور اجتہاد میں شریعت خطا کو جائز رکھتی ہے۔ لیکن اس خطا پر نبی کا قائم رہنا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ اصول فقہ میں مذکور ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ صحیح مسلم میں بروایت سیّدنا عمر بن خطاب ؓ منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن کفار کو شکست دی اور مشرکوں کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر آدمی قید ہوئے تو حضورِ اکرم ﷺ نے ان قیدیوں کے بارے میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر ؓ سے مشورہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر ؓ نے مشورہ دیا کہ یہ قیدی ہمارے چچاؤں کی اولاد، اپنے بھائی اور آپ کے قبیلہ کے لوگ ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ ان سے فدیہ لے لیا جائے تا کہ جو کچھ ان سے وصول ہو وہ ہمارے لیے کفار کے مقابلہ کے وقت ساز و سامان کی تیاری میں کام آئے۔ اور یہ بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر انہیں ہدایت فرما دے تو یہ ہمارے قوت بازو اور مددگار بن جائیں۔ پھر رسولِ خدا ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عمر بن خطاب تم کیا رائے دیتے ہو۔ میں نے عرض کیا، خدا کی قسم! میری رائے ابوبکر کی رائے کے موافق نہیں ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے۔ اور مجھے حکم فرمایئے کہ میں فلاں کو قتل کروں۔ (اور میں نے اپنے عزیزوں کی طرف اشارہ کیا۔) اور علی کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے بھائی عقیل کو ماریں۔ اور حمزہ کو حکم دیجئے کہ وہ فلاں عزیز کو قتل کریں تا کہ اللہ تعالیٰ جو علام الغیوب ہے جان لے کہ ہمارے دل مشرکوں کی محبت و دوستی سے پاک ہیں مگر حضورِ اکرم ﷺ کو حضرت ابوبکر کی رائے پسند آئی اور اسی کو اختیار فرمایا اور آپ نے ان سے فدیہ لے لیا۔ پھر دوسرے دن جب میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضور تشریف فرما ہیں اور حضرت ابوبکر آپ کے قریب ہیں اور دونوں رو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! بتایئے آپ دونوں کو کس چیز نے رلایا ہے تا کہ اگر ہو سکے تو میں بھی روؤں۔ اگر رونا نہ آئے تو بہ تکلف زور ڈال کر رونے کی کوشش کروں۔ اس پر

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ہم اس وجہ سے رو رہے ہیں کہ تمہارے یاروں پر فدیہ لینے کے سلسلے میں بلاشبہ میرے آگے اس درخت سے قریب تر عذاب ظاہر کیا گیا اور آپ نے ایک درخت کی طرف اشارہ فرمایا جو ہمارے نزدیک تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ.

کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کریں۔ جب تک زمین میں ان کا خون نہ بہائے۔

''اثخان'' کے معنی زیادہ کرنا اور کسی چیز میں مبالغہ کرنا ہے۔ اور اس جگہ اثخان سے مراد قتل و جرح ہے۔ مطلب یہ کہ نبی کو چاہیے کہ جب ان کے ہاتھ قیدی آئیں تو وہ انہیں قتل کرائیں اور اس میں مبالغہ کریں تاکہ کفر زائل ہو اور اسلام غالب ہو۔

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ.

تم تو دنیاوی مال و منال چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔

مطلب یہ کہ تم دنیا میں غنیمت و اموال کی خواہش رکھتے ہو اور خدا آخرت کو چاہتا ہے کہ اس پر دین اسلام کی قوت اور آخرت میں ان کا ثواب مترتب ہوگا۔

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ٥

اگر اللہ پہلے ایک بات نہ لکھ چکا ہوتا تو اے مسلمانو! تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا اس میں تم پر بڑا عذاب آتا۔

مطلب یہ کہ اگر ازل سے حکم الٰہی ایسا نہ ہوتا کہ مجتہد کو خطا پر نہ پکڑا جائے تو اس وقت جو کچھ تم نے لیا یا اختیار کیا ہے تمہیں بڑا عذاب ہوتا۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر ہم پر عذاب اترتا تو بجز عمر کے کوئی نجات نہ پاتا۔ اسی بنا پر وہ جماعت کہتی ہے کہ اس میں حضورِ اکرم ﷺ پر (معاذ اللہ) عتاب اور عذاب کی تہدید ہے۔ اس کے جواب میں صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر اس میں کسی گناہ کا الزام نہیں ہے بلکہ اس میں اس چیز کا بیان ہے جس سے تمام نبیوں کے سوا حضور کو مخصوص گردانا گیا ہے کہ حضورِ اکرم کے سوا کسی نبی کے لیے غنیمت جائز نہیں تھی۔ جیسا کہ فرمایا: اُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ میرے لیے غنیمتوں کو حلال بنایا گیا۔ انتہی۔

چاہے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم حضورِ اکرم کے سوا تمام نبیوں کے لیے ہے۔ لیکن حضورِ اکرم ﷺ کے لیے درست ہے کہ وہ قتل نہ کریں اور فدیہ لے لیں اور فدیہ غنیمتوں میں سے ایک قسم ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ تریدون عرض الدنیا (تم دنیاوی ساز و سامان چاہتے ہو) بعض کہتے ہیں کہ اس خطاب سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کا ارادہ کرے۔ اور دنیاوی غرض کے لیے دنیاوی ساز و سامان جمع کرے۔ اور اس آیت میں حضورِ اکرم ﷺ اور آپ کے اکثر صحابہ مراد نہیں ہیں بلکہ ضحاک سے مروی ہے کہ یہ آیت اس ہنگامہ کے وقت نازل ہوئی تھی جب کہ روز بدر مشرکین شکست کھا کر بھاگ رہے تھے۔ اور لوگ ساز و سامان کے لوٹنے اور غنیمتوں کے جمع کرنے میں مشغول ہو گئے تھے اور ان کے قتل سے ہاتھوں کو روک لیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہیں کفار پلٹ کر دوبارہ حملہ نہ کر دیں۔ اور ایسا ہی ہوا تو ان کے بارے میں نازل ہوا۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ.

کچھ تم میں سے دنیا چاہتے ہیں اور کچھ تم میں سے آخرت چاہتے ہیں۔

اب رہا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ (اگر روز ازل سے لکھا ہوا نہ ہوتا تو) اس کے معنی میں مفسرین اختلاف کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ اگر پہلے نہ لکھا جاتا کہ میں کسی پر عذاب نہیں کروں گا۔ مگر بعد از ممانعت تو ضرور میں تم کو عذاب دیتا''۔ تو یہ دلالت کرتی ہے کہ قیدیوں کا معاملہ گناہ نہ تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ تمہارا ایمان قرآن پر نہ ہوتا تو مراد کتاب سابق

سے یہی ہے اور تم عفو کے مستوجب ہوئے تو غنایم پر عتاب کیے جاتے۔ یا یہ مراد ہے کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا نہ ہوتا کہ غنیمتیں حلال ہیں''۔ یہ سب ذنب و معصیت کی نفی کرتی ہیں۔ اس لیے کہ جس چیز کا کرنا حلال ہے وہ معصیت نہیں ہوتی۔ اس لیے حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے آخر آیت میں فرمایا۔ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا تو کھاؤ جو غنیمت تمہیں ملی حلال طیب ہے''۔ اور بعض کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قتل اور فدیہ میں اختیار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ سیّدنا علی المرتضٰی سے مروی ہے کہ ہمارسول پاک ﷺ کے پاس جبریل آئے اور کہا کہ آپ کے صحابہ کو قیدیوں کے بارے میں اختیار دیا گیا ہے کہ اگر چاہیں تو انہیں قتل کر دیں اور نہ چاہیں تو اس شرط پر ان سے فدیہ لے لیں کہ آئندہ سال ان میں سے ستر مارے جائیں گے۔ چنانچہ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم نے فدیہ کو اختیار کر لیا۔ تاکہ ہم میں سے مارے جائیں۔ بلاشبہ روز احد ستر صحابہ کا قتل واقع ہوا۔ یہ دلیل اس کی ہے کہ انہوں نے اذن و اختیار پانے کے بعد ایسا کیا لہٰذا معصیت کہاں رہی۔ بعض کہتے ہیں کہ اگرچہ قتل و فدیہ میں انہیں اختیار دیا گیا تھا لیکن قتل و اثخان زیادہ بہتر تھا جن پر عتاب کیا گیا لیکن کوئی عاصی و گنہگار نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

اظہار سطوت و غلبۂ ربوبیت: لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ○ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ○

اور اگر ہم پر کچھ باتوں کی یوں ہی نسبت کرتے تو یقیناً ہم ان کو داہنی جانب سے پکڑتے پھر ہم ان کی گردن کی رگ کاٹ دیتے۔

گویا فرماتا ہے اگر حضور اپنی طرف سے بات بنا کر اس کی نسبت ہماری طرف کرتے تو ضرور انہیں دائیں جانب سے پکڑتے۔ اور ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ اور ہلاک کر دیتے۔ اس میں عذاب کا کنایہ ہے جیسا کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جن پر انھیں غصہ آتا ہے ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کی راست گوئی اور حق تعالیٰ کا آپ کو کذب و افتراء سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں مبالغہ ہے لیکن اس عبارت میں لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ کی مانند حضور ﷺ کی بزرگی و کرامت اور قدر و منزلت کے باوجود اظہار سطوت اور غلبۂ ربوبیت ہے۔ اور یہ آیت آپ کے مہتم بالشان حال اور کمال محبت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور درحقیقت مفتریوں اور کذابوں پر تعریض ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائیں۔ بہرحال ہمیں ادب کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے اور زبان کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اس چیز میں جو محبوب و محبّ کے درمیان ہو۔

تفصیلی علم کا مسئلہ: لیکن حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرح کی تفصیل) بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد احکام ایمان اور صفات ایمان کی تفصیلات کا حکم ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ کیونکہ اس کا وجود قرآن کے نازل ہونے اور دین شریعت کے مکمل ہونے کے بعد ہے۔ بلاشبہ یہ تو حد شہرت کو پہنچ چکا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ قبل نبوت خدا کی توحید کرتے اور بتوں کو اور ان کی پرستش کو دشمن جانتے اور حج و عمرہ کرتے تھے۔ آپ نے کبھی شراب نہ پی۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے بندوں کے لیے آپ کے ذریعہ جو شریعت مقررہ فرمائی ہے وہ اس وقت تک آپ پر نازل نہ ہوئی تھی۔ اس آیت کا یہی مفہوم و مراد ہے۔ ایمان کا ارادہ کرنے کا مطلب، تصدیق و اقرار ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایمان و احکام کی دعوت مراد ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حذف مضاف کے باب سے ہے۔ یعنی مَا كُنْتَ تَدْرِيْ اَهْلَ الْاِيْمَانُ مطلب یہ ہے کہ تم اہل ایمان کو نہیں جانتے کہ اعمام و اقارب یعنی عزیزوں اور رشتہ داروں میں سے کون کون ایمان لائے گا۔ یہ معنی کلام کے سیاق و سباق سے بعید ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَيْهِ الْمَرْجَعُ وَالْمَاٰبُ۔

باب چہارم

اس باب میں کتب سابقہ توریت اور انجیل وغیرہ کی ان پیشین گوئیوں اور خبروں کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جو آنحضرت کی تعلیم وتوقیر اور رسالت سے متعلق ہیں۔ اور علمائے اہل کتاب نے اپنے اجمال اور تفصیل میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰی هُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ.

جولوگ اس رسول و نبی اُمی کی پیروی کرتے ہیں وہ اپنے پاس توریت وانجیل میں لکھا پاتے ہیں کہ وہ انہیں نیکی کا حکم فرمائیں گے اور انہیں برائی سے بچنے کی تلقین فرمائیں گے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا ذکر شریف گزشتہ کتابوں میں بکثرت ہے۔ اور انبیاء ومرسلین کی مجلسوں میں حضور خاتم الانبیا علیہ السلام کا ذکر ہمیشہ رہتا تھا۔ چونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو اس سے مطلع کیا ہے۔ تو لامحالہ آپ کا ذکر شریف انہوں نے بطریق اولیٰ اپنی مجلسوں میں کیا ہوگا۔ کیونکہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَهٗ جو چیز بہت محبوب ہو اس کا ذکر اکثر کیا جاتا ہے۔ یہ آیہ کریمہ حضورِ اکرم کی سچائی پر دلیل ہے۔ اگر یہ خبر واقعہ کے مطابق نہ ہوتی تو حضور سے ان کی نفرت وتکذیب کا موجب ہوتا اور یہود ونصاریٰ سے زیادہ کوئی اور قوم حضور کے احوال اور صدق نبوت سے واقف اور شناسا نہ تھی۔ کیونکہ یہود ونصاریٰ توریت وانجیل میں آپ کے اوصاف پڑھ چکے تھے۔ اور مدینہ منورہ میں مدتوں سے آپ کے منتظر تھے کیونکہ اس شہر میں آپ کے ظہور کی علامتیں اور نشانیاں پائی جاتی تھیں اور یہی یہود ونصاریٰ تھے جب ان سے مقابلہ اور جنگ کی نوبت آتی تو یہ آپ کی بعثت کا واسطہ دے کر فتح ونصرت طلب کرتے اور کہتے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہم نبی آخرالزماں ﷺ کی سایۂ عافیت میں تم سے نبٹیں گے۔ ان کے آباء اپنی موت کے وقت اپنی اولادوں کے لیے وصیت نامے چھوڑ جاتے اور کہتے کہ ہمارا اسلام حضور ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا کر عرض کریں کہ ہم نے آپ کے انتظار میں جانیں دی ہیں۔ اور اس جہاں سے ایمان کے ساتھ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ (یہ آپ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) مطلب یہ کہ کافر لوگ آپ کو خوب پہچانتے ہیں۔ لیکن جب آپ کا ظہور قدسی ہوا تو ان کی سابقہ شقاوت ازلی عود کر آئی اور حسد وعناد سے آپ کو جھٹلانے لگے اور جان بوجھ کر راہ حق کو چھپانے کی خاطر اپنی کتابوں میں تحریف وتغیر کرنے لگے۔ اور دنیا کی محبت اور حب ریاست نے ذلت وشقاوت اور خسران کے سبب سے پست درجے میں گرا دیا۔ لیکن اس تحریف وتبدیلی کے باوجود ہمارے نبی کریم ﷺ کی نبوت کے دلائل اور آپ کی شریعت کی نشانیاں ان کی کتابوں میں اب بھی روشن وتاباں ہیں۔

بیان کرتے ہیں کہ سریانی زبان میں حضور کا نام ''مشفح'' ہے۔ اور مشفح کے معنی محمد ہیں۔ اس لیے کہ ان کی زبان میں شفح بمعنی حمد ہیں۔ اور جب وہ خدا کی حمد کرتے ہیں تو شفحا لایعنی الحمد اللہ کہتے ہیں اور جب شفح بمعنی حمد ہوا تو مشفح بمعنی محمد ہوگیا۔ آپ کے احوال وصفات اور آپ کی نبوت کی علامات ونشانیاں صاف صاف اور آپ کی بعثت وہجرت کی جگہ متعین تھی۔ جس روز حضورِ انور مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے اسی دن حضرت عبداللہ بن سلام جو احبار واشراف یہود اور اولاد حضرت یوسف علیہ السلام سے تھے حاضر

ہوئے اور ایمان لائے اور جس دن سے مکہ مکرمہ سے حضورِ انور کی ہجرت کی خبر سنی تھی یہ اسی دن سے آپ کے لقائے شریف کی سعادت حاصل کرنے کے منتظر تھے۔

مدتے بود کہ مشتاق لقایت بودم لاجرم روئے ترا دیدم واز جا رفتم

جب وہ حضور کے دیدار پر انوار سے مشرف ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم ہی ابن سلام' یثرب کے عالم ہو' عرض کیا ہاں! فرمایا میں تمہیں اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے مجھے بھیجا کیا تم نے خدا کی کتاب توریت میں میری صفات کو پایا ہے؟ کہا ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ کو مظفر و غالب فرمائے گا۔ وہ آپ کے دین کو تمام دینوں پر غالب کرے گا۔ یقیناً بلا شک و شبہ میں نے خدا کی کتاب میں آپ کی خوبیاں اور صفتیں پائی ہیں۔ اور آپ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

يَآ يُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا اے نبی یقیناً ہم نے آپ کو بھیجا امت پر گواہی دینے والا یعنی ان کی تصدیق و تکذیب اور نجات و ہلاکت کی۔

گواہی دینے والا اور فرمان برداروں کو ثواب و اجر کی بشارت دینے والا اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرانے والا۔ جو نر اللامیین امیون یعنی اہل عرب کو جن کی اکثریت پڑھنا لکھنا نہیں جانتی پناہ دینے والا' اور آپ سارے جہان کے لیے پشت پناہ ہیں۔ ﷺ۔ عرب کی تخصیص' ان میں آپ کی بعثت' اور آپ سے قریبی ہونے کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ پہلے جہل و نادانی اور شقادت قلبی میں مشہور و منہمک تھے۔ اب آپ کی تعلیم و تربیت سے علم و ہدایت کے بلند مقام پر فائز ہو گئے۔ ''حرز'' اس محفوظ جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی آفت و تکلیف نہ پہنچے۔ اس سے مراد ان کی حفاظت و پناہ آفتوں سے ہے۔ خواہ وہ آفت نفسانی ہو یا شیطانی وساوس وغیرہ جیسا کہ فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ اللہ وہ ہے جس نے امیوں میں رسول کو انہیں میں سے بھیجا جو ان پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا اور ان کا تزکیہ فرماتا۔ اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اگرچہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ممکن ہے کہ اس سے مراد دائمی عذاب و ہلاکت اور انہیں نیست و نابود ہونے سے محفوظ و پناہ میں رکھنا ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ. اور نہیں ہے خدا کہ ان کو دائمی عذاب دے در آنحالیکہ آپ ان میں تشریف فرما ہوں۔

عبداللہ بن سلام کی حدیث کا تتمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ آپ میرے بندہ خالص ہیں کوئی اس صفت میں آپ کا ہمسر نہیں۔ اور آپ میرے رسول ہیں۔ جو ساری مخلوق کی طرف مبعوث ہیں وَسَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ. اور میں نے آپ کا نام متوکل رکھا۔ کیونکہ آپ نے اپنے تمام کام مجھ پر چھوڑ دئے ہیں۔ اور آپ اپنی ذاتی قوت و طاقت سے باہر آ گئے ہیں۔ کیونکہ بندگی کے معنی کی حقیقت یہی ہے ''لَسْتَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيْظٍ اور آپ نہ درشت خو ہیں اور نہ سخت دل۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا:

لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ. یعنی اگر آپ درشت خو اور سخت دل ہوتے آپ کے گرد سے یقیناً ہٹ جاتے۔

اور یہ جو دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ: وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ. (ان منافقوں اور کفار پر سختی فرمایئے۔) تو اس کا جواب یہ ہے کہ مزاج کی خوبی اور دل کی نرمی آپ کی طبعی اور جبلی خصلت ہے' غلظت کا حکم' مخلوق کے علاج کے لیے ہے جس کی بہتر توجیہہ یہ ہے کہ عدم سختی اور نرم دلی مسلمانوں کے لیے ہے۔ اور کافروں اور منافقوں کے لیے سختی و غلظت کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ میں یہ دونوں صفتیں حق تعالیٰ کے

لیے ہیں۔ اَلْحَبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضَ لِلّٰهِ (محبت بھی اللہ کے لیے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے) اور فرمایا: اَنَا الضَّحُوْكُ الْقَتُوْلَ (خندہ روئی میری عادت ہے۔) باب اخلاق میں اس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ وَلَاسَحَابٍ فِي الْاَسْوَاقِ (اور بازاروں میں شور وشغب کرنے والے نہ تھے) جیسا کہ جاہلوں کی عادت ہے۔ یہ عقلمندی کی نشانی ہے کہ نرم خو ہو اور آواز بلند نہ کرے۔ اور کج خلقی سے احتراز کرے، مجلس میں بھی، گھر میں بھی اور بازاروں میں بھی۔

وَلَا يَجْزِىْ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُوْ وَيَغْفِرُ وَلَنْ يَّقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ يَقُوْلَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ.

برائی کا بدلہ برائی سے نہ لے اور عفو و درگزر اور پردہ پوشی سے کام لے۔ اور اللہ تعالیٰ ہرگز دنیا سے آپ کو نہ اٹھائے گا، جب تک کہ کجرو لوگوں کی درستگی نہ فرما دے اور لا الہ الا اللہ نہ کہہ لیں اور توحید کا اقرار کر کے شرک کا ازالہ نہ کر لیں۔

فَيَفْتَحُ بِهٖ اَعْيُنًا عُمْيًا وَّاٰذَانًا صَمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا (تو اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ایسی اندھی آنکھوں کو کھولے گا جو راہ راست نہیں دیکھتیں۔ اور ایسے کانوں کو کھولے گا جو حق بات نہیں سنتے اور ایسے دلوں کو کھولے گا جو نہیں سمجھتے۔ اور حقیقت حال کو نہیں پاتے۔

ایک اور روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ وہ بازار میں فریاد اور فحش کلامی نہ کریں گے اور جو فرمائیں گے جھوٹ نہ ہوگا۔ اور ہر خوبی و کمال اور ہر صفت جمال سے آراستہ و پیراستہ ہوں گے۔ اور میں انہیں ہر خلق کریم عطا کروں گا اور اطمینان و سکون اور آرام و آہستگی کو ان کا لباس بناؤں گا اور تقویٰ و پرہیزگاری کو ان کا ضمیر کروں گا۔ حکمت ان کی عقل، صدق و وفا ان کی طبیعت، عفو و نیکی ان کی عادت، عدل ان کی سیرت حق ان کی شریعت، ہدایت ان کا امام اسلام ان کی ملت اور احمد ان کا نام رکھوں گا لوگ گمراہی کے بعد ان سے ہدایت پائیں گے۔ اور آپ کے وسیلہ سے جہالت کے بعد لوگ عقلمند بنیں گے۔ اور گمنامی کے بعد ان کا نام چاردانگ عالم میں گونجے گا۔ اور کمی کے بعد انھیں کثرت و زیادتی عطا کروں گا اور جدائیگی کے بعد انہیں بلاؤں گا۔ اور مفلسی کے بعد انہیں تونگر کروں گا۔ اور مخالف دلوں اور پراگندہ خواہشوں اور جدا جدا بکھری ہوئی جماعتوں میں الفت و محبت ڈالوں گا۔ اور ان کی امت کو بہترین امت قرار دوں گا۔ کعب احبار سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ سیّدنا ابن عباس نے حضرت کعب سے دریافت فرمایا: تم نے توریت میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کیا کیا پائے۔ انہوں نے بیان کیا کہ توریت میں لکھا ہوا ہے کہ محمد بن عبداللہ، عبدالمختار یعنی اللہ کے بندے، مکہ مکرمہ ان کی جائے پیدائش، مدینہ منورہ ان کا مقام ہجرت اور ملک شام ان کے زیر قبضہ ہوگا نہ وہ سخت گو ہوں گے نہ درشت خو۔ نہ بازاروں میں شور و غل کریں گے اور نہ برائی کا بدلہ لیں گے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں گے۔ اس روایت میں حضور ﷺ کی امت مرحومہ کی تعریف بھی آئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بیان کیا۔ آپ کی امت غم و مسرت اور خوشی و ناخوشی میں شکرگذار ہوگی اور ہر پستی و بلندی پر حق تعالیٰ کی حمد و تکبیر کرے گی۔ نمازوں کے لیے آفتاب کی رعایت کریں گے۔ اور جب سورج کسی نماز کا وقت لائے تو وہ اس وقت نماز بجا لائے گی اگرچہ وہ خاک نشین ہوں گے اور ٹخنے سے اوپر ازار بند اور پائجامے پہنیں گے۔ اور اپنے اعضاء کے اطراف یعنی ہاتھ پاؤں اور چہرے کا وضو کریں گے۔ اور ان کا منادی یعنی مؤذن آسمان میں ندا کرے گا یعنی بلند و بالا برجوں میں اذان دے گا۔ ان کی صفیں جنگ اور نماز میں یکساں ہوں گی۔ وہ راتوں میں نغمہ سنج ہوں گی۔ اس نغمہ سنجی سے مراد ذرات کے اوراد و ظائف اور تلاوت قرآن ہے۔

بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ منقول ہے کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے سنا ہے کہ فرمایا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت نازل ہوئی اور انہوں نے اسے پڑھا اور اس میں انہوں نے اس امت مرحومہ کا ذکر پایا تو عرض کیا کہ اے خدا میں توریت کی ان تختیوں

میں ایسی امت کا ذکر پاتا ہوں جو آخر بھی ہے اور سابق بھی ہے۔ مطلب یہ کہ وجود زمانی میں تو وہ آخری امت ہوگی اور فضل وشرف میں سابق یعنی اول وفائق ہوگی۔ ان کے لیے شفاعت کی جائیگی۔ ان کی دعاؤں سے بارشیں ہوں گی ان کے سینوں میں کلام الٰہی محفوظ ہوگا۔ جنہیں وہ ازبر بطور حافظہ پڑھیں گے۔ غنیمتوں کو کھائیں گے۔ اور صدقات کو ان کے اپنے ہی شکموں کے لیے گردانا گیا۔ یہ اسی امت کے خواص ہیں۔ جن پر احکام کو آسان کیا گیا ہے۔ اور غنیمتوں اور صدقات کو ان پر حلال کیا گیا۔ بخلاف پچھلی امتوں کے کہ یہ ان پر حلال نہ تھیں۔ اور جب وہ کسی بدی کا ارادہ کریں گے تو اسے نہ لکھا جائے گا اور جب وہ بدی کا ارتکاب کرلیں گے تو ایک ہی بدی لکھی جائے گی۔ اور جب نیکی کا قصد کریں گے تو اسے لکھا جائے گا۔ اور جب نیکی کرلیں گے تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اور انہیں اول وآخر کا علم دیا جائے گا۔ اور دجال کو وہ قتل کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ اسلام کا امتی ہونے کی تمنا کرنا: بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب توریت کی تختیوں میں امت نبی آخر الزماں ﷺ کی تقریباً ستر صفات کو پڑھا تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا ''اے خدا! اس امت کو میری امت بنا دے''۔ فرمان باری آیا کہ اے موسیٰ! اس امت کو تمہاری امت کیسے بناؤں وہ امت تو نبی آخر الزماں احمد مجتبیٰ ﷺ کی ہے۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے رب تو مجھے ہی امت محمد یہ میں بنا دے۔ اس پر حق تعالیٰ نے انہیں اپنے اس ارشاد میں دو خوبیاں مرحمت فرمائیں۔ چنانچہ فرمایا:

قَالَ یٰمُوْسٰی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ فَخُذْ مَا اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ.	اے موسیٰ میں نے تمہیں لوگوں پر اپنی رسالت اور اپنے کلام کے ساتھ برگزیدہ فرمایا تو تم لو جو میں نے تمہیں دیا شکر گزاروں میں ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا' اے خدا! میں اس پر راضی ہوگیا۔ ابونعیم بروایت سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب نقل کرتے ہیں کہ کعب احبار سے ایک مرد نے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ حساب کتاب کے لیے جمع ہوئے ہیں اور تمام نبیوں کو بلایا گیا ہے جملہ نبی اپنی اپنی امت کے ساتھ آئے اور ہر نبی کے لیے دو نور اور ہر امتی کے لیے ایک نور جوان کے ساتھ ساتھ چلتا تھا دیکھا گیا۔ اس کے بعد حضور اکرم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو بلایا گیا تو آپ کے ہر موئے تن کے ساتھ ایک ایک نور تھا۔ اور آپ کے ہر امتی کے ساتھ دو نور تھے۔ اس پر کعب احبار نے اس مرد سے دریافت کیا کہ تم نے جو اپنے خواب کی تفصیل بیان کی ہے کیا تم نے ایسا کہیں پڑھا ہے؟ اس شخص نے کہا خدا کی قسم! خواب میں ایسا دیکھنے کے سوا کہیں اور کسی جگہ ایسا نہ پڑھا۔ تو حضرت کعب فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں کعب کی زندگی ہے یہ صفت محمد مصطفیٰ اور ان کی امت کی ہے اور وہ صفت تمام نبیوں اور ان کی امتیوں کی ہے یہی کتاب الٰہی میں ہے گویا کہ تو نے توریت میں اسے پڑھا ہے۔

وہ خبریں جن میں یہود کو پہلے ہی سے حضور ﷺ کی نبوت کی صداقت کا علم تھا

وصل: اب رہیں وہ خبریں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو رسول اکرم سید الابرار ﷺ کی نبوت وصداقت کا پہلے ہی سے علم تھا۔ اور ان شریروں نے ان کے ظہور کے بعد عناد وانکار کیا۔ بجز ان لوگوں کے جن کے حال کے ساتھ توفیق وہدایت ربانی شامل تھی۔ ایسی خبریں بے شمار ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ توریت کی تعلیم وتدریس کے وقت حضور کا ذکر کرتے اور اپنی اولاد میں برابر چرچا کرتے رہتے۔ آپ کا حلیہ شریف بتلاتے، ہجرت وبعثت کا مقام متعین کر کے کہتے کہ نبی آخر الزماں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ رونق افروز ہونگے۔ لیکن جب حضورِ انور ﷺ مبعوث ہوئے تو انہوں نے حسد وعناد کی راہ اختیار کی اور کہنے لگے یہ وہ شخص نہیں ہیں جن کے بارے میں ہم تمہیں بتلاتے آ رہے ہیں۔ اور آپ کی صفات شریف میں تحریف کرنے لگے۔ لیکن ان کی اس تحریف وتغیر کے باوجود آپ کے دلائل وشواہد توریت میں روشن وتاباں تھے۔ قبیلہ اوس کا ایک شخص ابو عامر راہب تھا۔ اور قبیلہ اوس وخزرج میں اس سے زیادہ کوئی دوسرا شخص حضورِ اکرم ﷺ کے اوصاف بیان کرنے والا نہ تھا۔ وہ مدینہ کے یہودیوں سے محبت کرتا اور ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ وہ ان سے دین اسلام کے بارے میں پوچھتا وہ اسے رسول رب العالمین ﷺ کے اوصاف بتاتے اور کہتے کہ مدینہ ان کے ہجرت کا مقام ہے پھر وہ یہودیوں کے پاس سے مقام تیما گیا۔ انہوں نے بھی اسے ایسا ہی بتایا اس کے بعد وہ ملک شام گیا اور نصرانیوں سے اس نے دریافت کیا انہوں نے بھی حضور ﷺ کی یہی صفات بیان کیں تو ابو عامر گوشہ نشین ہو گیا اور راہب بن گیا۔ راہبوں جیسا لباس (پلاس) پہننے لگا۔ وہ برابر یہ کہتا رہا کہ میں ملت حنیفیہ' دین ابراہیم علیہ السلام پر ہوں۔ اور نبی آخر الزماں ﷺ کے ظہور کا منتظر ہوں۔ اور اسی ابو عامر سے جنات کی عورتوں نے بھی حضورِ انور ﷺ کی صفات ونشانیاں سنی تھیں۔ لیکن جب حضورِ انور ﷺ نے ظہور فرمایا تو وہ اپنے حال میں برقرار رہ کر بغاوت' حسد اور نفاق کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ کہتا اے محمد ﷺ آپ کس چیز پر مبعوث کیے گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے ملت حنیفیہ پر مبعوث فرمایا گیا ہے۔ وہ کہنے لگا نہیں بلکہ اسے غیر کے ساتھ خلط ملط کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا' بلکہ میں اسے روشن اور پاک وصاف لایا ہوں۔ پھر فرمایا اے ابو عامر! وہ خبریں کیا ہوئیں جو یہود نے تجھے میری صفات کے بارے میں بتائی تھیں۔ کہنے لگا! آپ وہ نہیں ہیں جن کے بارے میں یہود نے صفتیں بیان کی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے عامر! تو جھوٹ بول رہا ہے۔ ابو عامر نے کہا میں جھوٹ نہیں بول رہا" آپ دروغ فرما رہے ہیں۔" حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے والے کو بیکس وناچار مسافرت کی حالت میں ہلاک کرے۔ چنانچہ اس کے بعد ابو عامر مکہ کی طرف لوٹ گیا اور قریش کے دین کی پیروی کرنے لگا۔ اس نے سابقہ طریقہ رہبانیت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد وہ ملک شام جاتے ہوئے یکہ وتنہا بیکسی وناچاری اور مسافرت کی حالت میں حضور ﷺ کی بدعا کے موجب مر گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے توفیق وہدایت نہ ہو علم ودانش کام نہیں آتا وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اسی ابو عامر کے بیٹے حضرت حنظلہ تھے جنہیں "غسیل ملائکہ" کہا جاتا ہے۔ یہ حضور ﷺ کی

بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اور ایمان لائے۔ اور ان کا اکابر صحابہ کرام میں شمار ہوا۔ ان کے ''غسیل ملائکہ'' ہونے کا مشہور قصہ ہے۔ چنانچہ ابن حبان اپنی ''صحیح'' میں اور حاکم ''مستدرک'' میں برشرط شیخین بیان کرتے ہیں کہ یہ نئے شادی شدہ تھے بلکہ اسی روز شادی کر کے اپنی بیوی سے ہمبستر ہو کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ اچانک روز احد کفار سے جنگ کی شدت کا غلغلہ سنا بے چین ہو گئے۔ غسل جنابت کرنے کی بھی فرصت نہ پائی باہر نکل کر کفار سے مصروف پیکار ہو گئے۔ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ فرشتے انہیں غسل دے رہے ہیں۔ فرمایا کہ حنظلہ حقیقت حال کیا ہے اور کس سبب سے ان کو شہدا کے درمیان خاص طور پر فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ (کیونکہ مسئلہ ہے کہ شہید جب میدان جنگ میں قتل ہو جائے تو اسے نہ تو غسل دیا جائے گا اور نہ اس کے کپڑے اتارے جائیں گے۔ اور یہاں تو انہیں فرشتے غسل دے رہے ہیں؟) اور ایک روایت میں تصریح ہے کہ فرمایا وہ جنبی تھے اور اپنی بیوی کے پاس سے اسی طرح اٹھ کر چل دئے تھے۔ اور جب ان کی بیوی سے دریافت کیا گیا تو اس نے یہی حقیقت حال بیان کی۔ اسی بنا پر امام اعظم ابوحنیفہ جنبی شہید کو غسل دینے کا حکم فرماتے ہیں لیکن صاحبین اور امام شافعی رحمتہ اللہ اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ غسل جو جنابت کی وجہ سے فرض تھا وہ تکلیف کے دائرے سے نکلنے کے بعد ساقط ہو گیا اور وہ غسل جو موت کے سبب لازم ہوتا ہے اسے شہادت نے ساقط کر دیا۔ اب اس پر کون سا غسل واجب ہے۔ امام اعظم رحمتہ اللہ اپنی دلیل میں حضرت حنظلہ کے اسی قصے کو لاتے ہیں۔ اور حضور کے اس ارشاد کو جو بعض روایتیوں میں آیا ہے کہ وہ جنبی تھے دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ اب ہم توریت' انجیل' زبور اور صحف آدم و ابراہیم وغیرہم علیہم السلام سے وہ خبریں نقل کرتے ہیں جو حضورِ اکرم ﷺ کے اوصاف میں ہیں۔

توریت وانجیل وغیرہ سے بشارتیں: وصل: مخفی نہ رہنا چاہیے کہ قرآن کریم کی اس خبر کے بعد کہ ان کتابوں میں حضورِ اکرم ﷺ کے احوال شریف اور آپ کی صفتیں موجود ہیں۔ اس مدعا کے ثبوت میں کسی مزید دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ لیکن ان دشمن خدا کافروں کی الزام تراشی سے بچنے کے لیے ان کا لانا ضروری ہے۔ اور اس سے مسلمانوں میں اطمینان کی زیادتی اور نورانیت ویقین پیدا ہوگا۔ لیکن توریت میں حذف وتحریف' تغیر وتبدل اور ان خیانتوں کے بعد بھی جو ان بدبختوں نے اس امانت کی ادائیگی میں کی ہے۔ موجود ہے کہ ''حق تعالیٰ نے سینا سے تجلی فرمائی اور ساغیر سے ظاہر ہوا اور فاران سے آشکارا ہوا''۔

''سینا'' اس پہاڑی کو کہتے ہیں جس کو طور سینا اور طور سینین کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس پر تجلی فرمائی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور اس پر ان کی نبوت ظاہر ہوئی۔ ساغیر سے ان پر انجیل نازل ہوئی ''فاران'' عبرانی نام ہے اور مکہ مکرمہ میں بنی ہاشم کی ان پہاڑیوں کو کہتے ہیں جن میں سے ایک پہاڑی پر حضورِ اکرم ﷺ اظہارِ نبوت سے قبل عبادت فرماتے تھے۔ اور اسی پہاڑی پر سب سے پہلے خدا کی وحی نازل ہوئی۔ یہ تین پہاڑ ہیں۔ ایک جبل ابوقبیس ہے جس کے نیچے مکہ مکرمہ کی آبادی ہے۔ اس کے مقابل جبل قیقعان بطن وادی تک ہے اور اس کے مشرق جانب جبل قیقعان کے متصل شعب بنی ہاشم ہے۔ اور اسی شعب میں حضورِ اکرم ﷺ کی جائے ولادت ہے۔

اور ابن قتیبہ جو کہ علمائے امت میں سے ہیں۔ جنہوں نے کتب سابقہ پڑھی اور ترجمہ کی ہیں۔ وہ ''اعلام النبوۃ'' میں فرماتے ہیں کہ اس جگہ ہر اس شخص کو جو ذرا بھی اس میں غور وفکر کرے کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اس لیے کہ جیسا کہ حقیقت الامر ہے کہ حق تعالیٰ کا طور سینا پر تجلی فرمانے کا مطلب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توریت کا نازل فرمانا ہے۔ اور جبل ساغیر سے اس کا ظہور فرمانے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کا نازل فرمانا ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارض خلیل کے جبل ساغیر میں (جسے ناصرہ کہتے ہیں) سکونت واقامت فرماتے تھے۔ اور اسی بنا پر ان کے پیروکاروں کا نام نصاریٰ رکھا گیا۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ ساغیر سے حق تعالیٰ کا ظہور فرمانا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل کا نازل فرمانا مراد ہے تو فاران کی پہاڑیوں پر سے طلوع وآشکارا ہونے سے حضورِ اکرم ﷺ پر قرآن

کریم کا نازل ہونا مراد ہے۔ اس بارے میں مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی اختلاف بھی نہیں ہے کہ فاران مکہ کی پہاڑیوں ہی کا نام ہے۔ اور اگر وہ یہ دعویٰ کریں کہ فاران مکہ کے سوا پہاڑوں کا نام ہے تو یہ ان کا بہتان اور افتراء ہوگا۔ اور اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ پھر ہمیں وہ دوسرا مقام بتاؤ جہاں خدا آشکارا ہوا ہو۔ اور اس جگہ کا نام بھی فاران ہی ہو۔ اور وہاں کسی نبی کی بعثت ہوئی ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اس نبی پر خدا نے کتاب نازل فرمائی ہو۔ اور ہمیں وہ دین دکھاؤ جو ظہور وانکشاف میں دین اسلام کی مانند ظاہر ومنکشف اور آشکارا ہو۔ کیا تم جانتے نہیں کہ مشرق اور مغرب میں کوئی دین بھی اتنا آشکارا اور ظاہر نہیں ہوا جتنا کہ جہان بھر میں دین اسلام آشکارا اور ظاہر ہوا۔

تو ریت کی دوسری بشارت: نیز توریت میں یہ بھی موجود ہے کہ حق تعالیٰ نے توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ’’سفر فامس‘‘ میں یہ خطاب فرمایا کہ تمہارا رب بنی اسرائیل کے لیے تمہارے برادروں میں سے (اور ایک روایت میں ہے ان کے برداروں میں سے) نبی پیدا کر کے مبعوث فرمائے گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام رکھے ہوگا پھر وہ ان کے لیے وہی فرمائے گا۔ جن کا میں حکم دوں گا۔ اور جو کوئی ان کے ارشاد کی اطاعت وتعمیل نہ کرے گا میں اسے سزا دوں گا‘‘۔

اس کلام توریت کی دلالت، سیدِ عالم محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر واضح ہے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم بنی اسرائیل، حضرت اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ اور ان کے بھائی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور اگر یہ نبی موعود، ابناء اسحٰق علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے ہے تو وہ انہیں میں سے ہوں گے نہ کہ ان کے بھائیوں میں سے۔ اور اگر وہ یہ کہیں بنی اسرائیل، بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ اس بنا پر اخوت کا اطلاق درست ہے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس طرح تم توریت کو جھٹلا رہے ہو اس لیے کہ توریت میں مذکور ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند قائم نہ ہوا۔ اور توریت کے ایک اور ترجمہ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی مانند بنی اسرائیل میں کبھی بھی کوئی قائم نہ ہوگا۔ لہٰذا بعض یہودیوں کا یہ قول باطل ہوگیا کہ اس نبی موعود سے حضرت ’’یوشع بن نون‘‘ مراد ہیں۔ اس لیے کہ حضرت یوشع، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نہ کفو تھے اور نہ ان کی مثل۔ بلکہ ان کی حیات میں ان کے خادم تھے۔ اور وفات کے بعد ان کی دعوت کو مؤکد ومؤید کیا تھا۔ چنانچہ ثابت ہوگیا کہ اس نبی موعود سے سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کفو ومثل ہیں۔ اور یہ کہ آپ اقامت دعوت حق، تحدی معجزہ، تشریع احکام اور اجراء نسخ بر شرائع سابقہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مماثل ہیں۔ اور بجائے خود یہ بات بکثرت دلائل سے روشن ہے کہ نبی موعود اور نبی آخر الزماں حضورِ اکرم سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

فرماتے ہیں کہ توریت کا یہ فرمان کہ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ’’میں اپنا کلام ان کے منہ میں رکھوں گا‘‘۔ اس سے مقصود اور معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے کلام کی وحی ان کی طرف کریں گے اور وہ اس کلام وحی سے وہی خطاب فرمائیں گے جو انہوں نے سنا ہوگا۔ اور ان کی طرف کوئی لکھا ہوا صحیفہ یا الواح نہیں اتاروں گا اس لیے کہ وہ اُمی ہیں لکھا ہوا نہ پڑھیں گے۔

انجیل کی بشارتیں: انجیل میں حضورِ انور ﷺ کی بشارت ہونے کے سلسلے میں ابن طفریل نے بیان کیا ہے کہ یوحنا جو حضرت عیسیٰ کا حواری تھا وہ اپنی انجیل میں حضرت مسیح کے حوالہ سے بتاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

> ’’میں اپنے باپ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمہیں دوسرا ’’فارقلیط‘‘ عنایت فرمائے جو تمہارے ساتھ تا ابد ثابت وقائم رہے۔ وہ روح حق ہے۔ اور وہ تمہیں ہر چیز سکھائے گا۔ اور فرمایا بیٹا جانے والا ہے۔ (اس سے کنا تیہ اپنی ذات مراد لی ہے۔) کیونکہ اب اس کے بعد فارقلیط آنے والا ہے۔ جو تمہارے بھیدوں کو زندہ کر کے ہر چیز کو بدل دے گا۔ اور وہ میری

گواہی دیں گے۔ جیسا کہ میں ان کی گواہی دے رہا ہوں۔ میں تمہارے لیے ''امثال'' لایا ہوں اور وہ اس کی تاویل (یعنی تفسیر وتشریح) لائے گا۔ (اس تاویل سے مراد قرآن ہے جو کہ محتمل تاویلات اور معانی کثیرہ کا حامل ہے بخلاف دیگر آسمانی کتابوں کے) اور دوسرا فارقلیط ایسا ہوگا جسے سارے جہان میں کوئی بھی توڑنے کی طاقت نہ رکھے گا۔ اگر تم میری دعوت مانتے ہو اور مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میری اس وصیت کو یاد رکھنا۔ میں خدا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تمہیں فارقلیط عنایت فرمائے۔ جو آخر زمانہ تک تمہارے ساتھ رہے''۔

اس میں اس کی وضاحت وصراحت ہے کہ حق تعالیٰ ان کی طرف کسی ایسے کو بھیجے گا جو حق تعالیٰ کی رسالت تبلیغ میں اور خلق کی سیاست اس کے مقام میں قائم فرمائے گا۔ اور اس کی شریعت باقی اور تاابد یعنی جب تک زمانہ قائم ہے رہے گی۔ آیا ہے کوئی ایسا؟ بجز سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کے۔

فارقلیط کی تفسیر میں نصاریٰ اختلاف کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فارقلیط کے معنی حامد یعنی حمد کرنے والے کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بمعنی مخلص ہے۔ اگر ہم مخلص کے معنی میں ان کی تائید کریں تو مخلص ایسا رسول ہوگا جو سارے جہان کی خلاصی اور رستگاری کے لیے تشریف لائے۔ اور یہ تفسیر ہماری منشاء کے موافق ہے اس لیے کہ ہر نبی کفر سے امت کو نجات دلانے والا ہوتا ہے۔ اور ان معنٰی میں انجیل میں حضرت مسیح کا قول شاہد ہے کہ ''میں لوگوں کو نجات دینے کے لیے آیا ہوں''۔ جب ثابت ہوگیا کہ حضرت مسیح نے اپنی توصیف ''لوگوں کا نجات دہندہ'' فرمائی ہے تب انہوں نے باپ سے استدعا کی کہ دوسرا فارقلیط یعنی نجات دہندہ عنایت فرمائے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ ایک فارقلیط تو گزر گیا اب دوسرا فارقلیط آتا ہے۔

اگر ہم بطریق تنزل یہ تسلیم کرلیں کہ ''فارقلیط'' کے معنی حامد کے ہیں تو یہ لفظ ''احمد'' سے کتنا زیادہ قریب ہے۔ اسی بنا پر ابن ظفر نے کہا ہے کہ انجیل میں جس چیز کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ فارقلیط رسول ہے اس لیے آپ نے فرمایا کہ جو کلام مجھ سے تم سنتے ہو وہ میرا نہیں ہے بلکہ وہ باپ کا کلام ہے۔ جو مجھ پر تمہارے لیے نازل فرمایا گیا ہے۔ اور وہ ''فارقلیط'' جو روح القدس ہے باپ اسے میرے نام سے بھیجے گا تاکہ وہ تمہیں ہر چیز کی تعلیم دے۔ اور تمہیں یاد دلائے اور نصیحت فرمائے جیسا کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں'' لہٰذا کیا اس سے زیادہ واضح تر کوئی بیان ہے؟ کہ ''فارقلیط'' وہ رسول ہے جسے حق تعالیٰ بھیجے گا۔ اور وہ خدا کی مخلوق کو ہر چیز کی تعلیم دے گا۔ وہ انھیں وعظ ونصیحت فرمائے گا۔ لیکن اس جگہ ''باپ'' کا بولنا معرف اور بدلا ہوا لفظ ہے۔ اور اہل کتاب اس لفظ کے استعمال سے ناآشنا نہیں ہیں کہ یہ پروردگار سبحانہ وتعالیٰ کی جانب اشارہ ہے کیونکہ یہ تعظیم کا لفظ ہے۔ اور اس لفظ سے شاگرد استاد کو مخاطب اور اس سے اپنے علم میں استمداد کرتا ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ نصاریٰ اپنے علمائے دین کو روحانی باپ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اور یہ کہ بنی اسرائیل اور بنی اعیض اپنے آپ کو ''نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰہِ'' کہتے ہیں۔ یعنی ہم اللہ کے بیٹے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اپنے تئیں بدگمانی میں ڈالے ہوئے تھے۔

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول کہ باپ اسے (فارقلیط) کو میرے نام سے بھیجے گا۔ اس میں سیّد عالم محمد مصطفےٰ ﷺ کی رسالت وصداقت پر شہادت موجود ہے۔ اور وہ آیات قرآنیہ جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی مدح وتعریف اور اس پاکی وتنزیہہ کے سلسلے میں قرآن میں مذکور ہیں جن کے لیے بنی اسرائیل افتراء کرتے تھے ان کی طرف اشارہ ہے۔

انجیل کے ایک اور ترجمہ میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ

''فارقلیط نہیں آئے گا جب تک میں نہ جاؤں اور جب فارقلیط آئے گا تو جہان کو غلطی وخطا پر سرزنش وتوبیخ کرے گا۔ اور وہ اپنے پاس سے کوئی بات نہیں فرمائے گا وہی فرمائے گا جو خدا سے سنے گا۔ اور حق وصداقت کے ساتھ لوگوں کی سیاست

فرمائے گا اور حوادث کی ان کو خبریں دے گا''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ''وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا۔ بلکہ وہی بات کرے گا جو کچھ خدا سے سنے گا۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اسے بھیجا ہے''۔

جیسا کہ قرآن کریم نے حق تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا: **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى** یعنی وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے وہی فرماتے ہیں جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

اور حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ''وہ (یعنی فارقلیط) میری بزرگی وعظمت بیان کرے گا اور میری نشانیوں کو معظم جانے گا''۔

اور یہ حقیقت واقعیہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جتنی عظمت وبزرگی حضور سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے کسی نے بھی ایسی بیان نہ کی۔ حضور نے ان کے وصف رسالت کو بیان فرمایا اور ان کو ان چیزوں سے پاک ومنزہ بتایا۔ جن کو ان کی امت نے ان کی طرف منسوب کر رکھا ہے۔

یہ تمام صفات حضورِ اکرم ﷺ کی ہیں۔ وہ کون ہے جس نے بنی اسرائیل کے علماء کو حق چھپانے اپنی جگہ سے کلمات ربانی کی تحریف کرنے اور تھوڑے داموں پر دین کو فروخت کرنے پر توبیخ فرمائی؟ اور وہ کون ہے جس نے حوادث کی اور غیبی حالات کی خبریں دی ہیں؟ بجز سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کے۔

انجیل میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرو اور ان پر ایمان لاؤ۔ اور اپنی امت سے فرمادو کہ ہر وہ شخص جو آپ کا زمانہ پائے وہ آپ پر ایمان لائے''

اے فرزند بتول! تم جان لو کہ اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں آدمؑ جنت اور دوزخ کسی کو بھی پیدا نہ فرماتا۔ اور جب میں عرش کو عالم وجود میں لایا تو وہ کانپتا تھا اسے قرار نہ تھا پھر میں نے عرش پر لکھا ''**لا اله الا محمد رسول الله**'' تو وہ ساکن ہوگیا۔

مواہب لدنیہ میں بیہقی سے بروایت سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ جب جارود نصرانی حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا تو اس نے کہا کہ ''اس خدا کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا بلاشبہ میں نے انجیل میں آپ کا وصف پڑھا ہے اور فرزند بتول نے آپ کی بشارت دی ہے۔ بیہقی دلائل النبوۃ میں از ابوامامہ باہلی از ہشام بن العاص اموی نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اور دیگر چند آدمیوں کو ہرقل قیصر روم کی طرف بھیجا گیا۔ تا کہ میں اسے دعوت اسلام دوں پھر پوری حدیث بیان کی اور کہا کہ ایک رات مرقل نے ہمیں اپنے پاس بلایا ہم اس کے پاس گئے تو اس نے ایک بڑا زرنگار صندوق منگوایا جس میں چھوٹے چھوٹے خانے تھے۔ اور ہر خانہ کا دہانہ چھوٹا تھا۔ پھر اس نے اس صندوق کو کھولا اور ایک سیاہ رنگ کا ریشم کا پارچہ نکال کر پھیلا دیا۔ اس میں ایک تصویر نظر آئی جس کی آنکھیں بڑی بڑی سرین بھاری' گردن دراز اور گیسو گندھے ہوئے تھے۔ یہ خدا کی بہترین مخلوق کا پیکر تھا۔ اس نے پوچھا تم اس تصویر کو پہچانتے ہو۔ ہم نے کہا ہم نہیں پہچانتے۔ کہا یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر ہے۔ پھر اس نے دوسرا خانہ کھولا اور سیاہ رنگ کا ریشم کا پارچہ نکال کر پھیلایا تو اس میں سفید پیکر میں بڑی بڑی آنکھیں اور سر وحسین داڑھی والی تصویر نظر آئی۔ اس نے پوچھا تم انہیں پہچانتے ہو۔ ہم نے کہا نہیں۔ اس نے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی شبیہہ ہے۔ پھر اس نے ایک اور خانہ کھولا اور ایک ریشم کا پارچہ نکال کر پھیلایا تو اس میں ایک حسین شبیہہ سفید چہرے والی نظر آئی گویا بذات خود رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں اس نے پوچھا ان کو پہچانتے ہو ہم نے کہا ہاں! یہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ پھر ہم رونے لگے اور ہرقل کھڑا ہوگیا اور پھر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا کیا یہ وہی ہیں؟ ہم نے کہا ہاں وہی ہیں۔ اس شبیہہ کو دیکھنے کے بعد گویا تم نے خاص انہیں کو دیکھ لیا۔ اس کے بعد ہرقل بہت دیر تک اس شبیہہ کو

دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا خدا کی قسم! یہ آخری نبی ہیں لیکن میں نے جلدی کی تا کہ تمہارے علم کو میں پا سکوں۔ ورنہ اس صندوق میں حضرت ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور سلیمان علیہم السلام وغیرہ کی صورتیں بھی ہیں۔ میں نے پوچھا تمہیں یہ صورتیں کہاں سے حاصل ہوئیں؟ اس نے کہا حضرت آدم علیہ السلام نے خدا سے درخواست کی تھی کہ تمام انبیاء اور ان کی اولاد کو دکھا دے تو حق تعالیٰ نے یہ صورتیں ان کے پاس بھیجیں۔ یہ سورج کے غائب ہونے کی جگہ حضرت آدم کے خزانہ میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضرت ذوالقرنین نے مغرب شمس سے انھیں نکالا اور حضرت دانیال کے سپرد فرمایا۔

زبور کی بشارتیں: ’’زبور کے چوالیس ویں باب میں حق تعالیٰ نبی آخر الزماں ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: **فَاَضَتِ النِّعْمَةُ مِنْ شَفَتَيْكَ** آپ کے دونوں ہونٹوں سے دنیا و آخرت کی نعمتیں فائض ہیں **مِنْ اَجْلِ هٰذَا بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ اِلَى الْاَبَدَ** اس کے لیے حق تعالیٰ نے آپ کو ابد تک برکت دی‘‘۔

لفظ فائض فیض سے بنا ہے۔ اور صراح میں فیض کے معنی خبر کا پھیل جانا، پانی کا کثرت سے ہونا، ندی میں لباب ہو کر پانی کا بہنا اور پانی کا بہانا ہے۔ اور حدیث مستفیض کے معنی ہیں حدیث کا بہت زیادہ پھیل جانا۔ اور فیاض کے معنی جوانمرد اور بہت زیادہ بخشش کرنے والے کے ہیں۔

تَقَلَّدِيْرَ اَيُّهَا الْجَبَّارَ السَّيْفَ یعنی اے بزرگ اپنی شمشیر کو گردن میں حمائل کر، شکستہ بندوں کے کام سنوارو۔

(جبار ایسے بلند درخت کو کہتے ہیں جس تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچے۔ نخلہ جبارہ کے معنی ہیں کھجور کا بہت اونچا درخت) **فَاِنَّ شَرَائِعَكَ وَسُنَّتَكَ مَقْرُوْنَةٌ بِهَيْبَةِ يَمِيْنِكَ.** یعنی بلاشبہ آپ کی شریعت و حکمت اور آپ کی سنت آپ کے داہنے ہاتھ کی بزرگی کے ساتھ پیوست ہیں **سِهَامُكَ مَسْنُوْنَةٌ** اور آپ کے تیر تیز کیے ہوئے ہیں۔ **وَجَمِيْعُ الْاُمَمِ يَخِرُّوْنَ تَحْتَكَ.** اور ساری امتیں آپ کے تحت سرنگوں اور خمیدہ ہیں‘‘۔

اس فرمودہ سے مراد سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وہ نعمت جو آپ کے دونوں لبہائے شیریں سے رواں ہے وہ کلام ہے جو آپ فرماتے ہیں اور وہ کتاب قرآن مجید ہے جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اور سنت سے وہ عمل مراد ہے جسے آپ نے کیا ہے۔ اور ’’گردن میں اپنی تلوار کا حمائل کرنا‘‘ یہ قول دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی آخر الزماں عربی ہیں کیونکہ عرب کے ماسوا کسی امت میں تلوار گردن میں حمائل نہیں کی جاتی۔ گردن میں تلوار کا حمائل کرنا اہل عرب سے مخصوص ہے اور یہ کہ آپ کی شریعت اور آپ کی سنت آپ کے داہنے ہاتھ کی بزرگی کے ساتھ پیوست ہے۔‘‘ یہ نص صریح ہے کہ آپ صاحب شریعت و سنت ہیں تو وہ نبی اپنی تلوار کے ساتھ مبعوث ہوتا ہے اور لوگوں کو تلوار سے درست کر کے حق پر مستحکم کرتا ہے۔ اور ان کو تلوار کے ذریعہ کفر سے نکالتا ہے۔ ﷺ۔ نیز زبور میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں تضرع وزاری کے ساتھ مناجات کی کہ

’’اے رب! سنت کے ظاہر کرنے والے کو بھیج تا کہ لوگ جان لیں کہ مسیح بشر ہیں‘‘۔

یہ خبریں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضور سیّدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے ان کے حال کے اظہار میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے خدا! محمد ﷺ کو بھیج تا کہ لوگوں کو معلوم کرائیں اور وہ پڑھیں کہ حضرت مسیح بشر ہیں الٰہ یعنی خدا نہیں ہیں گویا حضرت داؤد علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ لوگ حضرت مسیح کے بارے میں دعوئے الوہیت کریں گے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا حضور ﷺ کے ذکر و بیان کے سلسلے میں مذکور ہے کہ ’’اللہ تعالیٰ نے (اس نبی آخر الزماں) کو راستی و درستی اور کردار و گفتار میں برگزیدہ فرمایا ہے۔ اور انہیں اور ان کی امت کو بزرگی و کرامت عطا فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فیروز مندی

عطا فرمائی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی امت کو ایسی کرامت مرحمت فرمائی ہے کہ وہ خواب گاہوں میں خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور بلند آوازوں سے تکبیر کہتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تیز تلواریں ہیں تاکہ وہ خدا کی طرف سے ان لوگوں سے بدلہ لیں جو خدا کی عبادت نہیں کرتے اور اس زمانے کے بادشاہوں کو مقید کرتے اور ان کے عزت داروں کے گلے میں طوق ڈالتے ہیں۔''

ایک اور بات زبور میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ''صیہون'' سے (صیہون سے مراد مکہ مکرمہ ہے) تاج مرصع محمود کا ظاہر ہونا مقرر فرمایا ہے۔ تاج سے مراد عطا کردہ ریاست و امامت اور محمود سے مراد محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

ایک اور میں ہے کہ ''وہ مالک ہوگا۔ اور جود و سخا کرے گا۔ دریا سے دریا تک اور نہروں سے زمین کے آخری کنارے تک اور ان کے روبرو اپنے زانوؤں پر اہل جزائر بیٹھیں گے۔ ان کے سب دشمن مٹی کو اپنی زبان سے چاٹیں گے۔ سلاطین زمانہ اپنے مصاحبوں کے ساتھ سجدہ کرتے ہوئے اور سر کو زمین پر رکھتے ہوئے حاضر ہوں گے۔ اور ان کی امت کی فرماں برداری پر وہ عجز و انکسار کریں گے۔ اور گردن جھکانے سے انہیں نجات دے گا۔ وہ نبی غمزدہ ستم رسیّدہ لوگوں کو اس شخص سے جو اس سے بہت زیادہ قوی ہوگا رہائی عطا فرمائے گا۔ اور ہر کمزور و ناتواں کو جس کا کوئی مددگار نہ ہو وہ مدد فرمائے گا۔ اور ضعفاء و مساکین پر مہربانی کرے گا۔ اور ان پر ہر وقت درود بھیجا جاتا رہے گا اور ان کے لیے ہمہ وقت دعائیں کی جاتی رہیں گی۔ اور ابدالآباد تک ہمیشہ ہمیشہ ان کے ذکر کا چرچا رہے گا''۔ ﷺ

صحائف انبیاء میں ذکر جمیل: وصل: جس طرح کتب ثلاثہ یعنی توریت' انجیل اور زبور میں سیّد عالم ﷺ کے اوصاف مذکور ہیں اسی طرح ہر نبی کے صحیفوں میں بھی آپ کے اوصاف مذکور و مسطور ہیں۔ یہاں تک کہ ابوالانبیاء حضرت آدم علیہ السلام کے صحیفے میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ

''میں مکہ کا خداوند ہوں۔ اس کے رہنے والے میرے ہمسایہ ہیں اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے والے اور وہاں تک پہنچنے والے میرے مہمان ہیں۔ اور وہ میری عنایت و حمایت کی پناہ اور سایہ میں ہیں اور میری حفاظت و رعایت میں ہیں اور زمین و آسمان والوں سے اسے معمور کروں گا اور جوق در جوق جماعتیں بکھرے ہوئے اور گرد آلود بالوں سے لبیک پکارتے' تکبیر بلند آواز سے کرتے۔ آنکھوں سے آنسو بہاتے آئیں گے۔ اور جو بھی اس خانہ کعبہ کی زیارت کو آئے گا اس کا مقصود بیت اللہ کی زیارت اور میری خوشنودی و رضا کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ میں ہی صاحب خانہ ہوں' گویا کہ ایسا ہوگا کہ اس نے میری ہی زیارت کی وہ میرا مہمان ہوگا۔ اور میرے کرم کے لائق و مستحق ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میں اس کی تکریم کروں گا اور محروم نہ چھوڑوں گا۔ اور اس خانہ کعبہ کا انتظام تیرے فرزندوں میں سے اس نبی کے سپرد کروں گا۔ جسے ابراہیم کہیں گے۔ اس کے ذریعہ خانہ کعبہ کی بنیادوں کو اونچا کراؤں گا اور اس کے ہاتھ سے اسے تعمیر کراؤں گا۔ اور اس کے لیے زمزم کا چشمہ نکالوں گا۔ اور اس کی حرمت و حل اس کی میراث میں دوں گا۔ اور اس کے مشاعر کو اس کے ہاتھ سے آشکارا کروں گا۔ (مشاعر سے مراد مشعر الحرام اور نشانات ہیں) پھر حضرت ابراہیم کے بعد ہر زمانہ میں لوگ اسے آباد رکھیں گے۔ اور اس کی طرف قصد و ارادہ رکھیں گے۔ یہاں تک کہ نوبت بہ نوبت تیرے فرزندوں میں سے اس نبی تک پہنچے گی جسے محمد ﷺ کہیں گے۔ وہ سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے ہوں گے۔ اور اسی نبی کو میں اس کے گھر کے رہنے والوں' منتظموں' متولیوں اور حاجیوں میں بزرگ تر بناؤں گا۔ جو بھی میرا متلاشی اور میرا چاہنے والا ہو۔ اسے لازم ہے کہ وہ اس جماعت کے ساتھ ہو۔ جن کے بال بکھرے ہوئے گرد آلود ہیں جو خدا کے حضور اپنی منتوں اور نذروں کو پورا کرتے ہیں۔

صحیفہ ابراہیم میں ذکر جمیل: حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہٗ کے صحیفہ میں ہے کہ ''اے ابراہیم میں نے تمہاری دعا تمہارے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں قبول فرمائی ہے۔ میں نے ان پر اور ان کی اولاد پر برکتیں جاری فرمائیں۔ اور

ان میں سے ایک ایسا فرزند عالم وجود میں لاؤں گا جو معظم و مکرم ہوگا۔ جن کا اسم گرامی محمد ﷺ ہوگا۔ وہ میرے برگزیدہ اور مبعوث شدہ ہوں گے۔ اور ان کی امت بہترین امت ہوگی۔''

کتاب حبقوق میں ذکر جمیل: حضرت حبقوق ایک نبی تھے جو حضرت دانیال نبی کے ہم زمانہ تھے۔ (علیہما السلام) ان کی کتاب میں مذکور ہے کہ

جَآءَ اللّٰهُ مِنَ التَّيَمُّنِ وَالتَّقْدِيْسِ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ وَامْتَلَاتِ الْاَرْضُ مِنْ تَحْمِيْدِ اَحْمَدَ وَتَقْدِيْسِهٖ وَمَلَكَ الْاَرْضَ وَرِقَابَ الْاُمَمِ. لَقَدِ انْكَشَفَتِ السَّمَآءُ مِنْ بَهَاءِ مُحَمَّدٍ وَّامْتَلَأَتِ الْاَرْضُ مِنْ حَمْدِهٖ

اللہ تعالیٰ نے برکت و پاکی کے ساتھ فاران کے پہاڑوں پر جلوہ فرمایا اور زمین کو احمد کی مدحت و ثنا اور اس کی تقدیس سے بھر دیا جو کہ زمین اور امتوں کی گردنوں کا مالک ہے۔ بلاشبہ محمد ﷺ کی خوبیوں سے آسمان مجلّی ہوا اور اس کی مدحت سے لبریز ہوگئی۔

اور یہ بھی آیا ہے کہ:

يُضِيْٓئُ بِنُوْرِهِ الْاَرْضُ وَيَحْمِلُ خَيْلُهُ فِي الْبَحْرِ.

ان کے نور سے زمین روشن ہوگئی اور ان کے گھوڑے سمندر میں دوڑیں گے۔

اور حضرت حبقوق کے کلام میں یہ بھی ہے کہ:

ضَـنَـزَعَ فِيْ فِيْكَ اِغْرَاقًا وَتَرْتَوِىْ السِّهَامُ بِاَمْرِكَ يَا مُحَمَّدُ ارْتِوَاءً.

بہت جلد آپ کے کمان میں سخت تیر کھینچے جائیں گے۔ اور خوب سیراب ہوں گے تیر آپ کے حکم سے۔

یہ عبارت حکم میں مبالغہ اور کام کے انجام کی انتہا تک پہنچنے کی طرف کنایہ ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کے عہد مبارک میں دین و ملت کے کام کمال و اتمام تک پہنچیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الخ

یعنی میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمتیں تمام فرما دیں۔

حضرت دہب بن منبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے کتب قدیمہ میں پڑھا ہے کہ حق تعالیٰ یہ قسم ارشاد فرماتا ہے:

''مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے کہ میں عرب کے پہاڑوں پر اپنے نور کو نازل فرماؤں گا جس سے مشرق و مغرب کا درمیان نور سے پرنور ہو جائے گا۔ اور اولاد اسمٰعیل میں سے ایک نبی عربی و امی پیدا فرماؤں گا جس پر آسمان کے ستاروں کی گنتی اور زمین پر جتنی روئیدگی ہے ان کے برابر لوگ ایمان لائیں گے۔ اور میری ربوبیت اور اس کی رسالت پر سب ایمان لائیں گے۔ اور اپنے باپ دادا کی ملتوں سے نفرت کرتے ہوئے نکلیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا پاکی ہے تجھے اور تیرے اسماء پاک ہیں۔ بلاشبہ تو نے اس نبی آخر الزماں کو بڑی ہی عزت و شرافت سے نوازا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ آیا۔ میں دنیا و آخرت میں اس کے دشمنوں سے انتقام و بدلہ لوں گا۔ اور تمام دعوتوں پر ان کی دعوت کو ظاہر و غالب کروں گا۔ جو ان کی شریعت کی مخالفت کرے گا میں اسے ذلیل و خوار کروں گا۔ وہ شریعت ایسی ہے جسے عدل سے آراستہ کیا ہے۔ اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے ہی اس شریعت کو لاؤں گا۔ قسم ہے مجھے اپنی عزت کی' میں تمام امتوں کو ان کے وسیلہ سے آتش دوزخ سے نجات دوں گا۔ اور دنیا کا آغاز میں نے ابراہیم سے کیا اور محمد ﷺ پر اسے ختم کروں گا اب جو کوئی ان کا زمانہ پائے اور ان پر ایمان نہ لائے اور ان کی شریعت کی پیروی نہ کرے تو اس سے خدا بیزار ہے''۔

صحیفہ شعیا علیہ السلام میں ذکرِ جمیل: وصل: حضرت شعیاء علیہ السلام کے صحیفوں میں حضورِ انور ﷺ کا ذکرِ مبارک اس طرح مذکور ہے کہ ''حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وہ بندہ میرا محبوب ہے کہ میں اس سے خوش ہوتا ہوں وہ میرا مختار ہے کہ وہ مجھ سے خوش ہوتا ہے۔ میں اس پر اپنی روح کا افاضہ کرتا ہوں اور فرمایا۔ میں اپنی وحی اس پر نازل کرتا ہوں تو امتوں پر اس کا عدل ظاہر ہوتا ہے وہ ایسا بندہ ہے جو قہقہہ نہیں لگاتا۔ اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنی جاتی ہے۔ وہ بندہ اندھی آنکھوں کو بینائی بخشتا' بہرے کانوں کو کھولتا اور مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے۔ میں اس کو وہ دوں گا جو میں نے کسی کو نہیں دیا۔ وہ بندہ احمد ہے کہ وہ اپنے رب کی تازہ حمد بجالاتا ہے۔ کوئی اسے کمزور نہ کر سکے گا اور نہ اسے مغلوب بنا سکے گا۔ وہ اپنی خواہش کی پیروی نہیں کرتا اور وہ نیکوکار' صلحاء جو کلک کی مانند کمزور وناتواں ہیں ان کو وہ ذلیل وخوار نہیں جانتا۔ وہ صدیقوں کو قوی بناتا ہے وہ تواضع وانکساری کرنے والوں کا رکن ہے وہ خدا کا نور ہے جسے ہرگز کوئی نہ بجھا سکے گا۔ اس کے ذریعہ میری حجت' ثابت وبرقرار ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ عذر منقطع ہوتا ہے اور اس کی توریت یعنی تلاوت قرآن سے جن وانس اطاعت گزار بنتے ہیں۔ (اس جگہ توریت سے مراد اس کتاب کی تلاوت ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت کا قائم مقام ہے یعنی قرآن پاک) نیز حضرت شعیاء نبی علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

> ''اے محمد! ﷺ میں وہ خدا ہوں جس نے تمہیں حق کے ساتھ عظیم وقوی بنایا اور تمہیں ایسا نور بنایا جس سے تم امتوں کی اندھی آنکھوں کو بصارت عطا فرماؤ گے۔ اور تم ایسی دلیل ہو جس سے تم نفس وہوا کے قیدیوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے جاؤ گے۔''

نیز حضرت شعیاء علیہ السلام کی کتاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا:

> ''اے شعیاء اٹھ اور دیکھ اور جو کچھ نظر آئے اس کی لوگوں کو خبر دے تو میں اٹھا اور دیکھا کہ دو سوار سامنے سے آ رہے ہیں۔ ایک گدھے پر سوار ہے اور دوسرا اونٹ پر۔ ایک سوار دوسرے سے کہتا ہے گرا دو بابل کو اور ان بتوں کو جو انہوں نے تراش رکھے ہیں''۔

ابن قتیبہ جو کہ علماء امت میں سے ہیں اور کتب سماوی کے زبردست عالم اور محقق ہیں فرماتے ہیں کہ گدھے پر سوار ہونے والے حضرت مسیح ابن مریم علیہم السلام مراد ہیں جس پر تمام نصاریٰ کا اتفاق ہے تو لامحالہ اونٹ پر سوار شخص' حضور سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اس لیے کہ بابل کا سقوط اور وہاں کے بتوں کی شکستگی آپ ہی کے دست مبارک سے ہوئی ہے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ سے۔ کیونکہ اقلیم بابل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ہمیشہ ہی وہاں کے بادشاہ بتوں کی پرستش کرتے رہے ہیں۔ اور یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ کی اونٹ پر سواری اور حضرت مسیح علیہ السلام کی گدھے پر سواری بہت زیادہ مشہور ہے۔

اور حضرت شعیاء علیہ السلام کی کتاب میں مذکور ہے کہ

> ''آل قیدار کی محلات سے جنگلوں اور شہروں کو بھر دیں گے' وہ تسبیح کریں گے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اذانیں دیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت وبزرگی بیان کریں گے اور بحر وبر اور ہر خشکی وتری میں خدا کی پاکی اور اس کی تسبیح کو پھیلا دیں گے۔ اور زمین کے آخری کنارہ سے غلغلۂ تکبیر بلند کرتے تیزی کے ساتھ آئیں گے اور اپنے پاؤں کو ماریں گے جس طرح گل کاری کرنے والا مٹی کو پاؤں سے گوندھتا اور کوٹتا ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ محبت کے ساتھ آئیں گے اور ان کا تیزی کے ساتھ آنا۔ حج کے لیے بسرعت آنا' آواز بلند کرنا' تلبیہ یعنی لبیک کہتے ہوئے آنا۔ اور طواف میں رمل یعنی اکڑ کر چلنا مراد ہے۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ آل قیدار سے مراد اہل عرب ہیں اس لیے کہ

باجماع، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے پوتے کا نام قیدار ہے۔ ابن قتیبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت شعیاء کی کتاب میں مکہ مکرمہ خانہ کعبہ اور حجر اسود کا بھی ذکر ہے کہ وہ حجر اسود کا استیلام یعنی بوسہ دیں گے حضرت شعیاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آگاہ رہو میں صیہون یعنی مکہ مکرمہ میں اپنا گھر (بیت اللہ) بنانے والا ہوں۔ جس کے گوشہ میں حجر اسود ہے۔ اور اسے عظمت وکرامت دی گئی ہے۔ اسے بوسہ دیا جائے گا۔ اور حق تعالیٰ نے مکہ سے ارشاد فرمایا: اے عاقر (یعنی بانجھ) تو خوش ہو اور تسبیح کے ساتھ گویائی کر کہ تیرے اہل (یعنی ماننے والے) میرے اہل سے زیادہ ہوں گے۔ اپنے اہل سے مراد اہل بیت مقدس بنی اسرائیل لیا ہوگا اور مکہ کے حج وعمرہ کرنے والے ان سے زیادہ ہوں گے۔ اور یہ کہ حق تعالیٰ نے مکہ کو عاقر یعنی بانجھ سے تشبیہہ دی ہے۔ بایں وجہ کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پہلے اس میں کوئی آباد نہ تھا۔ اور نہ وہاں کوئی کتاب ہی نازل ہوئی۔ بخلاف بیت المقدس کے کہ وہاں بکثرت انبیاء علیہم السلام ہوئے۔ اور وہ مہبط وحی رہا۔ نیز کتاب شعیاء میں ہے کہ حق تعالیٰ نے مکہ سے فرمایا: قسم ہے مجھے اپنی ذات کی جیسا کہ مجھے قسم تھی حضرت نوح کے زمانہ میں کہ میں نے اہل زمیں کو طوفاں سے غرق کیا اس طرح اب تیرے لیے مجھے انی ذات کی قسم ہے میں تجھ سے کبھی بھی ناراض نہ ہوں گا۔ اور نہ کبھی تجھے چھوڑوں گا۔ جب تک کہ تمام پہاڑ اپنی جگہ سے نہ جائیں اور اس کے قلعے پست نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک اپنی نعمتیں تجھ سے زائل نہ کروں گا۔ اے مسکینہ تو آگاہ رہ کہ میں تیری بنیادوں کو پتھر اور گچ سے بناؤں گا۔ اور تجھے زر وجواہر سے آراستہ کروں گا۔ اور تیری چھت کو آبدار موتیوں سے اور تیرے دروازوں کو زبرجد سے سجاؤں گا۔ ظلم کو تجھ سے دور رکھا جائے گا۔ اور کسی اوزار سے جس کا بنانے والا تجھے نقصان پہنچائے اس سے خوف نہ رکھ۔ اٹھ اور روشن ہو کہ تیرے نور کے پہنچانے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ خدا کی عظمت وتوقیر تجھ پر ہے۔ خاتم الانبیاء ﷺ کے نور کے ظہور کی بشارت ہے۔ اسی طرح حرم شریف کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ بھیڑیا اور بکری ایک جگہ چریں گے۔ اور اس کی راہوں کے بارے میں ہے کہ راہوں کی عظمت وبزرگی اتنی زیادہ ہے کہ تحریر وبیان سے باہر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ کے صفات واحوال کتب متقدمہ میں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس میں کوئی اخفا واشتباہ نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ اعداء دین آپ کے نام نامی کو بدل دیں یا تحریف کر دیں۔ اس کے باوجود دلائل وشواہد روشن وظاہر ہیں۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ

یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا ہی کرتا ہے خواہ کافر کتنا ہی برا مانیں۔

صلّی اللہ علی سیدالاولین والآخرین وخاتم الانبیاء والمرسلین وعلٰی آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین.

بشارات پر مشتمل چندروایات: وصل: اجمال کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر شریف گذشتہ آسمانی کتابوں میں موجود ومذکور ہے۔ اور اہل کتاب کو اس کا علم قطعی اور یقینی حاصل تھا۔ اور انہوں نے حسد وعناد اور غلبۂ شقادت وبدنصیبی سے راہ انکار وارتداد اور طریقہ استبعاد اختیار کر کے تحریف اور تغیر وتبدل میں مبتلا ہو گئے۔ مناسب ہوگا کہ اس جگہ ان حکایتوں اور روایتوں کا ذکر کر دیا جائے جو ان کے بغض وعناد اور حسد وارتداد پر مشتمل ہیں۔

حدیث: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، اپنے والد مالک بن سنان سے جو شہداء اُحد میں سے ہیں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک دن بنی عبدالاشہل کے پاس بات چیت کی غرض سے آیا۔ ان دنوں ہم نے یہودیوں سے صلح کر رکھی تھی۔ وہاں میں نے یوشع یہودی کو کہتے سنا کہ اب اس نبی کے ظہور کا زمانہ نزدیک آ گیا ہے۔ جس کا نام احمد ﷺ ہے۔ وہ حرم مکہ سے ظاہر ہوں گے۔ اور اس شہر یعنی مدینہ میں ہجرت کر کے آئیں گے۔ پھر میں اپنی قوم کی طرف لوٹا۔ میں نے یوشع سے جو سنا تھا اس پر تعجب کرتا تھا۔ میں نے اپنی قوم کے ایک شخص کو یہ بات سنائی اس نے کہا یہ بات تنہا یوشع ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ یثرب کے تمام یہودی یہی بات کہہ رہے ہیں پھر میں

وہاں سے چل دیا۔ اور بنی قریظہ (ایک قبیلہ کا نام ہے) کے یہاں آیا تو وہ سب بھی حضورِ اکرم ﷺ کا یہی تذکرہ کررہے تھے۔ چنانچہ زبیر بن باطا نے کہا (یہ یہود کے روساء میں سے تھا۔) بلاشبہ وہ سرخ ستارہ طلوع ہو چکا ہے۔ جو کسی نبی کے ظہور کے بغیر کبھی طلوع نہیں ہوتا۔ اور کہا کہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے بجز احمد (مجتبےٰ ﷺ) کے اور یہ شہر یعنی یثرب ان کی ہجرت کا مقام ہے۔ حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ جب حضور ہجرت کر کے مدینہ طیبہ رونق افروز ہوئے تو میں نے حضور سے یہ حکایت بیان کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر زبیر اور اس کے ساتھی رونسائے یہود اسلام لے آتے تو سارے یہودی مسلمان ہو جاتے۔ کیونکہ وہ سب اس کے تابع تھے۔

حدیث: قتادہ سے مروی ہے کہ جب یہودی کفار عرب کی جنگوں میں فتح وکامیابی کی دعائیں مانگتے تھے تو اپنی دعاؤں میں کہتے تھے کہ اے خدا اس نبی اُمی کا ظہور فرما جن کا ذکر ہم توریت میں پاتے ہیں۔ تاکہ ان کافروں کو سزا دیں اور ان کے ساتھ ہو کر انہیں قتل کردیں ان کی یہ روش اس بنا پر تھی کہ ان کا گمان تھا کہ وہ نبی آخرالزماں ان کی جنس یعنی بنی اسرائیل میں سے ظاہر ہوگا اور جب ان کی جنس کے سوا یعنی بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوئے تو حسد کرنے لگے اور کفر وانکار کے درپے ہو گئے۔

حدیث: حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ وہ مقوقس بادشاہ کے پاس گئے اس نے ان سے کہا محمد ﷺ نبی ورسول ہیں۔ اگر وہ قبط (مصر) یا روم میں ہوتے تو سب ان کی پیروی کرتے۔ مغیرہ کہتے ہیں اس کے بعد میں نے اسکندریہ میں اقامت اختیار کی۔ اور کوئی کنیسہ (گرجا) ایسا نہ چھوڑا جہاں میں نہ گیا ہوں۔ میں نے قبط وروم کے تمام اسقفوں یعنی ان کے مذہبی پیشواؤں سے پوچھا کہ جو کچھ تم نے اپنی کتابوں میں حضورِ اکرم ﷺ کی صفتیں پائی ہیں بیان کرو۔ وہاں ان کا ایک بڑا اسقف یعنی مذہبی پیشوا تھا۔ لوگ اس کے پاس اپنے بیماروں کو لاتے اور وہ ان کے لیے دعا کرتا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انبیاء میں سے کوئی نبی ایسا باقی ہے جو آنے والا ہو۔ اور وہ ابھی تک نہ آیا ہو۔ اس نے کہا ہاں! وہ آخری نبی ہیں۔ ان کے اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ صرف وہی نبی ہے بلاشبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیں ان کے اتباع کا حکم فرمایا ہے۔ وہ نبی عربی اُمی ہے ان کا نام احمد ہے نہ دراز قد ہے نہ کوتاہ قد۔ اس کی دونوں آنکھوں میں سرخی ہے نہ سفید رنگ ہے نہ سیاہ رنگ ہے۔ اس کے بال گچھے دار ہیں۔ وہ سخت وکھردرا لباس پہنتا ہے اور کھانے میں جو مل جائے اسی پر قناعت کرتا ہے۔ اس کے کندھے پر تلوار ہے اور جو بھی اس کے مقابل آئے اس سے وہ خوف نہیں کرتا۔ قتال میں وہ پہل نہیں کرتا۔ اس کے اصحاب ہوں گے جو اپنے آپ کو اس پر فدا کریں گے۔ وہ اپنے آباء وفرزندان سے کہیں بڑھ کر ان سے محبت رکھیں گے۔ ان کا ظہور اس مقام میں ہوگا' جہاں ''سلم'' کے درخت ہیں۔ وہ ایک حرم سے نکلیں گے اور دوسرے حرم کی طرف ہجرت کریں گے۔ وہ زمین شور سے نخلستان کی طرف ہجرت کرے گا۔ اور پنڈلی کے درمیان پر تہبند پہنے گا۔ اور اعضاء کے کناروں کو دھوئے گا۔ (یعنی وضو کرے گا) اور اس میں ایسی خاص صفتیں ہوں گی جو کسی نبی میں نہیں ہیں۔ ہر نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا ہے مگر وہ سارے جہاں کے لیے مبعوث ہوں گے۔ اور ساری زمین اس کے لیے سجدہ گاہ بنا دی جائے گی۔ اور زمین کو پاک کرنے والا جہاں بھی نماز کا وقت آئے وہیں مٹی سے (اگر پانی موجود نہ ہو یا قدرت نہ ہو تو) تیمّم کر کے نماز ادا کرے گا۔ پھر جب مغیرہ اس سفر سے واپس آئے تو اسلام لے آئے۔ اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو جو کچھ سنا تھا اس کی خبر دی۔

حدیث: سعید بن زید سے مروی ہے کہ ان کے باپ زید بن عمرو دین کی تلاش میں نکلے تو وہ موصل میں ایک راہب کے پاس پہنچے۔ راہب نے زید سے پوچھا: کہاں سے آرہے ہو؟ زید نے کہا بیت ابراہیم یعنی خانہ کعبہ سے۔ اس نے کہا کس جستجو میں ہو۔ زید نے کہا دین کی تلاش میں ہوں۔ اس نے کہا واپس ہو جاؤ۔ قریب ہے کہ وہ ظاہر ہو تمہاری زمین پر۔ جس کی تم تلاش میں ہو۔ اس لیے زید بن عمرو بن نفیل کو زمانہ جاہلیت کا موحد کہتے ہیں۔ یہ مشرکوں کے ذبح کردہ جانوروں کا گوشت نہ کھاتے تھے اور توریت کو اپنی قوم پر نہ

پڑھتے تھے۔ ان کا تذکرہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔

حدیث: سیّدنا ابن مسعود ؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایک مرد کے جنت میں داخل کرنے کے لیے بھیجا۔ اس مقولہ کا اصل قصہ یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ ایک روز ایک یہودی کے کنیسہ میں تشریف لے گئے وہاں ایک یہودی کو دیکھا کہ وہ اپنی قوم کو توریت پڑھ کر سنا رہا ہے۔ جب وہ نبی آخر الزماں ﷺ کی صفت پر پہنچا تو خاموش ہو گیا اور پڑھنے سے رک گیا۔ پھر وہ بیمار بچوں کی مانند بڑبڑایا اور اس نے جا کر توریت لے کر حضور ﷺ کی صفت پڑھی اور کہنے لگا یہ آپ کی صفت ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ. اسی کلمہ پر اس نے جان دے دی۔ اس کے بعد حضور نے اپنے صحابہ سے فرمایا: اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کرو۔

حدیث: حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ جب طائف کے بادشاہ تبع نے مدینہ پر چڑھائی کی تھی اور اس نے اعلان کیا تھا کہ میں شہر مدینہ کو ویران کر دونگا۔ اور اس کے رہنے والوں کو اپنے اس لڑکے کے انتقام میں قتل کر ڈالوں گا جسے انہوں نے فریب اور دھوکے سے قتل کیا ہے تو اس وقت سامول یہودی نے جو اس زمانے میں یہودیوں کا سب سے بڑا عالم تھا اس نے کہا اے بادشاہ! یہ وہ شہر ہے جس کی طرف نبی اسمٰعیل سے نبی آخر الزماں کی ہجرت ہو گی اور اس نبی کی جائے ولادت مکہ مکرمہ ہے اس کا اسم گرامی احمد ہے' یہ شہر اس کا دار ہجرت ہے۔ اور اس کی قبر انور بھی اسی جگہ ہو گی۔ تبع یوں ہی واپس ہو گیا۔

محمد بن اسحاق کتاب مغازی میں نقل کرتے ہیں کہ تبع نے نبی آخر الزماں کے لیے ایک عالیشان محل تعمیر کرایا۔ تبع کے ہمراہ توریت کے چار سو علماء تھے۔ جو اس کی صحبت چھوڑ کر مدنیہ منورہ میں اس آرزو میں ٹھہر گئے کہ وہ نبی آخر الزماں کی صحبت کی سعادت حاصل کریں گے۔ اور تبع نے ان چار سو علماء میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک مکان بنوایا۔ اور ایک ایک باندی بخشی اور ان کو مال کثیر دیا۔ تبع نے ایک خط لکھا جس میں اپنے اسلام لانے کی شہادت دی۔ اس خط میں چند شعر یہ تھے

شَهِدْتُّ عَلٰی اَحْمَدَ اَنَّهٗ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ بَارِی النَّسَمِ فَلَوْلَا عُمْرِیْ اِلٰی عُمَرِهٖ لَكُنْتُ وَزِیْرًا لَّهٗ وَابْنَ عَمٍّ.	میں حضور احمد مجتبٰی کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ بلاشبہ اس اللہ کی جانب سے رسول ہیں جس نے مٹی سے انسان کو پیدا کیا۔ اگر میں آپ کے ظہور مبارک کے زمانہ تک زندہ رہا تو میں ان کا وزیر اور ابن عم ہوں گا۔

پھر تبع نے اپنے اس خط کو سر بہ مہر کر کے ان چار سو علماء کے سب سے بڑے عالم کے سپرد کر دیا اور وصیت کی کہ اگر وہ نبی آخر الزماں کو پائے تو یہ خط ان کی خدمت میں پیش کر دے ورنہ اپنی اولاد در اولاد کو اس وصیت کو پہنچاتے رہنا۔ وہ مکان جو خاتم الانبیاء ﷺ کے لیے بنایا گیا تھا وہ حضورِ اکرم ﷺ کے قدم رنجہ فرمانے تک موجود رہا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ایوب انصاری ؓ کا وہ مکان جس میں حضور نے ہجرت کے بعد نزول اجلال فرمایا تھا وہی مکان تھا۔

روایت: بیان کرتے ہیں کہ زبیر بن بطا جو یہودیوں کا بڑا عالم تھا اس نے کہا کہ میرے باپ نے ایک خط جس میں احمد مجتبٰی ﷺ کا ذکر تھا مہر لگا کر مجھے دیا کہ وہ نبی ہیں جو زمین قرظ میں ظاہر ہوں گے۔ ان کی صفات یہ ہیں۔ پھر اس نے باپ کے مرنے کے بعد اس کا تذکرہ کیا۔ ابھی حضورِ انور ﷺ مبعوث نہ ہوئے تھے۔ مگر جب نے سنا کہ مکہ مکرمہ میں حضورِ انور ﷺ ظاہر ہو چکے ہیں تو اس نے اس خط کو تلف کر دیا۔ اور حضور ﷺ کی شان و صفات کو چھپانے لگا۔

قبائل بنی قریظہ' نضیر' فدک اور خیبر کے یہودی اپنے پاس حضور ﷺ کی بعثت کے پہلے سے تعریف و پہچان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی ہجرت مدینہ ہو گی۔ اور جب حضورِ انور مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے تو وہ کہتے تھے کہ آج کی رات احمد مجتبٰی پیدا ہو گئے اور ان کی ولادت کا ستارہ طلوع ہو گیا لیکن جب وہ مبعوث ہوئے تو وہ کافر و منکر ہو گئے۔ ان کا یہ کفر و انکار محض سرکشی اور حسد و عناد کی بنا پر تھا۔

روایت: ہشام ابن عروہ اپنے باپ سے بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں ایک یہودی بغرض تجارت مقیم تھا۔ جب حضورِ انور ﷺ کی ولادت کی رات آئی تو وہ یہودی قریش کی مجلس میں آ کر بیٹھا اور اس نے پوچھا آج کی رات کوئی بچہ تم میں پیدا ہوا ہے۔ قریش نے کہا ہمیں نہیں معلوم۔ اس نے کہا نہیں' اے قریشیو! جستجو وتلاش کرو جیسا کہ میں کہتا ہوں یقیناً آج کی رات وہ پیدا ہوا ہے۔ وہ اس امت کا نبی ہے اس کا نام احمد ہے۔ اور اس کے دونوں شانوں کے درمیان ایک نشان ہے جس میں بال ہیں۔ تو قریش اپنی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس یہودی کی بات پر حیرت وتعجب کرنے لگے۔ جب وہ اپنے اپنے گھروں میں آئے تو اپنے گھر والوں سے سنا کہ حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے گھر ان کا فرزند پیدا ہوا ہے جس کا نام محمد رکھا گیا ہے۔ وہ یہودی کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہاں آج ہم میں ایک بچہ پیدا ہوا ہے۔ وہ یہودی ہماری خبر سنانے سے پہلے یا بعد میں کہنے لگا۔ مجھ کو اس بچے کے پاس لے چلو۔ وہ اس کو حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے پاس لے کر آئے اور حضورِ انور کو باہر لائے تو اس یہودی نے آپ کی پشت مبارک میں وہ نشان (مہر نبوت) دیکھا۔ اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو قریش نے کہا افسوس تجھے کیا ہو گیا۔ اس نے کہا بنی اسرائیل سے نبوت جاتی رہی۔ اور ان کے ہاتھوں سے کتاب (توریت) نکل گئی۔ یہ مولود (بچہ) انہیں مارے گا اور ان کے احبار وعلماء کو قتل کرے گا۔ اور عرب نے نبوت کو پا لیا' اے معشر قریش! تمہیں خوشی مبارک ہو۔ آگاہ رہو۔ خدا کی قسم! مشرق سے مغرب تک تمہارا غلبہ و دبدبہ ہو گا۔ اس حکایت کا کچھ آخری حصہ بھی ہے۔ جو انشاء تعالیٰ ذکر ولادت سیّد عالم ﷺ میں آئے گا۔

حدیث: سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ بیت مدراس میں تشریف لائے اور فرمایا تم میں جو سب سے زیادہ عقلمند ہے اسے میرے پاس لاؤ۔ تو وہ عبداللہ بن سوریا کو لائے۔ حضور نے اس نے تنہائی میں گفتگو فرمائی۔ اور فرمایا میں تجھے تیرے دین کی قسم دیتا ہوں اور اس نعمت کی جو بنی اسرائیل کو دی گئی۔ اور جو ''من وسلویٰ'' کھلایا۔ اور ان پر ابر کا سایہ کیا گیا کہ میں خدا کا رسول ہوں؟ اس نے کہا اللھم نعم' یعنی بارالہ ہاں! میں اور میری ساری قوم خوب جانتی ہے اور جو کچھ آپ کی تعریف وتوصیف اور آپ کی خوبیاں ہیں میں جانتا ہوں وہ توریت میں واضح طور پر مرقوم ہیں۔ لیکن یہ قوم آپ پر حسد کرتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر تجھے کس چیز نے باز رکھا ہے کہ ایمان نہیں لاتا۔ اور مسلمان نہیں ہوتا۔ اس نے کہا میں اپنی قوم کے خلاف چلنے کو اچھا نہیں جانتا۔ میں خواہش رکھتا ہوں وہ سب آپ کی متابعت کریں اور اسلام لائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤں۔

حدیث: حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں ملک شام میں بصرے کے بازار میں موجود تھا کہ اچانک ایک صومعہ (عبادت خانے) سے کسی راہب کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا ان تاجروں سے دریافت کرو کیا تم میں کوئی اہل حرم یعنی مکہ کا باشندہ ہے۔ طلحہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کہا ہاں! میں وہاں کا باشندہ ہوں۔ اس نے کہا کیا مکہ میں احمد ﷺ مبعوث ہوئے ہیں۔ میں نے کا کون احمد؟ اس نے کہا وہ عبدالمطلب کے پوتے ہیں۔ یہی دن ہیں کہ وہ ان میں مبعوث ہوئے ہوں گے وہ آخری نبی ہیں ان کا جائے خروج' حرم ہے اور ان کی جائے ہجرت' خرمازار سنگستان اور زمین شور ہے جس کا نام یثرت ہے۔ حضرت طلحہ فرماتے ہیں کہ راہب کی بات نے میرے دل میں جگہ کر لی۔ پھر میں وہاں سے چل کر مکہ مکرمہ آیا۔ میں نے دریافت کیا۔ کیا کوئی حادثہ (نئی بات) یا سانحہ ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا ہاں! محمد بن عبداللہ ﷺ نے دعویٰ نبوت کیا ہے اور ابن ابی قحافہ یعنی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی متابعت قبول کر لی ہے۔ پھر میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا ان سے راہب کی بات بیان کی اور کہا کیا تم نے اس شخص کی متابعت قبول کر لی ہے۔ انہوں نے فرمایا ہاں! پھر حضرت صدیق' طلحہ کو لے کر حضور کے پاس آئے اور انھوں نے متابعت کی۔

حدیث: حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا جس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا

اوران کی نبوت مکہ میں مشہور ہوئی تو میں جانب شام نکل گیا اور جب بصرے پہنچا تو وہاں نصاریٰ کی ایک جماعت آئی اور مجھ سے پوچھنے لگی کیا تم حرم مکہ سے آئے ہو۔ میں نے کہا ہاں! وہ کہنے لگے کیا تم اس شخص کی صورت پہچانتے ہو۔ جس نے تم میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے کہا ہاں میں پہچانتا ہوں انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اور مجھے ایک ایسے عبادت خانے میں لے گئے جس میں بیشمار تصویریں اور تمثیلیں آویزاں تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا انھیں بغور دیکھو کیا ان میں اس کی شبیہہ ہے۔ جس نے تم میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو میں نے ایک ایک کر کے بغور نظر ڈالی لیکن ان تصویروں میں مجھے آپ کی شبیہہ نظر نہ آئی۔ پھر وہ مجھے اس سے بڑے عبادت خانے میں لے گئے۔ وہاں پہلے سے کہیں زیادہ تصاویر وتماثیل آویزاں تھیں۔ انھوں نے دیکھو کیا تمہیں ان میں ان کی مبارک صورت نظر آتی ہے۔ میں دیکھنے لگا۔ اچانک حضورِ اکرم ﷺ اور حضور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صورت وصفت نظر آئی۔ کہ ابوبکر صدیق، حضور کا زانوئے مبارک پکڑے ہوئے ہیں انہوں نے پوچھا کیا تمہیں ان کی شبیہہ نظر آئی۔ میں نے کہا ہاں! پھر میں نے دل میں کہا مجھے ابھی ان کی نشاندہی نہیں کرنی چاہیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف وصفت بیان کی۔ میں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ وہی ہیں۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا تم جانتے ہو وہ کون ہیں؟ جو آپ کا زانوئے مبارک پکڑے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا ہاں! میں گواہی دیتا ہوں وہ ان کے صحابی خاص اور ان کے بعد ان کے خلیفہ ہیں اور میں نے کہا لیکن میں ڈرتا ہوں کہیں قریش انہیں قتل نہ کر دیں۔ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! وہ ان کو ہرگز قتل نہیں کر سکتے۔ وہ نبی آخر الزماں ہیں اللہ تعالیٰ انہیں سب پر غالب فرمائے گا۔ ﷺ

حدیث: حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب یہودی سے جو کہ امہات المومنین میں سے ہیں۔ مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب حضورِ اکرم ﷺ نے قدم رنجہ فرمایا اور قبا میں قیام فرمایا تو میرے باپ حی بن اخطب اور میرے چچا ابو یاسر بن اخطب رات اندھیرے بوقت سحر حضور کے پاس گئے۔ پھر وہ نہ لوٹے۔ یہاں تک کہ شام ہوئی اور رات آ گئی۔ جب وہ گھر آئے تو میں نے دیکھا وہ انتہائی بوجھل، کسل مند اور حد درجہ غم واندوہ میں تھے۔ جس کا میں اندازہ نہیں کر سکتی۔ وہ گھر میں آ کر پڑ گئے۔ میں چونکہ ان کے نزدیک اولاد میں سب سے زیادہ پیاری اور محبوب تھی تو اپنی دیرینہ عادت کے موافق ان کے سامنے آ گئی مگر وہ غم واندوہ کے بوجھ تلے اتنے شکستہ اور محزون تھے کہ انہیں اتنی فرصت وطاقت نہ ہوئی کہ وہ میری طرف التفات کر سکتے۔ اسی حالت کے دوران میرے چچا نے میرے باپ سے پوچھا کیا یہ وہی ہیں؟ کیا یہ شخص وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کی توصیف ہم توریت میں پڑھتے ہیں تو میرے باپ نے میرے چچا سے کہا ہاں یہ وہی ہیں۔ خدا کی قسم! یہ وہی ہیں، چچا نے پھر پوچھا کیا تم یقین سے جانتے ہو کہ وہی ہیں۔ میرے باپ نے کہا خدا کی قسم! یقین سے جانتا ہوں کہ یہ وہی ہیں اس نے کہا اپنے دل میں ان کی نسبت کیا پاتے ہو۔ محبت یا عداوت؟ اس نے کہا عداوت، واللہ جب تک میں زندہ ہوں اس کی عداوت میں برابر کوشاں رہوں گا۔ چنانچہ یہ دونوں حضورِ اکرم ﷺ کی عداوت میں شقی ازلی، اور گرفتار وبال ونکال ابدی ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذالك.

ان یہودیوں میں سے کچھ بدبخت وشقی حیلہ ونفاق کو دنیاوی ذلیل وحقیر مال کے جمع کرنے کا ذریعہ اور دنیاوی فانی زندگی کی حفاظت وصیانت کا وسیلہ بنا کر اسفل السافلین کے درجہ میں اتر گئے۔ اور ان ہی میں کچھ ایسے علماء واحبار بھی تھے جن کے اقبال کی پیشانی پر پہلے ہی سے ازلی رحمت وسعادت کے نقوش روشن تھے۔ انہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی۔ اور دولت آخرت اور سعادت کو جمع کر لیا۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہم۔ مخیریق۔ جو علمائے یہود میں نہایت عالم، تونگر اور بہت دانشمند تھا وہ حضورِ اکرم ﷺ کی صفات کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ اور اس پر قائم تھا۔ روز احد میں اس نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہا ''اے معشر یہود! بخدا تم خوب جانتے

ہو کہ سیّدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی مدد ہم سب پر واجب ہے لہٰذا تم اس سعادت کے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ یہودی کہنے لگے آج روز سبت یعنی ہفتہ کا دن ہے۔ اس نے کہا کوئی ہفتہ نہیں ہے۔ پھر انہوں نے اپنے ہتھیار اٹھائے اور نکل آئے اور ایمان لا کر وصیت کی کہ اگر آج میں مارا جاؤں تو میرا تمام مال ومنال حضورِ اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔ وہ جو چاہیں کریں اور جسے چاہیں عنایت فرمائیں۔

پھر وہ شہید ہو گئے۔ حضور نے ان کا تمام مال قبضے میں لے لیا۔ حضور کا عام صدقہ فرمانا اسی مال میں سے تھا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو تین سو سال سے اور ایک روایت کے مطابق اس سے زیادہ عرصہ سے حضور ﷺ کی بعثت کی خبر سن کر روئے مقصود کو دیکھنے کے منتظر بیٹھے تھے۔ ان کا قصہ مشہور ہے۔

باب پنجم

ذکر فضائل مشترکہ مابین حضور وانبیاء کرام علیہم السلام ودیگر فضائل مختصّہ

حضورِ اکرم ﷺ کے کچھ فضائل تو آپ کے اور تمام انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین کے مابین مشترک ہیں اور کچھ فضائل وکمالات وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور ان میں دنیا وآخرت میں کوئی نبی بھی آپ کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ حق تبارک وتعالیٰ نے جواہر نفوس انسانیہ کو مختلف فرمایا ہے۔ بعض مرتبہ صفا کے انتہائی مقام وجودت وطہارت کے غایت درجہ میں ہیں۔ بعض متوسط ہیں اور بعض انتہائی کدورت اور غایت روایت میں ہیں۔ چنانچہ ہر قسم میں مراتب ودرجات جداگانہ ہیں۔ مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے تمام نفوس قدسیہ سب سے زیادہ صاف وجید ہیں اور ان کے ابدان مبارکہ بھی جملہ نفوس بشری کے مقابلے میں سب سے زیادہ پاکیزہ اور ہر نقص وعیب سے محفوظ ومنزہ ہیں۔ باوجودیکہ یہ انبیاء کرام دائرہ کمال میں داخل اور اپنے غیر سے کامل وافضل ہیں مگر باہم ان کے درمیان بھی تفاوت وتفاضل ہے۔ اور حضور سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ ان سب سے از روئے مزاج اصح واعدل اور اسلم' اور از روئے بدن اطہر ان سب سے ازکی واصفا ہیں۔ اور باعتبار روحانیت سب سے اکمل واتم ہیں۔ اور تخلیق کے لحاظ سے بھی ان سب سے لطیف تر اور اشرف ہیں۔ آپ کے افضل البشر' سید ولد آدم' اور افضل الناس ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ انبیاء کرام کو از قسم کمالات وکرامات جو کچھ حاصل تھا وہ تمام یا اس کے مثل اور ان مخصوص فضائل وکمالات کے ساتھ جو خاص طور پر آپ کو حاصل ہیں دوسرا کوئی نبی آپ کو شریک وسہیم نہیں۔

حضرت آدم اور ہمارے نبی علیہما السلام: حضرت آدم علیہ السلام کو یہ فضیلت عطا فرمائی گئی کہ حق تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور ان میں روح پھونکی گئی لیکن ہمارے نبی حبیب خدا ﷺ کو یہ کمال عطا فرمایا گیا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ آپ کے شرح صدر کا متولی وکارساز ہے۔ اور اس میں ایمان ورحمت رکھا اس طرح حق تعالیٰ آدم علیہ السلام کے خلق وجودی کا متولی ہوا اور ہمارے نبی حبیب خد محمد رسول اللہ ﷺ کے خلق نبوی کا۔ اور آدم علیہ السلام کا سجود ملائک ہونا درحقیقت حضرت آدم کے جوہر روح میں نور محمدی ﷺ کو ودیعت کرنے کے سبب تھا۔ اور اس نور مبارک کو ان کی پیشانی میں تاباں کیا گیا۔ اور اس عظمت وشرافت سے حضور کو سرفراز کیا گیا۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

سجدہ کرنے میں حق تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ شامل نہ تھا۔ کیونکہ بجائے خود حق سبحانہ وتعالیٰ پر یہ جائز نہیں ہے۔ لیکن سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے میں حق تعالیٰ فرشتوں کے ساتھ شامل ہے لامحالہ یہ فضیلت اشرف واتم واکمل واعلیٰ ہے۔ نیز فرشتوں کے سجدہ کرنے میں عظمت وشرافت زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک بار واقع ہوا۔ لیکن صلوٰۃ وسلام بھیجنے میں حق تعالیٰ کے رحمت کے انوار اور اس کے اسرار قدس کا افاضہ ہر زمانے میں نو بہ نو دایم ومستمر ہے اور اس میں مسلمانوں کو بھی اشتراک عمل کا حکم دیا گیا ہے۔

اب رہا حضرت آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے اسماء کا تعلیم فرمانا تو دیلمی' مسند الفردوس میں بروایت ابورافع حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے لیے میری امت کو اس وقت جب کہ وہ پانی ومٹی کے درمیان تھی متمثل کیا گیا۔ اور مجھے ان سب

کے اسماء تعلیم کیے گئے۔ لہٰذا جس طرح آدم علیہ السلام کو تعلیم اسماء ہوا۔ اسی طرح ہمارے حضور کو بھی ہوا۔ اس زیادتی واضافہ کے ساتھ اور ذوات و مسمیات کا علم بھی دیا گیا۔ اور بلاشبہ اسماء سے مسمیات کا رتبہ بہت بلند و اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ اسماء مسمیات کے اظہار و بیان کے لیے ہیں اور مسمیات مقصود بالذات اور اسماء مقصود بالغیر ہے اور یہ کہ علم کی فضیلت' اس کے معلوم کی فضیلت سے ہوتی ہے۔

حضرت ادریس اور ہمارے نبی علیہما السلام: حضرت ادریس علیہ السلام کی فضیلت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا. ہم نے انہیں بلند مقام کی رفعت بخشی۔

اور ہمارے آقا سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کو معراج فرمائی گئی۔ اور آپ کے سوا کسی کو بھی ایسی رفعت نہ ملی۔

حضرت نوح اور ہمارے نبی علیہما السلام: اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ ان کے ذریعہ ایمانداروں کو غرقابی سے نجات ملی اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ آپ کی امت کسی آسمانی عذاب عام سے ہلاک نہیں کی جائے گی۔ جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ. اور نہیں اللہ تعالیٰ کہ انہیں عذاب فرمائے اور درآنحالیکہ آپ ان میں ہوں۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی عزت افزائی فرمائی کہ ان کی کشتی کو پانی میں محفوظ رکھا۔ اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کا اکرام اس سے عظیم تر فرمایا کہ ایک روز حضورِ اکرم ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ عکرمہ بن ابی جہل پانی کے کنارے بیٹھا ہوا ہے۔ عکرمہ نے کہا اگر آپ صادق ہیں تو دوسرے کنارے کے پتھر کو حکم دیجئے کہ وہ پانی پر تیرتا ہوا اس کنارے پر آجائے اور غرق نہ ہو۔ حضور نے ارشاد فرمایا: وہ پتھر اپنی جگہ سے اکھڑا اور تیرتا ہوا حضور کے سامنے آ گیا اور کھڑے ہو کر آپ کی رسالت کی شہادت دی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا اے عکرمہ اب تم خوش ہو۔ اتنا کافی ہے۔ عکرمہ نے کہا اب اسے حکم دیجئے کہ اپنی جگہ واپس چلا جائے۔ حضور نے پھر اشارہ فرمایا اور پتھر پانی پر تیرتا ہوا اپنی جگہ واپس جا کر نصب ہو گیا۔ چنانچہ پتھر کا پانی پر تیرنا اور اس کا غرق نہ ہونا لکڑی کی کشتی کے پانی پر تیرنے اور غرق نہ ہونے سے زیادہ عجیب ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور ہمارے نبی علیہما السلام: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو یہ فضیلت عطا فرمائی کہ نمرود کی آگ ان پر سلامتی کے ساتھ سرد ہو گئی۔ اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ نے کافروں کی آتش جنگ سرد کی۔ جنگ کی آگ میں تلواریں اس کی لکڑیاں اور ایندھن اور اس آگ کی لپٹ موت ہوتی ہے۔ اسے سلگانے والی شے حسد اور اس میں جلنے والی چیزیں روح اور جسم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (یعنی جب بھی کافروں نے جنگ کی آگ بھڑکائی اللہ تعالیٰ نے اسے بجھا دیا) کافروں نے بہت چاہا کہ کفر کی آگ سے دین کے نور کو سرد کریں مگر اللہ تعالیٰ نے جو جبار و قہار بھی ہے ہر بار فرما دیا۔ اور اپنے نور کو مکمل و اتم فرما دیا۔ اور ان کی شرارت کی آگ کو بجھا دیا۔ چنانچہ فرمایا: يَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ یعنی اللہ انکار فرماتا ہے۔ مگر یہ کہ اپنے نور کو مکمل فرمائے اگرچہ کافروں کو برا معلوم ہو۔ اور یہ بھی مذکور ہے شب معراج حضورِ انور ﷺ نے دریائے آتش (کرہ نار) پر سے بہ سلامت گزر فرمایا۔

نسائی روایت کرتے ہیں کہ محمد بن حاطب نے بیان کیا کہ میں بچہ تھا میرے اوپر جوش مارتی ہوئی ہانڈی الٹ گئی جس سے میری تمام کھال جل گئی۔ میرے والد مجھے رسولِ خدا ﷺ کے پاس لے گئے تو آپ نے اپنا لعاب دہن مبارک جلی ہوئی جگہ پر لگایا اور دعا کی اَذْهِبِ الْبَاْسَ رَبَّ النَّاسِ اے انسانوں کے رب اس کی تکلیف دور فرما۔ میں اسی وقت ایسا شفایاب ہوا گویا کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہی نہ تھی۔

مقام خلت ومحبت: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو مقام خلت عطا فرمایا اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کو مقام محبت مرحمت فرمایا۔ مقام محبت، مقام خلت سے عالی تر ہے۔

حبیب اس محبّ کو کہتے ہیں جو مقام محبوبیت تک پہنچا ہوا ہو۔ حضورِ اکرم ﷺ کو شفاعت عام سے خاص فرمانا اور اس مقام میں تکلم کی اجازت دینا آپ کی محبوبیت ہی کے زیرِ اثر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ میں مقام خلت اور مقام محبت دونوں جمع تھے۔ آپ کا مقام خلت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام خلت سے اکمل وافضل ہے۔ یہ بحث باب ہشتم میں ''بیان تخصیص آنحضرت بفضائل آخرت'' کے ضمن میں آئے گی۔

شکست اصنام: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تبر سے بتوں کو توڑنے کی عزت مرحمت فرمائی تو ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ نے ایسے مضبوط ومستحکم بتوں کو جو خانہ کعبہ کی دیواروں میں نصب تھے۔ لکڑی کے اشارہ سے توڑا اور فرمایا: **جَـآءَ الْـحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ** حق آیا اور باطل فرار ہوا۔

تعمیر خانہ کعبہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیل کو تعمیر خانہ کعبہ کی بزرگی سے نوازا تو ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ نے حجر اسود کو اپنے مقام میں نصب فرمایا (جیسا کہ قریش کا جھگڑا چکانے کے سلسلے میں یہ قضیہ مذکور ومشہور ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **اَلْـحَجَرُ الْاَسْوَدُ يَمِيْنُ اللّٰـهِ** یعنی حجر اسود خدا کا داہنا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اسے اس طرح بوسہ دیا جاتا ہے۔ جس طرح کہ عہد وپیمان کے وقت داہنے ہاتھ کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن حجر اسود کی آنکھ اور زبان ہوگی۔ آنکھ سے اپنے زیارت کرنے والوں کو پہچانے گا۔ اور زبان سے ان کی شفاعت کرے گا۔ لہٰذا تعمیر بیت اللہ میں حضورِ انور کا عمل مبارک، فعل ابراہیم علیہ السلام سے قوی تر اور کامل تر ہے۔

حضرت موسیٰ اور ہمارے نبی علیہما السلام: اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ مرحمت فرمایا کہا ان کا عصا اژدھا بن جاتا تھا اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کو اس کی مانند یہ معجزہ مرحمت ہوا کہ: اُستنِ حنانہ (یعنی کھجور کا وہ تنا جس سے حضور ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ جب منبر بنا تو اسے علیحدہ کر دیا گیا) یہ استن حنانہ آپ کے فراق میں فریاد کرتا۔ اور بزبان فصیح روتا تھا۔ جیسا کہ اس کا قصہ معجزات کے باب میں آئے گا۔

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ابوجہل لعین نے ارادہ کیا کہ حضور کو بڑا پتھر مار کر کچل دے۔ (معاذ اللہ) مگر اس نے دیکھا کہ حضور کے دونوں کاندھوں پر دو اژدھے ہیں وہ ڈر کر بھاگ گیا۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور وہ چمک عطا فرمائی جس سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔

اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ سر تا بقدم مجسم نور تھے کہ دیدہ حیرت، آپ کے جمال باکمال سے خیرہ ہو جاتے تھے۔ اگر آپ بشریت کا نقاب نہ پہنے ہوتے تو کسی کے لیے تاب نظر اور آپ کے حسن کا ادراک ممکن نہ ہوتا۔ اور آپ کا جوہر نوری حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عبداللہ تک اصلاب طاہرہ اور ارحام طیبہ میں منتقل ہو کر آتا رہا۔

فائدہ: معجزہ: حضرت قتادہ بن نعمان ؓ، جو کہ صحابہ کرام میں سے ہیں۔ ایک ابرِ باراں کی اندھیری رات انہوں نے نماز عشا۔ حضور ﷺ کے ساتھ گذاری۔ حضور نے ایک کھجور کی ٹہنی ان کے ہاتھ میں دے کر فرمایا اسے لے جاؤ۔ یہ راستہ میں ارد گرد دس دس گز روشنی دیگی۔ جب تم گھر پہنچو گے تو اس میں ایک کالا سانپ دیکھو گے۔ تم اسے مار کر پھینک دینا۔ رواہ ابونعیم۔

معجزہ: صحیح بخاری اور دیگر کتابوں میں مذکور ہے کہ حضرت عباد بن بشر اور اسید بن حضیر ایک اندھیری اور تاریک رات میں حضور ﷺ کی خدمت میں سے نکلے ان دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ راستہ میں ان میں سے ایک کی لاٹھی روشن ہوگئی۔ یہ اس کی

روشنی میں چلتے رہے جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے تو دوسرے کی لاٹھی بھی روشن ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ خود عین نور تھے۔ اور نور آپ کے اسماء شریف میں سے بھی ہے۔

معجزہ: امام بخاری اپنی تاریخ اور امام بیہقی وابونعیم بروایت حمزہ اسلمی نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ جب اندھیری رات میں ہم حضور سے جدا ہوئے تو میری انگلیاں روشن ہوگئیں۔ اور اس کی روشنیاں باہم مل گئیں۔ اور کوئی ایک ہلاک نہ ہوا۔

معجزہ: حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ انور ﷺ نے ایک صحابی کو ان کی قوم کو دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے کسی نشانی کی درخواست کی۔ جو ان کے لیے حجت بنے۔ حضورِ انور نے اپنی انگشت مبارک کو ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان ملا۔ اس جگہ سفیدی اور نور روشن ہوگیا۔ وہ صحابی عرض کرنے لگے مجھے ڈر ہے کہ لوگ اسے برص نہ خیال کرنے لگیں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں آیا ہے۔ بَیْضَاءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ یعنی ایسی روشنی جو بے عیب ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے اس روشنی کو ان کے تازیانے (کوڑے) کی طرف منتقل فرمادیا۔ اب رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا کا پھٹ جانا تو ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کا چاند کے ٹکڑے فرمانا اس سے زیادہ عظیم ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تصرف جہان آب وگل میں ہے اور آپ کا تصرف جہان سما پر ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق وامتیاز واضح ہے۔ روایتوں میں آیا ہے زمین وآسمان کے درمیان ایک دریا ہے۔ جسے ''مکفوف'' کہتے ہیں اور زمین کے دریا اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دریا حضورِ اکرم ﷺ کے لیے پھاڑا گیا۔ اور حضور شب معراج اس میں سے گزرے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلیے دریا پھاڑنے سے زیادہ عظیم ہے۔

قبول دعا: اب رہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیابی جو فرعون کے غرق کرنے کے لیے تھی۔ تو حضورِ انور ﷺ کی دعاؤں کا قبول فرمانا بے حد وبے حساب ہے۔

پانی بہانا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ کہ وہ پتھر سے پانی رواں فرمادیتے اور پتھر سے چشمہ برآمد کرتے تو ہمارے نبی ﷺ نے تو اپنی انگشت ہائے مبارک سے چشمہ جاری فرمادیا۔ پتھر تو زمین ہی کی جنس سے ہے۔ اور اس سے چشمے بہا ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف گوشت پوست سے پانی کا چشمہ جاری کرنا حد درجہ عظیم ہے۔

کلام فرمانا: یہ جو حق تعالیٰ نے ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضلیت میں ارشاد فرمایا: وَکَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے براہ راست کلام فرمایا''۔ تو ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کو یہ فضلیت شب اسریٰ مرحمت فرمائی۔ مزید برآں یہ کہ قرب اور کلام دونوں سے خاص فرمایا نیز یہ کہ حضورِ انور ﷺ کی مقام مناجات 'آسمانوں سے اوپر سدرۃ المنتہیٰ ہے جہاں خلق کے علوم کی حد ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مقام مناجات طور سینا ہے۔ اور حضور ﷺ کی مناجات کی جگہ سمٰوات علیٰ ہے۔

فصاحت وبلاغت: اب رہی یہ بات کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو زبان کی فصاحت دی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اَخِیْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا یعنی میرے بھائی ہارون زبان میں مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔ اور ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کی فصاحت وبلاغت اتنی زیادہ ہے کہ اس سے زائد تو درکنار اس کے برابر کا تصور کرنا بھی ممکن نہیں۔ حضرت ہارون کی فصاحت صرف عبرانی تک محدود تھی۔ لیکن عربی زبان اس سے زیادہ فصیح ہے۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے افصح منی یعنی مجھ سے زیادہ فصیح ہیں۔'' فرمایا مطلقاً نہیں فرمایا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی۔

حضرت یوسف کا حسن وجمال اور ہمارے نبی علیہما السلام: حضرت یوسف علیہ السلام کو نصف حسن دیا گیا اور ہمارے نبی

سیّد عالم ﷺ کو اس کا کل دیا گیا۔ جو بھی آپ کے حلیہ شریف کے سلسلے میں منقولات پر غور وفکر کرے گا وہ آپ کے حسن وجمال کی تفصیلات کو پالے گا۔ کیونکہ آپ جیسا باکمال حسن کسی انسان میں نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن وجمال اور چہرے کی صباحت وتابانی دی گئی تھی لیکن حضور ﷺ کی شکل وصورت مبارک کو ایسے ملاحت وجمال عطا ہوئے جو کہیں اور موجود نہ تھے۔ صلی اللہ علیہ وسلم قدر حسنہ وجمالہ۔

تعبیر خواب: وہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر بتانے اور ان تمام چیزوں کی تاویل جو منقول ومعلوم ہیں عطا کی گئی۔ وہ تین چیزیں ہیں ایک یہ کہ چاند سورج اور ستاروں کا اپنے لیے سجدہ کرتے دیکھنا دوسری یہ کہ قید خانے میں دو ساتھیوں کے خواب کی تعبیر کا واقعہ تیسری یہ کہ بادشاہ کے خواب کی تعبیر وتاویل بتانا مگر ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ کی تعبیرات وتاویلات رؤیا حد شمار سے باہر ہیں۔ جو بھی حدیثوں میں جستجو کرے گا اور روایتوں میں کد وکاوش اور عرق ریزی کرے گا اسے بڑے عجیب وغریب واقعات وحالات ملیں گے۔ جن کا کچھ حصہ اپنی اپنی جگہوں پر ذکر بھی کیا جا چکا ہے اور آگے بھی ہوگا۔

حضرت داؤد اور ہمارے نبی علیہما السلام: حضرت داؤد علیہ السلام کو لوہے کو نرم کر دینے کا معجزہ عطا ہوا کہ (جب آپ لوہے پر ہاتھ پھیرتے تو وہ نرم ہو جاتا۔) اور آپ کے دست مبارک میں خشک لکڑی سبز ہو جاتی اور اس میں پتے نمودار ہو جاتے تو ہمارے نبی سیّد عالم ﷺ نے اُم معبد کی اس بکری پر اپنا دست مبارک پھیرا جو سوکھ کر لاغر وکمزور اور ناتواں ہو گئی تھی۔ آپ کے دست اقدس کی برکت سے اس کے تھن تر وتازہ ہو گئے اور دودھ جاری ہو گیا۔ اور وہ اتنا وافر دودھ دینے لگی جو عام طور پر بکریوں کی عادت کے خلاف تھا۔ اگر داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم ہو جاتا تھا تو ہمارے نبی ﷺ کے لیے سخت پتھر کو نرم کیا گیا۔

حافظ ابونعیم روایت کرتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم ﷺ غار میں داخل ہوئے اور اپنے آپ کو اس میں پنہاں کرنے کا ارادہ فرمایا تو اپنا سر مبارک غار میں پہلے داخل فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کا سر مبارک داخل ہو گیا اور سخت پتھر کشادہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ آپ کے لیے پتھر نرم کیا گیا۔ اور آپ کے بازوئے مبارک نے اس میں اثر کیا۔ اور صخرہ بیت المقدس گندھے ہوئے آٹے کی مانند نرم کیا گیا۔ پھر اس میں اپنی سواری کے جانور کو باندھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں نے تسبیح کی اور حضورِ اکرم ﷺ کے دست مبارک میں پتھروں نے تسبیح کی۔ ﷺ

حضرت سلیمان اور ہمارے نبی علیہما السلام: حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیوں کا علم، شیاطین اور ہوا کی تسخیر اور ایسی حکومت جو آپ کے بعد کسی کو بھی میسر نہ ہوئی عطا کی گئی۔ مگر ہمارے نبی سیّد عالم سلطان کونین ﷺ کو بھی اس کی مانند مع زیادتی واضافہ کے عطا فرمایا گیا۔ اب رہا پرندوں کا بات کرنا تو فرمایا: اُوْتِیْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ (یعنی مجھے پرندوں کی بولیوں کی سمجھ عطا فرمائی گئی) تو حضورِ اکرم ﷺ کے دست اقدس پر پتھروں نے کلام کیا اور تسبیح کی۔ حالانکہ کنکریاں جمادات ہیں۔

تو پرندوں کے بولنے سے پتھر کا بولنا زیادہ نادر وعجیب ہے۔ اور آپ سے بھنی ہوئی زہر آلود بکری اور ہرن نے کلام کیا اور آپ سے دوسرے کی شکایت کی۔ جیسا کہ معجزات کے باب میں آئے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک پرندآیا اور حضور کے سر مبارک کے گرد چکر لگانے لگا۔ اور بات کی۔ آپ نے فرمایا: لوگو! تم میں سے کس نے اس پرند کو اس کے بچہ کو پکڑ کر اذیت پہنچائی ہے۔ اسے لازم ہے کہ اس کے بچے کو واپس لوٹا دے اسی طرح حضور سے بھیڑیئے کے کلام کرنے کا قصہ بھی مشہور ہے۔

اب رہا ہوا کا مسخر ہونا جیسا کہ واقع ہے کہ: غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کا تخت روئے زمین پر جہاں چاہتا لیجاتا لیکن حضورِ اکرم ﷺ کو براق دیا گیا جو ان کی ہوا سے تیز تر بلکہ برق خاطف سے بھی تیز تر تھا۔ وہ حضور کو ایک لمحہ میں

فرش سے عرش پر لے گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کیا گیا تا کہ وہ آپ کو زمین کے کناروں اور گوشوں تک لے جائے اور ہمارے نبی ﷺ کے لیے زمین کو لپیٹا اور کھینچا گیا۔ تا کہ حضور ﷺ اس کے مشارق ومغارب کو ملاحظہ فرمالیں۔ یہ فرق وامتیاز ان دو شخصوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک زمین کی طرف کوشش کے ساتھ دوڑ کر جائے اور دوسرے شخص کی طرف خود زمین کھینچ کر آ جائے۔

اب رہا شیاطین کا مسخر ہونا تو صحیح حدیث میں آیا ہے ایک مرتبہ شیطان حضور ﷺ کی نماز میں سامنے آ گیا۔ تو حق تعالیٰ نے حضور کو اس پر قدرت عطا فرمائی۔ آپ نے چاہا کہ اسے مسجد کے کسی ستون سے باندھ دیں تا کہ گلی کوچے کے بچے اس سے کھیلیں۔ اور یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جنات مسخر کیے گئے تو ہمارے نبی ﷺ پر جنات ایمان لائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات سے خدمت لی' ہمارے نبی ﷺ نے جنات کو مسلمان بنایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکریوں میں جن وانس اور پرندوں کو شامل کر دیا گیا اور حضورِ اکرم ﷺ کے لشکر میں فرشتے یہاں تک کہ جبریل ومیکائیل علیہما السلام کو بھی شامل کیا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں پرندوں کو شامل کر لینے سے زیادہ عجیب غار ثور کے کبوتر کا قصہ ہے کہ جب حضور نے غار ثور میں بوقت ہجرت اقامت فرمائی تو کبوتر نے اس کے دہانہ پر اپنا گھونسلہ بنایا انڈے رکھے اور اعدائے دین سے حضور ﷺ کی نگہداشت کی۔ لشکر کا مقصد تو بچانا اور حمایت کرنا ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ مقصد آسان ترین طریقہ سے حاصل ہو گیا۔

اب رہا یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا فرمائی گئی جو آپ کے بعد کسی کے لائق نہ تھی تو ہمارے نبی ﷺ کو بادشاہ ہونے یا بندہ ہونے کے درمیان اختیار دیا گیا مگر حضور نے بندگی کو اختیار فرمایا یہ ایک ایسا ملک عظیم ہے جس کے زائل ہونے کا خدشہ ہی نہیں اور حضور کے بعد ایسا ملک کسی کو بھی میسر نہ ہوا۔

حضرت عیسیٰ اور ہمارے نبی ﷺ: یہ جو حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو اندھے' کوڑھی کو تندرست کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ دیا گیا تو ہمارے نبی ﷺ کو بھی ایسا ہی معجزہ دیا گیا۔ چنانچہ حضور نے ابوقتادہ کی وہ آنکھ جو باہر نکل پڑی تھی دوبارہ اپنی جگہ لوٹائی تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو گئی۔ مروی ہے کہ حضرت معاذ بن عفرا کی بیوی برص میں مبتلا تھیں وہ حضورِ اکرم ﷺ کی بارگاہ میں اس کی شکایت لائیں حضور نے اپنے ہاتھ کی لکڑی سے برص کے مقام پر ملا۔ حق تعالیٰ نے برص کو دور فرما دیا۔

مواہب لدنیہ میں امام فخر الدین رازی اور بیہقی دلائل النبوۃ میں یہ قصہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں اس وقت ایمان لاؤں گا۔ جب میری مری ہوئی لڑکی کو آپ دوبارہ زندہ فرما دیں گے۔ حضور نے اس کی قبر پر کھڑے ہو کر آواز دی ''اے فلاں'' اسی وقت لڑکی قبر سے نکل کر کہنے لگی ''لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ (آخر حدیث تک) حضورِ اکرم ﷺ کا مردوں کا زندہ فرمانا متعدد مرتبہ واقع ہوا ہے۔ نیز پتھروں اور کنکریوں کا آپ کے دست اقدس پر تسبیح کرنا اور حجر اسود کا آپ کو سلام کرنا اور استن حنانہ کا آپ کے فراق میں گریہ وزاری کرنا مردوں کے کلام سے زیادہ اتم وابلغ ہے۔ رہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا تو ہمارے نبی کو شب معراج میں اس سے کہیں بالاتر مقامات پر لے جایا گیا۔ اور وہاں تک کوئی بھی نہیں لے جایا گیا۔ پھر آپ کو مزید درجات عالیہ سے مخصوص فرمایا گیا۔ مثلاً خلوت قدس میں مناجات کا سننا اور قسم قسم کے مشاہدات وکرامات سے سرفراز ہونا وغیرہ۔ الحاصل تمام انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو جتنے بھی فضائل وکمالات اور معجزات دئے گئے تھے وہ تمام حضورِ انور ﷺ کی ذات ستودہ صفات میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ شعر

خوبی وشکل وشمائل حرکات وسکنات
آنچہ خوباں ہم دارند تو تنہا داری

فضائل ومعجزات مختصہ: **وصل:** مذکورہ بالا فضائل ومعجزات وہ تھے جو حضورِ انور ﷺ اور تمام نبیوں کے درمیان مشترک تھے لیکن دیگر فضائل ومعجزات جنہیں حضور کے خصائص میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ حد وشمار اور حصر سے باہر ہیں۔ لیکن جس قدر ظاہر اور علماء کے قید وضبط میں محصور ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو احکام شرع کے زمرہ میں ہیں' دوم وہ جو صفات واحوال اور معجزات کی قسم سے ہیں۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ پہلی قسم میں کلام کرنا اور اس پر بحث کرنا بے فائدہ ہے۔ کیونکہ وہ ایسا حکم ہے جو گزر چکا۔ مگر درست یہی ہے کہ اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ ان سے آپ کے حال شریف کا علم ہوتا ہے۔ اور بلاشبہ اس کی تحقیق ایک ایسی سعادت ہے جو از قسم کمالات اور سب سے اہم اور اعظم ہے۔ اس کی اقتدا اور اتباع کے لیے ضروری ہے کہ اس کو جانا جائے۔ اس پہلی قسم کی مزید چار قسمیں کی گئی ہیں۔ اوّل وہ جو حضورِ انور ﷺ کے ساتھ بطریق واجبات مخصوص ہیں۔ اور ان میں حکمت یہ ہے کہ قرب ودرجات میں زیادتی ہو اس لیے کہ فرض کے ساتھ قرب پانا نوافل کے ساتھ قرب پالینے سے زیادہ کامل ہے۔ جیسا کہ حدیث مبارک شاہد ہے اور امر مکلفہ کا بوجھ اٹھانا زیادہ قوی اور اس کا اجر بہت بڑا ہے۔ ہم نے ہر قسم کے ساتھ چند مثالیں بیان کی ہیں۔

اور اس مثال کو مکمل طور پر معلوم کرنے کے لیے علماء کرام کی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کا ذکر مواہب لدنیہ میں ہے وغیرہ۔ جیسے کہ ایک قول کے بموجب ضحیٰ کی نماز کا وجوب ہے مگر درست مسئلہ اس کے برخلاف ہے۔ اگرچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اُمِـرْتُ بِرَکْعَتِیْ الضُّحٰی. مجھے ضحیٰ کی نماز کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن تحقیق یہی ہے کہ ضحیٰ کی نماز سنت موکدہ ہے اور امر وجوب کے لیے نہیں ہے۔ اور نماز ضحیٰ سے مراد وہ نماز ہے جو صبح سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد پڑھی جاتی ہے۔ جسے لوگ اشراق کی نماز کہتے ہیں۔ اور صلوٰۃ الضحیٰ چاشت کی نماز کو بھی کہتے ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے کہ: مَـا رَأَیْـتُ رَسُـوْلَ الـلّٰـهِ صَـلَّـی الـلّٰـهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُسَبِّحُ سُبْحَةَ الضُّحٰی اسی نماز پر محمول ہے جس طرح کہ نماز وتر اور فجر کی دو رکعت۔ جیسا کہ حاکم نے مستدرک میں بیان کیا۔

امام احمد وطبرانی کی حدیث میں بھی آیا ہے کہ حضورِ انور ﷺ نے فرمایا: تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں اور تم پر نفل وتر' فجر کی دو رکعتیں اور ضحیٰ کی دو رکعتیں۔ قول باختصاص وتر' امام شافعی کے قول پر ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے نزدیک وتر سب پر واجب ہے جیسا کہ نماز تہجد حضور ﷺ پر فرض تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ نماز تہجد امت پر بھی فرض تھی۔ پھر اس کی فرضیت امت پر سے اٹھالی گئی۔ اور بعض شافعی علما کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ سے بھی اس کی فرضیت اٹھالی گئی۔ اسی طرح مسواک کا حکم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ انور ﷺ ہر نماز کے قریب مسواک کے ساتھ وضو پر مامور تھے۔ اور جب دشواری لاحق ہوئی تو ہر نماز کے لیے مسواک کا حکم دے دیا گیا (یعنی اگر وضو ہو تو وضو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں مگر مسواک ضرور کی جائے مترجم) اور دوسری حدیث میں بھی مسواک کے متعلق حکم آیا ہے۔ ایسی حدیثیں وجوب قطعی پر دلالت نہیں کرتیں۔

دوسری قسم ایسی حرمت میں ہے جو حضورِ انور ﷺ کے خصائص میں سے ہے یعنی وہ احکام جو حضورِ اکرم ﷺ پر تو حرام ہیں مگر دوسروں پر حرام نہیں ہیں۔ جیسے تحریم زکوٰۃ کہ حضور ﷺ پر مال زکوٰۃ حرام ہے۔ اسی طرح تحریم صدقہ۔ برقول صحیح' مشہور' منصوص بقول حضور ﷺ اَنَـا لَا نَـاْکُـلُ الـصَّـدَقَةَ یعنی ہم صدقہ کا مال نہیں کھاتے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان کے کھانے کی ممانعت' حرام ہونے کی بنا پر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کے کھانے کی ممانعت سے حرام ہونا لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ کھانے کی ممانعت' کراہت تنزیہی کی بنا پر ہو بر بنائے حرمت نہ ہو۔ بہرحال اموال صدقہ کے کھانے سے اجتناب' از قبیل ''خصائص'' ہے خواہ یہ ممانعت تحریمی ہو یا تنزیہی۔ اسی طرح حضور ﷺ کی آل اور غلاموں پر تحریم زکوٰۃ ہے۔ جیسا کہ فقہ میں مقرر کیا گیا ہے۔

فائدہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ سے ان کے زمانہ میں اس کی اباحت مروی ہے۔

اسی طرح ان چیزوں کا کھانا جن میں ناگوار بو پائی جاتی ہو۔ جیسے لہسن اور پیاز۔ جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے اسی طرح تحریم کتابت وشعر۔ اور تحریم کا قول اس تقدیر پر ہے کہ آپ کتابت اور شعر کو جانتے ہوں اور تحقیق یہ ہے کہ بحکم طبع وجبلت حضورِ اکرم ﷺ سے دو چیزیں نہیں آئی ہیں۔ اس کی تحقیق صلح حدیبیہ کے قضیہ میں آئے گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔ اسی طرح جنگ کے وقت ہتھیار باندھنے کے بعد پھر جنگ سے پہلے بدن سے ہتھیار اتارنا۔ اسی طرح کتابیہ غیر مسلم عورت سے نکاح کی تحریم اس لیے کہ حضورِ انور ﷺ کی تمام بیویاں مسلمانوں کی مائیں اور جنت میں حضور ﷺ کی ازواج ہیں۔ اسی بنا پر آپ کا نطفہ پاک کافرہ کے رحم میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی طرح امۂ مسلمہ سے تحریم نکاح' لیکن تسری بامہ باتفاق جائز ہے۔ تیسری قسم وہ مباحات جو حضورِ انور ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جیسے کہ نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم تمام نبیوں کے ساتھ عام ہے۔ اسی طرح بعد نماز عصر نماز کی اباحت' اسی طرح وجوب کے باوجود سواری پر وتر کی ادائیگی کا جواز' اسی طرح غائب پر نماز جنازہ (امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ اور شافعی کے نزدیک) ساری امت کے لیے عام ہے۔ اسی طرح صوم وصال' اس کی تحقیق انشاءاللہ روزے کے باب میں آئے گی۔ اسی طرح اجنبیہ عورتوں پر نظر ڈالنے کی اباحت اور جواز خلوت با اجنبیہ' اسی طرح چار سے زائد عورتوں سے نکاح اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کے لیے اور ہمارے نبی ﷺ پر نو سے زیادہ تزوج جائز ہے۔ اسی طرح عورت کی جانب سے جواز نکاح بلفظ ہبہ کہ وہ عورت بغیر ولی اور بغیر گواہوں کے اپنے آپ کو ہبہ کر دے۔ اور مہر طلب نہ کرے۔ لیکن حضورِ انور ﷺ کی جانب سے لفظ نکاح یا تزوج ضروری ہے۔ (مطلب یہ کہ عورت خود کو ہبہ کرے اور عقد و نکاح کا لفظ اور شرائط استعمال کرے تو وہ کر سکتی ہے مگر حضور کے لیے ضروری ہے کہ آپ لفظ نکاح یا عقد ضرور فرمائیں تا کہ اجابت شرعی پائی جائے۔ مترجم) اور حضور کو جائز تھا کہ کسی عورت کا نکاح کسی مرد سے بغیر اس کی اجازت یا بغیر اس کے اولیاء کی اجازت کے کر دیں۔ اسی طرح بغیر عورت کی رضا کے نکاح فرمانا اگر حضور کسی ایسی عورت کو نکاح میں لانے کی خواہش فرمائیں جو شوہر نہ رکھتی ہو تو اس عورت پر لازم ہے کہ اسے قبول کرے۔ ایسی عورت اگر دوسرے لوگ چاہیں تو یہ ان پر حرام ہوگی۔ اور اگر شوہر رکھتی ہے تو شوہر پر فرض ہوگا کہ وہ اسے طلاق دے دے کیونکہ اس جگہ اس کے ایمان کا امتحان ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ نَّفْسِهٖ وَاَهْلِهٖ
وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ

تم میں سے وہ مسلمان نہیں جسے میں اس کی جان' اس کی بیوی' اس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہوں۔

لہٰذا اس شخص پر واجب ہے جو کھانا اور پانی رکھتا ہے اور وہ اس کے صرف کرنے کا ضرورت مند ن ہے مگر جب حضور کو اس کی ضرورت ہو تو وہ آپ پر خرچ کرے۔ اور اپنے آپ کو بھی حضور پر قربان کر دے۔ کیونکہ اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ نبی کریم مسلمانوں کے لیے ان کی جانوں سے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت زید اور سیّدہ زینب کے قصے کا مطلب بھی یہی ہے۔ حاصل اس قصہ کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سیّدہ زینب کا عقد اپنے حضور سیّد عالم ﷺ سے فرمایا اور حضرت زید کے دل میں زینب کی طرف سے کراہت پیدا فرمائی مگر حضورِ انور ﷺ نے ضعیف الایمان لوگوں کی وجہ سے وہ ہلاکت کے بھنور میں نہ پڑ جائیں۔ اس کے اظہار سے خوف کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی ''اے محبوب! تم میرا ہی خوف دل میں رکھو۔ امر الٰہی کی خلاف ورزی نہ کرو۔ لوگوں سے کیا ڈرنا ہے''۔ تب حضورِ انور ﷺ نے ان سے عقد فرمایا اور گھر میں لائے۔ بعض مفسرین اور ارباب سیر اس مقام میں کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ منصب نبوت کے لائق نہیں ہے۔ اور اہل تحقیق اسے مفسرین کی لغزشوں میں شمار کرتے ہیں۔

اسی طرح یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی زلیخا اور حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریاء کی بیوی کے قصے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام

کا مقام اس سے اعلیٰ ہے۔ عتق یعنی آزادی کو مہر کا قائم مقام گردانا جیسا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے لیے فرمایا۔ اور حضور پر بیویوں کے نان ونفقہ کے واجب ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ صحیح تر یہی ہے کہ واجب ہے اسی طرح یہ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ پر اپنی بیویوں کے درمیان باری کی رعایت واجب نہیں تھی۔ اکثر علماء احناف بھی اسی طرف ہیں۔ حضور نے جو کچھ برتاؤ فرمایا وہ برطریق تفضّل واحسان تھا نہ کہ بر بنائے وجوب۔

علماء بیان کرتے ہیں کہ ان تمام خصائص کے جمع کرنے کی وجہ یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ کے حق میں نکاح تسری کے حکم میں ہیں اور تمام عورتیں اور مرد آپ کے لیے غلام اور باندی کے حکم میں ہیں۔ اور حضورِ اکرم ﷺ پر مالِ غنیمت میں سے باندیاں' تلواریں وغیرہ جتنا چاہیں لینا مباح تھا۔ اور حضورِ اکرم ﷺ کے لیے مکہ میں قتال کرنا اور بغیر احرام کے داخل ہونا مباح تھا۔ اس کی تحقیق وتفصیل انشاء اللہ فتح مکہ کے باب میں آئے گی۔

آپ کے خصائص میں سے یہ بھی تھا کہ آپ اپنے علم سے اپنے لیے' اپنی اولاد کے لیے حکم دیتے اور اپنی گواہی اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے استعمال فرماتے تھے اور آپ کا کسی کو برا کہنا یا لعنت کرنا' قربت ورحمت اور مباح تھا۔ اور یہ حضور ﷺ کی خصوصیت تھی کہ فتح سے پہلے آراضی کو تقسیم فرماتے اس لیے کہ مالک الملک حق تعالیٰ نے آپ کو تمام آراضی اور ممالک کا مالک بنایا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ جب جنت کی زمینوں کو تقسیم فرماتے ہیں تو دنیاوی زمین تو بطریق اولیٰ تقسیم فرمانی چاہیے۔

ع مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں

خصائص صفات واحوال: وصل: حضورِ اکرم ﷺ کے وہ خصائص جو احکام کے قبیل سے نہیں بلکہ صفات واحوال کے قبیل سے ہیں۔ ان کا کوئی حد وحساب نہیں۔ خصوصاً وہ صفات واحوال جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں کسی کا علم بھی ان کی کنہ تک نہیں پہنچا۔ ان میں سے چند ظاہری صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ علماء نے ان کا احصار کر کے شمار کیا اور انہیں بیان کیا ہے اور تمام معجزات اسی قبیل سے ہیں کہ ایسے کسی نبی سے ظاہر نہ ہوئے لیکن ان کو ان کی عظمت وکثرت کی بنا پر مستقلاً جداگانہ باب میں رکھا۔

حضورِ اکرم ﷺ کی سب سے اعلیٰ واکمل فضیلت یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے آپ کی روح پر انور کو ساری مخلوق کی ارواح سے پہلے پیدا فرما کر تمام مکونات کی روحوں کو آپ کی روح سے تخلیق فرمایا۔ اور آپ اس وقت بھی نبی تھے جب حضرت آدم علیہ السلام ہنوز روح وجسد کے درمیان تھے جیسا کہ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور عالم ارواح میں بھی انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقدسہ کو آپ کی روح پر انوار نے مستفیض فرمایا۔

جب تک حضور ﷺ کی روح کا آفتاب پردہ غیب میں رہا انبیاء علیہم السلام کے ستار ہائے درخشاں آپ کے نور سے منور ہو کر عالم ظہور میں جگمگاتے رہے۔ جب آپ کی نبوت کے آفتاب نے طلوع وظہور فرمایا۔ تو وہ روپوش اور مخفی ہو گئے۔ بعینہ اسی طرح جیسے رات میں ستاروں کا رنگ وروپ چمکتا دمکتا ہے اور جب سورج چمکتا دمکتا ہے اور یہ سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ ماند پڑ کر روپوش ہو جاتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت فرمایا ہے کہ حضورِ انور ﷺ نے ارشاد فرمایا: عالم آفرینش میں میں سارے نبیوں سے پہلے اور عالم ظہور وبعثت میں ان سب سے آخر میں ہوں۔ آپ کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ ہی وہ اول ہیں جس نے روز الست میثاق لیا اور آپ ہی وہ اول ہیں جس نے اس روز سب سے پہلے "بلیٰ" (ہاں) کہا جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے۔ اور انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آدم وعالم اور آفرینش عالم کا مقصود اصلی' آپ ہی کا وجود گرامی ہے۔ آپ کا نام نامی اسم گرامی عرش پر جنت کے دروازوں پر اور اس کی ہر جگہ پر لکھا گیا۔ انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ تمام نبیوں سے اس کا عہد لیا گیا کہ جب آپ مبعوث ہوں تو

وہ آپ پر ایمان لائیں۔ یہ عہد پاک اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے کہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ. (اور یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا کہ) جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ گذشتہ تمام آسمانی کتابوں میں آپ کے وجود گرامی کی خبریں اور آپ کی بشارتیں واقع ہیں۔ یہ کہ آپ کے نسب مبارک میں آدم علیہ السلام تک آپ کے سبب کبھی بھی سفاح یعنی زنا واقع نہیں ہوا۔ جیسا کہ عہد جاہلیت میں عادت تھی اس کا ذکر باب ولادت میں انشاء اللہ آئے گا۔

اور یہ کہ ہر زمانے میں بنی آدم کے بہترین قرن میں اٹھایا گیا اور بہترین قبائل کے بہتروں میں منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو سرفرازی بخشی بنی کنانہ سے قریش کو قریش سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم کو سے مجھے برگزیدہ فرمایا۔ لہٰذا حضور سرفرازوں میں سرفراز اور بہتروں میں بہترین اور برگزیدگان میں برگزیدہ تر ہیں۔ بوقت ولادت مبارکہ تمام بت سرنگوں ہو کر گر پڑے۔ شکم مادر سے ختنہ شدہ غیر آلودہ اور پاک اور ناف بریدہ تولد ہوئے۔ پیدا ہوتے ہی سجدہ کیا اس طرح کہ بجانب آسمان نظر بلند تھی۔ اور انگشت شہادت اٹھی ہوئی تھی۔ آپ کی والدہ سیّدہ آمنہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نے جلوہ فرمایا جس سے شام کے تمام قصور اور محلات روشن ہو گئے۔ آپ کے جھولے کو فرشتوں نے جھلایا۔ اور مہد میں آپ نے کلام فرمایا۔ اہل سیر لکھتے ہیں کہ مہد میں چاند آپ سے باتیں کرتا۔ اور جدھر اشارہ فرماتے جھک جاتا تھا۔ انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کے لیے دھوپ میں بادل سایہ کرتے تھے۔ ایسا ہمیشہ نہ تھا بلکہ متعدد اوقات میں ایسا ہوا۔ زمانہ طفلی میں جب کہ آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفر میں تھے بحیرا راہب نے آپ کو پہچانا۔ انہی خصائص میں سے آپ کا شق صدر ہے۔ اس کا وقوع چار مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی مرتبہ بچپن میں جبکہ آپ بنی سعد میں تھے۔ دوسری مرتبہ دسویں سال میں تیسری مرتبہ بعثت کے وقت چوتھی مرتبہ شب معراج میں اور انہی خصائص میں سے آپ کی خدمت ابتدائے وحی کے وقت جبریل کا آکر لپٹانا اور آپ کے وجود شریف میں تصرف کرنا ہے۔ اسے بھی علماء نے خصائص میں شمار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کسی نبی کے ساتھ ایسا نہ ہوا انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ نے ہر عضو مبارک کا قرآن پاک میں ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ کے قلب اطہر کا ذکر اس ارشاد میں ہے کہ: تَنَزَّلُ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ جبریل امین آپ کے قلب اطہر پر اسے لے کر اترتے ہیں' اور آپ کی زبان مبارک کا ذکر اور ارشادات میں ہے کہ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ یقیناً ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان فرمایا اور فرمایا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اپنی خواہش سے زبان گویا نہیں ہوتی۔'' چشم مبارک کا ذکر مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى. آنکھ نہ تو جھپکی نہ بے راہ ہوئی۔ چہرہ مبارک کا ذکر قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ بے شک ہم نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بار بار دیکھا اور گردن اور دستِ مبارک کا ذکر وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ. اور نہیں کیا آپ کے ہاتھوں کو بندھا ہوا آپ کی گردن کی طرف اور سینہ اور پشت مبارک کا ذکر اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِىْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ کیا ہم نے تمہارا سینہ کشادہ نہ کیا۔ اور تم سے تمہارا بوجھ اتار لیا۔ جس نے تمہاری پیٹھ توڑی تھی۔'' ان آیات کریمہ میں حضورِ انور ﷺ کے ہر ہر عضو کا ذکر فرمانا۔ آپ پر کمال محبت اور عنایت حق جل وعلیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے اسم صفت ''محمود'' سے آپ کا اسم مبارک احمد' محمد ﷺ نکالا۔ آپ سے پہلے یہ نام کسی اور کے نہیں رکھے گئے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ' حضور ﷺ کی نعت و مدح میں فرماتے ہیں شعر

وَشَقَّ لَهٗ مِنْ اِسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ

بعض کہتے ہیں کہ یہ شعر حضرت ابو طالب کا ہے جیسا کہ بخاری نے ''تاریخ صغیر'' میں ذکر کیا۔ انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو بہشتی کھانا پینا کھلایا اور پلایا ہے۔ اس کا ذکر صوم وصال میں آئے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) اور یہ کہ انہی خصائص میں

سے یہ بھی ہے کہ حضورِ انور ﷺ کی پشت کی طرف بھی ایسا ہی دیکھتے تھے جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے۔ اور رات کی تاریکی میں بھی ایسا ہی ملاحظہ فرماتے جیسا دن کی روشنی میں ملاحظہ فرماتے۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جب آپ پتھر پر چلتے تو آپ کے دونوں قدم مبارک پتھر میں نقش ہو جاتے۔ جس طرح کہ مقام ابراہیم علیہ السلام میں ہے۔ قرآن میں قطعی طور پر اس کا ذکر ہے اور آپ کی دونوں کہنیوں کا نشان مکہ کے پتھر میں مشہور ہے۔ آپ کے گھوڑے کے سموں کا نشان مدینہ طیبہ میں بنی معاویہ کی مسجد میں واقع ہے۔ آپ کا لعاب کھاری پانی کو شیریں بناتا۔ اور شیر خوار بچے کو دودھ سے بے نیاز کرتا۔ (بیماروں کو شفا دیتا اور زخمیوں کے زخموں کو بھرتا تھا از مترجم) آپ کے بغلوں کا رنگ سفید و سرخ تھا۔ جن میں بال نہ تھے۔ اور نہ جسم اطہر کے رنگ سے مختلف تھا۔ ان میں بو بھی نہ تھی۔ حدیث استسقاء میں مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اتنے اٹھائے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی گئی۔ بعض کہتے ہیں کہ بغلوں کی سفیدی سے یہ لازم نہیں آتا ہے وہاں بال نہ ہوں۔ اس لیے کہ جہاں سے بال اکھیڑ لیے جاتے ہیں وہ جگہ سفید ہو جاتی ہے۔ اور یہ تحقیق سے ثابت ہے کہ حضور بغلوں کے بالوں کو اکھاڑا کرتے تھے۔ اور بعض حدیثوں میں آیا ہے عبداللہ بن اقرم خزاعی کہتے ہیں کہ میں نے حضورِ انور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب حضور سجدہ فرمار ہے تھے تو میری نظر آپ کے بغلوں پر پڑی۔ حدیث میں لفظ غفرۃ البطین آیا ہے۔ کہتے ہیں کہ غفرہ خالص سفیدی کو نہیں بلکہ مٹیالے رنگ کو بولتے ہیں۔ یہ اس کی دلالت کرتا ہے کہ اس جگہ بالوں کے نشانات موجود تھے۔ اسی کو اغفر کہتے ہیں ورنہ بالوں سے خالی جگہ کو اغفر نہیں کہتے ہیں۔ مواہب لدنیہ میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا ہے ہاں اس جگہ یہ اعتقاد ضرور رکھنا چاہیے کہ حضورِ انور ﷺ کی یہ شان ہے کہ آپ کی بغلوں میں ناگوار بو نہ تھی۔ بلکہ پاکیزہ اور طیب خوشبو تھی۔ جیسا کہ بخاری میں ثابت شدہ امر ہے۔

آپ کی آواز مبارک اتنی دور تک سنائی دیتی تھی جہاں تک آپ کے سوا کسی کی آواز نہیں پہنچ سکتی اور یہ کہ آپ کی آنکھیں تو سوتی تھی لیکن دل نہ سوتا تھا۔ (رواہ البخاری) اور جو بھی آپ کے پاس بات کرتا اس کی بات سنتے تھے۔ یہی اس مسئلہ کی بنیاد ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا وضو آپ کی نیند سے نہ ٹوٹتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ نیند سے وضو نہ ٹوٹنے کا حکم تمام انبیاء علیہم السلام کے حق میں ہے۔ اس جگہ یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پھر ''لیلۃ التعریس'' میں حضور نے آفتاب کے طلوع ہو جانے کو کیوں نہ جان لیا جس سے نماز فجر قضا ہو گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ طلوع و غروب کا جاننا آنکھوں کا کام ہے اور جب آنکھ نیند میں تھی تو نہ جانا گیا۔ اور دل میں وحی اس حکمت کی بنا پر نہ کی گئی کہ نماز قضا ہونے کی صورت مشروعیت آجائے یا کوئی ایسی وجہ جس سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے۔

اور کہ یہ حضورِ انور ﷺ نے کبھی بھی انگڑائی نہ لی' اسے ابن ابی شیبہ اور بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کیا۔ کبھی بھی جماہی نہ لینے کی روایت بھی ہے۔ چونکہ کسی نبی نے انگڑائی نہیں لی اس لیے یہ روایت خصوصیات میں سے نہیں ہے۔ اسکی تائید وہ روایت کرتی ہے جو صحیح بخاری میں ہے کہ جماہی شیطان سے ہے۔ حضورِ انور کے جسم اطہر پر کبھی مکھی نہ بیٹھی اور نہ آپ کے کپڑوں میں جوں پڑی۔ حضور کو کبھی احتلام نہ ہوا۔ اور نہ کسی اور نبی کو۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ منقول ہے کہ احتلام بھی شیطان سے ہے۔ اور بعض علماء نے انزال کو جائز رکھا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ مادہ منویہ کے غلبہ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو نہ کہ شیطانی خواب سے۔ کسی دوسرے مقام میں اس کی تحقیق کی گئی ہے۔

آپ کے سینہ مبارک کی خوشبو' مشک نافہ سے زیادہ تھی۔ اور یہ کہ زمین پر حضور کا سایہ نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ محل کثافت و نجاست ہے۔ اور سورج کی روشنی میں کبھی بھی آپ کا سایہ نہ دیکھا گیا۔ علماء کی یہ عبارت بڑی ہی عجیب و غریب اور نادر ہے کہ انہوں نے چراغ کی روشن کا ذکر نہ کیا۔ اور حدیث طویل میں اس دعا کا پڑھنا جو بعد نمازِ شب آپ پڑھتے تھے مروی ہے کہ اسے بعض مشائخ کرام فجر کی

سنت وفرض کے درمیان پڑھتے ہیں۔ اس دعا میں حضور مناجات کرتے کہ اے خدا تمام اعضاء اور ہر جانب نور بخش دے۔ اور اس کے آخر میں یہ ہے کہ واجعلنی نورا (اور مجھے سراپا نور بنادے) چونکہ حضورِ انور عین نور ہیں تو نور کا سایہ نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ جب آپ طویل القامت لوگوں کے درمیان چلتے تو آپ ان میں سب سے درازتر معلوم ہوتے اور یہ کہ آپ کے کپڑوں پر کبھی مکھی نہ بیٹھتی جیسا کہ فخر الدین رازی نے بیان کی۔ لامحالہ بطریق اولیٰ آپ کے جسم اطہر پر بھی نہ بیٹھتی ہوگی۔ اور یہ کہ مچھر و پسو نے نہ کاٹا نہ خون چوسا اور کھٹمل آپ کو گزند نہ پہنچاتے تھے۔ یہ ہیں علمائے کرام کی عبارتیں' اس سے مراد جوں وغیرہ کا نہ ہونا ہے۔ اور یہ جو بعض روایتوں میں آیا ہے کہ كَانَ يُفْلِىْ ثَوْبَهٗ آپ اپنے کپڑوں میں جوں دیکھا کرتے تھے تو اس سے جوں کا دیکھنا مراد نہیں ہے (بلکہ امت کی تعلیم مقصود ہے۔ تاکہ امت اس پر عمل کر کے اجر و ثواب کی مستحق بنے۔ مترجم) اور آپ کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت سے کاہنوں اور شیاطین کا آسمان سے چوری چھپے خبریں سننے کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اور آسمان کی حفاظت کی گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شیاطین آسمانوں سے پوشیدہ اور چھپے ہوئے نہ تھے۔ وہ آسمانوں میں گھس کر وہاں سے چوری چھپے کچھ باتیں اور خبریں لے آیا کرتے تھے۔ اور وہ ان کاہنوں کے کانوں میں پھونکتے تھے جن کی روحیں شیاطین کی خبیث روحوں کی مانند خبیث تھیں۔ اور ان کا ان سے روحانی تعلق تھا۔ کاہن لوگ ان سے خبریں حاصل کر کے ان میں اپنی طرف سے کذب و افتراء ملا کر سناتے تھے۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کو ارواح طیبہ یعنی فرشتوں سے مناسبت تھی۔ اسی مناسبت سے وہ وحی اور سچی و صادق خبروں کے مورد اور مقام نزول و ورود ہوتے تھے۔ اور جب حضور سیّد السادات فخر موجودات محمد رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تو شیاطین کو آسمان پر چڑھنے اور داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی ولادت کی برکت سے انہیں تمام آسمانوں سے روک دیا گیا۔ جب بھی کوئی شیطان آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو آگ کی چنگاریوں یعنی شہاب سے انہیں مارا جاتا ہے۔ یہ شہاب کبھی خطا نہیں جاتا۔ کسی کو جلا ڈالتا ہے اور کسی کا چہرہ جھلسا دیتا ہے۔ اور کسی کے اعضا کو تباہ اور ناکارہ بنا دیتا ہے اور ان کی عقلیں فاسد اور خراب ہو جاتی ہیں۔

فائدہ: یہ جو شیاطین کے غول' جنگلوں میں لوگوں کو راستے سے بھٹکاتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کے زمانہ بعثت سے پہلے ایسا نہ ہوتا تھا اور نہ کسی نے آپ کے زمانہ بعثت سے قبل اس کا ذکر کیا ہے۔ حضور کے ابتدائی امر عہد میں ایسا رونما ہوا۔ یہ آپ کی نبوت کی اساس اور بنیاد کا مرکز تھی۔ حضرت معمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے زہری سے پوچھا کہ کیا زمانۂ جاہلیت میں بھی ستارے یعنی شہاب گرا کرتے تھے۔ انہوں نے کہا: ہاں! لیکن اس میں شدت اور زیادتی اسوقت سے ہوئی جب سے حضورِ انور ﷺ نے بعثت فرمائی۔ لیکن ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ شیاطین کو آگ کے شعلوں یعنی شہاب سے حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی مارا جاتا تھا لیکن آپ کی بعثت کے بعد اس میں شدت و زیادتی ہوگئی۔ اور آسمان کی حفاظت سخت کر دی گئی۔ بعض کہتے ہیں کہ ستارے گرتے تھے اور شیاطین کو ان سے مارا جاتا تھا۔ لیکن اپنی جگہ وہ پھر لوٹ آتے تھے۔ اسے امام بغوی نے بیان کیا ہے انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ انور ﷺ کے لیے شب اسریٰ میں زین و لگام کے ساتھ براق لایا گیا۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ اس پر دوسرے انبیاء کرام برہنہ پشت سوار ہوئے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انبیاء کے لیے بھی براق تھا۔ روایتوں میں ایسا ہی آیا ہے کہ۔ لیکن کیا یہی براق تھا جو حضورِ انور ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ یا ہر ایک نبی کے لیے جداگانہ براق تھا جو ان کے شان اور مرتبہ کے اندازہ پر تھا۔ وہ حدیث جو معراج میں آئی ہے کہ "جب براق نے شوخ و سرکشی کی تو جبریل نے براق سے کہا آرام سے رہ' کوئی تجھ پر حضور ﷺ کی مانند سوار نہیں ہوا۔" بظاہر اس سے پہلے قول کی ہی دلالت ہوتی ہے۔ (واللہ اعلم) اور یہ کہ راتوں رات حضور کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جایا گیا۔ اور وہاں سے مقام اعلیٰ تک" اور آیات

کبریٰ''، یعنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائی گئی اور نظر مبارک کو ماسویٰ سے بچایا گیا۔ حتیٰ کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی. (نہ آنکھ جھپکی اور اور نہ بے راہ ہوئی۔) آپ کے لیے تمام انبیاء حاضر کیے گئے اور آپ نے ان کی اور فرشتوں کی امامت فرمائی۔ آپ کو بہشت کی سیر کرائی گئی اور دوزخ کا معائنہ کرایا گیا اور اس مقام تک لے جایا گیا جہاں تک کسی کا علم نہ پہنچ سکا۔ اور بچشم سر پرودگار عالم کی دید کی۔ اور حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کے لیے کلام ورویت جمع فرمائے۔ اور آپ کو اس عالم میں اپنے جمال کی رویت سے مشرف فرمایا۔ اور کسی فرشتے اور نبی وولی کو یہ فضلیت میسر نہ ہوئی۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جس جگہ حضور ﷺ سیر فرماتے تھے اور چہل قدمی کرتے فرشتے آپ کی پشت مبارک کے پیچھے چلتے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرام سے فرماتے تم آگے چلو اور میری پشت فرشتوں کے لیے چھوڑ دو۔ اور یہ کہ فرشتے حضور ﷺ کی معیت میں قتال کرتے جیسا کہ غزوۂ بدر اور حنین میں واقع ہوا۔ اور اس پر قرآن کریم ناطق ہے۔ انہی خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کو کتاب عزیز دی گئی۔ حالانکہ آپ اُمی تھے نہ کسی سے کچھ پڑھا لکھا اور نہ کسی مدرسے میں گئے اور نہ کسی اہل علم کی مجلس میں حاضری دی۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ امیت آپ کی ذات مقدسہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ آپ حضرت الوہیت کے مظہر خاص ہیں اور آپ کسی سبب اور ذریعہ کے محتاج نہیں۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کی کتاب مبارک کو تبدیل وتحریف سے محفوظ کیا گیا باوجودیکہ بکثرت ملحدوں، زندیقوں اور معطلہ وقرامطہ نے تغیر وتبدیلی کی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور نہ اس کے کسی کلمہ اور حروف میں تغیر اور اشتباہ پیدا کر سکے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَامِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍo

کوئی باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکمت والے سراہے کا نازل کردہ ہے۔

یہ کتاب عزیز ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن پر گذشتہ تمام کتب ربانی تھیں۔ یہ کتاب، ازمنہ سابقہ کی خبروں وگذشتہ امتوں کی حالتوں اور ان کے ان احکام وشرائع کا جامع ہے جن کا آج نام ونشان نہیں اور اہل کتاب میں سے صرف ایک دو ہی ایسے ہیں جنہوں نے پڑھنے پڑھانے میں ساری عمریں ختم کر کے ان کا تھوڑا بہت حال جانا ہو۔ بایں ہمہ اس کتاب کا ایجاز اور اختصار اور اس کی مکمل تعریف اور توصیف معجزات کے باب میں آئے گی انشاء اللہ۔ اور اس کتاب کو ہر اس امتی پر جو خواہش کرے اس کا حفظ کرنا آسان کر دیا گیا۔ اور دوسری امتوں میں سے کوئی بھی اپنی کتاب کو حفظ نہیں کر سکا۔ چہ جائے کہ جم غفیر یاد کرے۔ سالہا سال اور صدیاں گزر جانے کے باوجود بچوں اور جوانوں کے لیے قرآن آج بھی آسان وسہل ہے کہ تھوڑی مدت میں حفظ کر لیتے ہیں۔ اور سہل وآسانی، شرافت وشفقت اور عزت افزائی کے لیے ''سات حرفوں'' پر اسے نازل کیا گیا۔ اس ''سات حرفوں'' کی تحقیق مشکوٰۃ شریف میں شرح کی گئی ہے۔ قرآن ہمیشہ وباقی رہنے والا معجزہ اور نشانی ہے۔ یہ تا ابد رہے گا۔ جنتی اسے جنت میں پڑھیں گے۔ اور اس کے ذریعہ ترقی درجات کریں گے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے رَتِّلْ وَارْتَقِ یعنی تلاوت کریں گے اور ترقی درجات پائیں گے تمام نبیوں کے معجزے ختم ہو گئے اور ان میں سے بجز خبر کے کوئی معجزہ باقی نہ رہا۔ مگر قرآن ایسا معجزہ ہے کہ اس کی حفاظت ونگہبانی کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ.

ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔

اور توریت وانجیل کی حفاظت کو انبیاء واحبار پر چھوڑا گیا لامحالہ تحریف وتبدیلی نے اس میں راہ پائی۔ چونکہ حق تعالیٰ نے چاہا کہ قرآن محفوظ رہے۔ اس لیے صحابہ کرام کو اس پر مقرر فرما دیا۔ تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ جب خدا اس کا محافظ تھا تو صحیفوں میں اسے جمع کرنے کی کیا حاجت تھی۔ بعض شوافع کہتے ہیں کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کا ہر سورت کے جزو ہونے پر اس جگہ دلیل قوی ہے۔ کیونکہ

قرآن کریم میں اسے ثابت و برقرار رکھا گیا ہے ورنہ زیادتی لازم آتی ہے پھر کمی کا گمان بھی ہوسکتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بسم اللہ کا ہر سورۃ کے شروع میں لکھنا باجماع صحابہ ہے اور بسم اللہ سورتوں کے فصل کے لیے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ بعض متاخرین علماء سورتوں کے اسماء اور آیتوں کے شمار کو جائز رکھتے ہیں۔ اور تغیر میں داخل نہیں ہے۔ جس سے شبہ لاحق ہوسکے۔ اور قرآن کریم کو اس کی حفاظت کے لیے لوگوں کے کلام سے بالکل مختلف و معجز بیان کیا گیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ذرا بھی کمی و بیشی کرتا ہے تو اس کا نظر و اسلوب بدل جاتا ہے۔ او ہر ایک جان لیتا ہے کہ یہ کلمہ قرآن کا نہیں ہے۔ اور لوگوں کو اس کا حفظ کرنا بھی اس کے اسباب حفاظت میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی بڑے دبدبہ والا بزرگ بھی ایک حرف یا ایک نقطہ کی کمی بیشی بھی کرتا ہے تو چھوٹے سے لے کر جوان تک اس کی غلطی اور تبدیلی کو پکڑ لیتا ہے۔ اور یہ کہ حق تعالیٰ نے حضورِ انور ﷺ کو سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی اور آمن الرسول یعنی سورۂ بقر کی آخری آیتوں سے مخصوص فرمایا کہ یہ عرش کے نیچے خزانوں میں سے ہیں۔ اور کسی نبی کو ان کی مثل آیتیں نہیں دی گئیں۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو خزانوں کی کنجیاں عطا فرمائی گئیں۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ ملک فارس و روم کے خزانے صحابہ کرام کے قبضہ میں آئے۔ اور اس کا باطن یہ ہے کہ خزائن سے مراد اجناس عالم ہیں کیونکہ تمام رزق آپ کے دست اقتدار کے سپرد فرمایا اور ظاہر و باطن کی تربیت و قوت آپ کو مرحمت ہوئی۔ جس طرح غیب کی کنجیاں در دستِ علم الٰہی ہیں۔ اس کے سوا ذاتی علم غیب کوئی نہیں جانتا۔

اسی طرح ان کے رزق و قسمت کے خزانے حضورِ اکرم ﷺ کے دست مبارک میں عطا فرمائے۔ سیّد عالم ﷺ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَالْمُعْطِیْ هُوَ اللّٰهُ یعنی میں ہی تقسیم فرمانے والا ہوں اور وہی اللہ عطا فرمانے والا ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ اور آپ رسول الثقلین ہیں۔ اور اجنہ اور رانسان کی جانب مبعوث ہیں۔ اور بعض ملائکہ کی جانب بھی اور بعض تمام اجزائے عالم کی جانب بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ وہ آپ کی رسالت کی شہادت دیتے اور شجر و حجر آپ پر سلام عرض کرتے ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کے تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہونے پر حضرت نوح علیہ السلام سے یہ اشکال لاتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد صرف وہی ایماندار لوگ باقی رہ گئے تھے جو آپ کی کشتی پر سوار تھے۔ ان کے سوا روئے زمین پر کوئی شخص باقی نہ رہا تھا۔ تو ان کی بعثت تمام لوگوں کے لیے ہے؟ اس کے جواب میں شیخ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ عمومی رسالت' ان کی بعثت میں نہ تھی۔ بلکہ اس کا اتفاق اس حادثہ کی بنا پر پڑ گیا جو طوفان سے واقع ہوا۔ اور لوگ ایمانداروں کی جماعت میں منحصر ہوکر رہ گئے لیکن ہمارے نبی ﷺ کے رسالت کی عمومیت' اصل بعث اور اس کی ابتدا میں ہی تھی۔

بندہ مسکین یعنی شیخ محقق صاحب مدارج النبوۃ ثبتہ اللہ علی الطریق الحق والیقین ورحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضورِ انور ﷺ کا کافہ خلق کی طرف مبعوث ہونے کی عمومیت سے مقصود تمام عالم کا شرق سے غرب تک عرب اور عجم کا اس رسالت میں شامل ہونا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی خاص طور پر اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا رہا ہے مگر میری بعثت ہر احمر و اسود (کالے گورے) یعنی عرب و عجم کے لیے ہے۔ احمر سے مراد عجم اور اسود سے عرب مراد ہے۔ کیونکہ عرب رنگ میں سیاہی و سبزی مائل ہوتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں صاف طور پر اِنَّـا اَرْسَلْنَـا نُوْحًـا اِلٰی قَوْمِهٖ. بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنایا۔ واقع ہے۔ نیز جماعت قلیلہ کو کافہ ناس نہیں کہا جاسکتا۔ اگرچہ حادثہ کے پیش آنے کی وجہ سے صرف اتنے ہی باقی رہے ہوں۔ گویا حضرت شیخ ابن حجر مکی کے جواب کا مفہوم و مطلب یہی ہے۔ اور یہ بھی اشکال لایا گیا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تمام اہل زمین پر ہلاکت کی بدعا فرمائی۔ اور ایمان داروں کے سوا جو آپ کی کشتی میں تھے۔ آپ کی بدعا سے سب ہلاک ہوگئے۔ اگر آپ ان

کی طرف مبعوث نہ ہوتے تو وہ سب کیوں ہلاک کیے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا نہیں ہیں ہم عذاب کرنے والے جب تک کہ ہم رسول نہ بھیجیں اور بلاشبہ حدیث شفاعت میں آیا ہے کہ وہ پہلے رسول تھے تو اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت توحید ان لوگوں کو پہنچ گئی ہو۔ کیونکہ آپ کی عمر شریف اس جہان میں بہت طویل (یعنی طوفان سے قبل ساڑھے نو سو برس تھی)۔ اور حضرت نوح کی امت نے شرک پر سرکشی کی ہو جس وہ سے عذاب کے مستحق بن گئے ہوں۔ چنانچہ شیخ ابن وقیق العید فرماتے ہیں کہ بعض نبیوں میں توحید عام ہو۔ اور شریعت کے احکام فروعی عام نہ ہوں۔ اس لیے کہ بعض نبیوں نے اپنی قوم سے شرک پر قتال کیا جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے حضرت نوح علیہ السلام کی موجودگی کے دوران ان کے سوا کوئی اور نبی بھی مبعوث ہوا ہو اور حضرت نوح کو معلوم ہو گیا ہو کہ لوگ ان پر ایمان نہیں لائے۔ اس بنا پر آپ نے ہر اس شخص پر بدعا فرمائی جو ایمان نہیں لایا۔ خواہ اپنی قوم کے ہوں۔ یا کسی اور قوم کے۔ یہ جواب اچھا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی اور نبی بھی آپ کے زمانے میں بھیجا گیا۔ حالانکہ ایسا منقول نہیں ہے۔ اور محض احتمال اور امکان کافی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ کے لیے بعثت عامہ کی خصوصیت سے مراد قیامت تک آپ کی شریعت کی بقا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہیں اور قیامت تک آپ کی شریعت یوں ہی برقرار رہے گی۔ اور حضرت نوح اور ان کے تمام انبیاء علیہم السلام ایک مدت کے لیے تھے۔ کیونکہ ان کے اپنے زمانہ میں یا ان کے بعد کوئی دوسرا نبی آتا اور ان کی شریعت کا کچھ حصہ منسوخ کر دیتا۔ لیکن آپ کی شریعت غراء کے منسوخ نہ ہونے پر دال ہے۔ کیونکہ آپ خاتم النبیین یعنی آخری نبی ہیں۔ بعض یہودیوں کا یہ کہنا کہ محمد ﷺ خاص عرب کے لیے مبعوث ہیں فاسد اور متناقض ہے۔ اور جب بھی آپ کی رسالت کو مانیں گے تو وہ رسول کو صادق جانیں گے۔ اس لیے کہ رسول کاذب نہیں ہوتا۔ حالانکہ آپ خود دعویٰ فرماتے ہیں کہ میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوں' لامحالہ ضروری ہے کہ آپ کا یہ دعویٰ صادق ہے اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ کو ایک ماہ کی مسافت میں رعب وخوف سے مدد فرمائی گئی۔ ایک ماہ کی مدد کی تخصیص اس لیے کہ آپ کے شہر مبارک اور اعدائے دین کے شہروں کی مسافت ایک ماہ سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہ خصوصیت آپ کو علی الاطلاق حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ تنہا ہوں اور کوئی لشکر نہ ہو تو بھی آپ کو یہ رعب حاصل ہے۔ مانا کہ یہ خصوصیت دیگر انبیاء علیہم السلام سے بھی منسوب ہے اور اگر بعض امراء وسلاطین کو یہ حاصل ہو تو یہ دوسری بات ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو فتح ونصرت بالفعل رعب کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جس طرح کہ جنگ وقتال کے بعد حاصل کی جاتی ہے لیکن وہ جو دلوں رعب' خوف' دبدہ اور اندیشہ ہوتا ہے وہ تمام انبیاء میں عام ہے۔ ممکن ہے کہ بعض امراء وسلاطین کو بھی حاصل ہو۔ فافہم وباللہ التوفیق۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جنگ وقتال میں آپ کی تائید فرشتوں سے کی گئی ہے۔

یہ مرتبہ کسی نبی کو بھی نہ ملا۔ اس کی تفصیل غزوات کے بیان میں اور خاص کر غزوۂ بدر سے معلوم ہو گی۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے غنیمتوں کو حلال کیا گیا حالانکہ آپ سے پہلے کسی ایک کے لیے بھی غنیمتوں کو حلال نہ کیا گیا تھا اور بعضوں کو تو جہاد کا اذن نہ تھا کہ غنائم حلال نہ ہو جائیں۔ اور بعضوں کو جہاد کا اذن تھا مگر اس کا کھانا جائز وحلال نہ تھا۔ وہ مالِ غنیمت کو جمع کر کے کسی جگہ اکٹھا کر لیتے۔ آسمان سے آگ نمودار ہوتی اور اسے جلا دیتی۔ غنائم کا اس طرح جل جانا قبولیت کی علامت تھا۔ مگر اس امت مرحومہ کے لیے اسے حلال بنا دیا گیا۔ اہل علم بیان کرتے ہیں کہ حضور سیّد عالم ﷺ کو ہر وہ چیز جوامت کی طبیعت وخواہش کے موافق ہے عطا فرمائی گئی ہے۔ اس لے کہ ان کی طرف خواہشیں اپنی طبیعت سے لذت پاتی ہیں۔ اور انہیں وہ قہر وغلبہ' محنت ومشقت اور رنج وتکلیف اٹھا کر حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ نہ چاہیں گے کہ ان نعمتوں سے تلذذ وتمتع ان کے لیے

جاتا رہے۔ انہی خصائص میں یہ بھی ہے کہ حضور کے لیے اور آپ کی امت کے لیے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی کہ ہر جگہ نماز ادا کرنا جائز ہے۔ اور کسی خاص جگہ کو سجدہ کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ زمین کو ذریعہ پاکی بنایا گیا۔ اس سے مراد تیمّم ہے۔ دوسری شریعتوں میں پانی کے سوا کسی دوسری شے سے طہارت کرنا درست نہ تھا۔ اسی طرح دیگر امتوں کے لیے مخصوص مقامات کے سوا نماز ادا کرنا جائز نہ تھا۔ مثلاً کنیسہ' کلیساء وغیرہ میں۔ اگر ان سے دور ہوتے تو کیا کرتے ہوں گے۔ یا تو نماز ہی نہ پڑھتے ہوں گے یا کسی شے کو اس کی طرف نسبت دے کر خاص کر لیتے ہوں گے۔ مثلاً کوئی کپڑا یا لکڑی وغیرہ۔ (فائدہ) میں نے علماء کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہ پایا بجز اس کے کہ مواہب لدنیہ میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمیشہ زمین میں چلتے تھے اور جس جگہ بھی نماز کا وقت آ جاتا وہیں نماز ادا کر لیتے۔ اسے س ''داوَدی'' اور ''ابن التبیّن'' سے نقل کیا گیا ہے۔ اور فتح الباری میں سیّدنا ابن عباس ؓ سے حضرت جابر ؓ کی حدیث کی مانند مروی ہے کہ انبیاء کرام علیہ السلام میں سے کوئی نبی نماز ادا نہیں کرتے جب تک کہ اپنے محراب (بیت المقدس یا کنیسہ وغیرہ) میں نہ پہنچ جاتے۔ مگر ان دونوں نقلوں میں امت کا ذکر نہیں۔ غرض کہ یہ مقام اشکال واختلال سے خالی نہیں۔ (واللہ اعلم) بعض کہتے ہیں کہ زمین کا مسجد وطہور ہونا دوسروں کے لیے نہ تھا کیونکہ زمین مسجد تو تھی مگر طور نہ تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے لیے ہر جگہ بجز اس جگہ کے جائز نہ تھی جس کے پاک ہونے پر انہیں یقین نہ ہوتا اور یہ امت کو جائز ہے کہ جہاں نجاست کے نہ ہونے کا یقین ہو' ظاہر حال پر نظر کرنا کافی ہے (واللہ اعلم)

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ کے معجزات تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے بہت زائد تھے۔ اور قرآن کریم سراسر معجزہ ہے اور اس میں کم سے کم جو اعجاز ہے اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ میں صرف ایک یہی کہ انا اعطینك الكوثر (ہم نے آپ کو کثرت دی) تو اسی میں غور کرنا چاہیے کہ ''کثرت'' کی حد کہاں تک پہنچی ہے۔ یا اس کی مقدار میں کوئی اور آیت لے کر غور کریں۔ اس سلسلے میں شافی بیان باب معجزات کے آخر میں ذکر کیا گیا ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ کہ سیّد عالم ﷺ انبیاء ومرسلین کے خاتم یعنی آخری ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا قرآن مجید اس پر ناطق وشاہد ہے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ میرے قصہ وداستان اور انبیاء علیہم السلام کے قصہ وداستان کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے محل بنایا۔ اور اس محل کو مکمل کر دیا۔ مگر اینٹ کی جگہ کسی گوشتے میں خالی رہ گئی۔ لوگ جوق در جوق اس محل کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھتے ہیں۔ اور تعجب کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس خالی جگہ میں اینٹ کیوں نہ رکھی گئی تو سمجھ لو میں وہی اینٹ ہوں۔ اور خاتمِ انبیاء ہوں۔ اب عمارت تمام ہوگئی۔ کسی شے کی حاجت نہ رہی۔ اور بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَمَحَاسِنَ الْاَفْعَالِ اور مجھے مکارم اخلاق اور محاسن افعال کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا۔'' یہ اشارہ انبیاء کی ختمیّت کی طرف ہے۔ او یہ کہ آپ کی شریعت دائمی ہے جو قیامت تک رہے گی۔ اور یہ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی شریعتوں کی ناسخ ہے۔ اور یہ کہ آپ کی امت ان سب کی امتوں سے بہتر ہے اور آپ کی امت تمام نبیوں کی امتوں سے زیادہ ہے۔ اگر انبیاء علیہم السلام بھی آپ کا زمانہ پاتے تو وہ سب آپ کی پیروی کرتے۔ اس کی تحقیق باب فضائل میں گزر چکی ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ کہ حق تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ اگر رحمت سے مراد ہدایت لیں تو اس سے مقصود تمام لوگوں کی طرف رسول ہونا ہے۔ اگر چہ وہ تمام لوگ ہدایت نہ پائیں۔ اور شک وشبہ کی تاریکی میں پڑے رہیں' اگر عام تر مراد لیں تو آپ کے وجود گرامی کے واسطہ سے تمام کائنات کے لیے فیض وجودی میں شمولیت ہوگی۔ اور اس کا بیان باب سوم کے اول میں گزر چکا ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے ناموں سے مخاطب فرمایا۔ مثلاً یا آدمؑ یا ابراہیمؑ یا داوٗدؑ یا ذکریاؑ یا عیسیٰؑ یا یحییٰ وغیرہ مگر حضورِ انور ﷺ کو اس طرح خطاب نہ فرمایا بلکہ یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ یَآ اَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ اور یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ سے خطاب فرمایا۔ آخر کے دو ناموں سے مخاطب فرمانا شفقت ومحبت سے ہے اور محبت والے اس لذت کی لذت کو جانتے ہیں۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ امت کے لیے حضورِ اکرم ﷺ کا نام لے کر فریاد کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ یا محمد ﷺ کہہ کر پکاریں جس طرح کہ لوگ اپنے جیسوں کو پکارتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا. (رسول کو اس کی طرح نہ پکارو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔) بلکہ حضور کے کسی صفتی نام سے فریاد کرو۔ مثلاً یا حبیب اللہؐ یا رسول اللہؐ یا نبی اللہ وغیرہ۔ اور نہایت ادب واحترامؐ انکساری اور نیچی آواز سے۔ اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں مروی ہے کہ کہ حضرت ثابت بن قیس ؓ کو ثقل سماعت کی شکایت تھی اور ان کی آواز بہت بلند تھی۔ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی تو وہ گھر میں بیٹھ گئے اور مجلس نبوی میں حاضر نہ ہوئے ایک دن سیّد عالم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے ثابت نہ ہمارے پاس آتے ہیں اور نہ کہیں شکل دکھاتے ہیں۔ آپ نے انہیں بلوایا اور حاضر نہ ہونے کا سبب دریافت فرمایا۔ عرض کیا یا رسول اللہ آپ پر یہ آیہ کریمہ نازل ہوگئی۔ اور میں بلند آواز ہوں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے عمل اکارت نہ جائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم اس آیت کے مصداق نہیں ہو۔ اور نہ ان میں سے ہوگے۔ اور حضور نے ان کے ادب واحترام پر خوش ہو کر فرمایا تمہاری زندگی کے ایام بھی اچھے ہیں۔ اور جب رحلت کروگے تو تب بھی اچھے ہی رہوگے اور ان کو جنت کی بشارت دی۔ چنانچہ وہ جنگ یمامہ کے دن شہید ہوئے۔ ان کا ذکر آخر کتاب میں ذکر خطباء کے ضمن میں آئے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) اسی طرح حضورِ انور کو آپ کے حجرہ مبارک کے باہر سے آواز دینا بھی حرام تھا۔ اس میں حسن ادب یہ ہے کہ لوگ آئیں اور بیٹھ جائیں۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ خود باہر تشریف لا کر انہیں مشرف فرمائیں۔ غایت ادب میں تفصیلی ذکر اپنی جگہ پر آئے گا۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کی زندگانی، حضور کے شہر مقدس اور حضور کے زمانہ مبارک کی قسم فرمائی۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے سیّد عالم ﷺ سے وحی کے تمام اقسام میں کلام فرمایا۔ اس کی تحقیق مبعث کے بیان میں آئے گی۔ (انشاء اللہ) انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ اسرافیل علیہ السلام آپ کے حضور نیچے آئے حالانکہ آپ سے پہلے کسی نبی کے پاس نہ آئے تھے۔ طبرانی بروایت ابن عمر انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا کہ میرے پاس اسرافیل آئے اور وہ پہلے کسی نبی کے پاس نہ آئے اور نہ آئندہ کسی پر آئیں گے۔ انہوں نے عرض کیا آپ کے رب نے مجھے بھیجا ہے اور آپ کو حکم دیا ہے کہ میں نے آپ کو اختیار دیا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو نبی اور بندہ رہیں اور اگر آپ چاہیں تو نبی اور بادشاہ رہیں۔ پھر میں نے حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف بطریق مشورہ دیکھا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں اور تم کیا کہہ رہے ہو تو جبریل علیہ السلام نے میری جانب اشارہ کیا کہ متواضع رہو اور بندہ رہو۔ حضورِ انور فرماتے ہیں کہ اگر میں فرماتا کہ میں نبی اور بادشاہ رہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلا کرتے۔ اسی طرح مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔ اسرافیل علیہ السلام ایک دو بار نہیں آئے بلکہ وہ حضور کی مجلس مبارک کے ہمیشہ حاضر باشوں میں سے تھے۔

صاحب ''سفر السعادۃ'' لکھتے ہیں کہ جب حضورِ انور ﷺ کی عمر شریف سات سال کی ہوئی تو آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب ؓ نے وفات پائی اور آپ کی کفالت وتربیت کا شرف آپ کے چچا ابوطالب کو ملا۔ حضرت حق عز اسمہ نے اسرافیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں ہمیشہ رہیں تو اسرافیل علیہ السلام ہمیشہ آپ کے نزدیک رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے عمر شریف کا

گیارہواں سال مکمل فرمایا۔ اس وقت جبریل علیہ السلام کو فرمان ہوا کہ حضورِ انور کی خدمت میں حاضر رہو۔ (ﷺ)

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ بہترین اولادِ آدم ہیں۔ مسلم نے بروایت ابو ہریرہ ؓ نقل کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار رہوں گا۔'' جب آپ روزِ قیامت سب سے بہتر وافضل ہوں گے تو دنیا میں بطریق اولیٰ ہیں اس لیے کہ وہ جگہ تو سیادت' عزت اور کرامت کے ظہور کی ہوگی وہاں کسی ایک کو بھی دم مارنے کی طاقت نہ ہوگی۔ بجز آپ کے۔ جیسا کہ آیۂ کریمہ ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ''کی تفسیر میں اسی نکتہ کو مانند کہتے ہیں۔

ترمذی میں بروایت حضرت ابو سعید خدری ؓ نے فرمایا: اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَبِیَدِیْ وَلِوَآءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ. میں بروزِ قیامت اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور یہ فخر نہیں' میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور یہ فخر نہیں۔'' مطلب یہ کہ حضورِ انور ﷺ حضرت عزت جل جلالہ کی ایسی حمد کریں گے کہ کسی نے ایسی نہ کی ہوگی۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ کی جتنی معرفت آپ کو حاصل ہے اتنی کسی اور کو نہیں۔ اور آپ پر اس کی نعمتیں جتنی شامل ہیں اتنی کسی اور کے لیے نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ حمد بمعنی محمودیت یعنی تعریف کے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ روزِ قیامت جس قدر آپ کی مدح وثنا ہوگی کسی کی نہ ہوگی۔ وہ دن آپ ہی کا دن ہے۔ وہاں شان آپ کی ہی شان ہوگی۔ آپ کا ارشاد کہ 'ولا فخر۔'' اس کا مفہوم یہ ہے کہ خصلت میری اپنی حاصل کردہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ فضل وکرامت' خدا کی جانب سے ہے) میں اسے از خود نہ پاؤں گا۔ اور نہ ایسی قوت از خود مجھے ہوگی۔ جس پر میں فخر کروں۔ (بلکہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے) جیسا کہ اہلِ علم بیان کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس سے یہ مراد ہو کہ مجھ جو اولادِ آدم کی سیادت کی نسبت حاصل ہے اس پر کوئی فخر نہیں ہے۔ بلکہ مجھے تو اس نسبت پر فخر ہے جو مجھے حق تعالیٰ عزاسمہ سے حاصل ہے۔ جس طرح کہ بعض اہلِ علم' حضورِ انور ﷺ کی ولایت کو آپ کی نبوت پر فضلیت دینے میں کہتے ہیں۔ اور بعض اربابِ معانی یعنی اہلِ کلام کہتے ہیں کہ میرا فخر تو درحقیقت ذاتِ احدیت میں فنا و گم ہونے پر ہے نہ کہ وہ جو آثارِ وجود اور تحت حیطہ تکوین سے ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ الفقر فخری' فقر میرا فخر ہے (واللہ اعلم) اسی طرح سید اولادِ آدم اور سید تمائمہ خلق ہے اور خدا کے نزدیک تمام انبیاء ومرسلین' ملائکہ مقربین اور تمام زمین اور آسمان والوں سے زیادہ آپ معزز ومکرم ہیں۔ ﷺ

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے سبب تمام اولین وآخرین کے ذنوب کے بخشا۔ چنانچہ فرمایا: مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ شیخ عزالدین عبدالسلام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آپ کی ہی خصوصیت ہے کہ حق تعالیٰ نے دنیا میں آپ کو آمرزش کی خبر دی۔ اور یہ نقل نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو ایسی بشارت نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ روزِ قیامت نفسی نفسی کہیں گے۔ (انتہی) مطلب یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام اگرچہ مغفور ہیں اور انبیاء کی تعذیب جائز نہیں ہے۔ لیکن صراحت کے ساتھ کسی نبی کو اس فضلیت کی خبر دنیا میں نہ دی گئی۔ اور قیامت کے بارے میں ان سے اس کی تصریح کی گئی یہ حضور سیّد عالم ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ اپنے غم واندیشہ سے فارغ ہو کر جمع خاطر کے ساتھ اپنی امت کے حال کی غور وپرداخت کریں۔ اور امت کی شفاعت' مغفرت ذنوب اور ان کے درجات کی بلندی میں کوشش فرمائیں۔۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کا قرین (جسے ہمزاد کہتے ہیں) اسلام لے آیا۔ اس بات کی تفصیل یہ ہے سیّدنا ابن مسعود ؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ موکل گردانا گیا ہے۔ اس کے ساتھ جنات میں سے اس کا ایک قرین اور فرشتوں میں سے اس کا ایک قرین۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کا بھی یہی حال ہے۔ فرمایا ہاں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد نصرت فرمائی تو وہ اسلام لے آیا۔ تو وہ بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ بعض کہتے ہیں

اسلام لانے سے مراد انقیاد واطاعت اور حضور پر اس کے تصرف کا عدم نفاذ ہے اور اکثر کا یہی قول ہے کہ حقیقتاً اسلام ہی مراد ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ انور ﷺ پر خطا جائز نہیں ہے۔ اسے ماوردی اور حجازی نے ''مختصر روضہ'' میں بیان کیا ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نسیان یعنی بھول چوک بھی جائز نہیں ہے۔ امام نووی سے شرح مسلم میں اس قول کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ اسی طرح صاحب مواہب لدنیہ نے بغیر تفصیل اور بغیر ذکر اختلاف بیان کیا ہے کہ وہ اقوال واخبار جو تبلیغ وشرائع اور وحی سے متعلق ہیں ان میں بھول چوک کے نہ ہونے یعنی عدم نسیان پر اجماع کرتے ہیں اور بسلسلہ اخبار بعض لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ اور ان میں نسیان کو جائز رکھا ہے۔ یہ قول ضعیف ہے اس لیے کہ خلاف واقعہ کی خبر دینا کذب وعیب ہے۔ حالانکہ حضورِ اکرم ﷺ کے دامن عزت کو اس سے پاک وصاف ماننا واجب ہے۔ اور یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت تھی کہ وہ حضورِ انور ﷺ کے تمام اقوال کی تصدیق اور تمام خبروں پر اعتماد کرنے میں عجلت اور سبقت کرتے تھے۔ خواہ وہ کسی باب یا کسی چیز میں ہوں۔ یہی جمہور علماء کا مذہب ہے۔ لیکن نسیان افعال میں جائز ہے۔ نماز میں اس کا وقوع درجہ صحت کو پہنچ چکا ہے۔ اب اس کے قائل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ البتہ! ضمناً یہ ضرور اعتقاد رکھنا چاہیے کہ اس میں تشریعی حکمت اور امت کو اس کی اقتداء کی سعادت پانے کی مصلحت ہے۔ اور حضور ﷺ کے حصہ بشری اور جبلی احکام کے بقا اور اعضاء کے افعال اور جوارح کے حرکات اس عالم سے متعلق ہیں۔ **واللہ اعلم بحقیقتہ الحال.**

اب رہی خطا کی نسبت تو اگر اس خطا سے مراد خطائے اجتہادی ہے جو بعض مواقع پر رونما ہوئی مثلاً بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینا تو حضور کو ایسی خطائے اجتہادی پر ثابت وقائم نہ رکھا گیا بلکہ اس سے باخبر کر دیا گیا۔ اسی طرح نسیاں میں بھی ہے اب رہا شک تو یہ حضور سے ہرگز واقع نہ ہوا۔ مثلاً کبھی اس میں شک ہوا ہو کہ دو رکعت پڑھی ہیں یا تین۔ آپ نے فرمایا: شک وشبہہ شیطان سے ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے مردے سے قبر میں حضورِ انور ﷺ کے بارے میں یہ سوال کیا جائے گا کہ ''اس شخص کے بارے میں تو کیا کہتا ہے جو تم میں مبعوث ہوئے تھے'' (آخر حدیث تک) جیسا کہ علماء خصائص میں بیان کرتے ہیں۔ اس کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اور امتوں سے دوسرے نبیوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ یعنی قبر میں ان سے اپنے اپنے نبیوں کے بارے سوال نہ ہوگا اور اس سے بعض علماء کہتے ہیں کہ سوال قبر امت محمدیہ کے خصائص میں سے ہے۔ اس لیے کہ انہیں عالم برزخ میں گناہوں سے پاک وصاف کر کے عالم آخرت میں لے جائیں گے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جائز ہے کہ خدا کی قسم! حضورِ انور ﷺ کے ساتھ کھائی جائے آپ کے غیر سے نہیں مثلاً فرشتے یا دیگر انبیاء وغیرہ۔ شیخ عزالدین ابن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ لازم ہے کہ یہ جواز حضور کے ساتھ مخصوص اور آپ سے مقصود ہے۔ کیونکہ کوئی دوسرا آپ کے درجہ میں نہیں ہے۔ ﷺ

مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات آپ کے بعد امت پر حرام قرار دی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ یعنی حرمت میں وہ ماؤں کے حکم میں ہیں۔ یہ حضور ﷺ کی تکریم وتعظیم کے سبب اور بایں وجہ آپ کی ازواج جنت میں بھی آپ کی ازواج ہوں گی۔ اور ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا.

تمہیں لائق نہیں کہ تم رسول اللہ کو ایذا دو اور نہ یہ کہ آپ کی ازواج سے نکاح آپ کے بعد کبھی بھی کرو۔

''روضتہ الاحباب'' میں مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ طلحہ بن عبید اللہ نے کہا تھا جب حضورِ انور ﷺ دنیا سے پردہ فرما جائیں گے تو میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا پیام دوں گا تو یہ آیت نازل ہوئی اور بعض کتابوں میں کہا گیا کہ یزید شقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں طمع کی تو لوگوں نے اس پر آیت پڑھی۔ اور اس سے اُسے باز رکھا۔ یہ حرمت نکاح ان بیویوں کے بارے میں ہے جنہیں اختیار دیا گیا کہ وہ چاہیں تو دنیا اور اس کی زینت کو اختیار کر لیں۔ یا وہ چاہیں تو خدا اور اس کے رسول کو اختیار کر لیں۔ لہٰذا جن عورتوں نے دنیا کو چاہا وہ حضور سے جدا ہو گئیں۔ ان کے حلال ہونے میں اختلاف ہے۔ امام الحرمین اور امام غزالی ان کے حلال ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن وہ بیویاں جو حضورِ انور کی وفات کے وقت تک زندہ رہیں وہ حضور کے سوا غیر پر حرام ہیں۔ دیکھنے کے جواز میں دو وجہ ہیں۔ زیادہ مشہور تو ممانعت ہے۔ اور ''ماں'' کے حکم میں ہونے کا مطلب احترام و اطاعت اور تحریم نکاح ہے نہ کہ خلوت' اور نفقہ و میراث کے جواز میں اور یہ حکم ان کے غیر کے ساتھ متعدی و متجاوز نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ حضور ﷺ کی صاحبزادیاں مسلمانوں کی بہنیں ہیں۔ برقول اصح' ایسا ہی مواہب لدنیہ میں ہے۔

درحقیقت آپ کے ازواج مطہرات کی حرمت کا سبب' حضور کا قبر شریف میں زندہ ہونا ہے۔ اسی بنا پر علماء کہتے ہیں کہ ازواج مطہرات پر وفات کی عدت نہیں ہے۔ اور وہ عورت جس کو حضور نے اختیار دے کر جدا فرما دیا۔ جیسے وہ عورت جس نے حضور سے استعاذہ کیا اور وہ عورت جس کے نچلے حصہ میں سفیدی دیکھ کر جدا فرما دیا تھا ان کے بارے میں کئی قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ حرام ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ اسی پر پختگی سے قائم ہیں اور دوسرا قول یہ ہے وہ حرام نہیں ہے۔ امام الحرمین فرماتے ہیں کہ اگر مدخول بہا یعنی ہم بستری ہو چکی ہے تو حرام ہے۔ روایت ہے کہ اشعث بن قیس نے مستعیذہ عورت سے سیّدنا فاروق اعظم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نکاح کیا۔ اس پر حضرت عمر نے ارادہ کیا کہ اسے رجم کریں۔ پھر آپ کو باخبر کیا گیا کہ اس سے دخول واقع نہ ہوا تھا۔ تو حضرت عمر اس کے رجم کرنے سے رک گئے۔ اور اس باندی کے بارے میں جسے ہم بستری کے بعد جدا فرمایا اس میں بھی تین قول منقول ہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ وہ حرام ہے۔ اگر موت سے جدا ہوئی۔ جیسا کہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا جو کہ حضرت ابراہیم فرزند رسول ﷺ کی والدہ ہیں اور حرام نہیں ہیں اگر حیات میں فروخت کر دیا جائے (انتہی) یہ مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ جس کے ذکر سے اب کوئی فائدہ نہیں۔

انہی خصائص میں سے یہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد ازواج مطہرات کے کالبد کا دیکھنا بھی حرام ہے۔ اگرچہ وہ برقع و چادر میں مستور ہوں۔ اور کسی ضرورت سے مثلاً گواہی وغیرہ کے لیے چہرہ اور ہتھیلی کھولنا بھی حرام تھا۔ جس طرح کہ تمام عورتوں کے لیے جائز ہے۔ اس کا فتویٰ قاضی خاں نے دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ امہات المومنین پر بلا خلاف چہرہ اور ہتھیلیوں کا پردہ کرنا فرض کیا گیا ہے۔ اور گواہی وغیرہ میں بھی ان کا کھولنا جائز نہیں ہے اور نہ اظہار شخوص یعنی کالبد مستور در ثیاب وغیرہ مگر ان مواقع پر جو ضروریات بشری ہیں جیسے پیشاب' پاخانہ وغیرہ جائز ہے۔ اور موطا میں اس روایت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو عورتوں نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے وجود کو چھپا لیا کہ کوئی ان کے وجود نہ دیکھ سکے۔ اور زینب بنت جحش نے ان کی نعش پر قبہ سا بنایا۔ تاکہ ان کا وجود پوشیدہ ہو جائے۔ صاحب مواہب لدنیہ نے شیخ ابن حجر عسقلانی سے نقل کیا ہے کہ جو کچھ فتاویٰ قاضی خان میں بیان کیا ہے اس کی فرضیت کے دعویٰ میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بات متحقق ہے کہ ازواج مطہرات حج و طواف کے لیے باہر نکلتی تھیں۔ اور صحابہ و تابعین ان سے احادیث سنتے تھے ان کے بدن مبارک کپڑوں سے مستور ہوتے۔ اور کالبد متشخص وجودی پوشیدہ نہ ہوتے تھے۔ (انتہی)

امہات المومنین کے حجاب کا مطلب متشخص وجود (ڈھانچے) کا عدم اظہار' اگرچہ وہ کپڑوں میں مستور و محجوب ہوں۔ یہ کیوں مشہور و ثابت ہوا۔ اور شیخ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ کا اس باب میں بحث کرنے کا مطلب کیا ہے؟ آیا فرضیت کی نفی ہے جیسا کہ ان کے ظاہر کلام

سے ظاہر ہے یا وہ انہیں ''تحت ضرورت'' میں داخل کرتے ہیں۔ حالانکہ امہات المومنین کے مشخص وجودی (ڈھانچے) کا حج وطواف میں ظاہر ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ جب ہم حج کی راہ میں عورتوں کے جھرمٹ کے درمیان چلتیں تو ہم اپنے چہروں کے سامنے سے پردے اٹھا دیتیں۔ اور جب ہم دیکھتیں کہ لوگ پہنچنے والے ہیں تو اپنے چہرہ پر پردہ الٹ لیتیں۔ اسی طرح ام المومنین حضرت صفیہ ؓ ناتوانی کے باعث ہجوم میں طواف نہ کر سکتی تھیں۔ تو حضور نے فرمایا لوگوں کے پیچھے سے طواف کرو۔ بہر تقدیر یہ بالکل ظاہر ہے کہ ان کا کالبد (ڈھانچہ) ظاہر تھا اور یہ کہنا کہ قبہ یا عماری کی مانند کوئی چیز ان کے اوپر ہوتی ہوگی بعید ہے۔ اب رہا حدیث مبارک کے سنانے کی حالت تو ممکن ہے کہ وہ پس پردہ سناتی ہوں۔ چنانچہ حضرت عبدالواحد ایمن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ ؓ کے پاس آیا تو ان پر قطری اوڑھنی تھی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہ اوڑھنی آپ کے جسم اطہر پر تھی۔ اور اگر حجاب سے یہ مراد لیں کہ وہ چیزیں جو عورتوں کو کھولنا جائز ہے مثلاً چہرہ' ہتھیلیاں تو یہ بھی ان پر حرام تھیں نہ کہ کالبد (ڈھانچہ) کا چھپانا۔ اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ انور ﷺ کی صاحبزادیوں کی اولاد کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کی جاتی ہے چنانچہ نے فرمایا: ''ہر نبی کے اولاد اس کے صلب سے ہے۔ اور میری اولاد علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ کے صلب سے ہے۔ حضرت امام حسن اور امام حسین ؓ کی شان مبارک کے سلسلے میں حدیث پاک میں آیا ہے کہ:

هٰذَانِ ابْنَا بِنْتِيْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهُمَا فَاَحِبَّهُمَا وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا.

یہ دونوں میری بیٹی کے فرزند ہیں اے خدا میں ان دونوں کو محبوب رکھتا ہوں تو بھی انہیں محبوب رکھ۔ اور جو انہیں محبوب رکھے تو انہیں بھی محبوب رکھ۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ:

اِنَّ ابْنِيَّ هٰذَيْنِ رِيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا.

بیشک یہ میرے دونوں فرزند دنیا کے میرے دو پھول ہیں۔

نیز مروی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ سیّدتنا فاطمۃ الزہرا ؓ سے فرماتے ہیں میرے ان دونوں فرزندوں کو میرے پاس لاؤ پھر حضور ﷺ ان کی بو سونگھتے اور سینہ مبارک سے چپٹاتے۔ اور سیّدنا امام حسن ؓ کے بارے میں فرمایا: اِنَّ ابْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ بیشک میرا یہ فرزند سید ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا کہ امام حسن' امام حسین ؓ میں سے کوئی صاحبزادے مسجد نبوی میں آئے اور بحالت سجدہ حضور ﷺ کی پشت پر بیٹھ گئے۔ حضور نے اپنا سر مبارک سجدہ سے نہ اٹھایا اور سجدہ دراز فرما دیا۔

بعد نماز صحابہ کرام نے اس سجدہ کی بابت دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا سجدہ میں وحی آئی تھی؟ فرمایا میری پشت اطہر پر میرا فرزند سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اچھا نہ جانا کہ جلدی کروں یہاں تک وہ خود نہ اترے اور مباہلہ والی آیت نَدْعُ اَبْنَآءَ نَا (ہم اپنے فرزند کو بلائیں) بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔

اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر ایک کا سبب ونسب منقطع ہو جائے گا۔ یعنی قیامت میں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ مگر میرا نسب اور سبب'' اور نسب سے مراد اولاد ہے۔ اور سبب سے مراد ازواج ہیں۔ اسی بنا پر سیّدنا فاروق اعظم عمر بن خطاب ؓ نے حضرت فاطمۃ الزہرا ؓ کی صاحبزادی سے نکاح فرمایا بایں تمنا کہ حضورِ اکرم ﷺ سے سلسلہ سبب متصل ہو جائے۔ یہ قصہ اپنی جگہ اس سے زیادہ تفصیل سے آئے گا۔

اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ آپ کی صاحبزادیوں کی موجودگی میں کسی اور سے نکاح نہیں کیا گیا۔ مطلب یہ کہ جب کسی شخص کے نکاح میں آپ کی کوئی صاحبزادی ہو تو اسے جائز نہیں تھا کہ آپ کی صاحبزادی پر کسی اور عورت کو نکاح میں (سوت بنا کر) لا

سکے۔ دراصل اس باب میں سیدتنا فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا قصہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ابوجہل کی لڑکی سے جو مسلمان ہوکر مدینہ منورہ آ گئی تھی نکاح کرنا چاہتے تھے۔ جب حضرت سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں آئیں اور کہنے لگیں، آپ کی قوم کہتی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ اپنی صاحبزادیوں کے حق میں برا نہیں چاہتے ''حضرت علی ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کر رہے ہیں اور آپ کچھ نہیں فرماتے۔'' اس پر حضورِ اکرم ﷺ کھڑے ہوگئے اور منبر پر رونق افروز ہوکر خطبہ فرمایا اور کہا۔ میں نے ابوالعاص کے نکاح میں اپنی بیٹی دی (یہ حضور کے داماد ہیں ان سے حضور ﷺ کی صاحبزادی سیّدہ زینب منسوب ہوئی تھیں اور اس وقت تک وہ انہی کے گھر تھیں۔) تو اس نے ہمارے ساتھ درست روی کو اختیار کیا او ہماری رضا کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔

سیّدہ فاطمۃ الزہرا میری جگر گوشہ ہے۔ میں ناپسند کرتا ہوں کہ اسے کوئی آزار و تکلیف پہنچے۔ اور انھیں کسی آزمائش میں مبتلا کیا جائے۔ اور جو چیز سیّدہ فاطمہ کو ایذا دیتی ہے اور اس سے مجھے ایذا ہوتی ہے اور میں نے سنا ہے کہ علی المرتضیٰ ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں! خدا کی قسم رسولِ خدا کی بیٹی اور دشمن رسولِ خدا کی بیٹی ایک مرد کے عقد میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ پہلے فاطمہ کو طلاق دیں اس کے بعد اس سے نکاح کریں۔'' چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ حاضر ہوئے۔ معذرت چاہی اور ابوجہل کی لڑکی سے نکاح کرنے کا ارادہ ترک فرمادیا۔ اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت علی مرتضیٰ پر حرام فرمادیا کہ جب تک سیّدہ فاطمہ حیات ہیں ان کے اوپر کوئی سوت لائی جائے اور فرمایا ''اے علی! میں تمہیں اپنا محبوب رکھتا ہوں اور اس سے ڈراتا ہوں کہ تم فاطمہ کو ایذا پہنچاؤ۔ اور اس سے مجھے ایذا پہنچانا لازم آئے۔'' یہ حدیث مبارک اگرچہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے ساتھ مخصوص و منطوق ہے لیکن آپ کی کسی بیٹی پر کسی اور کو سوت بنالانا ایذا کا موجب ہے۔ اس لیے اسے حضور ﷺ کی تمام بیٹیوں پر جاری گردانا گیا ہے۔

اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ مسجد نبوی میں تعیین قبلہ کے لیے ''محراب'' میں جو کہ مدینہ منورہ میں ہے۔ دائیں بائیں اجتہاد وتحری نہیں کی جائے گی۔ اور شیخ الاسلام ابوزرعہ نے اس شخص کے بارے میں فتویٰ دیا۔ جس نے محراب نبوی ﷺ کی جانب نماز ادا کرنے سے انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ میں تعیین سمت قبلہ میں اجتہاد کرکے نماز پڑھوں گا۔ اگر اس نے یہ تحری واجتہاد یہ جان کر کیا کہ یہ محراب وہ نہیں ہے جو نبی کریم کے زمانہ میں تھی تو مرتد ہوگیا (نعوذ باللہ منہا) اور اگر وہ یہ تاویل کرتا ہے کہ موجودہ محراب وہ نہیں ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں تھی بلکہ اس میں ردوبدل و تغیر کیا گیا ہے۔ تو اسے کافر و مرتد نہ بنائے گا۔ کیونکہ روایتوں میں آیا ہے کہ درمیان سے تمام حجابات یعنی پردے اٹھادئے گئے تھے اور حضورِ اکرم ﷺ کی پیش نظر خانہ کعبہ تھا۔ اور بالمشافہ عین کعبہ کے مقابل محراب تعمیر کی گئی اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جس نے خواب میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا بلاشبہ اس نے حق اور بے شک وشبہ آپ ہی کو دیکھا اس لیے کہ شیطان آپ کی صورت میں متمثل نہیں ہوسکتا اور نہ اُسے اس کی قدرت دی گئی ہے کہ وہ حضور کا ہم شکل بن کر فریب ودھوکا دے سکے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ مَنْ رَّاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقُّ (جس نے مجھے دیکھا اس نے حق ہی دیکھا۔) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے کہ مَنْ رَّاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَقَدْ رَاٰنِیْ یعنی جس نے مجھے خواب میں دیکھا یقیناً اس نے مجھے ہی دیکھا۔'' مطلب یہ کہ اگرچہ حق تعالیٰ نے شیطان کو قدرت دی ہے کہ وہ جو صورت چاہے اختیار کرلے۔ لیکن اسے حضورِ اکرم ﷺ کی صورت مبارکہ میں آنے کی قدرت نہ دی گئی اس لیے کہ حضورِ انور ﷺ مظہر ہدایت ہیں۔ اور شیطان مظہر ضلالت گمراہی اور ہدایت وضلالت ایک دوسرے کی ضدیں ہیں۔ یہاں تک کہ شیطان بصورت پروردگار عالم تعالیٰ وتقدس آسکتا ہے اور دھوکہ وفریب دے سکتا ہے۔ کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ ہدایت وضلالت کا خالق یعنی پیدا کرنے والا ہے مگر حضور ﷺ کی ذات مبارک دونوں کے لیے محل اشتباہ نہیں ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ فضلیت تمام انبیاء علیہم السلام کے لیے عام ہے اور شیطان کسی نبی کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ لیکن

صاحبِ مواہب لدنیہ اس فضلیت کو حضور ﷺ کے خصائص کے بیان میں لائے ہیں اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے میں کسی خاص شکل وصورت میں دیکھنے کی شرط نہیں ہے۔ جو شخص جس صورت میں بھی دیدار سے بہرہ ور ہو یقیناً اس نے آپ ہی کا دیدار کیا۔ اور بعض نے راہ شک اختیار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ یہ اس تقدیر پر ہے کہ اس نے بصورت خاص مجھے دیکھا ہو۔

مطلب یہ کہ اس نے اس شکل وصورت میں دیکھا ہو۔ جو واقعتاً حضور ﷺ کی صورت مبارکہ رہی ہے۔ اور بعض نے اس سے زیادہ تنگی اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ کو اسی خاص صورت میں دیکھا ہے جو صورت مبارکہ دنیا سے رحلت کے وقت تھی حتیٰ کہ وہ آپ کی داڑھی شریف میں سفید بالوں کی گنتی کا بھی شمار ملحوظ رکھتے تھے۔ یعنی آپ کی داڑھی شریف میں بیس سے زیادہ سفید بال نہ تھے۔ اور کہتے ہیں کہ ابن سیرین جو کہ خواب کی تعبیر میں ماہر تھے ان کے پاس اگر کوئی شخص آ کر کہتا کہ میں نے خواب میں حضور کا دیدار کیا ہے تو وہ اس سے پوچھتے بتاؤ کس صورت میں تم نے دیکھا ہے۔ اگر وہ ویسی صورت نہ بتاتا جیسی کہ حضور ﷺ کی صورت تھی تو ابن سیرین کہتے تو نے حضور ﷺ کی زیارت نہیں کی۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (واللہ اعلم)

کسی شخص نے سیّدنا ابن عباس ؓ سے کہا میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ آپ نے دریافت کیا کہ کس صورت میں دیکھا اس نے کہا کہ میں نے سیّدنا امام حسن مجتبیٰ ؓ کا ہم شکل دیکھا ہے۔ اس پر ابن عباس ؓ نے فرمایا تو نے حضور رسول اللہ ﷺ کو درست دیکھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ آپ کی خاص صورت اور جانی پہچانی صفات کے ساتھ دیکھنا آپ کی حقیقت کا ادراک ہے۔ اور اس کے سوا میں دیکھنا مثال کا ادراک ہے لیکن درست بات یہی ہے جس پر تمام محدثین متفق ہیں کہ جس صورت میں بھی دیکھے حقیقتہً حضور ہی کا دیکھنا ہے۔ لیکن آپ کی خاص صورت میں دیکھنا اتم واکمل ہے۔ اور صورتوں مں تفاوت آئینہ خیال کا تفاوت ہے۔ جس کا آئینہ خیال نور اسلام سے جتنا صاف تر اور منور ہوگا اس کی رویت اتنی ہے درست اور کامل تر ہوگی۔ اس مقام کی تحقیق کی تفصیل مشکوٰۃ شریف کی شرح میں بیان کردی گئی ہے۔ وہاں دیکھنی چاہیے۔

مسلم کی حدیث میں ہے کہ مَنْ رَّاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَةِ (جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو وہ بہت جلد مجھے بیداری میں دیکھے گا) اس حدیث کی چند وجوہات سے توجہیں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آخرت میں دیکھے گا۔ حالانکہ علماء بیان کرتے ہیں کہ آخرت میں ساری امت ہی دیدار مصطفیٰ سے بہرہ ور ہوگی۔ خواب میں رویت کی تخصیص کیا ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ ایسی رویت کے لیے ایک خاص قسم کی رویت اور مخصوص قسم کی قربت ہوگی۔ ممکن ہے بعض گنہگاران امت، بعض اوقات میں جمال جہاں آرا کی رویت سے اپنے گناہوں کی بدبختی سے محروم رہیں۔ بخلاف ایسی رویت کے۔ کہ وہ اس محرومی اور ناکامی سے محفوظ ہو جائیں۔

دوسری وجہ یہ کہ ''بیداری میں دیکھنے سے مراد خواب میں تاویل اور اس کی صحت ہے اور یہ حضور ﷺ کے اہل زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ گویا کہ انہیں بشارت دی گئی ہے کہ اہل زمانہ میں جو بھی خواب میں حضور کو دیکھنے سے مشرف ہو گیا امید ہے کہ وہ شرف صحبت سے بھی مشرف ہوگا۔ یہ معنی اظہر ہیں۔ جیسا کہ بعض روایتوں میں بھی آیا ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا میرا باپ بہت بوڑھا ہے وہ حضور ﷺ کی صحبت میں حاضر ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ لیکن وہ خواب میں حضور کے دیدار سے مشرف ہو گیا۔ فرمایا: مَنْ رَّاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَةِ (جس نے مجھے خواب میں دیکھ لیا عنقریب وہ بیداری میں بھی دیکھ لے گا۔) اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مستعد ومقربان بارگاہ اور سالکان راہ کے لیے بشارت ہو کہ وہ گاہ بہ گاہ اس نعمت سے مشرف ہو کر بیداری میں دیدار کرنے کے مرتبہ وسعادت سے ہمکنار ہو جائیں۔ مگر علماء کرام حضور ﷺ کی دنیا سے رحلت فرما جانے کے بعد بیداری رویت ہونے کے خلاف ہیں۔ صاحب مواہب لدنیہ اپنے شیخ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہم میں سے کوئی ایک بھی خواہ وہ

صحابہ کرام میں سے ہو یا ان کے بعد والوں میں سے بیداری میں شرف دیدار سے مشرف نہ ہوا۔ اور یہ بات تو بخوبی تحقیق سے ثابت ہے کہ سیدتنا فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ' حضورِ اکرم ﷺ کی رحلت پر انتہائی غم واندوہ میں رہیں حتیٰ کہ بقول صحیح اسی غم نہانی میں گھل گھل کر حضور ﷺ کی رحلت کے چھ ماہ بعد دنیا سے رخصت فرما گئیں۔ حالانکہ آپ کا گھر قبر انور کے جوار میں تھا۔ مگر اس ساری مدت فراق میں کسی ایک نے بھی ان سے بیداری میں حضور کے دیدار کی روایت نقل نہیں کی۔ لیکن بعض صالحین نے اپنے نفوس کی حکایت بیان کی ہیں۔ جیسا کہ بازری کی ''توثیق عبرس الایمان'' میں ابن ابی حمیرہ نے کی۔

'بہجۃ النفوس'' میں عفیف یافعی کی ''روض الریاحین'' اور ان کی دیگر تصانیف میں اور شیخ صفی الدین بن المنصور کے اپنے رسالہ میں مذکور ہیں۔ نیز مواہب لدنیہ میں ابن ابی حمیرہ کی عبارت نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سلف وخلف کی ایک ایسی جماعت نے ذکر کیا ہے جو اس حدیث کی تصدیق کرتی ہے۔ یعنی مَنْ رَّاٰنِیْ فِی الْمَنَامِ فَسَیَرَانِیْ فِی الْیَقْظَۃ (جس نے مجھے خواب میں دیکھا عنقریب وہ بیداری میں مجھے دیکھے گا) کہ ہم نے حضور کو خواب میں دیکھا اس کے بعد بیداری میں دیدار سے مشرف ہوئے۔ اور انہوں نے حضور سے اپنی پریشانیوں اور مشکلات سے نجات پانے کا ذریعہ معلوم کیا۔ حضور نے انہیں ان سے روخلاصی کی راہیں ہدایات فرمائیں۔ اگر انسان کرامات اولیاء پر اعتقاد نہ رکھے تو اس سے بحث ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اس سے جو بھی کہا جائے گا وہ اس کی تکذیب کرے گا اور اگر وہ اعتقاد رکھتا ہے اور تصدیق کرتا ہے تو اس سے کہنا چاہیے کہ بیداری میں دیدار سے مشرف ہونا بھی انہی کرامتوں کے زمرہ میں سے ہے۔ اس لیے کہ اولیاء کرام کے لیے ایسے ایسے خرق عادات اور عجیب وغریب واقعات خواہ وہ عالم علوی سے ہوں یا عالم سفلی سے منکشف ہوتے ہیں جن پر کسی اور انسان کی دسترس ناممکن ہے'' نیز صاحب مواہب لدنیہ نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابو منصور نے اپنے رسالہ میں ذکر فرمایا کہ ''اہل کمال بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ ابو العباس قسطلانی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو حضو اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَخَذَ اللّٰہُ بِیَدَیْکَ اَحْمَدُ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری دستگیری کرے اے احمد!''

اور شیخ ابو السعود سے صاحب مواہب لدنیہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے تمہارے شیخ ابو العباس اور دیگر مشائخ وصلحائے زمانہ کی زیارت کی ہے۔ پھر میں سب سے قطع تعلق کر کے مشغول ہو گیا اور مجھ پر انکشافات شروع ہو گئے۔ پھر میں نے شیخ کو بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر دیکھا اور حضور نے سب کے بعد مجھ سے مصافحہ فرمایا۔''

حضرت شیخ ابو العباس حراں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضورِ انور اولیاء کرام کے لیے احکام وفرامین تحریر فرما رہے ہیں۔ میرے بھائی جن کا نام محمد ہے ان کے لیے بھی حضور نے ایک فرمان تحریر رمایا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لیے حضور نے کوئی فرمان نہ لکھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا: اس کے سوا ان کا ایک مقام ہے۔

امام حجۃ الاسلام نے اپنی کتاب ''المنتقذ من الضلال '' میں فرماتے ہیں کہ ارباب قلوب' بیداری میں فرشتوں اور ارواح انبیاء علیہم السلام کا مشاہدہ کرتے ان کی آوازیں سنتے اور ان سے انوار کا اقتباس اور فوائد کا استفادہ کرتے ہیں۔

حضرت سید نور الدین الحی والد ماجد سید صفی الدین وسید عفیف الدین سے حکایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے بعض اوقات بوقت زیارت' قبر شریف کے اندر سے جواب سلام یعنی علیک السلام یا ولدی کو سنا ہے۔

مواہب لدنیہ میں اس قسم کی بہت سی حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن سے دیدار بحالت بیداری اور خواب دونوں کا احتمال موجود ہے۔ اور نقل کرتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز ''عوارف المعارف'' میں حضور سیّدنا غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا میں نے اس وقت تک نکاح کرنے کا ارادہ نہ کیا جب تک رسولِ خدا ﷺ نے مجھ سے نکاح

کرنے کا حکم نہ فرمایا۔

راقم ایں حرف بندہ ء مسکین عبدالحق بن سیف الدین (محدث دہلوی رحمتہ اللہ) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین کہتا ہے کہ ''بہجۃ الاسرار'' میں جو کہ شیخ ابوالحسن علی بن یوسف شافعی نخمی رحمتہ اللہ کی تصنیف ہے۔ ان شیخ کے اور حضور سیّدنا غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی ؓ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔ وہ حضرت شیخ جلیل القدر ابوالعباس احمد بن شیخ عبداللہ ازہری حسینی ؓ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ میں حضور سیّدنا محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی ؓ کی مجلس شریف میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کی مجلس مبارک میں دس ہزار لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور شیخ علی بن ہیتی غوث الاعظم کے بالکل سامنے مواجہ میں تھے۔ اس لیے کہ ان کے بیٹھنے کی جگہ یہی مقرر تھی۔ انہیں غنودگی نے گھیرا۔ اس وقت حضور غوث الاعظم نے فرمایا خاموش ہو جاؤ۔ چنانچہ تمام لوگ خاموش ہو گئے اور ان کی سانسوں کی آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی پھر حضور غوث الاعظم منبر شریف سے اترے اور حضرت شیخ ہیتی کے سامنے باادب دست بستہ کھڑے ہو گئے اور خوب غور سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جب شیخ علی نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا اے شیخ کیا تم نے خواب میں حضور ﷺ کا دیدار کیا ہے۔ وہ کہنے لگے ہاں! فرمایا میں اسی وجہ سے ادب بجالایا تھا۔ اور فرمایا حضور نے تمہیں کیا نصیحت فرمائی ہے۔ انہوں نے کہا: مجھے آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کا حکم فرمایا ہے۔ اس وقت شیخ علی ہیتی نے لوگوں سے فرمایا کہ میں نے جو کچھ خواب میں دیکھا۔ حضور غوث الاعظم نے اسے بیداری میں دیکھا لیا۔ اس روز اہل مجلس میں سے سات آدمی (خوف وخشیت الٰہی سے) فوت ہو گئے تھے۔ واضح رہنا چاہیے کہ صاحب مواہب لدنیہ نے بعد از نقل اقوال مشائخ در رویت حضورِ اکرم ﷺ شیخ بدرالدین حسن بن اہرل سے روایت نقل کی ہے کہ بیداری کی حالت میں رویت شریف کا وقوع ان اولیاء کرام کی خبروں سے حدِ تواتر تک ثابت ہو چکا ہے۔ جن سے ایسا علم قوی حاصل ہوتا ہے۔ جس سے کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔ وقوع رویت کے وقت ان اولیائے کرام کے حواس گم ہو جاتے ہیں اور ان پر ایسا حال وارد ہوتا ہے جس کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس رویت میں ان کے مراتب واحوال مختلف ومتفاوت ہیں۔ کبھی وہ خواب میں دیدار سے مشرف ہوتے ہیں اور کبھی حواس کی غیبوبیت میں جسے وہ بیداری خیال کرتے ہیں اور دیدار سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اور کبھی اپنے ہی تصور وخیال کو دیکھ کر گمان کر لیتے ہیں حقیقتاً حضور کا دیکھنا نیند اور بیداری کے مابین ہوتا ہے۔ جسے ہم غنودگی کہتے۔ ہاں وہ ارباب قلوب جو ہمیشہ مراقبہ وتوجہ میں قائم رہتے ہیں اور نفسانی کدورتوں سے پاک وصاف اور دنیا واہل دنیا سے مطلقاً کنارہ کش اور حضور ﷺ کی جمال پرانوار کے عاشق اور مشتاق رہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک ولی اپنے تمام اہل وعیال اور مال ومنال سے جدا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ نبی کریم ﷺ کا دیدار اس شان کے ساتھ کرتا ہے جس طرح کہ حضور سیّدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی ؓ نے عالم شہود میں اپنی آنکھوں سے نبی کریم ﷺ کی صورت متمثلہ کی زیارت کی۔ اور ان کو اتنا اختیار تھا کہ وہ ہر عالم میں جہاں جسمانی علائق سے مبرا ہوتے ہیں حالت ذوق میں کلام کرتے ہیں۔

حضرت شیخ ابوالعباس مرسی سے مروی ہے کہ کہا اگر مجھ سے ایک لحظہ کے لیے جمال جہاں آراء سیّد عالم ﷺ پوشیدہ ہو جائے تو میں اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہ کروں۔ یہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کے سنن وآداب اور سلوک ومناہج میں دوامی مشاہدہ وحضور پر محمول ہے۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کے اس طریقہ ارشاد پر ہے جس میں فرمایا الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ یعنی ''احسان'' یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اور بدر اہلال نے شیخ ابوالعباس مرسی کے اس قول کے بعد کہا کہ مشائخ کرام کے کلام واقوال میں جو کچھ واقع ہے۔ اس کو جائز رکھنے کے بارے میں یہ قول ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حجاب غفلت ونسیان سے حضور در پردہ نہیں ہیں اور دائمی طور پر اعمال واقوال میں مراقبہ وحضور اور استحضار کی جہت سے مشاہدہ میں ہیں۔ اور یہ مراد نہیں لیا کہ اپنی آنکھوں سے

حضورِ انور ﷺ کی روح پیکری سے محجوب نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ محال ہے واللہ اعلم۔ مواہب لدنیہ کی عبارت کا یہ اختصار وخلاصہ ہے کہ جو انہوں نے چشمِ سر بیداری میں رویت کے انکار میں نقل کیا ہے۔

بندہ مسکین ثبتہ اللہ علی طریق الصدق والیقین یعنی شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوامی مراقبہ، حضور غلبہ شوق ومحبت، رویت بچشم خیال اور مثال کا تصور کرنا یہ اہل طلب اور اصحاب سلوک کا ایک مرتبہ ہے۔ جس سے وہ متمتع اور محفوظ ہوتے ہیں۔ سلسلہ کلام صورت ومثال کی رویت پر چل رہا ہے۔ جیسا کہ خواب میں جائز ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا جو ہر شریف متصور ومتمثل ہو جائے اور اس میں شیطان کے متصور ومتمثل ہونے کا شبہ تک نہ رہے۔ یہ بات بیداری میں بھی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ سونے والا نیند میں دیکھتا ہے۔ جاگنے والا بیداری میں دیکھتا ہے؟ ''بہجۃ الاسرار'' کی حکایت سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کئی ہزار بنی اسرائیل کے ساتھ احرام باندھتے، تلبیہ پڑھتے اور حج کرتے دیکھا ہے۔ اس کیفیت کو بھی خواب اور یقین میں مبالغہ پر محمول کرنا ظاہر کے خلاف ہے۔ تمثیل ملکوتی بصورت ناسوتی یعنی انسانی شکل میں فرشتوں کا آنا حقیقت امری ہے اس سے یہ مستلزم نہیں کہ حضورِ انور ﷺ قبر شریف سے نکل آئے ہوں گے۔ اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ بیداری میں دیدار سے مشرف ہونے والوں کو ''اصلاحی صحابہ'' کہا جائے۔ لیکن بعض وجوہ میں یہ صحابی کے حکم میں ضرور ہوں گے۔ اور اگر عالم حسی سے غلبہ ذکر کی وجہ سے غیبوبیت ثابت کریں اور نیند وخواب کا اثبات نہ کریں تو کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اس لیے کہ نیند نام ہے دماغ میں غلبۂ رطوبت مزاجی کی وجہ سے حواس کے معطل ہو جانے کا۔ اور اس جگہ حواس کی غیبوبیت، ذکر شہود کے غلبہ کی وجہ سے ہے اور یہ بیداری میں ہے نہ کہ نیند میں۔

خلاصہ مبحث یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو بعد از رحلت دیکھنا مثالی ہے جیسا کہ نیند میں دیکھا جاتا ہے۔ اسی طرح بیداری میں بھی مشرف ہوا جا سکتا ہے اور وہ وجود مبارک جو مدینہ منورہ میں اپنی قبر شریف میں آسودہ ہے وہی متمثل ہوتا ہے۔ اور ایک آن میں متعدد مقامات پر جلوہ افروز ہوتا ہے جو عوام کو خواب میں اور خواص کو بیداری میں دیدار سے مشرف فرماتا ہے۔ صاحب مواہب لدنیہ خود فرماتے ہیں کہ جو شخص اولیائے کرام کی کرامتوں کی تصدیق کرتا ہے اور یہ کہ اولیائے کرام اس قابل ہیں کہ ان پر زمین وآسمان کی کی ہر چیز بے شک وشبہ منکشف ہو جائے۔ تو یہ دیدار بھی اسی قبیل سے ہے اور امام غزالی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ عوام میں سے ہر وہ شخص جو کچھ خواب میں دیکھتا ہے اسے خواص حالت بیداری میں پاتے ہیں اور عوام جو کچھ محنت ومشقت سے حاصل کرتے ہیں اولیاء کرام ان کو اللہ تعالیٰ کی موہبت یعنی عطا سے پاتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ.

تنبیہ: اگرچہ حضورِ اکرم ﷺ کا خواب میں دیدار سے مشرف ہونا حق وثابت ہے لیکن علماء فرماتے ہیں کہ خواب میں جو کچھ از قبیل احکام سنے اس پر عمل نہ کرے۔ یہ اس بنا پر نہیں کہ رویت میں کوئی شک وتردد ہے بلکہ اس لیے ہے کہ خواب میں یعنی نیند کی حالت میں ضبط وحفظ ناپید ہے۔ جیسا کہ علماء فرماتے ہیں اور احکام سننے سے مراد ایسے شرعی احکام ہیں جو دین وشریعت کی مخالف ہوں (ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔) ورنہ بعض وہ علوم جو اس قبیل سے نہیں ہیں ان کے ماننے اور ان پر عمل کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ بکثرت محدثین کرام نے احادیث کریمہ کی تصحیح حضورِ اکرم ﷺ سے کی ہے اور عرض کیا ہے کہ کیا فلاں حدیث آپ سے روایت کی گئی ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ہاں یا نہیں۔ اور بیداری میں رویت سے بھی مشائخ نے استفادہ علوم کیا ہے (واللہ اعلم)۔

اسم مبارک پر نام رکھنا: انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے اسم مبارک پر نام رکھنا مبارک ونافع اور دنیا وآخرت میں حفاظت میں لینے والا ہے۔ چنانچہ سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: بارگاہِ حق میں دو

بندے کھڑے کیے جائیں گے اس پر حق تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کرنے کا حکم فرمائے گا۔ یہ دونوں بندے عرض کریں گے اے خدا کس چیز نے ہمیں جنت کا اہل اور مستحق بنایا حالانکہ ہم نے کوئی نیک عمل نہیں کیا بجز اس کے کہ تیری رحمت سے ہم جنت میں جانے کے امیدوار تھے۔ اس پر اللہ رب العزت جل وعلیٰ فرمائے گا تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس لیے کہ ہم نے اپنی ذات کی قسم اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ میں اسے ہرگز جہنم کی آگ میں نہ بھیجوں گا جس کا نام احمد یا محمد ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ سے فرمایا: مجھے قسم ہے اپنے عزت وجلال کی کسی ایک پر عذاب نہ کروں گا جس کا نام تمہارے نام پر ہے۔ سیّدنا علی ابن طالب کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ فرمایا کوئی دسترخوان نہیں ہے کہ بچھایا گیا ہو اور اس پر لوگ کھانے کے لیے آئیں اور ان میں احمد یا محمد کے نام والے ہوں مگر یہ کہ حق تعالیٰ اس گھر کو جس میں یہ دسترخوان کھانے کا بچھایا گیا ہوا سے روزانہ دو مرتبہ پاک نہ فرمائے۔ اسے ابو منصور دیلمی نے روایت کیا۔ نیز یہ بھی مروی ہے کہ کوئی گھر نہیں ہے جس میں نام محمد والے ہوں مگر یہ کہ حق تعالیٰ انہیں برکت دے۔ ایک حدیث میں ہے جو قوم کسی مشورہ کے لیے جمع ہوئی اور ان میں کوئی شخص ایسا موجود ہے جس کا نام محمد ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے نام میں برکت عطا فرمائے گا۔ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس کا نام محمد ہو گا حضور اس کی شفاعت کریں گے اور جنت میں داخل کرائیں گے۔ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

فان لی ذمته منه بِتَسْمِيَتِیْ محمد وهو اوفی الخلق بالدمم

صاحب مدارج النبوۃ نے ایک مرتبہ خواب میں حضور غوث الثقلین ؓ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ حاضرین مجلس نے عرض کیا کہ محمد عبدالحق (محدث دہلوی رحمۃ اللہ) سلام عرض کر رہے ہیں۔ حضور غوث پاک کھڑے ہو گئے اور معانقہ فرمایا اور فرمایا کہ تم پر آتش دوزخ حرام ہے۔'' بظاہر یہ بشارت اسی نام رکھنے کی برکت کا نتیجہ میں ہے۔ کیونکہ علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ بعض علماء اسم مبارک اور آپ کی کنیت دونوں کو جمع کر کے نام رکھنے کو منع فرماتے ہیں اور ایک ایک کر کے رکھنے کو جائز کہتے ہیں۔ (یعنی یا تو ابوالقاسم نام رکھو یا محمد نام رکھو) یہ قول زیادہ صحیح ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کئی مذہب ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ مطلقاً ممنوع ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مطلقاً جائز ہے اور تیسرا مذہب یہ ہے کہ ابوالقاسم نام رکھنا اس شخص کے لیے جائز ہے جس کا نام محمد نہیں ہے۔ اور جو حضرات مطلقاً جائز کہتے ہیں وہ ممانعت والی حدیثوں کو حضور اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کی حالت کے ساتھ مخصوص ومقید کرتے ہیں۔ یہ قول اقرب الی الصواب ہے۔ (انتہیٰ)۔

بارگاہِ نبوی میں بلند آوازی کی ممانعت: انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حدیث رسول پڑھتے وقت غسل کرنا اور خوشبو ملنا مستحب ہے۔ حدیث رسول ﷺ کو پڑھتے وقت آواز کو پست کیا جائے۔ جس طرح کہ حیاتِ طیبہ میں جب گفتگو ہوتی تو آواز پست رکھی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ اے ایمان والو نبی کی آواز سے اونچی اپنی آوازوں کو نہ بلند کرو۔

اس لیے کہ آپ کا کلام اور حدیث پاک مروی وماثور ہے اور یہ آپ کے بعد عزت ورفعت میں آپ ہی کی آواز کی مانند ہے۔ اور یہ بھی لازم ہے کہ کسی اونچی اور بلند جگہ پر پڑھا جائے۔

حضرت مطرف سے مروی ہے کہ جب لوگ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے تو پہلے باندی کو بھیج کر دریافت کراتے

کہ شیخ سے کیا چاہتے ہو؟ آیا حدیث پاک یا مسائل شرعیہ؟ اگر لوگ مسائل کہتے تو فوراً باہر تشریف لے آتے۔ اور ان کو مسائل تعلیم فرماتے ایک اور روایت میں یہ ہے کہ آپ اندر ہی سے مسائل کے جواب بھیج دیتے اور اگر لوگ حدیث پاک سننے کی استدعا کرتے تو پہلے آپ غسل خانے میں جاتے غسل کرتے سفید لباس پہنتے' سر پر عمامہ باندھتے۔ چادر اوڑھتے' خوشبو لگاتے' کرسی رکھی جاتی پھر آپ باہر تشریف لاتے اور کرسی پر جلوس فرماتے۔ اور عود وعنبر کی دھونی لگائی جاتی اور خشوع ووقار کے ساتھ حدیث مبارک پڑھتے حالانکہ قرأتِ حدیث مبارک فرمانے کے سوا آپ کرسی پر نہ بیٹھا کرتے تھے۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ امام مالک رحمتہ اللہ نے یہ روش حضرت سعید بن مسیّب سے حاصل فرمائی تھی۔

حضرت قتادہ اور مالک اور دوسری جماعت بے وضو قرأتِ حدیث کو مکروہ جانتے تھے۔ حضرت اعمش کی تو یہ عادت تھی کہ جب یہ بے وضو ہو جاتے تو تیمّم کر لیتے تھے۔ اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے ذکر مبارک' حدیث مبارک' اسم مبارک اور آپ کی سیرت پاک کے سننے کے وقت ویسا ہی احترام' تعظیم' اور توقیر لازم ہے۔ جیسی کہ آپ کی مجلس مبارک کی حاضری میں تھی۔

کسی آنے والے کی خاطر قرأت حدیث کے وقت کھڑا نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ حضور کے ادب واحترام پر دوسرے کو ترجیح ملتی ہے۔ اور یہ کہ غیر کی طرف متوجہ ہونے سے آپ کی حدیث میں رکاوٹ لازم آتی ہے۔ خاص کر فساق وفجار اور مبتدع لوگوں کے لیے تو ہرگز نہ کھڑا ہو۔ سلف صالحین کی یہ عادت مستمرہ تھی کہ احترام حدیث نبوی ﷺ کی خاطر نہ حدیث میں قطع کرتے اور نہ حرکت کرتے اگرچہ ان کے جسموں پر کوئی آفت یا ضرر ہی کیوں نہ پہنچتا۔ منقول ہے کہ ایک مرتبہ امام مالک رحمتہ اللہ کے جسم مبارک پر بچھو نے سترہ مرتبہ ڈنک مارا' مگر آپ نے جنبش تک نہ کی اور صبر وتحمل فرماتے رہے۔ اور حدیث نبوی ﷺ کی تعظیم وتوقیر کی خاطر حدیث کو قطع نہ کیا۔ اسے ابن الحاج نے ''المدخل'' میں بیان کیا ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نے حضورِ اکرم ﷺ سے ایک لمحہ کے لیے ملاقات کی یا آپ کی مجلس مبارک میں بیٹھا اور ایک لحظہ اور ایک نظر جمال مبارک کو دیکھا اس کے لیے صحابیت ثابت ہے۔ علماء اسے حضور ﷺ کے خصائص میں لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عرف وعادت میں تو طویل عرصہ رہنے اور عرصہ دراز تک ہم نشینی حاصل ہونے کو مصاحبت کہتے ہیں مگر یہاں ایک لحظہ اور ایک نظر بھی میسر آ جاتے تو صحابیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور بقول صحیح ومختار ایسے ہی کو صحابی کہتے ہیں۔

علماء نے بکثرت ایسے خصائص کا بھی ذکر کیا ہے جو حضورِ اکرم ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً نیند سے وضو کا نہ ٹوٹنا اور شیطان کا متمثّل نہ ہونا اور جماہی وغیرہ کا نہ آنا وغیرہ۔ ممکن ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کو بیک نظر جمال انور دیکھنے اور صحبت اختیار کرنے سے نورانیت اور کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہ صفات ان میں ظاہر ہو جاتی ہوں۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ حضو انور ﷺ کی محض ایک نظر مبارک کی یہ تاثیر ہے کہ بیوقوف نادان پر پڑ جائے تو وہ حکمت ودانائی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور قوت القلوب میں ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ کے جمال جہاں آرا پر ایک نظر پڑنے سے ایسا کچھ نظر آنے لگتا ہے اور ایسے ایسے انکشافات ہونے لگتے ہیں جو متعدد چلوں اور مراقبوں سے نہیں حاصل ہو سکتے۔ حضور سید الانبیاء ﷺ کے یہ ایسے خصائص ومعجزات ہیں جو کسی دوسرے نبی میں نہ تھے۔ اسے بھی حضور کے خصائص میں شمار کیا ہے۔

نیز یہ بھی منجملہ خصائص میں سے ہے کہ حضور ﷺ کے تمام صحابہ کرام عادل ہیں کیونکہ ان کی مدح وتعدیل میں کتاب وسنت واضح طور پر شاہد ہیں ان کی عدالت میں کسی ایک کے بارے میں بھی کسی کو کلام نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث کی تمام راویوں میں تنہا صحابی کی (منفرد) روایت کو فرد وغریب نہیں کہتے۔ بلکہ صحابہ کے بعد تابعین اور ان کے بعد کے راویوں میں فرد وغریب بولا جاتا ہے۔ اہل سنت

وجماعت کا تمام صحابہ کے عادل ہونے پر اجماع ہے اگر چہ ان میں سے بعض پر فتنوں اور شورشوں کی نسبت ہے۔ مگر حسن ظن کی بناء پر کہتے ہیں کہ شورشیں اور فتنے ان کے اجتہاد اور تاویل میں خطا واقع ہونے کی بناء پر ہوئے ہوں گے۔ ان کے فضائل وکمالات میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حضور کے اوامر اور نواہی کو غایت درجہ بجالاتے' حضور ﷺ کی صحبت میں حاضر رہتے۔ غزوہ جہاد میں حضور کے ہمرکاب رہتے' ممالک واقالیم کے فتح کرنے' لوگوں میں احکام وہدایت کرتے' نماز وروزہ اور زکوٰۃ وغیرہ عبادات میں ہمیشہ مشغول رہتے اسمیں کوئی اشتباہ نہیں پایا جاتا۔ ان صحابہ کرام میں جرأت وشجاعت' بخشش وکرم اور اخلاق حمیدہ کے ایسے صفات کمال تھے کہ گزشتہ امتوں میں سے کسی امتی کو حاصل نہ تھے۔

نیز جمہور علماء کا مذہب ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خیار امت اور افاضل ملت ہیں اور ان کے بعد والوں میں سے کوئی بھی ان کے مرتبہ ومقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور بعض علماء نے جیسے حضرت ابن عبداللہ (جو کہ مشہور محدثین میں سے ہیں) اور ان کی مانند اوروں نے بھی ان کے بارے میں یہی کہا ہے کہ اس جماعت میں وہ کون ہوگا جو ان کے بعد آئے۔ اور ان کے کمالات علمی وعملی میں ان سے افضل ہو؟ بعض صحابہ سے ارتکاب گناہِ کبیرہ ہوا۔ اور ان پر حد شرعی قائم کی گئی۔ ابن عبداللہ نے ان حدیثوں سے استدلال کیا۔ جو آخر امت کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔ اور بعض محدثین کہتے ہیں کہ صحابہ کی افضلیت اور سب سے بہتر ہونے کی فضیلت ان صحابہ کبار کے ساتھ خاص ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کی صحبت میں طویل عرصہ حاضر رہے۔ اور انہوں نے حضور سے بہت استفاضہ اور استفادہ کیا۔ قول مختار پہلا ہی قول ہے۔ اور حق یہ ہے کہ حضور ﷺ کی رویت کی فضیلت اور یقین کا حاصل ہونا اور بالمشاہدہ ایمان سے مشرف ہونا صحابہ کرام ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا ایسی فضیلت نہیں رکھتا۔ اور وہ حدیثیں جو آخر امت کی فضیلت میں وارد ہیں ان کی حیثیت اور ہے۔ کیونکہ ان کا ایمان بالغیب ہے۔ جیسا کہ ''یومنون بالغیب'' (بے دیکھے ایمان لائیں) کی تفسیر میں مفسروں نے بیان کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

انہی خصائص میں سے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مصلی یعنی نماز پڑھنے والا نماز میں یا درود وسلام بھیجنے والا حضورِ انور ﷺ کو صیغۂ خطاب سے اپنے قول میں ''السلام علیک ایہا النبیؐ'' سے مخاطب کرتا ہے۔ آپ کے سوا کسی اور کو ایسے صیغۂ خطاب سے مخاطب نہیں کرتا۔ اگر اس خطاب سے یہ مراد ہے کہ حضورِ انور ﷺ کے سوا کسی اور پر خاص کر کے سلام بھیجنا واقع نہیں ہوا ہے تو یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث مبارک کے موافق ہے جس میں مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب ہم حضورِ انور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تو ہم کہتے ''السلام علی اللہ' السلام علی جبریل' السلام علی میکائیل' السلام علی فلان'' پھر جب حضور نماز سے فارغ ہوئے تو اپنا رخ انور ہماری طرف پھیر کر فرمایا ''السلام علی اللہ'' نہ کہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود سلام ہے یعنی ہر نقص سالم ومحفوظ جو خوف واحتیاج کا وہم پیدا کرتا ہے بے معنیٰ ہے۔ لہٰذا جو کوئی تم میں سے نماز کے قعدہ میں بیٹھے تو وہ کہے کہ **التحایت اللہ ولاصلوات والطیبات السلام علیك ایها النبی ورحمته اللہ وبرکاته السلام علینا وعلی عباد اللہ الصالحین.''**

جب بندے نے یہ کلمات کہے تو خدا کے ہر صالح بندے کو خواہ آسمان میں ہو یا زمین میں سلام پہنچتا ہے۔ (آخر حدیث تک) لہٰذا اس جگہ خصوصیت کے ساتھ حضورِ اکرم ﷺ پر سلام کا پیش کرنا واقع ہے اور دوسروں کو عمومیت کے زمرہ میں رکھا ہے۔ اور اگر ''التحیات'' میں باوجود غیبوبیت نظر کے حضورِ اکرم ﷺ کو صیغہ خطاب سے سلام عرض کرنا خصائص سے مراد لیں تو اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ علماء فرماتے ہیں چونکہ شب معراج میں صیغہ خطاب سے رب العزت جل وعلیٰ کی جانب سے حضورِ اکرم ﷺ پر وارد ہوا تھا۔ اس کے بعد اسی صیغہ کو بحالہ برقرار رکھا گیا۔ اور ''کرمانی شرح صحیح بخاری'' میں کہا گیا ہے کہ رسول ﷺ کی رخصت کے بعد

صحابہ کرام السلام علی النبی کہتے تھے نہ کہ صیغہ خطاب سے (واللہ اعلم)۔

بعض عرفاء کے کلام میں واقع ہوا ہے کہ نمازی کا التحیات میں صیغہ خطاب سے حضور پر سلام عرض کرنا حضورِ اکرم ﷺ کی روح مقدس کے شہود وملاحظہ کرنے اور تمام موجودات میں روح مقدس کے ذراری سرایت کرنے خصوصاً نمازیوں کی روحوں میں جلوہ فگن ہونے کی بناء پر ہے۔ غرضیکہ نماز کی حالت میں حضورِ اکرم ﷺ کے شہود وحضور اور وجود گرامی سے جلوہ فگن ہونے سے غافل و بے خبر نہ رہنا چاہیے۔ اور امید رکھنا چاہیے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی روح پُر فتوح پر فیوضات وارد ہوں۔ اور انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ ہر اس شخص پر واجب ہے جسے حضورِ انور ﷺ پکاریں کہ وہ جواب میں حاضر ہو۔ اگرچہ وہ نماز میں ہو جیسا کہ سعید بن معلٰی کی حدیث شاہد وناطق ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ میں نماز میں تھا کہ حضورِ انور ﷺ نے پکارا میں نے جواب نہیں دیا۔ پھر میں نے نماز کے بعد بارگاہ قدس میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز میں تھا جواب عرض نہ کر سکا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالٰی نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ

اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ   اللہ اور رسول جب تمہیں پکاریں تو فوراً حاضر ہو کر قبول کرو بایں وجہ کہ تم دوست رکھتے ہو۔

لہٰذا حضورِ اکرم ﷺ کی اجابت فرض ہے اور اس کے ترک سے گنہگار ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ نماز باطل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ تو ''صاحب مواہب'' فرماتے ہیں کہ علماء شوافع اور دیگر حضرات نے یہ تصریح کی ہے نماز باطل نہیں ہوتی۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ باطل ہو جاتی ہے بہر حال حدیث سے کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی (واللہ اعلم)۔

انہی خصائص میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پر جھوٹ باندھنا دوسروں پر جھوٹ باندھنے کے برابر نہیں ہے۔ لہٰذا جو شخص حضورِ اکرم ﷺ پر جھوٹ باندھے اس سے کبھی کوبھی کوئی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ اگرچہ وہ جھوٹ سے توبہ کر لے جیسا کہ محدثین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر ؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھا اس پر حضورِ انور ﷺ نے حضرت علی اور حضرت زبیر ؓ کو بھیجا اور فرمایا ''جاؤ اگر وہ تمہیں مل جائے تو اسے قتل کر دو'' شیخ محمد جوینی جو کہ امام الحرمین کے والد ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ پر قصداً جھوٹ باندھنا کفر ہے لیکن ان کے اس قول میں ائمہ کرام نے موافقت نہیں کی ہے اور حق پر ہے کہ حضورا کرم ﷺ پر عظیم ترین بدی اور گناہ کبیرہ ہے مگر کافر نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اسے حلال نہ جانے اور توبہ اگر صحیح ہو اور اس کے آثار وقرائن ظاہر وعیاں ہوں تو مقبول ہے اور شہادت وروایت کے درمیان فرق نہیں ہے۔ (واللہ اعلم)۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ انور ﷺ ہر قسم کے گناہ کبیرہ ہوں یا صغیرہ۔ عمداً ہوں یا سہواً ہر ایک سے معصوم ہیں۔ یہی مذہب مختار ہے اور ایسی ہی عصمت تمام انبیاء علیہم السلام میں ہے۔ اس کی تفصیل علم کلام کی کتابوں میں ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر جنون، دیوانگی اور طویل بے ہوشی کی نسبت جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ عیب ونقص ہے۔ اسی طرح تمام نبیوں پر بھی یہ جائز نہیں ہے۔ علامہ سُبکی علیہ الرحمتہ نے اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بے ہوشی دوسروں کی بے ہوشی کے برخلاف ہے اور یہ کہ درد والم کا غلبہ، ظاہری حواس پر ہوتا ہے نہ کہ دل پر۔ اس لیے کہ حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی آنکھیں محو خواب ہوتی ہیں نہ کہ ان کے دل۔ جب کہ ان کے دلوں کو نیند وخواب سے جو کہ بے ہوشی سے بہت ہی ہلکا اور سبک تر ہے۔ اس سے محفوظ رکھا گیا ہے تو بے ہوشی سے وہ بطریق اولٰی محفوظ ہوں گے۔ نیز علامہ سبکی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام پر نابینائی یعنی آنکھوں کی روشنی کا زائل ہو جانا بھی جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ نقص وعیب ہے اور کوئی نبی بھی اعمٰی ونابینا کبھی نہیں

ہوئے۔ اور وہ جو حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہے وہ ثابت نہیں ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی چشم مبارک پر پردہ آ گیا تھا جس نے روشنی کو ڈھانپ لیا تھا۔ (امام فخر الدین رازی) ارشاد باری تعالیٰ: وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ (ان کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "ان پر گریہ وبکا غالب ہو گیا اور غلبۂ گریہ وبکا کے وقت ان کی آنکھ میں بہت پانی آ جاتا گویا کہ وہ سفید ہو گئیں اور وہ سفیدی پانی سے تھی۔ یہ اس قول کی صحت پر دلیل ہے۔ کیونکہ غلبۂ بکا میں غم اثر انداز ہوتا ہے نہ کہ نابینائی کے حصول میں۔ اس کے بعد امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کیا وہ کلیۃً نابینا ہو گئے تھے۔ بعد ازاں حق تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص مبارک سر مبارک پر ڈالتے وقت بصارت واپس لوٹا دی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ کثرت بکا وحزن سے ان کی بصارت کمزور ہو گئی تھی۔ اور وہ بصارت کی کمزوری کو محسوس فرماتے تھے۔ پھر جب حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص مبارک ان کے چہرۂ انور پر ڈالی گئی تو ان کی بصارت قوی ہو گئی۔ اور کمزوری جاتی رہی۔ (انتہیٰ کلامہ)۔

علامہ سبکی علیہ الرحمۃ نے نابینائی کے جائز نہ ہونے کی علت اس کا نقص وعیب ہونا قرار دیا ہے۔ تو انبیاء علیہ السلام پر ایسے امراض میں مبتلا ہونا جو نقص وعیب ہیں ان کے اطلاق پر بھی یہ حکم داخل ہے۔ خصوصاً وہ ابتلاء وامتحان جو حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں عارض ہیں (ان کے لیے ایسے مرضوں کے نسبت جو موجب نقص وعیب ہیں، جیسے کوڑھ، جذام، نابینائی ان کا گھوڑے پر ڈالنا وغیرہ ان سب کی نسبت جائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب امراض منافی شان نبوت اور موجب نقص ونفرت ہیں انبیاء علیہم السلام ان سب باتوں سے معصوم ہیں۔ فافہم۔ مترجم) اسی طرح حضرت شعیب علیہ السلام کی نابینائی کا قصہ باوجود عدم ثبوت کے ان سے اس کی نسبت کرنا سراسر تحکم اور دیدہ دلیری ہے۔ البتہ! حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت کے بارے میں صحیح ہے اس لیے حق تعالیٰ نے فرمایا فدرتد بصر (تو ان کی بصارت لوٹ آئی۔) مقاتل فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے چھ سال تک کچھ نہیں دیکھا حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص سے ان کی بصارت واپس آئی۔ امام فخر الدین رازی کا قول ہے کہ تاثیر حزن غلبہ بکا میں ہے نہ کہ حصول عمیٰ میں، تو اس کا جواب یہ ہے تاثیر حزن غلبۂ بکا میں ہے اور تاثیر غلبۂ بکا عمیٰ میں ہے۔ لہٰذا تاثیر حزن کے واسطہ سے عمیٰ بکا ہو گیا۔ مشہور ہے کہ کوئی نبی گونگا نہ ہوا۔ البتہ! ان میں سے بعض اعمیٰ ہوئے ہیں (واللہ اعلم)

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جو بھی نبی کریم ﷺ کو دُشنام دیتا ہے یا کسی قسم کی تنقیص وتوہین کرتا ہے خواہ صراحۃً ہو یا کنایۃً۔ اس کا قتل کرنا واجب ہے اس میں سب کا اتفاق ہے۔ البتہ! اختلاف اس میں ہے کہ یہ قتل کرنا بہ طریق حد ہے۔ اور فی الفور قتل کر دینا چاہیے اور اس سے توبہ کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے۔ یا بہ طریق ردت یعنی مرتد ہو جانے کی وجہ سے ہے کیونکہ مرتد سے توبہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اور اگر توبہ کر لے تو بخش دیا جاتا ہے مگر پہلا قول مختار ہے اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ وہ مسلمان ہو اور اگر کافر ہے اور اسلام لے آئے تو درگزر کیا جائے گا۔ یہ بحث آخر کتاب میں تفصیل سے آئے گی۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ احکام میں جس کے لیے جو چاہیں تخصیص فرما دیں۔ اس جگہ دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ کی طرف احکام مفوّض ہو نگے۔ (یعنی تفویض احکام میں آپ مختار ہو نگے۔) جو چاہیں آپ حکم فرما دیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ کسی کے لیے جدا وحی آتی ہو گی۔ چنانچہ حضرت خزیمہ بن ثابت ؓ کے لیے تخصیص فرمائی کہ ان کی ایک شہادت دو شہادتوں کا حکم رکھتی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک بدوی سے حضور نے ایک گھوڑا خریدا تھا پھر وہ بدوی گھوڑے کی فروختگی سے منکر ہو گیا۔ اور کہنے لگا کوئی ایسا گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے میں نے اسے آپ کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جو بھی مسلمان آتا وہ بدوی سے کہتا "افسوس ہے تجھ پر۔ خدا کا نبی نہیں فرماتا مگر حق۔"، لیکن بدوی کسی کی بات نہ مانتا۔ یہاں تک کہ حضرت خزیمہ آئے اور انہوں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں

کہ تو نے فروخت کیا ہے۔'' حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اے خزیمہ تم کیسے گواہی دیتے ہو حالانکہ میں نے تمہیں گواہ نہیں بنایا اس پر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کی آسمان کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں تو کیا ہم اس بدوی پر تصدیق نہ کریں۔'' بنا بریں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خزیمہ کی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا۔ اور اس فضلیت میں انہیں مخصوص فرمایا۔ خطابی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو بہت سے لوگوں نے غیر محل پر محمول کیا ہے اور اہل بدعت کے ایک گروہ نے اپنے کسی معروف و جانے پہچانے شخص کی گواہی کو حلال بنانے میں ذریعہ بنایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک وہ شخص معروف جو بھی دعویٰ کرے وہ صادق (بلا ثبوت شرعی سچا) ہے۔ حالانکہ حدیث کی وجہ یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے بدوی پر اس کے اپنے علم پر حکم فرمایا اور حضرت خزیمہ کی گواہی کو اپنے قول کی تاکید اور مخالف پر حصول غلبہ کے قائم مقام بنایا اس بنا پر معنیٰ ہیں میں دو گواہوں کے حکم میں ہو گیا۔ (فافہم)۔

اسی طرح حضورِ اکرم ﷺ نے ام عطیہ کو جو فضلائے صحابیات میں سے ہیں بعد نزول آیہ مبایعت نساء کیونکہ اس جگہ واقع ہے وَلاَ يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ (نیکی میں نافرمانی نہ کرنا) انہیں نوحہ کی رخصت عطا فرمائی۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! آل فلاں (یعنی فلاں قبیلہ) زمانہ جاہلیت میں نیاحت پر میری مدد کرتی تھیں۔ اب مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ موافقت کروں اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے ام عطیہ کو نیاحت میں رخصت دی۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ ام عطیہ کو رخصت عطا فرمانا اور نیاحت میں (خاص فلاں قبیلہ کے لیے) انہیں مخصوص کرنا ہے اور شارع کو حق پہنچتا ہے کہ جس کے لیے جو چاہے خاص فرما دے۔

اسی طرح حضرت اسماء بنت عمیس کو ان کے شوہر حضرت جعفر بن ابی طالب کے سوگ کو ترک کرنے پر نہیں رخصت عطا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: تین دن تک ماتمی لباس پہنو اور سوگ کرو۔ اس کے بعد جو چاہو کرو۔

اسی طرح حضرت ابو بردہ بن نیاز کو قربانی کے لیے جذعہ بزغا یعنی بکری کے اس بچہ کو جس پر سال پورا نہ ہوا ہو اسکی قربانی دینے کو جائز قرار دیا۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا جو نماز عید سے پہلے قربانی کرے اس کی قربانی شمار نہ ہو گی۔ حضرت ابو بردہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ میں ایک بکری رکھتا تھا میں نے اس کے ذبح کرنے میں جلدی جلدی (یعنی نماز عید سے پہلے ذبح کر دیا) اور عرض کیا کہ میں نے خیال کیا کہ چونکہ آج کا دن کھانے پینے کا ہے تو میں نے اپنے اہل وعیال اور اپنے ہمسایوں کو کھلا دیا اور اب میرے پاس سوائے بزغالہ کے کوئی جانور نہیں ہے مگر وہ بزغالہ (ایک سال سے کم بکری کا بچہ) فربہ اور دنبہ سے بہتر گوشت رکھتا ہے کیا میری طرف سے اس کی قربانی کفایت کرے گی۔'' حضور ﷺ نے فرمایا تمہاری طرف سے وہ کفایت کر لے گا مگر تمہارے سوا دوسروں کے لیے نہیں۔

اسی طرح حضورِ انور ﷺ نے ایک عورت کا نکاح ایک مرد سے اس چیز کے مقابلہ میں جو وہ مرد قرآن سے تعلق رکھتا تھا جس کا ذکر قرآن پاک میں اس طرح ہے اِمْرَاَۃً وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ. ایک عورت نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں نے اپنے آپ کو حضور پر ہبہ کر دیا۔ حالانکہ یہ حضور کے لیے جائز تھا مگر حضور نے قبول نہ فرمایا۔ پاس ہی ایک مرد مسکین کھڑا تھا اس نے کہا یا رسول اللہ اگر یہ عورت آپ کے قابل نہیں ہے تو اس کا عقد میرے ساتھ کر دیجئے۔ فرمایا: مہر میں دینے کے لیے کچھ تمہارے پاس ہے۔ کہا میرے پاس اس پہنے ہوئے تہبند کے سوا کچھ نہیں ہے فرمایا تلاش کرو خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔ عرض کیا قرآن مجید کی ان چند سورتوں کے سوا جو کہ یاد ہیں میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ فرمایا قرآن کا جتنا حصہ تجھے یاد ہے اس کے عوض نکاح کر لو۔ تم اسے تعلیم دینا اور اسی کو اپنا مہر قرار دے لو۔ حالانکہ تمہارے بعد کسی کے لیے قرآن نہ ہو گا۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور کو دو آدمیوں کے برابر بخار چڑھتا تا کہ اجر و ثواب دو گنا ملے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ انور ﷺ کی بیماری میں حضرت جبریل علیہ السلام آپ کی عیادت اور احوال شریف کی پرسش کے لیے تین روز آئے۔ انہی خصائص میں یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی نماز جنازہ (جوکہ محض صلوٰۃ وسلام عرض کرنا تھا) بغیر امامت کے مسلمانوں کی فوج درفوج نے ادا کی اور یہ کہ بعد از وفات تین دن کے بعد دفن کیا گیا اور آپ کی لحد شریف میں اس قطیفہ کو بچھایا گیا جو آپ کے نیچے بچھا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں حضور ﷺ کی سوا کسی کے لیے جائز نہیں۔ (یعنی نہ بغیر امامت کے نماز جنازہ اور نہ لحد میں کسی چادر وغیرہ کا بچھانا) بعض کہتے ہیں کہ لحد میں قطیفہ یعنی مخملی چادر کا بچھانا رسول اللہ ﷺ کے غلام شقران کی جانب سے تھا۔ جس کا صحابہ کو علم نہ تھا یہ اس لیے کہ کوئی اور اس چادر کو اپنے نیچے نہ بچھائے۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد زمین تاریک ہوگئی جیسا کہ اپنے مقام پر اس کی تفصیل آئے گی۔ انہی خصائص میں سے یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ کے جسد شریف کو زمین نہیں کھاتی اسی طرح تمام انبیاء علیہم کے اجساد طیبہ کو زمین نہیں کھاتی۔ علماء نے اسے بھی حضور کے خصائص میں ہی شمار کیا ہے۔ حالانکہ بعض اولیاء امت کے بارے میں بھی وہ نقل کرتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ علی متقی کی قبر کو ایک خاص تقریب کے موقع پر کھولا گیا تو وہ اسی طرح درست، کفن کے ساتھ باقی تھے۔ وہ تقریب یہ تھی کہ ان کے بھتیجے نے جو کہ جوان اور صالح تھے خواہش ظاہر کی کہ انہیں ان کی قبر میں دفن کریں کیونکہ مکہ معظّمہ میں دستور رواج ہے کہ اموات کو بزرگوں کو قبر میں تبرکاً دفن کرتے ہیں۔

حضورِ انور ﷺ کے جسد اطہر کو زمین کے نہ کھانے سے ظاہر مطلب یہ ہے کہ یہ حیات طیبہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ حیات حضورِ انور ﷺ اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رواثت، حیات وبقا کی وجہ سے پائی نہیں گئی۔ آپ کا ترکہ آپ ہی کی ملکیت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صدقہ ہوتا ہے کہ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ" ہم جو ترکہ چھوڑیں وہ صدقہ ہے اور اس ترکہ کو انہی مصارف پر خرچ کیا جائے گا جس پر حضور خرچ فرماتے تھے۔ یعنی اہل وعیال، اولاد واحفاد، فقراء ووصایا اور مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔ جیسا کہ حضورِ انور ﷺ اپنی اس دنیاوی حیات میں خرچ فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضورِ انور ﷺ کو مباح ہے کہ اپنے تمام مال کے لیے وصیت فرمائیں اور آپ کے سوا دوسروں کے لیے تہائی مال کے سوا پر وصیت جائز نہیں ہے۔ یہی حکم تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے کہ ان کی میراث نہیں ہوتی۔ اور حق تعالیٰ کے ان ارشادات کا مطلب کہ وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَرِثُنِيْ. الخ (اے میرے رب! اپنی طرف سے میرا وارث بنا جو میری میراث لے۔) تو اس وراثت سے ارث نبوت وعلم مراد ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام بھی۔ حضورِ انور اذان واقامت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

ابن زبالہ اور ابن نجار بیان کرتے ہیں کہ ایام حرہ (یہ وہ زمانہ ہے کہ یزیدی لشکر نے مدینہ منورہ پر حملہ کرکے صدہا صحابہ کو شہید کیا۔ عورتوں کی عصمتیں پامال کیں۔ اور مسجد نبوی میں گدھے، گھوڑے باندھے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ) کے موقع پر مسجد نبوی شریف میں تین دن تک اذان نہ ہوئی اور لوگ مدینہ چھوڑ کر باہر نکل گئے تھے۔ اس وقت حضرت سعید بن میبّب مسجد نبوی شریف میں رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب ظہر کا وقت آیا تو میں متوحش وپریشان ہوگیا اور قبر انور کے پاس چلا گیا اور اذان کی آواز میں نے سنی اور نماز ظہر ادا کی۔ اس کے بعد ہر نماز کے وقت قبر شریف سے اذان واقامت کی آواز سنتا رہا یہاں تک کہ تین راتیں گزر گئیں۔ پھر جب لوگ واپس آئے تو انہوں نے بھی قبر شریف سے ویسی ہی آواز سنی جیسی کہ میں سنتا رہا۔

حضورِ اکرم ﷺ کے زندہ وحیات پر اتفاق کرنے کے بعد علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آپ قبرِ انور میں زندہ ہیں یا کسی خاص مقام میں۔ یا ہر وہ جگہ جہاں خدا چاہے۔ خواہ جنت میں یا آسمان میں یا کسی اور جگہ جیسا کہ مقید بجائے معین نہ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کے جسد شریف کو قبر میں رکھا ہے۔ ہم وہاں سے نکلنے پر کوئی دلیل نہیں رکھتے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ آپ اسی بقعہ نور میں جلوہ افروز ہیں اور اگر کوئی کہے کہ وہ بقعہ انور تنگ ہے اس میں جسد شریف کا محبوس ہونا مناسب نہیں ہے تو اس کے جواب میں وہ حدیث پیش کریں گے جس میں ہے کہ مومن کی قبر کو ہر جانب' ستر گنا کشادہ کر دیا جاتا ہے تو حضورِ اکرم ﷺ کی قبرِ انور کی کشادگی کا کیا اندازہ! اس کی وسعت تو دائرہ قیاس اور وہم وگمان سے باہر ہے۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ حضورِ انور ﷺ کی تمکن واستقرار کے لیے آپ کے بقعہ قبر سے فردوس اعلیٰ انسب واولیٰ ہے تو اس کے جواب میں کہیں کہ قبر شریف سے کون سی جنت بہتر وشریف تر ہوگی۔ (کیونکہ جنت تو حضور کے غلاموں کے رہنے کی جگہ ہے۔) اگر حضورِ انور اسی جگہ رونق افروز ہیں تو امام تقی الدین سبکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس بقعہ کو جو حضور کے اعضائے شریف سے متصل ہے تمام مقامات اور ہر جگہ سے اسے ترجیح وفضلیت دیں حتیٰ کہ کعبہ معظّمہ اور عرش عظیم سے بھی فوقیت دیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس میں کوئی مومن ومسلمان توقف کرے گا۔

ظاہر طور پر حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث کہ قبرِ انور سے اذان کی آواز سنی اور شب معراج کی وہ حدیث کہ حضور نے فرمایا کہ میں نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر شریف میں نماز پڑھتے دیکھا اس قول کی تائید کرتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کو شب معراج میں آسمان میں دیکھنے والی حدیث اور دوسری حدیث کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستر بنی اسرائیل کے ساتھ حج کرتے اور تلبیہ کرتے دیکھا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ ناظر در اطلاق مکان ہے۔

اور اگر کوئی کہے تو قرآن کریم حضورِ اکرم ﷺ کی موت پر ناطق ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ. (بیشک تمہیں انتقال فرمانا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے۔) اور حضور سیّد عالم ﷺ نے فرمایا: اِنِّىْ رَجُلٌ مَّقْبُوْضٌ. (میں ایک انتقال فرما جانے والا شخص ہوں) اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْمَاتَ (بلاشبہ محمد مصطفیٰ یقیناً انتقال فرما چکے ہیں) اور اس رحلت وموت کا اجماع ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضورِ انور ﷺ نے یقیناً موت کا درد والم اور اس کا ذائقہ چکھا اور رحلت فرما گئے لیکن بعد ازاں حق تعالیٰ نے آپ کو زندہ فرما دیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ میں خدا کے نزدیک اس سے زیادہ مکرم ہوں کہ وہ مجھے قبر میں چالیس دن سے زیادہ رکھے۔'' نیز حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے لہٰذا حضورِ اکرم ﷺ حیات جسمانی' دنیاوی اور اس بدنی حیات کے ساتھ زندہ ہیں جو آپ رکھتے تھے۔ یہ حیات شہدا کی حیات سے زیادہ کامل ہے۔ کیونکہ شہدا کی حیات روحانی اور اخروی ہے۔ اور یہ روح کے لیے ثابت ہے۔ اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ ان کی روحوں کے لیے اجسام مثالیہ اس عالم میں پیدا فرمائے یا انہیں بدنوں میں رکھے جو ان کے لیے ظروف کا حکم رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مسلمانوں کی روحیں سبز پرندوں کے جوف میں ہیں جو عرش کی قندیلوں کے نیچے آسائش پاتے ہیں یا جنت میں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی ارواح مقدسہ ان کے انہیں ابدان طیبہ میں لوٹا دی جاتی ہیں جو وہ دنیا میں رکھتے تھے۔ ان کے اجسام وابدان نہ بوسیدہ ہوتے ہیں اور نہ خاک بنتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ قادر ہے کہ ارواح کو بغیر بدنوں کے محفوظ رکھے۔ لیکن ان کے لئے بدنوں میں وجود رکھنے پر نقل وارد ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قبر میں نماز پڑھنا' کیونکہ نماز کا ادا کرنا ان کے جیتے بدن کا تقاضہ کرتا ہے۔ اور وہ صفات جو شب معراج بیاء علیہم السلام کے بارے میں مذکور ہیں وہ صفات اجسام کی ہیں ان سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حیات حقیقی ہو جو وہ دنیاوی رکھتے

تھے۔ اور کھانے پینے اور جسمانی دیگر ضروریات کی احتیاج جیسا کہ ہم دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں رکھتے ہوں بلکہ برزخ میں ان کے احکام اور ہوں۔ کھانے پینے اور دیگر جسمانی ضرورتوں کی احتیاج امر عادی ہے۔ اور وہاں کا حال بخلاف عادت ہے اور ممکن ہے کہ وہاں روائح ونسائم اور ارزاق وغیرہ روحانی ہوں جیسا کہ شہدا کی شان میں واقع ہوا ہے کہ "یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ" (رزق دیے جاتے ہیں خوش ہیں) اور اگر جنتی کھانے دیے جاتے ہوں تو عجب نہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے **یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ** (مجھے وہ کھلاتا ہے اور مجھے وہ پلاتا ہے)۔

اب رہا علم وسماع یعنی جاننا اور سننا تو ان حضرات قدس کے لیے اس کے ثبوت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے بلکہ بہ تصریح علماء کرام یہ بات تو تمام مردوں کو حاصل ہے۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ نماز پڑھتے تلبیہ کہتے اور ذکر وتسبیح کرتے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ برزخ نہ تو دار العمل ہے۔ اور نہ وہاں احکام شرعیہ پر مکلف ہے تو یہ اعمال کس لیے کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عالم برزخ میں اجر وثواب کا اجراء ہے اور اس دنیاوی احکام مثلاً کثرت عمل اور زیاتی اجر وثواب کا حکم جاری ہے۔ اور بسا اوقات بغیر تکلیف یعنی مکلف ہوئے بغیر بلحاظ تلذذ وشوق وذوق اعمال رونما ہوتے ہیں جیسا کہ نوافل وحسنات کا حال ہے۔ وہاں بھی یہی ہے۔ لہٰذا جنت میں تسبیح کریں گے۔ اور قرآن پڑھیں گے۔ چنانچہ قاری قرآن کی شان واقع ہے۔ رتل وارتقِ یعنی تلاوت قرآن کرتے ہوئے بڑھتے چلے جاؤ۔ اور اسی قبیل سے حضور کا باب شفاعت کھولنے کے وقت سجدہ فرمانا ہے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کا مال آپ کی ملک پر قائم ہے۔ اور آپ کے نفقہ پر وعدہ کیا گیا ہے۔ اور امام الحرمین نے اسے خصائص میں نقل کیا ہے کہ جو کچھ حضور نے چھوڑا ہے وہ آپ کی ملک پر باقی ہے۔ اور سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کی نیابت وخلافت کے طریقہ پر حضور کے اہل وعیال وخدام اور آپ کے تمام مصارف پر خرچ کیے جانے پر اتفاق کیا ہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ آپ کا مال آپ کی ملک پر باقی ہے۔ یہ قول تقاضہ کرتا ہے کہ دنیاوی احکام میں آپ کی حیات ثابت ہے۔ نیز حیات شہدا سے آپ کی حیات بہت زائد وارفع ہے۔ (ﷺ) اور بعض زوال ملک کے قائل ہیں۔ غرض کہ دونوں قسم کے اقوال بر بفحوائے ارشاد نبوی "مَا تَرَکْنَاهُ صَدَقَةٌ" "ہم نے جو کچھ چھوڑیں صدقہ ہے۔" حق وصادق ہے۔ واللّٰہ اعلم یہ بحث 'حیات انبیاء علیہم السلام اور حیات سیّد الانبیاء ﷺ کی مناسبت سے آگئی ہے۔ ورنہ آخر کتاب میں "باب وفات النبی" میں دونوں باتیں مستقلاً ذکر کی جائیں گی۔ اگرچہ موجب تکرار ہے مگر کوئی مضائقہ نہیں تاکہ یہ مسئلہ مؤکد ومستحکم ہو جائے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی قبر انور پر فرشتے مقرر کیے گئے ہیں۔ جو زائر کے صلوٰۃ وسلام کو پیش حضور کرتے ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد ونسائی اور حاکم نے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو ان لفظوں کے ساتھ صحیح بتایا ہے کہ

اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِکَةً سَیَّاحِیْنَ فِی الْاَرْضِ یُبَلِّغُوْنِیْ عَنْ اُمَّتِیِ السَّلَامَ

بیشک اللہ نے فرشتوں کو زمین میں پھیلا دیا ہے جو میری امت کا سلام میرے حضور لاکر پیش کرتے ہیں۔

اور اصحاب کے نزدیک بروایت عمارہ حدیث میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ایک فرشتہ ہے اسے سماعت کی ایسی قوت عطا فرمائی گئی ہے جو کسی بندے میں نہیں ہے میری امت میں جو بھی جہاں بھی مجھ پر صلوٰۃ وسلام بھیجتا ہے وہ فرشتہ اس صلوٰۃ وسلام کو میرے حضور پیش کرتا ہے۔ (ﷺ)

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے حضور امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ اور حضور ان کے لیے استغفار یعنی طلب آمرزش کرتے ہیں۔ ابن مبارک نے سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کوئی دن نہیں ہے مگر یہ کہ حضور ﷺ کی

بارگاہ میں صبح وشام امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں تو حضور انہیں ان کی پیشانیوں اور ان کے اعمال سے پہچانتے ہیں۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ فرمایا کہ مجھ پر امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے جو بد ہیں انہیں چھپاتا ہوں اور جو نیک ہیں انہیں بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہوں ''چھپانے سے'' پیش نہ کرنا مراد ہوگا۔ گویا اس پر سنت الٰہی جاری ہے کہ پیش کرنے کے بعد اعمال ثابت ہوجاتے ہیں۔ اور وہ جو پیش نہیں کیے جاتے وہ درجہ اعتبار سے محو وساقط کردئے جاتے ہیں (فافهم وباالله التوفیق.)

کعب احبار کی حدیث میں ہے کہ ہر صبح وشام حضور ﷺ کی قبر شریف پر ستر ہزار فرشتے اترتے ہیں اور مزار پرانور کا طواف کرتے ہیں اور اپنے بازوؤں کو ہلاتے ہیں۔ اور جب حضور اپنی قبر شریف سے (روز قیامت) مبعوث ہوں گے۔ تو ان فرشتوں کے جھرمٹ میں باہر تشریف لائیں گے۔ اور ان سے زفاف کریں گے'' زفاف کے اصلی معنیٰ ''دلہن کو شوہر کے گھر لیجانا ہے۔'' مگر اس جگہ لازم معنی مراد ہیں کہ محبوب کو محبّ کے حضور لے جایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتے اپنے جھرمٹ میں حضور ﷺ کو درگاہ عزت میں لے جائیں گے۔ ﷺ

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ مسجد نبوی شریف میں حضور اکرم ﷺ کا منبر مبارک آپ کے حوض شریف کے اوپر ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ میرا منبر جنت کے ترعہ میں سے ایک ترعہ ہے۔ اور ترعہ کی تفسیر باب یعنی دروازہ سے کی گئی ہے۔ اور بعض نے درجہ سے اور بعض نے باغ کے بلند جگہ ہونے سے کی ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن سیّد عالم ﷺ منبر شریف پر ایستادہ تھے۔ آپ نے فرمایا: اس وقت میرا قدم جنت کے ترعہ میں سے ایک ترعہ پر ہے۔ اور ایک اور روایت میں یہ ہے کہ فرمایا میرا منبر میرے حوض پر ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اب میں اپنے حوض کے عقر پر ایستادہ ہوں۔ عقر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے حوض میں پانی آتا ہے۔ اور اس کی تاویل میں بعض علماء کہتے ہیں کہ ''حوض پر منبر ہونا'' اس سے اس کی جانب قصد کرنے' اس سے برکت لینے اور اس کے سامنے اعمال صالحہ کو ہمیشہ بجالانے کی طرف کنایہ ہے تاکہ وہ اس طرح حوض نبوی پر آنے اور اس سے جاں فزاشستہ پانی پینے کے سزاوار نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے سرور انبیاء ﷺ اپنے اس منبر کو جو شرافت بخشتی ہے کل قیامت کو تمام خلائق کے رنگ میں اعادہ فرمائیں اور حوض کوثر کے کنارے پر رکھیں رہا اسے ''ترعہ جنت فرمانا تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ حضور انور ﷺ کی عظمت وشان کے اظہار کے لیے اسے کھڑا کریں گے۔ ایک جماعت کی تاویل یہ ہے کہ یہ اس منبر کی خبریں دی جارہی ہیں جو روز قیامت سرورِ عالم ﷺ کے لیے قائم کیا جائے گا نہ کہ یہ منبر جو مسجد نبوی شریف میں ہے۔ یہ قول تو سیاق لفظ حدیث سے بہت ہی بعید ہے۔ کیونکہ حضور فرماتے ہیں کہ میرے حجرہ اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے۔ اور میرا منبر میرے حوض پر ہے اس ارشاد وکلام کا ظاہر وروشن پہلو اسی منبر شریف کی طرف ہے۔ جو روضہ مقدسہ کی تحدید کے لیے ذکر فرمایا گیا۔ اسی طرح ''تاریخ مدینہ'' میں مذکور ہے۔

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ کسی ایک عالم نے اس حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کرنے میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ اور یہی حق ہے۔ کیونکہ مخبر صادق ﷺ نے امور غیب کی جو کچھ خبریں دیں ہیں ان پر ایمان رکھنا واجب ہے۔ انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور کے منبر اور قبر شریف کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اسے بخاری نے لفظ ''مابین بیتی ومنبری'' سے روایت کیا ہے اس مقام پر بھی علماء نے بحث کی ہے۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ روضۂ جنت یعنی جنت کی کیاری سے اس بقعہ شریف کی تشبیہ مراد ہے۔ نزول رحمت اور حصول سعادت اس شخص کے لیے جو وہاں ذکر ومجالست کو اختیار کرنے سے حاصل کرے۔ جیسا کہ مسجدوں کو ریاض جنت نام رکھنے میں ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِذَا مَرَرْتُمْ بِرِيَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوْا (جب تم ریاض جنت یعنی مسجدوں سے گزرو تو اس کے

آداب کی رعایت کرو) اس اشارہ کا پرتو بھی اسی جانب ہے۔ خصوصاً حضورِ انور ﷺ کے زمانہ سعادت نشان میں، کہ وہاں سے ثمراتِ علوم، انوار اذکار اور مجلس جنت آثار، تمام لوگ حاصل کرتے تھے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس مقام میں طاعت وعبادت بجالانا جنت میں پہنچنے کا موجب بنتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ یعنی جنت تلواروں کے سایوں میں ہے۔ اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ یعنی جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ ''مذکورہ دونوں اقوال ضعیف وبعید ہیں۔ اس لیے کہ ریاض جنت سے تشبیہ، نزول رحمت، جنتی باغوں میں پہنچنا اور ان پر ثواب کا مترتب ہونا یہ تمام مسجدوں اور ہر خیر کی جگہوں کو شامل ہے۔ یہ بشارتیں مسجد نبوی شریف اور منبر مبارک کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہیں اور اگر انہیں رحمت خاص اور جنت کے مخصوص باغ کے ساتھ محمول کریں پھر بھی بعد وتکلف سے خالی نہیں ہے۔ حق یہی ہے کہ حضور کا کلام حقیقت اور اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ اور حجرہ نبوی اور منبر شریف کے درمیان کی جگہ حقیقتاً جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے۔ بایں معنی کہ روز قیامت یہ جنت میں منتقل ہوگا۔ اور زمین کے تمام مقامات کی مانند فنا وناپید نہ ہوگا۔ جیسا کہ ابن فرحون اور ابن جوزی نے حضرت امام مالک سے نقل کیا ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت کے اتفاق کو بھی اس کے ساتھ شامل کیا ہے۔ اور شیخ ابن حجر عسقلانی اور اکثر محدثین اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اکابر علماء مالکیہ میں سے ابن ابی جمرہ نے فرمایا ہے کہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ بقعہ فی نفسہ جنت کے باغوں کی ایک کیاری ہے جسے وہاں سے دنیا کے اس مقام پر اتارا گیا ہے۔ جیسا کہ حجر اسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کی شان میں واقع ہے اور بعد از قیام قیامت پھر اسے اس کے اصلی مقام میں لے جایا جائے۔ اور نزول رحمت اور استحقاق جنت اس مقام کے فضل وعلوم مرتبت کو لازم ومترتب ہے۔ یا یہ کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت کے ایک خاص پتھر سے مرتبہ جلیلہ امتیازی شان سے عطا فرمایا گیا۔ اسی طرح حبیبِ خدا احمدِ مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کو روضة میں ریاض الجنة سے اختصاص فرمایا گیا۔ اگر وہ ظاہری آنکھوں سے تمام دنیائے ارضی کے اجزاء کی مانند نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ جب تک انسان اس دنیا میں طبیعت کے کثیف حجابوں اور بشریت کی عادت وخصلت کے حجاب میں محجوب ہے۔ اس وقت تک اس پر اشیاء کی حقیقتوں کا انکشاف اور امور آخرت کا ادراک اس سے ممکن نہیں۔ اور تمہیں یہ وہم نہ کرنا چاہیے کہ جب اس بقعہ طیبہ کی حقیقت ''روضہ من ریاض الجنة'' ہے تو تشنگی وبرہنگی وغیرہ دور ہونا جنت کے خواص اور لوازم میں سے ہے اس جگہ میں ن ہو جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ لَكَ اَنْ لَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى. بیشک تمہارے لیے جنت میں نہ بھوک ہوگی نہ برہنگی۔

اس لیے ممکن ہے کہ لوازم جنت نے اس بقعہ کے اخراج کے بعد انتقال وجدائی کی صورت قبول کر لی ہو، لہٰذا حجر اسود اور مقام ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیا کہو گے۔ اس جگہ بھی تو یہ آثار ظاہر نہیں ہیں۔

اگر تم یہ کہو اس قسم کی باتیں بغیر سماع وخبر (حدیث) ثابت نہیں ہوتیں چونکہ رکن یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیم کے لیے دلائل وشواہد بطریق تعبد وتسلیم واقع موجود ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہوگیا۔ اور ان کے سوا میں ایسا نہیں ہے تو جواب میں ہم کہیں گے کہ دلیل وشہادت خبر رسول اللہ ﷺ کے سوا نہیں ہے۔ جس طرح رکن ومقام کی حقیقت، اس صادق ومصدوق ﷺ کی خبروں سے معلوم ہوئی ہے۔ اسی طرح روضہ شریف اور منبر مبارک کا حال بھی معلوم ہوا ہے۔ اگر اس جگہ تاویل ہو سکتی ہے تو یہ دونوں جگہ ممکن ہے۔ اور اگر حقیقت کی جانب لے جاتے ہو تو بھی یہ دونوں جگہوں میں ثابت ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے لیے سب سے پہلے قبر انور شق ہوگی اور سب سے پہلے باہر تشریف لائیں گے۔ اور مبعوث ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ روز قیامت موقف میں حاضر ہوں گے۔ اور آپ ہی وہ پہلے شخص ہوں گے۔ جو ''پل

صراط‘‘ سے گزریں گے۔ اور آپ ہی وہ پہلے شخص ہوں گے جو جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کہ میں روز قیامت جنت کے دروازہ پر آؤں گا اور اسے کھلواؤں گا۔ پھر خازن جنت کہے گا **بك امرت لا افتح لاحد قبلك** مجھے آپ ہی کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے پہلے کسی کے لیے باب جنت نہ کھولوں۔ اور ممکن ہے کہ ’’بک‘‘ میں باقسم کے لیے ہو۔ یعنی قسم ہے مجھے آپ کی الخ یہ معنی احسن اور ذائقہ محبت میں زیادہ لذیز ہیں۔ اور آپ ہی وہ شخص ہیں جو جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے اور آپ ہی سب سے پہلے شفاعت کا دروازہ کھولیں گے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ براق پر سوار محشور ہوں گے۔ اور آپ کو جنت کے نفیس ترین جوڑوں میں سے سب سے اعلیٰ خلعت ولباس عطا فرمایا جائے گا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ روز قیامت لوگ محشور ہوں گے۔ اس وقت میں اور میری امت ’’رتل‘‘ یعنی مقام بلند پر ہوں گے۔ اور حق تعالیٰ مجھے سبز حلہ (جوڑا) پہنائے گا۔ اور حضور اکرم ﷺ مقام عرش پر اس جگہ کھڑے ہوں گے جہاں کوئی بھی کھڑا نہ ہوا ہوگا اور اس پر اگلے پچھلے رشک وغبطہ کریں گے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضور کو ’’مقام محمود‘‘ عطا فرمایا جائے گا۔ مجاہد جو کہ ائمہ تفسیر سے ہیں کہتے ہیں کہ اس سے مراد عرش پر جلوس فرمانا ہے اور عبداللہ بن السلام سے مروی ہے کہ ’’کرسی‘‘ پر جلوس فرمانا ہے۔ تفسیر بیضادی میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جو بھی وہاں کھڑا ہوگا اور آپ کو پہچانے گا آپ کی تعریف وثنا کرے گا۔ یہ مطلقاً ہر مقام کے لیے ہے۔ گویا آپ جہاں بھی قیام فرمائیں گے وہی مقام کرامت وبزرگی کو شامل ہے۔ لیکن مشہور ہے کہ یہ مقام شفاعت ہے اس پر مزید بحث آپ کے فضائل کے ضمن میں آئے گی۔ جو انشاء اللہ آخرت میں ظہور پذیر ہوں گے۔

انہی خصائص میں یہ ہے کہ سیّد عالم ﷺ کو اہل موقف کے درمیان شفاعت عظمیٰ دی جائے گی۔ جس وقت کہ تمام انبیاء ومرسلین کے بعد وہ آئیں گے۔ کسی جماعت کو جنت میں بے حساب داخل کرائیں گے اور کسی کے درجات بڑھائیں گے۔ اس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ سیّد عالم ﷺ کا لواء حمد (حمد کا جھنڈا) ہوگا۔ روز قیامت حضرت آدم اور ان کے ماسوا سب ہی اس جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور وسیلہ جو اعلیٰ درجہ جنت میں سے ہے وہ بھی مخصوص آپ کے لیے ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنی ساری مخلوق میں سب سے زیادہ مکرم وافضل ہیں اور روز قیامت سب کے پیشوا ہیں جیسا کہ فرمایا:

اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَنَا اَكْرَمُ الْاَوَّلِيْنَ
وَالْاٰخِرِيْنَ وَبِيَدِيْ لِوَاءُ الْحَمْدِ وَلَا فَخْرَ وَمَا مِنْ
نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ اٰدَمَ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا وَهُوَ تَحْتَ لِوَائِيْ.

روز قیامت میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور میں اولین وآخرین میں سب سے زیادہ مکرم ہوں اور میرے ہاتھ لواء حمد ہوگا یہ فخر سے نہیں ہے اس دن کوئی نبی بھی آدم اور ان کے ماسوا ایسا نہ ہوگا مگر یہ کہ وہ میرے جھنڈے تلے ہوگا۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ جنت کا دروازہ کھلوانے تشریف لے جائیں گے تو تعظیم وتکریم کے لیے خازن جنت کھڑے ہو جائیں گے۔ اور آپ کا استقبال کریں گے اور جنت کا دروازہ کھولیں گے۔ کہیں گے آپ سے پہلے کسی لیے نہ کھولتا۔ اور نہ آپ کے بعد کسی کے لیے میں کھڑا ہوں گا۔ اس میں حضور کے مرتبت کی زیادتی کا اظہار ہے۔ ورنہ خزنہ جنت یعنی نگہبانانِ بہشت سب کے سب آپ کے خادم ہیں۔ اور بحکم الٰہی آپ ان کے بمنزلہ بادشاہ کے ہیں۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے حوض کوثر کو آپ کے لیے مخصوص فرمایا جس میں شہد سے زیادہ شیریں اور دودھ سے زیادہ سفید پانی بہتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ برف سے زیادہ سفید ہے۔ اور اس کے پیالے ستاروں سے زیادہ ہیں بعض کہتے ہیں کہ آخرت میں ہر نبی کے لیے ایک حوض ہوگا۔ جو ان کے فضل ومرتبت کے لائق ہوگا اور حضور کا حوض کوثر ان سب سے عظیم تر اور شریف تر ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی کتاب مجید میں چونکہ انبیاء علیہم السلام کے توبہ وغفران اور ان سے واقع شدہ زلتہ وخطا کا ذکر فرمایا ہے تو نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں فرمایا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ○ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ تو فتح کو قدم رکھا اس کے بعد غفران ذنوب گزشتہ وآئندہ کا ذکر فرمایا۔ اور ذنب کو مستور رکھا۔ اس مقام کی تحقیق باب دوم میں گزر چکی ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کو جو کچھ سوال کرنے اور مانگنے کے بعد عطا فرمایا وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بے سوال وبغیر مانگے مرحمت فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے عرض کیا۔ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے مجھے رسوانہ کرنا اور حضور ﷺ اور آپ کی امت کی شان میں فرمایا: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ اس دن اللہ رسوانہ فرمائے گا نبی کو اور ان ایمانداروں کو جو آپ کے ساتھ ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ اے میرے رب میرے سینے کو کھول دے تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں فرمایا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھولا۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیّد عالم ﷺ کو مقام محبت سے نوازا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام خلت سے ممتاز فرمایا۔ مقام محبت' مقام خلت سے بالاتر ہے۔ پہلے باب میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ بعض علماء عارفین' خلیل وحبیب کے درمیان فرق میں لطیف بحث فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ خلیل' خلت سے بنا ہے جس کے معنی حاجت کے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کی طرف سراپا محتاج ومفتقر تھے۔ اسی لحاظ سے حق تعالیٰ نے انہیں خلیل فرمایا اور حبیب بروزن فعیل بمعنی فاعل یا مفعول ہے لہٰذا حضور بے واسطہ غرض محبّ بھی ہیں اور محبوب بھی اور کہتے ہیں کہ خلیل کا فعل خدا کی رضا کے لیے ہوتا ہے۔ اور حبیب کی رضا کے لیے خدا کا فعل ہوتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا: فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا. ضرور بالضرور ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے۔ جس سے آپ راضی ہیں اور فرمایا: وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' اور خلیل کبھی لقائے محبوب کے لیے عجلت نہیں کرتا۔ جیسا کہ مروی ہے کہ جب قبضِ روح کے لیے ملَک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توقف فرمایا۔ اور ان سے کہا پرودگار عالم سے دریافت کرو کہ کیا حکم ہوتا ہے؟ آیا جلدی حاضری ہے یا کچھ توقف ہے۔ لیکن حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اِخْتَرْتُ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى. یعنی میں نے رفیق اعلیٰ حق تعالیٰ کو اختیار کیا۔'' اور آپ اپنی دعا میں کہتے ہیں

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَالُكَ النَّظْرَ اِلٰى جَلَالِ وَجْهِكَ
وَالشَّوْقَ اِلٰى لِقَائِكَ

اے خدا! میں تجھ سے مانگتا ہوں وہ نظر جو تیرے چہرہ جلال کی
طرف ہے اور وہ شوق جو تیرے دیدار کی طرف ہے۔

اور خلیل وہ جس کی مغفرت' حد طمع میں ہے جیسا کہ فرمایا: وَالَّذِيْ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ اور وہ جو طمع کرتا ہے کہ میری خطاؤں کی مغفرت قیامت کے دن ہو اور حبیب وہ جس کی مغفرت حد یقین میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِيَغْفِرَلَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ. تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے ذنب کی مغفرت کرے اور آپ پر اپنی نعمت تمام فرمائے۔

اور خلیل نے دعا کی وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ جس دن لوگ اٹھائے جائیں مجھے رسوانہ کرنا اور حبیب سے فرمایا گیا: يَوْمَ لَايُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ جس دن اللہ نبی کو رسوانہ کرے گا۔ بندہ مسکین (شیخ محقق) کہتا ہے کہ اس پر مزید یہ فرمایا کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ اور وہ لوگ جو ایمان لائے آپ کے ساتھ۔'' اور خلیل وہ ہے جس نے کہا: اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنَ میں اپنے رب کے حضور جانے والا ہوں۔ عنقریب وہ رہنمائی فرمائے گا اور حبیب وہ ہے جس کے لیے فرمایا گیا: وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى اور آپ کو وارفتہ پایا تو رہنمائی فرمائی۔

خلیل وہ ہے جس نے کہا وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ اور بنا میرے لیے سچی زبان پچھلوں میں۔'' اور حبیب کے لیے فرمایا: وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔'' خلیل نے کہا: واجعلنی حسن ورثة العجنة النعيم. اور بنا مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں سے۔ اور حبیب کے لئے فرمایا: اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ. ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔'' خلیل نے کہا: وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ اور بچا مجھے اور میری اولاد کو بتوں کے پوجنے سے۔'' اور حبیب وہ ہے جس سے فرمایا گیا:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا. اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرمائے اور تمہیں پاک کر کے خوف ستھرا کر دے۔

چنانچہ ثابت ہوا کہ خلتِ خلیل اور محبتِ حبیب کی فضلیت میں موخر الذکر فائق ہے۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ جو نفلی نماز بیٹھ کر ادا کریں تو آپ کے لیے اس کا ثواب کھڑے ہو کر ادا کرنے کے برابر ہے۔ بخلاف دوسروں کے فرمایا: مَنْ صَلّٰى قَاعِدًا فَلَهٗ نِصْفُ اَجْرِ الْقَائِمِ جو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کے لیے کھڑے ہونے والے کے اجر کا آدھا ہے۔'' اگرچہ اس حدیث کا ظاہر عامہ ہے لیکن سیّد عالم ﷺ اس عموم سے مستثنٰی اور مخصوص ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے حدیث مروی ہے۔ انہوں نے کہا میں رسولِ خدا ﷺ کے حضور حاضر ہوا تو میں نے آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا میں نے عرض کیا یارسول اللہ میں نے سنا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: صَلٰوةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلٰى نِصْفِ الصَّلٰوةِ قَائِمًا. بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے سے آدھی ہے اور اس وقت آپ بیٹھ کر ادا فرما رہے تھے۔'' فرمایا: ہاں! میرا ارشاد یہی ہے لیکن لَسْتُ كَاَحَدٍ مِّنْكُمْ تم میں سے کوئی بھی میرے برابر نہیں۔''

انہی خصائص میں سے یہ ہے جو کچھ دنیا میں زمانہ آدم سے نفخہ اولیٰ یعنی قیام قیامت تک ہے۔ وہ سب آپ پر منکشف کیا گیا یہاں تک کہ آپ کو اگلوں اور پچھلوں کے تمام احوال کا علم دیا گیا اور ان میں سے بعض کے احوال آپ نے اپنے صحابہ کرام کو بھی بتائے اور بعض صلحاء اہل فضل سے سنا گیا کہ بعض عارفوں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں ثابت کیا گیا ہے کہ حضور سرورِ عالم ﷺ کو تمام علوم الٰہی بتائے گئے تھے۔ یہ بات بظاہر بہت سے دلائل کے مخالف ہے مگر قائل نے اس سے کیا مقصد لیا ہوگا اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

امت محمدیہ کے فضائل وخصائص

وصل: امت مرحومہ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے فضائل وخصائص بھی بیشمار ہیں اور یہ فضائل وخصائص بھی حضورِ اکرم ﷺ ہی کی طرف راجع ہوتے ہیں کیونکہ آپ تابع وفرماں بردار امت رکھتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اگرچہ انسان وجنات سب ہی آپ کی امت ہیں۔ لیکن اس خصوصیت وقابلیت کے لحاظ سے جو انسان میں ہے عنایت ربانی انسانی رافت کے ساتھ ظاہر ہوئی اور آپ نے انسانوں میں ظہور فرمایا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم تمام امتوں سے بہترین امت ہو) یہ خطاب بے واسطہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے ہے۔ ایمان میں سبقت پانے والے مقربین بارگاہ ہیں۔ اور فرمایا کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے بچاتے ہیں۔) درحقیقت یہی سبب افضلیت اور بہتری کی شرط ہے۔ صحابہ کرام میں یہ خوبی رسول اللہ ﷺ کی صحبت کی فضیلت کی وجہ سے اتم واکمل اور سب سے فائق ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام مشاہدہ جمال جہاں آرا اور آپ کے انوار وآثار کا بے واسطہ اقتباس واستفاضہ کرنے میں مخصوص ہیں۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس امت کے اولین بعد والوں سے افضل ہیں۔ اس کی ایک ترتیب بھی اس ضمن میں شارع علیہ السلام سے واقع ہے فرمایا:

خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِي الَّذِيْنَ اَنَا فِيْهِمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ.

سب سے بہتر میرا وہ زمانہ ہے جس میں میں ہوں پھر وہ جو ان سے متصل ہے پھر وہ جو ان سے متصل ہے۔

مشہور یہ تین مرتبے ہیں۔ اوّل صحابہ، دوم تابعین، سوم تبع تابعین۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث سے مرتبہ چہارم بھی معلوم ہوتا ہے۔ جس کو اتباع تبع کہتے ہیں۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ثُمَّ يَفْشُوا الْكِذْبُ (پھر جھوٹ پھیل جائے گا) مطلب یہ کہ ان تین یا چار مرتبوں کے بعد جس طرح اوائل زمانہ میں دین، صدق تصوو اور یقین میں جو ربط وضبط تھا اس کے بعد کذب، جھوٹ اور افترا عام ہو جائے گا۔

صحابہ کرام کی ایک جماعت تو وہ ہے جو ایک لحظہ کی شرفیابی دیدار مصطفےٰ کے بعد ایمان لا کر اپنے کام وکاج میں مشغول ہوگئی اور جسے عرصہ دراز تک آپ کی خدمت اور صحبت میں حاضر رہ کر استفادہ کا موقع نہ ملا۔ ان کے بارے میں بھی بعض علماء اس کے قائل ہیں کہ انہیں اپنے بعد آنے والوں پر فضیلت حاصل ہے۔ معلوم نہیں ان کے اس کہنے کا مقصود کیا ہے؟ اگر وہ یہ کہتے ہیں حضورِ اکرم ﷺ کی رویت ومشاہدہ کی برکت سے انہیں وہ تمام کمالات حاصل ہو جاتے ہیں جو متاخرین یعنی عرصہ دراز تک صحبت رکھنے والوں میں ہیں تو یہ محل توقف ہے اور صحابہ کرام کے مابین عدم تفاضل وتفاوت کو مستلزم ہے۔ اور یہ خلاف واقعہ ہے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی رویت ومشاہدہ ایسی فضیلت ہے جو تمام فضائل وکمالات سے اتم واکمل ہے۔ اور کوئی فضیلت اس کی ہمسری نہیں کرسکتی۔ بہرحال کچھ بھی ہو وہ صحابہ کرام جنہوں نے آپ کی مختصر سی صحبت حاصل کر لی اپنے ان بعد کے آنے والوں سے افضل ہیں جو آنحضرت ﷺ کی صحبت ورویت سے محروم رہے۔ اہل اصول کی جماعت، اسم صحبت کے اطلاق کو بھی جماعت اولیٰ سے مخصوص جانتی ہے۔ حالانکہ یہ محدثین کے مذہب کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ اطلاق صحبت میں، رویت وملاقات کو اگرچہ ایک ہی بار ہو کافی رکھتے ہیں۔

اس امت کے فضائل وخصائص علی الاطلاق بیشمار اور اس بارے میں اخبار وآثار بکثرت ہیں ان کی سب سے بڑی اور اتم واکمل فضلیت یہی ہے کہ وہ امت محمد یہ میں ہیں۔ جس طرح یہ نبی آخر الزماں ﷺ خاتم النبیین اور تمام نبیوں کے فضائل وکمالات کے جامع ہیں اور آپ پر مکارم اخلاق اور صفات حمیدہ تمام ہیں اسی طرح آپ کی اُمت خاتم الامم ہے۔ اور کمال دین اور اتمام نعمت سے مخصوص ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا۔ اور اپنی تمام نعمتیں تم پر تمام کر دیں)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے رب تیرے نزدیک میری امت جیسی بھی کوئی امت ہے جس پر تو نے بادلوں کا سایہ فرمایا ہو۔ اور ان کے لیے من وسلویٰ اتارا ہو'' حق تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا: اے موسیٰ! تم امت محمد ﷺ کی فضلیت کو نہیں جانتے۔ جتنا میرا فضل ہے تمام خلق پر اتنا تنہا اس امت پر ہے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے رب مجھے اس اُمت کو دکھا دے'' حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا تم ان کو دیکھ نہیں سکتے (کیونکہ وہ آخر زمانے میں ہے) لیکن میں تمہیں ان کا کلام سنواتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ندا فرمائی تو سب نے بیک آواز ہو کر جواب دیا: ''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ''. (حاضر ہوں اے خدا حاضر ہوں) حالانکہ اس وقت وہ سب اپنی ماؤں اور باپوں کے رحموں اور بطنوں میں تھے اس کے بعد حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

صَلٰوتِیْ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ وَعَفْوِیْ سَبَقَ عَذَابِیْ
میرا کرم تم پر ہے اور میری رحمت میرے غضب پر اور میرا عفو میرے عذاب پر سبقت کر گیا۔

اس سے پہلے کہ تم دعا مانگو۔ میں نے تمہاری دعا کو قبول کیا اور جو کوئی میرا ادراک اس حال میں کرے کہ وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی گواہی دیتا ہو۔ میں اس کے تمام گناہوں کو بخش دوں گا۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: حق تبارک وتعالیٰ نے چاہا کہ مجھ پر اس نعمت کا اظہار احسان فرمائے تو حق تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا کُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَاہُ یعنی اے محمد! ﷺ نشاء عنصری میں جس وقت ہم نے تمہارے نور کو ندا کی اور ندا کی ہم نے تمہاری امت کو' تا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کا کلام سنائیں تو اس وقت آپ طور پر تشریف فرما نہ تھے۔ اس حدیث کو قتادہ نے روایت کیا۔ اس میں اتنا اور زیادہ کیا گیا ہے کہ ''تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے رب تعجب ہے کہ امت محمد یہ ﷺ کی آواز کتنی اچھی اور پیاری ہے۔ اے پرودگار مجھے دوبارہ سنا۔

اور ابونعیم ''حلیہ'' میں بروایت حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ جو کوئی مجھ سے اس حال میں ملے کہ وہ احمد (ﷺ) کا منکر ہے تو اسے آتش دوزخ میں جھونک دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا احمد (ﷺ) کون ہیں؟ فرمان باری تعالیٰ ہوا کہ احمد وہ ذات گرامی ہے کہ میں نے اپنے نزدیک اس سے بڑھ کر گرامی تر کسی کو پیدا نہ فرمایا۔ اور زمین وآسمان کی پیدائش سے قبل اس کا نام اپنے نام کے ساتھ عرش پر لکھا اور اس وقت تک میری تمام مخلوق پر جنت حرام ہے جب تک کہ وہ اور اس کی امت اس میں پہلے داخل نہ ہو جائیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی امت آپ کی تبعیت میں داخلہ جنت میں دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے پہلے ہے۔ اور حب مہمان عزیز ہے تو اس کا طفیلی بھی عزیز ہوگا۔ خلق سے مراد غیر انبیاء ہیں۔ حالانکہ جمیع خلق کہا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ امت انبیاء سے فاضل تر یا برابر ہے۔ حاشا وکلا' ایسا ہرگز ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ کوئی ولی نبی کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا امت محمدی (ﷺ) کیسی ہے اور ان کی صفتیں کیا ہیں۔ تو حق تبارک وتعالیٰ نے ان کی صفات کا

ذکر فرمایا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے خدا مجھے اس امت کا نبی بنا دے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا امت کا نبی ان کی قوم سے ہوگا۔ پھر حضرت موسیٰ نے کہا خداوند مجھے اس نبی کی امت بنا دے۔''

حضرت وہب ابن مبہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حضرت شعیا بنی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ میں نبی اُمی کو بھیجوں گا۔ جو کہ بہرے کانوں' اندھی آنکھوں اور ان دلوں کو جو پردہ غفلت سے پوشیدہ ہیں کھولے گا۔ ان کی جائے ولادت مکہ مکرمہ اور اس کا مقام ہجرت مدینہ طیبہ اور اس کا ملک شام ہے۔ اور حضور ﷺ کی صفتوں کا ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا کہ میں ان کی امت کو تمام امتوں میں بہترین بناؤں گا۔ وہ نیکی کا حکم دے گی اور بدی سے روکے گی۔ میری وحدانیت کو مانے گی۔ مجھ پر ایمان لائے گی۔ مجھ س اخلاص برتے گی۔ اور میں نے جو کچھ نبیوں پر نازل کیا ہے وہ سب کی تصدیق کرے گی۔ آفتاب و ماہتاب کی حفاظت کریگی۔ یعنی عبادت کے اوقات کے لیے ان کی محافظت کرے گی۔ خوش نصیب ہیں وہ دل' چہرے اور روحیں جو مجھ سے اخلاص برتتی ہیں۔ میں انہیں تسبیح و تکبیر اور تحمید و توحید کو ان کی مجلسوں میں' ان کی آرام گاہوں اور ان کے سفر و حضر اور ہر حرکت و سکون میں الہام کروں گا۔ مسجدوں میں ان کی صفیں' فرشتوں کی صفوں کی مانند ہیں۔ فرشتے عرش کے گرد ہیں۔ وہ میرے دوست اور میرے مددگار ہیں۔ میں ان کے ذریعہ اپنا کینہ بت پرست دشمنوں سے نکالوں گا۔ وہ میرے لیے کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں ادا کریں گے۔ وہ میری خوشنودی کی خاطر اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکلیں گے۔ اور میری راہ میں جہاد و قتال کریں گے اور میں ان کی کتاب یعنی قرآن مجید سے دیگر کتابوں کو' ان کی شریعت سے دیگر شریعتوں کو اور ان کے دین سے دیگر دینوں کو ختم کروں گا۔ اور جو کوئی ان کے زمانہ کو پائے اور ان کی کتاب پر ایمان نہ لائے اور ان کے دین و شریعت کو نہ مانے وہ میرا نہیں ہے میں اس سے بیزار ہوں۔ میں نے انہیں ساری امتوں سے افضل اور امت وسط بنایا۔ جو تمام لوگوں پر گواہ ہیں۔ جب غضب میں آئیں گے تو میری تہلیل لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا نعرہ لگائیں گے اور جب نزاع کریں گے تو تسبیح کریں گے اور میری پاکی بیان کریں گے یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہیں گے اور اپنے چہروں اور اعضاء کو پاک و صاف کریں گے۔ اور ٹخنوں سے اوپر ازار باندھیں گے ہر چڑھائی و اُتار پر اللہ اکبر کہیں گے اور خون بہا کر قربانی دیں گے۔ ان کی کتاب یعنی قرآن ان کے سینوں میں ہے۔ رات میں عبادت گذار اور دن میں شیر یعنی مجاہد ہیں۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جو ان کے ساتھ ہے۔ ان کے مذہب اور ان کی راہ و رسم پر ہے۔ یہ میرا فضل ہے جسے میں چاہتا ہوں اسے دیتا ہوں۔ میں خداوند فضل عظیم ہوں۔ اسے ابونعیم نے روایت کیا۔

عبادات میں اس امت کی خصوصیات: یہ فضائل اس امت مرحومہ کے ہیں جو پچھلی کتابوں میں ہیں لہٰذا امت کو چاہیے کہ ان صفات پر ہو کیونکہ بہتری اور افضلیت کی علت یہی صفات ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں اس امت کے پہلے حضرات جو کہ صحابہ کرام اور ان سے متصل ہیں ان صفات میں اکمل و اتم ہیں۔ اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر غنیمتوں کو حلال قرار دیا حالانکہ اس سے قبل کسی پچھلی امت کے لیے یہ حلال نہ ہوا تھا۔ اور یہ کہ تمام زمین کو مسجد گردانا۔ (کہ جہاں چاہیں نماز پڑھیں) اور یہ کہ مٹی کو پاک کرنے والا بنایا۔ (یعنی اگر پانی میسر نہ ہو یا اس پر قدرت نہ ہو تو مٹی سے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی جائے) جیسا کہ حضور ﷺ کے خصائص میں گزرا۔ یعنی امت بھی آپ کے ساتھ ان صفات و احکام میں شریک ہے۔ بعض علماء وضو کو بھی اس کے خصائص میں شامل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ اِنَّ اُمَّتِیْ یَدْعُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ غُرَّ الْمُحَجِّلِیْنَ مِنْ اٰثَارِ الْوُضُوْءِ. (بے شک قیامت کے دن آثار وضو سے میری امت کے اعضاء روشن و تاباں ہوں گے۔ اس طرح آئے گی) اور ممکن ہے کہ یہ تابانی وضو کی جزاء میں ان کے ساتھ مخصوص ہو۔ کیونکہ ''فتح الباری'' میں حضرت سارہ کے قصے کے درمیان

مذکور ہے کہ جب بادشاہ جابرو کافر نے انہیں گرفتار کرنا چاہا تو وہ اٹھیں، وضو کیا اور نماز میں مشغول ہوگئیں۔ جریج راہب کے قصہ میں بھی آیا ہے کہ وضو کیا، نماز پڑھی اور بچے کے ساتھ کلام کیا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جو چیز اس امت کے ساتھ مخصوص ہے وہ غرہ اور تجیل یعنی نورانیت اور تابانی ہے وضو نہیں۔ مسلم شریف کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ پیشانی کی تابانی تمہارے سوا کسی میں نہیں۔

اس امت کے خصائص میں سے پانچ نمازیں بھی ہیں گزشتہ امتوں میں چار نمازیں تھیں نماز عشا نہیں تھی۔ سب سے پہلے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشا ادا کی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ نماز عشا میں تاخیر کرو۔ (ایک تہائی رات تک) اس لیے کہ تمہیں گزشتہ امتوں کی نمازوں پر فضلیت دی گئی ہے۔

اذان، اقامت اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا کہنا بھی اس امت کے خصائص میں سے ہے۔ کیونکہ کسی دوسری امت پر اس کا نزول نہیں ہوا تھا۔ مگر حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ انہوں نے ملکہ سبا کو جو خط تحریر فرمایا وہ بسم اللہ سے شروع کیا تھا۔

اس امت کے خصائص میں سے ''آمین'' کہنا بھی ہے۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود ہم پر کسی چیز پر حسد نہیں کرتے جیسا کہ وہ جمعہ پر حسد کرتے ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ہمیں ہدایت فرمائی۔ اور امام کے پیچھے ''آمین'' کہنے پر بھی وہ حسد کرتے ہیں۔ اس امت کے خصائص میں سے نماز میں رکوع کرنا بھی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ فرمایا سب سے پہلے جس نماز میں ہم نے رکوع کیا وہ نماز عصر تھی۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یہ رکوع کیا ہے جسے آپ نے آج کے سوا کبھی نہیں کیا۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں بھی ابتدائی وقت میں رکوع نہ تھا بعد میں اس کا حکم ہوا۔ البتہ! اس جگہ ہی حق تعالیٰ نے فرمایا یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ. (اے مریم اپنے رب کی اطاعت کرو اور سجدہ و رکوع کرو۔) یہ آیت وجود رکوع پر دلالت کرتی ہے کہ امم سابقہ میں رکوع تھا۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ قنوت سے مراد دائمی طاقت ہے کیونکہ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّقَائِمًا اور قنوت کے معنی طاعت، قیام اور خشوع کے آتے ہیں۔ سجود سے مراد نماز ہے جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا وادبار السجود اور رکوع سے مراد خشوع، عاجزی اور فروتنی ہے کہ رکوع پر سجدہ کو مقدم کرنا یہ ایک قسم کا قرینہ ہے۔ جو اس معنی پر دلالت کرتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ رکوع مقدم ہوتا ہے۔ یہ جواب وتوجیہہ اس تقدیر پر ہے کہ نص سے ثابت ہو ورنہ امم سابقہ میں رکوع شروع نہ ہونے پر علماء نے حضرت مرتضیٰ کی حدیث سے استدلال کیا ہے اگرچہ یہ استدلال مکمل نہیں ہے۔

نماز وقتال میں ان کی صفوں کی قدر ومنزلت اور قرب بارگاہ میں فرشتوں جیسا تقرب بھی اس امت کے خصائص میں ہے۔ اگر یہ کہیں کہ جماعت بھی اس امت کے خصائص میں سے ہے تو اللہ تعالیٰ ہی زیادہ جانتا ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے تحیہ سلام بھی ہے جیسا کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں گزرا باخبر رہنا چاہیے کہ حدیث عائشہ کا ظاہر مطلب، نماز کے آخر میں سلام پھیرنا ہے اور تحیہ سلام کی عبارت کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ وقت ملاقات ایک دوسرے کو سلام کرنا۔

اس امت کے خصائص میں سے جمعہ بھی ہے جو دوسری امتوں میں نہیں ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: هٰذَا یَوْمُهُمُ الَّذِیْ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ یَعْنِیْ یَوْمَ الْجُمْعَةِ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَهُ وَالنَّاسُ فِیْهِ لَنَاتَبَعٌ اَلْیَهُوْدُ غَدًا وَّالنَّصَارٰی بَعْدَ غَدٍ (رواہ البخاری) یہ ان کا وہ دن ہے جو اللہ نے ان پر فرض فرمایا تو یہ دن اللہ کا ہے۔ دوسرے لوگ اس میں ہمارے بعد ہیں یہود کے لیے سنیچر (ہفتہ) اور نصاریٰ کے لیے اتوار ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے جمعہ کی وہ گھڑی ہے کہ اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ سے جو مانگا جائے ملتا ہے۔ اس ضمن میں تقریباً چالیس اقوال ہیں جنہیں ''شرح سفر السعادۃ'' میں ہم نے اقوال میں مطابقت پیدا کر کے بیان کیا ہے۔ ان میں صحیح تر دو قول ہیں۔ اول یہ کہ وہ خاص مذکورہ گھڑی امام خطبہ کے لیے نکلنے کے وقت سے نماز جمعہ کے فارغ ہونے تک محیط ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ روز جمعہ کی آخری گھڑی ہے۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اسی جانب ہیں۔ علماء کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک خادم کو مقرر کر رکھا تھا کہ اس آخری گھڑی کی خبر دے۔ (واللہ اعلم)

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ جب رمضان مبارک کی پہلی رات آتی ہے تو حق سبحانہ وتعالیٰ ان کی طرف نظر عنایت سے دیکھتا ہے۔ اور جس کی طرف حق تعالیٰ نظر عنایت فرمائے۔ وہ پھر اس کو کبھی بھی عذاب نہیں دیتا۔ اور جنت کو ان کے لیے مزین کرتا اور سنوارتا ہے۔ اور یہ کہ روزہ دار کے منہ کی بو کو اپنے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ بنایا اور رمضان کی ہر رات میں فرشتے ان کے لیے استغفار کرتے ہیں اس وقت سے جب کہ وہ روزہ افطار کرتے ہیں اور جب رمضان کی آخری رات ہوتی ہیں تو ان سب کو بخش دیتا ہے اور اس امت کو ماہ رمضان میں پانچ ایسی خوبیاں مرحمت فرمائی ہیں جو ان سے پہلے کسی نبی کی امت کو نہیں دی گئیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ روزہ دار جس وقت افطار کرتا ہے۔ اس وقت سے فرشتے استغفار کرتے رہتے ہیں۔ اور شیطانوں کو زنجیر میں جکڑ کر قید کر دیا جاتا ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے سحری کھانا' افطار میں جلدی کرنا مستحب کیا گیا ہے۔ رات میں صبح صادق تک کھانے' پینے اور جماع کرنے کو مباح قرار دیا گیا۔ حالانکہ ہم سے پہلے ہر ایک پر یہ چیزیں حرام تھیں اسی طرح شروع اسلام میں ہم پر بھی تھیں۔ بعد میں یہ منسوخ ہو گیا۔

اس امت کے خصائص میں شب قدر ہے۔ جیسا کہ امام نووی نے ''شرح مہذب'' میں کہا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے ہزار مہینہ تک راہ خدا میں جہاد کیا اور اپنے جسم سے ہتھیار نہ اتارے۔ صحابہ کہنے لگے کیا ہم میں سے کسی میں اتنی طاقت ہے جو ایسا کر سکے۔ اس وقت سورہ قدر نازل ہوئی کہ شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اور اس ایک رات میں قیام کرنا ہزار مہینے راہ خدا میں جہاد کرنے سے افضل ہے۔ باقی بحث اپنے مقام میں آئے گی۔ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے کہ رمضان المبارک کے روزے اس امت کی خصوصیتوں میں سے ہیں یا پچھلی امتوں پر بھی فرض تھے۔ آیہ کریمہ ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
تم پر روزے فرض کیے گئے جیسے کہ تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے۔

اس سے مراد رمضان کے روزے ہی ہیں۔ اس میں ظاہر بات یہی ہے کہ پچھلی امتوں پر بھی فرض کیے گئے تھے۔ ابن ابی حاتم بروایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ رمضان کے روزے پچھلی امتوں پر بھی فرض تھے۔ اس حدیث کی اسناد میں ایک شخص مجہول ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مطلق روزہ مراد ہے نہ کہ ان کی مقدار اور وقت تو یہ تشبیہ بھی مطلقاً روزوں پر ہو گی۔ جمہور کا قول بھی یہی ہے۔

اعمال میں خصوصیت: اس امت کی خصوصیات میں سے مصیبت کے وقت استرجاع یعنی **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** کہنا بھی ہے کہ جو کہ پروردگار عالم کی جانب سے فضل و رحمت کا مستوجب اور ان کے لیے سبب ہدایت ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا اس امت کو مصیبت کے وقت وہ چیز دی گئی ہے جو کسی نبی کو اس کی مانند نہیں دی گئی۔ اور وہ قول **اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ** کو مصیبت کے وقت کہنا ہے۔ اگر یہ چیز انبیاء کو دی جاتی تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی مرحمت ہوتی جس وقت کہ انہوں نے کہا: **يَا اَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ** آہ مجھے یوسف پر رنج ہے۔

بندہ مسکین (یعنی شیخ محقق) ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین کہتا ہے کہ یہ قول اس امت کو انبیاء علیہم السلام پر ترجیح دینے کا وہم پیدا کرنے کا موجب ہے۔ حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَّاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ. (اب صبر جمیل ہے اور اللہ ہی مددگار ہے۔) تو یہ استرجاع کے ہی ہم معنی ہے۔ اور ان کا یہ فرمانا کہ ''یَا اَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ''۔ اس کے منافی نہیں ہے۔ اگر یہ کہیں کہ ''اس امت کو استرجاع کی ایسی چیز دی گئی ہے جو کسی دوسری امت کو نہیں دی گئی۔'' تو بہتر ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس امت کی تخصیص بہ نسبت امت سابقہ ہوگی نہ کہ بہ نسبت انبیاء کرام صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہم اجمعین۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت سے اصر اور اغلال اٹھالیا ہے جو امم سابقہ پر تھا۔ (اصر اگر الف کے زیر سے ہے تو اس کے معنی عہد، بوجھ اور گناہ کے ہیں اور اگر الف کے زبر سے ہے تو اس کے معنے، توڑنے، بند کرنے اور باز رکھنے کے ہیں اور اغلال کے معنی کینہ رکھنا اور مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کے ہیں۔) اس سے مراد تخفیف اور ان تکلیفوں کو دور کرنا ہے جو پچھلی امتوں پر لازم تھیں۔ مثلاً قتل عمد اور خطا کے درمیان تعیین قصاص، خطا کار کے اعضا کاٹنا، موضع نجاست کو کاٹنا اور توبہ میں اپنی جان کو ہلاک کرنا وغیرہ تھا۔ اگر بنی اسرائیل میں سے رات کو گناہ کرتا تو پچھلی صبح کے وقت اس کے گھر کے دروازے پر لکھا ہوتا کہ اس گناہ کا کفایہ یہ ہے کہ اپنی دونوں آنکھیں نکالے۔ چنانچہ وہ دونوں آنکھوں کو نکال دیتا۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان پر ان چیزوں کو آسان فرمایا جو ان کے ماسوا پر بہت سخت تھیں۔ اور ان کے دین میں کوئی دشواری لازم نہ رکھی۔ جیسے کہ اگر کوئی کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے سے مجبور ہے تو وہ بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ اور حالت سفر میں افطار اور نماز فرض میں قصر کو مباح فرمایا اور ان پر توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا۔ اور حقوق اللہ میں ان کے لیے کفارہ جات مشروع فرمائے اور حقوق العباد میں دیت وضمان کو مشروع فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا بنی اسرائیل پر جس قدر شدائد اور دشواریاں تھیں حق تعالیٰ نے اس امت سے اٹھالیں۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس امت کو خطا ونسیان (وسوسہ) اور ہر وہ عمل جو جبر واکراہ سے سرزد ہو ان سب کے مواخذہ سے بری فرمایا۔ بلاشبہ بنی اسرائیل کا یہ حال تھا کہ جس چیز کا انہیں حکم دیا جاتا جب وہ اس میں کچھ بھول جاتے یا خطا ہو جاتی تو ان پر عذاب میں جلدی کی جاتی تھی۔ اور ان کے گناہ کے قدر و انداز کے مطابق کھانے پینے کی کچھ چیزیں ان پر حرام کی دی جاتیں۔ بلاشبہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى رَفَعَ عَنْ اُمَّتِىْ الْخَطَاءَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرَ هُوَ عَلَيْهِ رواہ احمد وابن حبان والحاکم وابن ماجہ'' (یقیناً اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا ونسیان اور جس پر مجبور کیا جائے اٹھالیا۔) خطا ونسیان کے درمیان فرق یہ ہے کہ نسیان میں مطلقاً بھول جانا ہے جیسے کہ روزہ دار روزے کو بھول کر کچھ کھا پی لے۔ اور خطا میں یادداشت ہوتی ہے لیکن غلط کر جاتا ہے مثلاً روزہ دار کو اپنا روزہ یاد ہے۔ مگر کلی کرنے میں پانی حلق میں اتر جائے اور اکراہ یہ ہے کہ کسی سے بزور اور جبر کوئی کام کرایا جائے۔ مثلاً کوئی ظالم زور وجبر کرے اور کہے کہ کلمہ کفر زبان سے بول ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا اس وقت اگر کلمہ کفر بول دے۔ اور دل میں اپنے ایمان پر برقرار رہے تو نقصان نہ ہوگا۔ اس پر مواخذہ نہیں ہے۔ لیکن ''حدیث نفس'' جسے خیال و وسوسہ کہتے ہیں اس کی کئی صورتیں ہیں ایک یہ کہ کسی چیز کا خیال بے اختیار دل میں یکایک آجائے تو اسے ہاجن کہتے ہیں اس میں بالکل کوئی مواخذہ نہیں ہے خواہ کچھ بھی ہو اس کے بعد وہ دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اور دل کو برانگیختہ کرے تو اسے ''خاطر'' کہتے ہیں اس کے بعد قصد وارادہ ہے چاہے کرے یا نہ کرے۔ یہ امت سے مرفوع ہے۔ بلکہ اگر نہ کیا تو ایک نیکی لکھی جاتی ہے اس کے بعد ''عزم وتہیہ'' ہے کہ ضرور کرنا چاہتا ہے مگر خارج میں کوئی چیز مانع پیدا ہے جس سے وہ کر نہیں سکتا۔ البتہ! اگر مانع نہ ہو تو کرے۔ اس صورت میں مواخذہ ہے۔ اس لیے کہ یہ

فعل قلب ہے۔ اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد محمول ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ

جو تمہارے دلوں میں ہے خواہ اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تمہارا محاسبہ کرے گا۔

لیکن عزم زنا کا زنا نہیں ہے۔ اس پر مواخذہ زنا کا سا نہیں بلکہ یہ اپنا ایسا مخفی گناہ ہے جس پر آدمی کا مواخذہ کیا جاتا ہے۔

اس امت کے کامل ترین خصائص میں سے اس کا خیر الامم ہونا ہے۔ کیونکہ اس کی شریعت تمام گزشتہ شریعتوں سے زیادہ کامل ہے اور یہ ظاہر ہے جو بیان کا محتاج نہیں۔ جب کہ حضورِ اکرم ﷺ مکارم اخلاق اور افعال حمیدہ کو پورا کرنے کے لیے مبعوث ہیں تو لامحالہ آپ کی شریعت اور آپ کا دین تمام ادیان اور شرائع سے اتم و اکمل ہے۔ شریعت موسوی پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں کتنی تکلیفیں شاقہ ہیں۔ مثلاً قتل نفوس، تحریم طیبات، تعجیل عقوبات، عہد و میثاق اور ناقابل برداشت بوجھ کا اٹھانا اور اظہار قہر و جلال وغیرہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیبت و غضب اور گرفت و مواخذہ میں مخلوق خدا میں سب سے بڑھکر اعظم و اشد تھے۔ چنانچہ خلق کو ان کی جانب نظر کرنے کی طاقت نہ تھی۔ بیان کرتے ہیں جس دن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کلام ربانی اور تجلی الٰہی سے مشرف و ممتاز ہوئے تو اپنے چہرہ مبارک پر کپڑا ڈال لیا تاکہ اس کے دائمی قہر و جلال سے لوگ بے تاب نہ ہوں۔ اور آپ کی امت کے لوگ بھی سخت و شدید درشت خو اور کجرو تھے۔ بجز تکالیف غلیظہ اور احکام شدیدہ کے اصلاح و استقامت پر نہیں آ سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (پھر اس کے بعد تمہارے دل شدید سخت ہو گئے گویا کہ وہ پتھر ہیں۔ یا اس سے زیادہ سخت تر)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں فضل و احسان اور لطف و نرمی تھی۔ لیکن اس میں مقاتلہ و محاربہ نہ تھا۔ اور دین نصاریٰ میں قتال حرام ہے اگر وہ کریں گے تو گنہگار و عاصی ہوں گے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے لوگ ملائم و نرم خو تھے ان کے اوپر، اصر و اغلال، احکام شدیدہ اور امر غلیظہ نہ تھے۔ بلکہ انجیل میں ہے کہ ”اگر کوئی تمہارے داہنے رخسار پر طمانچہ مارے تو اس کے آگے بایاں رخسار بھی کر دو“۔ اور جو کوئی تم میں کپڑے کے بارے میں جھگڑے اور کپڑے اتارنا چاہے تو اپنے کپڑوں کے ساتھ اپنی چادر بھی اسے دیدے۔ اور جو کوئی تمہیں ایک میل تک لے جائے تم اس کے ساتھ دو میل تک جاؤ۔“ اور یہ رہبانیت جو نصاریٰ نے پیدا کی ہے وہ بدعت جسے انہوں نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے حق تعالیٰ نے ان کے لیے انجیل میں لکھا اور واجب کیا ہو چنانچہ قرآن کریم ناطق ہے کہ: وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ. (اور ان کی رھبانیت جسے انہوں نے اپنی طرف سے بطور بدعت دین قرار دیا۔ ہم نے ان پر اسے فرض نہ کیا۔) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام خالص جمال و لطف اور احسان کے مظہر تھے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام محض جلال و قہر اور دبدبہ کے مظہر تھے۔ لیکن ہمارے نبی کریم ﷺ مظہر کمال اور جلال و جمال کے مابین جامع تھے۔ اور قوت، عدل، شدت، نرمی، مہربانی اور رحمت والے تھے۔ آپ کی شریعت شرائع میں اکمل، آپ کی امت کو تمام امتوں میں اکمل اور ان کے احوال و مقامات اکمل احوال و مقامات ہیں۔ لہٰذا آپ کی شریعت انتہائی توسط و اعتدال و غایت جامعیت و کمال میں آئی۔ آپ کی شریعت میں کہیں فرض و ایجاب ہے اور کہیں ندب و استحباب۔ اور شدت کے مقام میں شدید اور نرمی کی جگہ میں نرمی، کسی جگہ شمشیر زنی ہے تو کسی جگہ جود و عطا ہے۔ کہیں عدل و انصاف کا ظہور ہے تو کہیں فضل و کرم کی بارش ہے۔ چنانچہ ایک وقت میں جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا. (ایک بدی کے بدلے میں اس کے برابر بدی ہے۔) فرمایا جا رہا ہے اور یہ عدل و انصاف ہے اور ایک وقت میں فَمَنْ عَفٰى وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (جو معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ کرم پر ہے۔) ارشاد ہوتا ہے اور یہ فضل و کرم

ہے اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. (بیشک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا) یہ ظلم کو حرام قرار دیتا ہے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ. (اور کوئی تمہیں ایذا پہنچائے تو تم اس کی ایذا کے برابر بدلہ لے لو) یہ عدل وانصاف کو واجب بھی کرتا ہے اور ظلم کو حرام بھی۔ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (اور اگر تم صبر کرو تو یقیناً وہ بہتر ہے صابروں کے لیے)۔ اس میں فضل وکرم پر خبرداری اور تنبیہ ہے۔ اور اس امت پر ہر ضرر دینے والی برائی کو حرام قرار دیا۔ اور ہر امر پسندیدہ ونافع کو مباح فرمایا۔ حرام قرار دینا اس شریعت میں رحمت ہے ورنہ پچھلی امتوں پر حق تعالیٰ نے ان کی وجہ سے ان پر عذاب فرمایا هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. فرمایا: (یہ تمہیں بچاتا ہے اور دین میں تم پر کوئی دشواری نہ رکھی۔)

اور اس امت پر لوگوں کو گواہ بنایا۔ اور رسولوں کے مقام میں انھیں کھڑا فرمایا کیونکہ وہ اپنی اپنی امتوں پر گواہ ہیں اور اس امت کو خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (لوگوں میں جتنی امتیں گزریں ان سب میں بہتر) بنایا اور ان کو فضائل وکرامات اور مراتب ودرجات کے ساتھ مخصوص فرمایا: اَللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (اللہ اپنی رحمت کو جہاں چاہے خاص فرمائے۔ وہی صاحب فضل عظیم ہے)۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ یہ ضلالت وگمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔ یہ حدیث کثیر سندوں سے مشہور ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری امت ضلالت وگمراہی پر مجتمع نہ ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے میرے سوالوں کو قبول فرمایا۔ اور یہ عنایت فرمائی یہ ''اجماع'' کی حجت پر دلیل ہے۔ اور ان کا اجتماع حجت ہے۔ اور ان کا اختلاف رحمت ہے۔ جو پچھلی امتوں پر عذاب تھا۔ حدیث پاک میں آیا ہے ''اختلاف صحابی لکم رحمتہ'' (میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لیے رحمت ہے۔) اور مشہور ان لفظوں سے ہے کہ اختلاف امتی رحمۃ (میری امت کا اختلاف رحمت ہے)

علماء صاحبان فتویٰ واجتہاد میں ہمیشہ یہ اختلاف رہا ہے۔ چنانچہ کسی نے حلت کا فتویٰ دیا تو دوسرے نے حرمت کا۔ اور کسی نے عیب نہ لگایا۔ بعض علماء نے اس حدیث سے حرفت اور صنعت کے درمیان امت کا اختلاف مراد لیا ہے جو کہ موجب ہنر اور امور دنیا اور کارخانہ صنعت کے انتظام میں آسانی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح مسائل فقیہہ میں علماء کے اختلاف سے رخصت اور دینی امور میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

اس امت مرحومہ کے خصائص میں سے یہ ہے کہ طاعون ان کے لیے شہادت ورحمت ہے حالانکہ یہ دوسری امتوں پر عذاب تھا۔ جیسا کہ وارد ہوا ہے کہ ''اَلطَّاعُوْنُ رِجْزٌ اُنْزِلَ عَلٰى بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ.'' (طاعون ایک عذاب ہے جو بنی اسرائیل پر اترا) اور ایک روایت میں علی من قبلکم (تم سے پہلوں پر) آیا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ ''اَلطَّاعُوْنَ شَهَادَةٌ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (طاعون ہر مسلمان کے لیے شہادت ہے۔) ایک اور روایت میں یہ ہے کہ اَلطَّاعُوْنُ شَهَادَةٌ لِاُمَّتِيْ وَرَحْمَةٌ بِهِمْ وَرِجْزٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ یعنی طاعون میری امت کے لیے شہادت اور ان کے ساتھ رحمت فرمانا ہے اور کافروں پر عذاب ہے اور اس سے بھاگنا لشکر سے بھاگنے کے حکم میں ہے۔ چنانچہ سیّدہ عائشہ صدیقہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ طاعون سے بھاگنا بلاشبہ معصیت وگناہ کبیرہ ہے۔ دوسرے مقام میں ہم اس سے زیادہ روشن وواضح کلام لائے ہیں۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ جب کسی شخص کے لیے دو آدمی بھلائی کے ساتھ گواہی دیں تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن پچھلی امتوں میں جب سو آدمی گواہی دیتے تھے تو اس وقت جنت واجب ہوتی تھی۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ مَنْ

اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ بِخَيْرٍ وَّجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَمَنْ اَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ بِشَرٍّ وَّجَبَتْ لَهُ النَّارُ تم میں سے جس نے کسی کے لیے بھلائی سے تعریف کی تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اور جس نے کسی پر برائی سے تعریف کی تو اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ بھی ہے کہ گزشتہ امتوں کی بہ نسبت ان کی عمریں کم اور ان کے اعمال اقل ہیں۔ مگر ان کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ فرمایا تمہاری داستان اور ان لوگوں کی داستان جو تم سے پہلے یہود ونصاریٰ تھے اس شخص کی داستان کی مانند ہے جس نے تین مزدور لیے ایک سے صبح سے دوپہر تک یعنی وقت ظہر تک کام لیا۔ دوسرے سے وقت ظہر سے وقت عصر تک کام لیا۔ اور تیسرے سے وقت عصر سے غروف آفتاب تک کام لیا اور ہر ایک کی ایک درہم اجرت مقرر کی۔ جب مزدوروں کو اجرت دینے کا وقت آ گیا تو تینوں مزدور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہمارے عمل متافاوت وکم وبیش ہیں مگر یہ عجیب بات کہ اجرت سب کی برابر ہے۔ اس شخص نے کہا میں نے جو کچھ شرط کی تھیں وہ میں نے تم کو دے دی باقی میرا فضل ہے جس کو چاہوں میں دوں۔ پہلے مزدور کی مثال یہود کی ہے اور دوسرے مزدور کی مثال نصاریٰ کی ہے اور تیسرے مزدور کی مثال امت مرحومہ کی ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے اسناد حدیث کا عطا کیا جانا ہے۔ کیونکہ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ باقی ہے۔ اور قیامت تک یہ سلسلہ یوں ہی رہے گا۔ یہ ان کی خاص خصوصیت اور سنتِ سنیہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس اُمت کو یہ شرافت اور فضیلت اور اکرام عطا فرمایا کیونکہ پچھلوں میں سے کسی اُمت کو یہ بزرگی عطا نہ ہوئی تھی۔ باوجودیکہ انبیاء علیہم السلام کے صحیفے ان کے ہاتھوں میں تھے مگر انہوں نے اپنی ان خبروں کو ان میں ملا دیا جو انھیں غیر ثقہ لوگوں سے حاصل ہوئیں۔ اور ان کے سامنے توریت وانجیل اور جو کچھ انہوں نے خبریں وغیرہ ملائیں ان کے درمیان فرق وامتیاز کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اور اس امت فاضلہ شریفہ زادھا اللہ فضلاً وشرفاً نے احادیث نبوی کو ان ثقہ حضرات سے حاصل کیا جو اپنے زمانہ میں صدق ودیانت کے ساتھ مشہور تھے۔ اور انہوں نے ایسے ہی دوسروں سے یہاں تک کہ حضور سیّد عالم ﷺ سے حاصل کیا اور بحث وتفتیش کرتے رہے تا کہ مرتبہ میں احفظ واضبط کو پہچان سکیں اور امتیاز کرتے رہے۔ ان لوگوں کے درمیان جن کی صحبت ومجالست اپنے شیخ کے ساتھ زیادہ طویل تھی اور ان کی جن صحبت ومجالست کم تھی اور مختلف سندوں اور متعدد طریقوں سے حدیثوں کو لکھتے رہے اور غلط وخطا اور زلتہ دخلل سے حدیثوں کے حروف ومسلم ہے کیونکہ کلمات کو ضبط کرتے رہے اور مسلسل تہذیب وتنقیح کرتے رہے۔ خصوصاً اصحاب صحاح کہ ان میں سے عمدہ بخاری یہ دونوں آسمان جلالت وعدالت کے آفتاب ہیں جَزَاهُمْ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرًا یہ خدائے عزوجل کا اس امت پر خاص فضل ہے۔ نَشْكُرُ اللّٰهَ عَلٰى هٰذِهِ النِّعْمَةِ وَسَائِرِ نِعَمِهٖ وَنَسْأَلُهُ الْمَزِيْدَ مِنْ فَضْلِهٖ وَكَرَمِهٖ.

ابوحاتم رازی فرماتے ہیں کہ گزشتہ امتوں میں سے کسی ایک امت میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت سے ایسے علماء وامنانہ تھے جو اپنے نبیوں اور رسولوں کے آثار کی حفاظت کریں بجز اس امت مرحومہ کے۔

اور تواریخ وانسابِ کی معرفت میں بھی یہ امت مخصوص ہے اور یہ اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ چنانچہ علماء بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام میں علم انساب کے سب سے زیادہ جاننے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ بیان کرتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہفتہ میں ایک دن اشعار تواریخ انساب اور ایام عرب کے بیان کرنے میں صرف کرتے تھے۔ سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ شعراء عرب کے دیوانوں اور عرب کے لغات کو یاد کرنے اور التزام رکھنے کی وصیت کرتے تھے۔ تا کہ قرآن کی تفسیر کے وجوہات اور اس کے اعراب کے معرفت میں مددگار ہو۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ یہ امت دین کے بارے میں کتابیں تصنیف کرنے میں مخصوص اور توفیق الٰہی پائے

ہوئے ہے۔ اور یہ اس حدیث کی مصداق میں ہے کہ

لَا يَزَالُ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْـرُ اللّٰهِ وَمُجَاهِدِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمُتَمَسِّكِيْنَ بِهٖ سُنَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ.

اس امت کے کچھ حضرات ہمیشہ حق کو ظاہر و غالب کرنے والے رہیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت آ جائے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور اللہ کے رسول کی سنت کو مضبوطی سے تھامنے والے رہیں گے۔

قرن اوّل اور قرنِ ثانی کے شروع میں لوگوں میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہ ہوا تھا اگرچہ کتابت علم، جمع احادیث کا سلسلہ موجود تھا مگر یہ تصنیف و تالیف اور اس کی ترتیب کے طریقہ پر نہ تھا۔ اسی طرح تبویب و تفصیل، وضع واصلاح، تدوین علوم، تعین موضوع اور مسائل سلوک کا طریقہ بھی نہ تھا۔ مگر اس کے بعد یہ اتنا ہوا گنتی و شمار اور حد و حصر سے باہر ہے۔ جس کا بجز علام الغیوب کے سواء کوئی دوسرا احاطہ نہیں کرسکتا۔ (قرن کی مدت کے تعین میں کئی قول ہیں)۔ ایک قرن تیس سال کی مدت کو بھی کہتے ہیں۔ بیس یا اسی یا سو برس کی مدت کو بھی کہتے ہیں۔ اور آخری قول زیادہ درست ہے۔ کیونکہ حضورِ اکرم ﷺ نے ایک بچہ کو فرمایا عشق قرنا. (تو وہ بچہ سو سال تک زندہ رہا۔)

اولیاء کرام اور مردانِ غیب: اس امت کے خصائص میں سے ان میں اقطاب، اوتاد، نجباء اور ابدال کے وجود کا ہونا بھی ہے۔ حدیث مرفوع میں بروایت سیّدنا انس رضی اللہ عنہ ہے کہ ابدال چالیس مرد و زن ہیں۔ جب ان مرد و زن سے کوئی مرجاتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے بدلے کسی دوسرے مرد و زن کو پیدا فرماتا ہے۔ ابن خلال نے کرامات اولیاء میں اسے نقل کیا ہے۔ اور طبرانی اوسط میں اسے یوں روایت کرتے ہیں کہ زمین ایسے چالیس شخصوں سے خالی نہیں رہتی جو خلیل الرحمٰن (علیہ السلام) کی مانند ہیں۔ ان کے ساتھ زمین قائم ہے۔ اور ان کی برکت سے لوگوں کے لیے بارشیں ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی نہیں مرتا۔ مگر یہ کہ حق تعالیٰ کسی دوسرے مرد کو اس کا بدل فرما دیتا ہے۔ ان کا نام ''ابدال'' اسی بنا پر رکھا گیا ہے۔ اور بعض مشائخ عظام نے فرمایا انہیں ابدال اس لیے کہتے ہیں کہ انہوں نے بری صفتوں کو صفات حمیدہ سے بدل دیا ہے۔ اور یہ صفات بشریت سے باہر آئے ہوئے ہیں۔ اور جو یہ کہا گیا کہ وہ خلیل الرحمٰن کی مانند ہیں۔ یہ ان کی کمالی صفتوں میں سے ایک خاص صفت کمال مراد ہے۔ جو اخص صفات ہیں۔ اور اس میں حضرت خلیل علیہ السلام سے مشارکت رکھتے ہیں۔ اور یہی مطلب مشائخ کرام کے اس قول کا ہے کہ ''ہر ولی نبی کے قدم پر ہے۔'' حاشا وہ نبی کے تمام صفات میں ہم مثل مراد نہیں ہے۔ اور ابن عدی ''کامل'' میں نقل کرتے ہیں کہ ان چالس ابدال میں سے بائیس افراد ملک شام کے ہوتے ہیں اور اٹھارہ افراد ملک عراق سے اور جب حکم الٰہی ہوگا تو وہ سب انتقال کر جائیں گے۔ اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ مسند احمد بھی یہی ہے۔

ابو نعیم ''حلیہ'' میں سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خیار امت پانچسو شخص ہیں۔ اور ابدال چالیس ہیں نہ کہ پانچ سو۔ یہ چالیس سے نہ کم ہوتے ہیں نہ زیادہ ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے کوئی مرتا ہے تو دوسرا اس کے بدل میں آ جاتا ہے۔ یہ تمام روئے زمین میں ہوتے ہیں۔ نیز ''حلیہ'' میں سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میری امت کے چالیس مرد ایسے ہیں جن کے دل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے خلق کو بلاؤں سے محفوظ فرماتا ہے۔ انہیں کو ابدال کہا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ درجہ روزہ و نماز اور صدقہ سے نہیں پایا۔ حضرت ابن مسعود نے دریافت کیا پھر کس چیز سے یہ درجہ پایا۔ فرمایا، مسلمانوں کی خیر خواہی اور سخاوت سے۔ مطلب یہ کہ نماز روزہ و صدقہ میں تو وہ مسلمانوں کے ساتھ شریک ہیں لیکن ان کی وہ خاص صفات جس کی بنا پر انہیں یہ درجہ ملا یہی دو صفتیں ہیں۔

حضرت معروف کرخی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جو شخص روزانہ یہ دعا مانگے کہ: اَللّٰھُمَّ ارْحَمْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ (اے خدا امت محمد پر رحم فرما) تو حق تعالیٰ اسے ابدال میں لکھتا ہے۔ اور ''حلیہ'' میں ہے کہ جو روزانہ دس بار ان لفظوں کو کہے: اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اُمَّةَ مُحَمَّدَ اَللّٰھُمَّ فَرِّجْ عَنْ اُمَّةِ مُحَمَّدَ اَللّٰھُمَّ اَرْحَمْ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ (اے خدا! امت محمد کی اصلاح فرما۔ اے خدا امت محمد پر کشادگی فرما۔ اے خدا امت محمد پر رحم فرما۔)

منقول ہے کہ ابدال کی نشانی یہ ہے کہ ان سے اولاد پیدا نہیں ہوتی۔ اور وہ کسی چیز پر لعنت نہیں کرتے۔ زید بن ہارون سے مروی ہے کہ ابدال اہل علم ہیں اور امام احمد رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابدال اگر محدثین نہ ہوں گے تو پھر کون ہوں گے؟

خطیب نے ''تاریخ بغداد'' میں ایک کتاب سے نقل کیا ہے کہ فرمایا ''نقباء'' تین سو ہیں اور ''نجباء'' ستر ''ابدال'' چالیس ''اخیار'' سات ''عمد'' (غالباً اوتاد) چار اور ''غوث'' ایک ہے۔ نقباء کا مسکن مغرب اور نجباء کا مسکن مصر اور ابدال کا مسکن شام اور اخیار زمین میں سیاح ہیں۔ عمد زمین کے گوشوں میں ہیں اور غوث کا مسکن مکہ مکرمہ ہے۔ اور جب کوئی امر عام عارض ہوتا ہے تو نقبا دعا کرتے ہیں اور اس حاجت کے پورے ہونے کے لیے وہ عاجزی کرتے ہیں۔ ان کے بعد نقباءٔ ان کے بعد ابدال ٔ ان کے اخیار ٔ ان کے بعد عمد ٔ اگر ان کی دعائیں مستجاب ہو جائیں تو فبہا ورنہ غوث عاجزی کرتے ہیں ٔ گڑگڑاتے ہیں اور سوال کے تمام ہونے سے پہلے غوث کی دعا قبول کر لی جاتی ہے۔

قبر وحشر میں امت کے خصائص: اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ قبروں میں گناہوں کے ساتھ داخل ہوں گے اور بے گناہ ہو کر باہر نکلیں گے۔ مسلمانوں کے استغفار کرنے کی بنا پر انہیں گناہوں سے پاک وصاف کر دیا جائے گا۔ اسے طبرانی نے ''اوسط'' میں بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اس حدیث سے خاص قسم کی انسیت ان سے حاصل ہوتی ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قول شاذ ہے کہ ''عذاب قبر اس امت مرحومہ کے ساتھ خاص ہے تاکہ انہیں پاک وصاف کر کے آخرت میں لے جائیں اور ان پر کوئی دوسرا عذاب نہ ہو۔''

انہی خصائص امت میں سے یہ ہے کہ انہیں کے لیے سب سے پہلے زمین پھاڑی جائے گی۔ مطلب یہ کہ تمام امتوں سے پہلے یہ اپنی قبروں سے باہر آئیں گے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ فرمایا میں پہلا ہوں گا کہ سب سے پہلے میرے لیے اور میری امت کے زمین شق ہو گی۔''

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جب اس امت کو بلایا جائے گا تو ان کے اعضاء وضو سے جو کہ روشن وتاباں۔ محجل) ہوں گے۔ غرہ اس سفیدی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کے چہرے پر ہو اور محجل گھوڑے کی اس سفیدی کو کہتے ہیں جو اس کے پاؤں پر ہوتی ہے۔ محجل اس بناء پر کہا گیا کہ وضو میں ہاتھوں کو کہنیوں تک اور پاؤں کو ٹخنوں تک خوب دھویا جاتا ہے۔ اور ''غر'' اس لیے کہا گیا کہ وضو میں مقدم سر ٔ گردن کا بالائی حصہ اور چہرہ دھویا جاتا ہے۔

انہی خصائص امت میں سے ہے کہ روز حشر موقف میں یہ بلند مقام پر ہوں گے۔ سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اور میری امت ایسی بلند جگہ پر ہو گی جو خلائق میں سے کسی کے لیے ایسی مشرف نہ ہو گی مگر یہ کہ وہ ہم میں سے ہونے کو پسند کرے اور نہیں ہے کوئی نبی کہ اس کی امت نے ان کی تکذیب کی ہے مگر یہ کہ ہم گواہی دیں گے کہ انہوں نے حق تعالیٰ کی رسالت پہنچائی ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ میں اور میری امت ''تل'' یعنی بلند جگہ پر ہوں گے۔

اس امت کے خصائص میں یہ ہے کہ ان کی پیشانیوں پر ایک نشان ہو گا جو ان کے سجدہ ریزی کا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سِيْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کی پیشانیوں میں اثر سجدہ کا نشان ہے۔) لیکن یہ علامت دنیا میں ہے یا آخرت میں۔ اس میں دو قول ہیں ایک یہ کہ سیما یعنی علامت دنیا میں ہے اور اس سے مراد حسن سیرت اور سیمائے اسلام وخشوع ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بیداری کی وجہ سے ان کے چہرے میں زردی کا نام ہے۔ جس سے لوگ گمان کرتے ہیں کہ شاید یہ بیمار ہیں۔ حالانکہ وہ بیمار نہیں ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سیما وعلامت آخرت میں ہوگا کہ ان کے مواضع سجود روشن ہوں گے جس سے وہ پہچانے جائیں گے کہ یہ دنیا میں سجدہ کرنے والے ہیں۔ شہر بن حوشب سے مروی ہے کہ امت محمدیہ کے چہروں کے مواضع سجود چودھویں رات کے چاند کی مانند دمکتے ہوں گے۔ عطاء خراسانی فرماتے ہیں کہ اس آیت کے تحت ہر وہ شخص ہے جو نماز پنجگانہ ادا کرتا ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ ان کو ان کے نامہ اعمال' ان کے داہنے ہاتھ میں دئے جائیں گے اسے امام احمد و بزار نے روایت کیا ہے۔ ایسا ہی مواہب میں بھی ہے' مشکوٰۃ میں بھی امام احمد کی حدیث بروایت ابوالدرداء مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں اپنی اُمت کو روزِ قیامت اس سے پہچانوں گا کہ ان کے اعضاء وضو چمکتے ہوں گے اور ان کے نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور میں اس سے پہچانوں گا کہ ان کی اولاد ان کے آگے سعی کرے گی۔ شیخ ابن حجر شرح میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ان کا نامہ اعمال دوسروں سے پہلے داہنے ہاتھ میں دیا جائے۔ اب رہا ''اولاد کی سعی''؟ ممکن ہے یہ بھی خصائص میں سے ہو۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ اس امت کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنی جانب چلتا ہوگا۔ جیسا کہ قرآن کریم ناطق ہے۔ انہی خصائص میں سے یہ کہ ہر وہ چیز ان کے لیے خاص ہے جو انہوں نے بذات خود سعی کی یعنی اعمال کیے۔ اور وہ بھی جو ان کے بعد لوگوں نے ان کے لیے سعی و اعمال کے لیے۔ (ایصال ثواب' صدقہ جاریہ اور استغفار وغیرہ) حالانکہ ان سے پہلی امتوں کے لیے صرف وہی اعمال تھے جو انہوں نے بذات خود کیے۔ ابن عکرمہ اسی جگہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ارشاد سے ایک اشکال بیان کرتے ہیں کہ فرمایا وان لین للا نسان الاماسعی (بیشک نہیں ہے انسان کے لیے وہی جو اس نے عمل کیے۔) کیونکہ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ آدمی کے لیے بجز اس چیز کے جو اس نے خود عمل کیے کوئی نفع دینے والی چیز نہیں ہے۔ علماء نے اس اشکال کے کئی جواب دئے ہیں۔ ایک یہ کہ آیت کریمہ اس ارشاد باری سے منسوخ ہے کہ فرمایا: وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ.

ایصال ثواب کا ثبوت: لہٰذا بچہ ماں باپ کے میزان میں گردانا جاتا ہے اور ان سے وہ خوشی و مسرت پاتے ہیں۔ اور حق تبارک وتعالیٰ' ماں باپ کی شفاعت بیٹوں کے لیے اور بیٹوں کی شفاعت ماں باپ کے لیے قبول فرماتا ہے اس کی دلیل حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اٰبَآءُ كُمْ وَاَبْنَآءُ كُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا (تمہارے والدین اور تمہاری اولاد' تم نہ ڈرو کہ نفع میں کون تمہارے زیادہ قریب ہے) قرطبی فرماتے ہیں کہ بکثرت احادیث اس قول پر دلالت کرتی ہیں کہ مومن کو عمل صالح کا ثواب اس کے غیر کی جانب سے اسے پہنچتا ہے۔ ''صحیح'' میں مروی ہے کہ فرمایا جو کوئی اسے حال میں مر جائے کہ اس کے ذمہ روزہ ہے تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے۔ اور رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنے غیر کے لیے حج کرے اسے لازم ہے کہ پہلے اپنا حج کرے پھر اس کی طرف سے حج (بدل) کرے۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی طرف سے اعتکاف کیا اور ان کی طرف سے غلام آزاد کیا۔ حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا یارسول اللہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے کیا میں ان کی طرف سے صدقہ دوں۔ فرمایا ہاں! عرض کیا کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا پانی دینا۔ اس پر حضرت سعد نے ایک کنواں بنوایا۔ اور کہا: هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ (یہ سعد کی ماں کا کنواں ہے) حضرت عبداللہ بن بکر رضی اللہ عنہ کی دادی نے نذر مانی تھی کہ پاپیادہ مسجد قبا جائیں گی۔ پھر ان کا انتقال ہو گیا اور نذر پوری نہ کر سکیں۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فتویٰ دیا کہ ان کے بیٹے ان کی جانب سے وہاں تک جائیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت کریمہ: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اس میں انسان سے مراد ابوجہل ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک عقبہ بن ابی معیط اور ولید بن مغیرہ ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس جگہ انسان سے مراد زندہ ہے نہ کہ مردہ۔ لیکن بعض کی رائے ہے کہ ہماری شریعت دلالت کرتی ہے کہ انسان کے لیے اپنے عمل اور دوسروں کے عمل دونوں ہی نافع ہیں۔

صاحب کشاف (زمخشری جو کہ معتزلی ہے۔) کہ ''اپنی ذات کو غیر کے عمل نفع نہیں دیتے۔ مگر وہ جو مبنی ہوں اپنے نفس کے عمل پر۔ اور ہے وہ مومن و مصدق۔'' لہٰذا اس اعتبار سے غیر کے عمل خاص اس کے اپنے عمل تابع ہونے کی بناء پر حکم میں اپنے عمل اور اس کے قائم مقام کے ہوگا۔ اور نیز عمل نافع نہیں جب کہ وہ غیر اپنے لیے عمل کرتا ہے۔ لیکن جب اس نے دوسرے کے لیے نیت کر لی تو وہ حکم شرع میں اس کا نائب و وکیل ہو گیا۔ اور اس کا قائم مقام بن گیا۔ انتہیٰ۔ بلاشبہ کا اس میں اختلاف ہے کہ قرأت قرآن کا ثواب میت کو پہنچتا ہے یا نہیں۔ مذہب شوافع کے اکثر مشہور علماء اور امام مالک اور احناف کی مختصر جماعت کے نزدیک نہیں پہنچتا۔ لیکن شوافع او احناف کے اکثر علماء کا یہ مذہب بھی ہے کہ پہنچتا ہے۔ امام احمد بھی اسی کے قائل ہیں۔ بلکہ امام احمد سے تو یہ منقول ہے کہ میت کو ہر چیز پہنچتی ہے۔ خواہ صدقہ ہو یا نماز و حج اعتکاف و قرأت۔ اور ذکر وغیرہ لیکن کہا گیا ہے کہ قبر پر قرأت بدعت ہے۔ شیخ شمس الدین قسطلانی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کا ثواب پہنچنا صحیح ہے۔ قریب سے ہو یا اجنبی یا وارث یا غیر وارث کی طرف سے ہو جس طرح کہ باجماع صدقہ' دعا اور استغفار نفع دیتا ہے۔

امام عبداللہ یافعی رحمتہ اللہ ''روض الریاحین'' کے تکلہ میں ذکر فرماتے ہیں کہ لوگوں نے شیخ عزیز الدین بن عبدالسلام کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں حکم دیتے تھے کہ میت کو قرآن کی قرأت کا ثواب نہیں پہنچتا اب معلوم ہوا کہ پہنچتا ہے۔ قرآن پڑھو اور اس کا ثواب پہنچاؤ۔

قاضی حسین نے فتویٰ دیا ہے کہ قبر پر قرأت قرآن کی اجرت لینا جائز ہے۔ جس طرح کہ اذان و تعلیم قرآن کے لیے اجرت لینا جائز ہے۔ چاہیے کہ قرآن کے بعد میت کے لیے دعا کرے۔ اس لیے کہ دعا اس کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اور بعد قرأت دعا کرنا قبولیت سے زیادہ نزدیک اور برکت کی رو سے زیادہ ہے۔

شیخ عبدالکریم سالوسی بیان کرتے ہیں کہ اگر قاری اپنی قرأت کے دوران نیت کرے کہ اس کا ثواب میت کے لیے ہے تو نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ یہ عبادت بدنی ہے۔ لہٰذا غیر سے واقع نہیں ہوگی۔ لیکن اگر نیت کرنے کے بعد قرأت کی اور جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے میت کے لیے بخش دے تو یہ دعا ہے۔ اور اس کے حصول سے ثواب میت کو نفع دیتا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ موضع قرآن' برکت اور نزول رحمت کی جگہ ہے۔ اور مردہ حکم میں زندہ کے موجود ہے۔ لہٰذا جس وقت قاری اسے ثواب پہنچائے تو نزول رحمت اور حصول برکت کی امید رکھنی چاہیے۔

صاحب ''غدہ'' بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی چشمہ نکالے' کنواں کھودے یا درخت لگائے یا قرآن کو اپنی زندگی میں وقف کرے یا ان کاموں کو دوسرے کے مرنے کے بعد کرے تو اس کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ اور وقف کرنا مصحف اور قرآن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر وقت اس کے ساتھ شامل ہے۔ اور یہ قیاس میت کی طرف سے قربانی کے جائز ہونے پر تقاضہ کرتا ہے اس لیے کہ یہ صدقہ کی ایک قسم ہے۔ لیکن ''تہذیب'' میں کہا گیا ہے کہ اس کے حکم کے بغیر غیر کے لیے قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی حکم میت کا ہے مگر یہ کہ اس پر وصیت کر دی گئی ہو۔

امیر المومنین سیّدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہ نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد آپ کی طرف سے قربانی دیتے تھے اور ابوالعباس محمد بن

اسحاق سے ''سراج'' میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ستر جانوروں کی قربانی دی ہے اب رہا رسولِ خدا ﷺ کی طرف ہدیہ کرنا تو اس کے انکار میں میرے پاس نہ کوئی حدیث ہے نہ کوئی اثر۔ ایک قلیل جماعت نے اس کا انکار کیا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ اسے صحابہ کرام نے نہیں کیا۔ (حالانکہ اوپر حضرت علی مرتضٰی کا عمل گزر چکا ہے) بعض فقہائے متاخرین نے اسے مستحب قرار دیا ہے۔ اور کچھ لوگ اسے بدعت جانتے کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حضور اس سے غنی ہیں۔ اس لیے کہ حضور سے ثابت ہے بحکم ''من سن حسنته'' الی آخر حدیث۔ یعنی جس نے کوئی عمل خیر کیا آپ کی امت میں سے بغیر اس کے کہ عامل کے ثواب میں سے کچھ کمی ہو تو ان سب کے برابر ہے سے اجر ملے گا۔ الخ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی چیز نہیں ہے کہ عمل کرے اسے کوئی امتی مگر یہ کہ نبی کریم ﷺ اس میں اصل بنیاد ہیں۔ نصرت کی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام حسنات اور ان کے ہر عمل صالح حضور کے صحائف یعنی نامہ اعمال میں اس سے زیادہ ہیں۔ جو عامل کے اجر میں ہے اور اس زیادتی کو بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ اس لیے کہ مہتدی یعنی ہدایت کا پانے والا اس کا اجر اور عامل قیامت تک ہوں گے۔ اور اس کا تازہ بتازہ اجر شیخ و معلم کے لیے اس کے ثواب کے برابر ہوتا ہے۔ اور استاد کے استاد کو دونا تیسرے استاد کو چار گنا اور چوتھے استاد آٹھ گنا' اسی طرح بعد داجور حاصلہ ہر مرتبہ میں اجر پہنچتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تک یہ سلسلہ پہنچ جاتا ہے اور اسی بنیاد پر بعد والوں پر پچھلے لوگوں کی فضیلت معلوم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کے بعد دس مراتب کو جب فرض کیے جائیں گے تو حضور ﷺ کے لیے ایک ہزار چوبیس گنا ثواب حاصل ہوگا۔ پھر جب دسویں سے گیارہواں ہدایت پائے گا تو حضور کا اجر و ثواب دو ہزار اڑتالیس ہو جائے گا۔ اسی طرح جتنے زیادہ مرتبہ ہوتے جائیں گے اتنے ہی ماقبل سے دو چند اجر و ثواب بڑھتا جائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ جیسا کہ محققین جواب دیتے ہیں کہ حضور تمام اقسام شرف میں کامل ہیں لیکن چونکہ قاری کی قرأت کا ثواب اس کے معلم کو بھی پہنچے گا اور پھر معلم کے معلوم کو۔ یہ سلسلہ اسی طرح اوپر کو جاری ہوگا۔ یہاں تک کہ معلم اول جو کہ شارع علیہ السلام ہیں آپ کو ان سب کے برابر اجر پہنچے گا جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور زمرہ میں اس دعا کی مشروعیت ہے جو خانہ خدا کی رویت کے وقت ہے۔ زائرین کہتے ہیں: اَللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَشْرِيْفًا وَّتَعْظِيْمًا (اے خدا! اس گھر کی شرافت اور عظمت کو اور زیادہ فرما) یہ سب مواہب لدنیہ میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے قول میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ: مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَهَا. (جس نے کوئی اچھی بات نکالی تو اس کے لیے اس کے عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ہے) یہ سنت حسنہ کے عمل کے سنت ہونے پر امت کو ترغیب و تحریص ہے۔ اور اس میں حضور کے لیے اجور غیر متناہی کے اثبات اور اپنے کمال کی طرف اشارہ ہے۔

اس امت کے خصائص میں سے یہ ہے کہ یہ امت تمام امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔ طبرانی نے ''اوسط'' میں بروایت سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حرام کر دی گئی جنت انبیاء پر جب تک کہ میں داخل نہ ہوں۔ اور حرام کر دی گئی دوسری امتوں پر جب تک کہ میری امت داخل نہ ہو۔

انہی خصائص میں سے یہ ہے کہ جنت میں اس امت کے ستر ہزار لوگ بے حساب داخل ہوں گے اسے شیخین نے روایت کیا اور بیہقی و طبرانی کے نزدیک ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میری امت کے ستر ہزار افراد کو بے حساب جنت میں داخل فرمائے گا۔ میں نے حق تعالیٰ سے اس سے زیادہ کے لیے سوال کیا حق تعالیٰ نے وہ بھی مجھے عنایت فرمایا یعنی ان ستر ہزار میں سے ہر ایک شخص مزید ستر ستر ہزار شخص کو بے حساب لے جائے گا۔

غرض کہ حق تبارک وتعالیٰ نے اس اُمت کو وہ کچھ عنایت فرمایا ہے جو کسی اُمت کو مرحمت نہ ہوا جیسا کہ ہمارے نبی ﷺ نے اپنی

اطاعت کے لیے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام رسولوں میں مکرم فرمایا اور ہمیں تمام امتوں میں مکرم بنایا۔

صلی اللّٰہ علیٰ خیر خلقہٖ محمدٍ آلہٖ واصحابہٖ وامتہٖ اجمعین۔

ذکر معراج مبارک

وصل: اخص خصائص، اشرف فضائل وکمالات، ابہر معجزات وکرامات میں سے اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کا حضور اکرم ﷺ کو اسریٰ ومعراج کے ساتھ مخصوص ومشرف فرمانا ہے کیونکہ کسی نبی یا رسول کو اس سے مشرف ومکرم نہ کیا گیا اور جس مقام علیا تک آپ کی رسائی ہوئی اور جو کچھ وہاں دکھایا گیا کوئی ہستی کبھی وہاں نہ تو پہنچی ہے اور نہ دیکھا ہے۔ فرماتا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیَاتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ.

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ خاص کو رات کے تھوڑے عرصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا وہ جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھیں تا کہ دکھائیں ہم انہیں اپنی نشانیاں بیشک وہ سنتا دیکھتا ہے۔

اسریٰ کے معنی ہیں لے جانا۔ مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے مسجد اقصیٰ تک لے جایا گیا۔ اس کا منکر کافر ہے کیونکہ یہ اللہ کی کتاب سے ثابت ہے۔ پھر وہاں سے آسمان پر لے جانے کا نام معراج ہے۔ یہ احادیث مشہورہ سے ثابت ہے۔ اس کا منکر مبتدع، فاسق اور مخذول ہے۔ دیگر جزئیات اور عجیب وغریب احوال کا ثبوت حدیثوں سے ہے۔ اس کا منکر جاہل ومحروم ہے۔ مذہب صحیح یہی ہے کہ وجود اسریٰ ومعراج سب کچھ بحالت بیداری اور جسم کے ساتھ تھا۔ صحابہ، تابعین اور اتباع کے مشاہیر علماء اور ان کے بعد محدثین، فقہا اور متکلمین کا مذہب اسی پر ہے۔ اس پر احادیث صحیحہ اور اخبار صریحہ متواتر ہیں۔ بعض اس پر ہیں کہ معراج خواب میں روح سے تھی۔ اس کی جمع وتطبیق اس طرح کی ہے کہ یہ واقعہ متعدد مرتبہ ہوا۔ ایک مرتبہ بیداری میں اور دیگر اوقات خواب میں روح سے۔ کچھ مرتبہ مکہ مکرمہ میں اور کچھ مرتبہ مدینہ طیبہ میں، اس کے باوجود اس پر سب متفق ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی رویا یعنی خواب وحی ہے جس میں کسی شک وشبہ کو دخل نہیں۔ اور خواب میں ان کے دل بیدار ہیں۔ اور ان کی آنکھیں پوشیدہ ہوتی ہیں جیسے حضور ومراقبہ کے وقت آنکھیں پوشیدہ ہوتی ہیں تا کہ محسوسات میں سے کوئی چیز مشغول نہ کر دے۔

قاضی ابوبکر بن العربی کہتے ہیں کہ اس کا وقوع خواب میں توطئہ وتیسیر یعنی سمجھانے اور آسان کرنے کے لیے تھا۔ جیسا کہ ابتدائے نبوت میں رویائے صادقہ دیکھتے تھے تا کہ وحی کا بوجھ جو ایک امر عظیم ہے اس کی برداشت آپ کو آسان وسہل ہو جائے۔ چنانچہ قوائے بشر یہ اس کی برداشت میں کمزور اور عاجز ہیں۔ ایسے ہی معراج پہلے خواب میں واقع ہوئی تا کہ بیداری میں اسے پانے کی قوت واستعداد حاصل ہو جائے بلکہ اس کے قائلین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خواب میں اس کا وقوع بعثت سے پہلے تھا۔ (واللہ اعلم)

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اسرات اور معاریج بہت تھیں اور بعض نے چونتیس کہا ہے۔ جن میں سے ایک تو بچشم بیداری سے تھی۔ باقی خواب میں روحانی تھیں۔ (واللہ اعلم)۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اسریٰ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جسمانی بیداری میں تھی۔ اور وہاں سے معراج آسمانوں تک خواب میں روحانی تھی۔ اور وہ اسی آیت کریمہ سے دلیل لیتے ہیں کہ اس میں مسجد اقصیٰ کو اسراء کی غایت ٹھہرایا ہے۔ اگر اسراء جسمانی، مسجد اقصی سے آگے ہوتی تو ذکر فرمایا جاتا۔ یہ ذکر فرمانا رسول اللہ ﷺ کی بزرگی ومدح میں اور حق تبارک وتعالیٰ کی قدرت کی تعظیم وتعجب میں زیادہ بلیغ تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کریمہ میں مسجد اقصیٰ کے ذکر تخصیص،

وقوع خلاف ونزاع اور اس میں قریش کے انکار کی بناء پر ہے اور حضور ﷺ سے منکرین قریش کا اس کی علامتوں اور نشانیوں کو دریافت کرنے کی وجہ سے اس کا ذکر ہے۔ اور ان کا بغرض امتحان مسجد اقصیٰ کی صفتوں کے بارے میں باتیں معلوم کرنے کی بنا پر خصوصیت سے ذکر ہے۔ جیسا کہ آگے تذکرہ آئے گا۔ اس بارے میں احادیث مشہورہ اور اخبار صحیحہ بکثرت وارد ہیں بلکہ آیات قرآنیہ بھی ہیں۔ چنانچہ سورہ ''والنجم'' میں واقع ہے۔ اگرچہ سورہ والنجم میں جو کچھ واقع ہوا ہے اسے جبریل علیہ السلام کی رویت اور ان کے نزدیک ہونے پر کچھ حضرات محمول کرتے ہیں لیکن تحقیق یہی ہے کہ یہ قصہ معراج پر محمول ہے۔

بندہ مسکین (شیخ محقق رحمۃ اللہ) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق و الیقین کہتا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ یہ اشارہ کہ: لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا (تاکہ ہم دکھائیں انہیں نشانیاں) معراج کے ساتھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسجد اقصےٰ لے جایا گیا۔ یہاں تک کہ وہاں سے آسمانوں پر لے جا کر نشانیوں کو دکھایا گیا۔ اس لیے کہ نشانیوں کا دکھانا اور غایت کرامات ومعجزات کا ظاہر فرمانا آسمانوں میں تھا۔ اور مسجد اقصیٰ میں جو واقع ہوا ہے اس پر انحصار نہ تھا۔ مسجد اقصیٰ لے جانا وہ اس معراج کا مبداء ہے۔ اسی بنا پر مسجد اقصیٰ کا ذکر فرمایا۔ اور واقعہ اگر خواب میں ہوتا تو کفار اسے مستبعد نہ جانتے۔ اور ضعفاء مومنین فتنہ میں نہ پڑتے نیز خواب میں واقعات وقضایا کے وقوع پذیر ہونے کو خارج میں حصر واحصاء غیر متعارف ہے۔ نیز صیغہ ''اسریٰ'' کا اطلاق خواب پر نہیں کرتے اور جب اسریٰ بیداری میں ہوا تو معراج جو اس کے بعد واقع ہوا بیداری میں ہوگا اور اس کے بعد خواب میں ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جو لوگ وقوع معراج کو خواب میں ہونے کے قائل ہیں ان کے شبہات کے موجب چند چیزیں ہیں۔ ایک تو حق تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ: وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ. نہیں بنایا ہم نے اس خواب کو جو آپ کو دکھایا مگر لوگوں کے امتحان کے لیے۔ اس آیہ کریمہ کو بعض مفسرین قضیہ معراج پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ ''رویا'' نیند میں خواب دیکھنے کو کہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ''رویا'' یا تو قضیہ حدیبیہ کے رویا پر یا واقعہ بدر کے رویا پر محمول ہے۔ اور اہل علم ورویت بصریٰ کے معنی میں بھی رویا استعمال کرتے ہیں اور وہ ''متنبی'' شاعر کے اس قول سے استناد کرتے ہیں کہ وَرُؤْيَاكَ اَحْلٰى فِيْ الْعُيُوْنِ مِنَ الْغَمْضِ اور بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ چونکہ معراج رات میں واقع ہوئی اس بنا پر اس کا نام رویا رکھا۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ فرمایا: فَاسْتَيْقَظْتُ (تو میں بیدار ہوگیا) اس میں بھی دلیل ہے کہ اسریٰ ومعراج نیند میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ اس نیند سے بیداری مراد ہے جو فرشتے کے حاضر ہونے سے پہلے تھی۔ مطلب یہ کہ حضورِ اکرم ﷺ خواب میں تھے کہ فرشتے نے حاضر ہو کر بیدار کیا۔ اور براق پر سوار کیا اور لے گئے۔ اور اگر بیداری سے مراد قضیہ معراج کے مکمل ہونے کے بعد کی نیند سے ہے جیسا کہ واقع ہوا ثُمَّ اسْتَيْقَظْتُ وَاَنَا فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (پھر میں بیدار ہوا تو میں مسجد حرام میں تھا۔) تو ممکن ہے کہ اِسْتَيْقَظْتُ بمعنی اصبحت ''یعنی میں نے صبح کی ہے''۔ یا یہ بیداری اس دوسری نیند سے ہے جو بیت الحرام آنے کے بعد واقع ہوئی ہے۔ اور ''اسریٰ'' تمام شب کی نہ تھی بلکہ رات کے مختصر حصے میں تھی۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ ''استیقاظ'' سے مراد افاقہ، ہشیاری اور اس حال سے اپنے حال پر آنا ہے۔ چونکہ جس وقت حضور ﷺ نے ملکوت سموات وارض کے عجائب وغرائب کا مطالعہ فرمایا اور ملاء اعلیٰ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں اور اسرار نامتناہی کا مشاہدہ کیا آپ کی حالت سخت ہوگئی تھی۔ اور آپ کا باطن، نیند کی حالت کے مشابہ ہوگیا تھا۔ اہل علم فرماتے ہیں کہ مشاہدہ ملکوت اگرچہ بیداری میں ہے مگر وہ ایک قسم کی عالم محسوسات سے غیبوبیت ہے اسی کو وہ بین النوم والیقظہ یعنی نیند و بیداری کی درمیانی حالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ درحقیقت وہ حالت بیداری میں ہے۔ لیکن غیبت کے عارض ہونے کے سبب اور اس کے زائل ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی اسے نیند سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اور ایک روایت میں وَاَنَا بَيْنَ النَّائِمِ وَالْيُقْظَانِ (میں سونے اور جاگنے والے کی حالت کے مابین تھا) بھی آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نوم سے مراد سونے کی مانند اور کروٹ سے لیٹنا

ہے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ بَیْنَ اَنَا نَائِمٌ فِی الْحِجْرِ وَرُبَّمَا قَالَ مُضْطَجِعٌ (حجر اسود کے قریب میں سونے کے قریب قریب تھا۔ اور بعض نے روایت کیا میں کروٹ سے لیٹا ہوا تھا) باوجود اس کے حضرت انس نے اس حال کا مشاہدہ نہیں کیا اور نہ حضور ﷺ سے ہی سنا کیونکہ قصہ معراج ہجرت سے پہلے کا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ بعد ہجرت بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور اس وقت بھی وہ سات آٹھ سال کے بچے تھے۔ جیسا کہ اہل علم تصریح کرتے ہیں۔ یہی حال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا ہے کہ مَا فَقَدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ. (حضور کا جسم اطہر بستر مبارک سے گم نہ ہوا) یہ ان لوگوں کے دلائل ہیں جو کہتے ہیں کہ ''اسریٰ'' خواب میں ہوئی۔ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس زمانہ میں حضور ﷺ کے پاس نہ تھیں اور نہ قبط وحفظ کی عمر ہی تھی۔ بلکہ ممکن ہے پیدا بھی نہ ہوئی ہوں۔ اس قول کے بموجب جو کہتے ہیں کہ اول اسلام میں بعثت سے ایک یا ڈیڑھ سال کے بعد ''اسریٰ'' ہوئی (واللہ اعلم)۔ مقصود یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان دوسری حدیثوں پر راجح نہیں ہے۔ جو بطریق مشاہدہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ اور حدیث عائشہ میں واقع ہوا ہے کہ ''مَا فَقَدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ (حضور کا جسم اطہر بستر مبارک سے گم نہ ہوا) یہ ان لوگوں کے دلائل ہیں جو کہتے ہیں کہ اسریٰ خواب میں ہوئی سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس زمانہ میں حضور ﷺ کے پاس نہ تھیں اور نہ ضبط وحفظ کی عمر ہی تھی بلکہ ممکن ہے کہ پیدا بھی نہ ہوئی ہوں اس قول کے بموجب جو کہتے ہیں کہ اوّل اسلام میں بعثت سے ایک یا ڈیڑھ سال کے بعد اسریٰ ہوئی (واللہ اعلم) مقصود یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان دوسری حدیثوں پر راجع نہیں ہے جو بطریق مشاہدہ حدیث روایت کرتے ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں واقع ہوا ہے کہ مَا فَقَدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ (حضور ﷺ کا جسم اطہر گم نہ ہوا۔ اس سے استدلال بے شبہ خطا ہے۔ اور وہ جو آیا ہے کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَدُ مَارَاٰى. (دل نے نہیں جھٹلایا جو آنکھ نے دیکھا) یہ خواب پر دلالت نہیں کرتا۔ اس لیے کہ مراد یہ ہے کہ دل نے آنکھ کو غیر حقیقت کا وہم نہیں ڈالا۔ بلکہ اس کی رویت کی تصدیق کیا اور جس چیز کو آنکھ نے دیکھا دل نے اس کا انکار نہ کیا۔ بدلیل: مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى. (نہ آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی) اب رہا فلسفیوں کے اباطیل ومزخرفات سے تمسک واستدلال کرنا کہ ''طبعی طور پر جسم ثقیل بلندی کی جانب نہیں جا سکتا اور آسمان میں خرق والتیام (پھٹنا اور ملنا) جائز نہیں ہے'' وغیرہ۔ یہ باتیں طریقہ اسلام میں باطل ولغو ہیں۔

ایک اور جماعت اہل اشارات وتاویلات کی صورتوں کو معانی پر محمول کرتی ہے۔ یہ معراج کو روحانی تصور کرتی ہے۔ ان کے اس قیاس پر کہ حشر کو روحانی کہتے ہیں اس معنیٰ میں نہیں کہ روح کو خواب میں معراج ہوئی۔ بلکہ اس معنی میں کہ معراج، ترقی کے مقامات واحوال اور عروج کمال کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ وہ جبریل سے روح محمدی اور براق سے آپ کا نفس مبارک جو روح کی سواری ہے جو اپنی خاصیت میں سرکش ہے اور رام نہیں ہوتا مگر روحانی قوت سے۔ اور آسمان سے مراد مقام قرب اور سدرۃ المنتہی سے انتہائی مقامات ہیں، ان کے اسی قیاس کے مطابق یہ فرقہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرعون، عصا نعلین اور وادی مقدس کی تاویلات کرتا ہے اگر یہ صورتوں کا اثبات کریں (یعنی الفاظ وکلام کے ظاہری مطلب ومفہوم کو برقرار رکھیں) پھر وہ ان کو معانی کی طرف اشارہ کریں تو علم ومعرفت میں ایک چیز ہے اور اس کا کوئی مرتبہ ہے۔ ان کے قیاس پر کہ حشر جسمانی وروحانی کے درمیان جمع کریں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ بھی اسی خیال کے بھنور میں ہیں اگر صرف معانی کا اعتقاد کریں اور الفاظ وصور کے قائل نہ ہوں تو یہ بجائے خود کفر والحاد ہے۔ اور یہ مذہب باطنیہ ہے۔ اس مسکین (شیخ محقق رحمہ اللہ) کے ایمانی ذائقہ پر یہ طریقہ اولیٰ بھی استبعاد اور انکار کی طرف مشیر اور موہم ہے گویا انہوں نے وجود صور کو جب دائرہ امکان سے عادی سے بعید جانا تو تاویل کی طرف گھوم گئے۔ حالانکہ ایمان اس کے سننے اور ماننے ہی کا نام ہے جیسا کہ اس واقعہ معراج کے سلسلے میں سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا اور اسی دن سے آپ ''صدیق'' کے نام ولقب سے موسوم ہوئے

اور چند ایک ضعیف الاعتقاد مسلمان دائرہ ایمان سے نکل گئے۔ علم الیقین، عین العین سے پہنچتا ہے۔ جب بھی کلام کرنا اور زبان وتاویل اور اس کے امکان کا اثبات دلائل کلامیہ سے کھولنا عقل اور اس کے حیلوں میں گرفتار ہونا ایمان وبندگی سے بعید ہے۔ اور ہم ایمانداروں کو خدا اور سول کے قول سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں ہے جو کچھ ہم ان سے سنیں گے کریں گے۔ یہ فرقہ اسے تقلید کہتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ تقلید کس کی ہے؟ یہ تقلید اس کی ہے جس کا تحقق معجزات قاہرہ سے ثابت ہے۔ اور محقق کی تقلید عین تحقیق ہے۔ اور حقیقۃً یہ تقلید بھی نہیں ہے یہ صراط مستقیم کا اتباع ہے۔ مقلد تو تم ہو کہ عقل کی تقلید کرتے ہو اور اس کے کہے پر چلتے ہو۔ جس کی تحقیق ثابت شدہ نہیں ہے۔ اور اس کی راہ میں سراسر شکوک وشبہات ہیں۔ فلاسفر اصلیت میں خود انبیاء علیہم السلام کے منکر ہیں۔ ہمیں ان سے کیا کام۔ ان کا نبی تو ان کی عقل ہے اور ان متکلمین خانہ خراب کو کیا ہو گیا ہے کہ باوجود راہ راست کے وہ گم گشتہ ہیں۔ اور راہ میں گفتگو، شبہ اور جدال پیدا کرتے ہیں۔ اگر چہ ان کی نیت، فلاسفہ کی مخالفت اور ان کا ورد ہے لیکن سلوک راہ میں عقل اور اس کی پیروؤں کی موافقت کرتے ہیں۔ خود بھی گم راہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

اثبات معراج شریف: وصل: باخبر رہنا چاہیے کہ معراج مبارک کی حدیث کو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کثیرہ نے تواتر معنوی کے مرتبہ میں روایت کیا ہے اگر چہ بعض خصوصیات میں رویات مختلف ہیں۔ ان میں مشہور وہ طویل حدیث ہے جسے امام بخاری ومسلم نے اپنی صحیح مین بروایت حضرت قتادہ، حضرت انس۔ مالک بن صعصہ ؓ ذکر فرمایا ہے اور حدیث میں نبی کریم ﷺ کے قلب انور کے شق کرنے اور اسے سونے کے طشت میں آب زم زم سے غسل دینے اور اسے حکمت وایمان سے پر کرنے پھر اسے سینہ اطہر میں اپنی جگہ رکھنے اور اسے برابر کرنے کا ذکر ہے۔ شق صدر شریف چار بار ہوا ہے۔ سب سے پہلے عہد طفولیت میں جبکہ آپ حضرت حلیمہ سعیدہ کے پاس تھے، دوسری مرتبہ، وقت بلوغ کے قریب دسویں برس میں۔ تیسری مرتبہ بعثت کے وقت اور چوتھی مرتبہ اس وقت جب کہ آپ کو ''اسریٰ'' یعنی معراج ہوئی۔ تاکہ کمال طہارت وصفا کے ساتھ عالم ملکوت میں پہنچنے میں مستعد ومنتہی ہوں۔ اسی قیاس پر وضو ہے کہ نماز سے پہلے پاکیزگی ہوتی ہے۔ اس لیے نماز معراج کا نمونہ ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (طور پر کلام الٰہی سے مشرف ہوتے وقت) اس تہیہ اور استعداد کا اتفاق نہ ہوا۔ اسی وجہ سے رویت الٰہی سے مشرف نہ ہوئے۔ یہ اس مقام کی خوبی ہے جس کا فطرت کے پرستار یعنی نیچری انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ شق صدر اور اخراج قلب، موت کی علت ہے۔ یہ زندگی کے ساتھ جمع نہیں ہوتی۔ اور ارباب عقل تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غسل وطہارت قلب سے مراد، حدوث وامکان کے میل سے حضور ﷺ کی باطنی صفائی ہے۔ اور اہل ایمان بغیر تاویل اور بغیر ظاہر سے انحراف کے تصدیق کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں یہ سب اسباب عادی ہیں اور حق تعالیٰ کے لیے کوئی چیز محال وممتنع نہیں ہے۔ لیکن سونے کا طشت لانا اور غسل دینا یہ عرف وعادت کے اعتبار سے ایک قسم کی تکریم ہے۔ اور اس طرف اشارہ ہے آپ تمام عالم میں معظم ومکرم ہیں لیکن یہ کہ آپ کی شریعت میں سونے کے برتن کا استعمال حرام ہے تو اس کے جواب میں اہل علم فرماتے ہیں کہ سونے کا حرام ہونا اس دنیا کے لیے ہے۔ لیکن آخرت میں خالصاً مسلمانوں کے لیے یہی ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ.

اے نبی فرمادو یہ سونا (حرام ہے) دنیا میں ایمانداروں کے لیے اور یہ خالص ہے قیامت کے دن۔

اور حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد کہ: هُوَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا وَلَنَا فِی الْاٰخِرَةِ سونا کفار کے لیے دنیا میں ہے اور ہمارے لیے آخرت میں۔ قصہ اسراء درحقیقت عالم آخرت کے قبیل سے ہے نیز اس کا استعمال اور فائدہ اٹھانا حضور ﷺ کی جانب سے حاصل نہیں ہے بلکہ

ملائکہ نے کیا ہے جو اس کے مکلّف نہیں ہے۔ بلکہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ واقعہ حرام ہونے سے پہلے کا ہے اور واقعہ بھی یہی ہے اس لیے کہ اس کی تحریم مدینہ منورہ میں بعد از اسریٰ ہوئی ہے۔ بعض ارباب معانی نے سونے اور قلب نبوی میں مناسبتیں نکالی ہیں۔ یہ کہ سونا جنت کے ظروف میں سے ہے۔ اور معدنیات میں اثقل جواہر ہے۔ نہ اسے مٹی کھاتی ہے اور نہ اس میں زنگ لگتا ہے۔ اسی طرح ہر دل سے قلب نبوی ثقیل تر، زرین تر اور مزین تر ہے اس میں وحی کا بوجھ ہے اور اسے سفلیات کی خاک نہیں کھاتی۔ اور نہ اس پر کدورات کو نیہ کا زنگ لگتا ہے اور لفظ ذہب (سونا) ذہاب الی اللہ (خدا کی طرف جانے) اور تطہیر اور اذہاب رجس (ناپاکی کو دور کرنے، پاک وصاف کرنے) کی طرف مشعر ہے اور یہ چمک، بقا، صفا اور رزانت کے معنی کو متضمن ہے۔ اور طشت کو حکمت وایمان سے پر کرنے کا مطلب ان جواہر نورانیہ سے جو کہ ایمان وحکمت کے کمال کا خلاصہ ہے اس سے لبریز کرنا ہے اور احتمال رکھتا ہے کہ یہ معنوی اجسام کے قبیل سے ہوں۔ جیسا کہ سورہ بقر میں آیا ہے کہ روز قیامت ظلہ (سایہ دار چیز) اور موت بکری کی شکل میں لائی جائے گی اور اعمال حسنہ صور حسنہ سے متمثل کیے جائیں گے پھر یہ میزان عدل میں رکھے جائیں گے۔ اہل عرفاء فرماتے ہیں کہ اس میں یہ دلیل ہے کہ ایمان وحکمت جواہر محسوسہ نہ کہ معنی معقولہ اور نہ از قسم اعراض۔ جیسا کہ متکلمین کا مذہب ہے اور شارع علیہ السلام حقائق اشیاء اعلم واعرف ہیں۔ اہل عقل کی نظر ظاہر پر ہے کیونکہ جب وہ دیکھتے کہ یہ جواہر سے صادر ہوئے ہیں تو ان پر عرضیت یعنی قایم بالغیر کا حکم لگا دیتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کا اس واقعہ سے مشاہدہ فرمانا یقین وایمان کی تکمیل واضافہ اور عادات مہلکہ سے بیخوف ہونے کا موجب ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ ہر حال ومقام میں سب سے بڑھ کر شجاع، ثابت قدم اور اقوی تھے۔ لیکن قلب اطہر کو آب زم زم سے پہلے غسل دینے کی حکمت میں اہل علم فرماتے ہیں کہ آب زم زم دل کو تقویت دیتا ہے۔ اس لیے قلب شریف کو غسل دیا کہ عالم ملکوت کے مشاہدہ پر قوی ہو جائے۔ اسی بناء پر علماء استدلال کرتے ہیں کہ آب زم زم آب کوثر سے افضل ہے۔ اس لیے کہ قلب شریف کو غسل نہیں دیا گیا مگر افضل پانی سے۔ یہ قول کہ آب زم زم قریب تھا اور آب کوثر دور"۔ تو یہ بہت ضعیف قول ہے اس لیے کہ یہاں قرب وبعد متصور نہیں ہے یہاں تو دونوں برابر ہے (واللہ اعلم)۔

ذکر براق: اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام ایک سفید چوپایہ لائے جس کا نام براق ہے۔ وہ خچر سے پست اور گدھے سے اونچا تھا۔ اور منتہائے نظر پر اس کا قدم پڑتا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ مجھے سوار کیا گیا اور حضرت جبریل مجھے آسمان پر لے گئے۔ ظاہر حدیث یہ ہے کہ آسمان تک براق پر تھے اور وہ ہوا میں اس طرح چلتا تھا جس طرح زمین پر چلتے ہیں۔ یہ بھی عادت کے خلاف ہے کیونکہ بشر ہوا پر نہیں چلتا چہ جائیکہ چار پایہ پر سوار ہو کر۔ یہ سب قدرت الٰہی کے ہاتھ میں ہے اور خدا کی قدرت عادت کے جاری ہونے میں مقید نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے براق کے دو بازو تھے جن سے وہ اڑتا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ براق پر سواری مسجد اقصیٰ تک تھی۔ اس کے بعد ایک معراج یعنی سیڑھی رکھی گئی جس کے ذریعہ اوپر لے جایا گیا۔ یہ بھی ایک روایت میں ہے۔ ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ بعض راویوں نے ان تفصیلات کا ذکر نہیں کیا جسے دوسرے راویوں نے بیان کیا۔ پہلے راوی نے مسجد اقصیٰ تک براق پر سواری کا ذکر صراحت سے کیا۔ اور پھر اسی سواری کے ذریعہ آسمان پر جانے کا تذکرہ نہیں کیا۔ اور دوسرے راوی نے آسمان پر عروج فرمانے کا ذکر کیا۔ ممکن ہے کہ یہ بے سواری ہو۔

(واللہ اعلم) براق کے بھیجنے میں حکمت، سیّد عالم محبوب رب العٰلمین ﷺ کی تعظیم وتکریم مقصود تھی جس طرح کہ محبین اپنے محبوبوں کے لیے گھوڑا بھیجتے ہیں اور اخص وخواص جو محرم وانیس مجلس خاص ہو اس کے بلانے کے لیے پیادوں کو بھیجتے ہیں اور رات کے وقت جو کہ خلوت خاص کا وقت ہے غیروں کی آنکھوں سے بچا کر بلاتے ہیں وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَتَعَالٰى وَتَقَدَّسَ. خچر سے پست اور حمار

سے بلند نہ بر شکل فرس، براق بھیجنے کی حکمت یہ ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ بلانا سلامتی و امن میں ہے نہ کہ حرب و خوف میں۔ اور براق کی ایسی تیز رفتاری جس کا عرف و عادت میں رواج نہیں ہے اظہار معجزہ کے لیے تھی۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ اس کا نام براق ہے گھوڑا اور خچر نہیں ہے اور یہ براق بریق سے بنا ہے جس کے معنی روشنی کی شعاعوں کے ہیں۔ اسی جہت سے اس کی تیز رفتاری بھی ہے۔

حضرت قاضی عیاض رحمتہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسے براق اس بناء پر کہا گیا ہے کہ ﷺ سکے دو رنگ تھے جیسے ''شاۃ برقا'' (چمکدار بکری) کہا جاتا ہے جس کے بالوں میں سفیدی و سیاہی دونوں ہوں صاحب مواہب لدنیہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے۔ براق بریق سے مشتق نہ ہوں۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جب حضورِ اکرم ﷺ رکاب میں پائے اقدس رکھنے لگے تو براق نے شوخی کی اس وقت جبریل علیہ السلام نے براق سے کہا تجھے کیا ہو گیا ہے کیوں شوخی کرتا ہے۔ تجھ پر حضورِ اکرم ﷺ سے زیادہ بزرگ تر سوار نہیں ہوا۔ پھر براق نے شوق کا اظہار کیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حضور نے اس کی پشت پر سواری فرمائی۔ یہ بات دلالت کرتی ہے کہ براق انبیاء علیہ السلام کی سواری کے لیے آمادہ تھا۔ بعض فرماتے ہیں ہر نبی کے لیے ان کے قدر و مرتبہ کے مطابق جداگانہ براق ہوتا ہے، چنانچہ روایتوں میں آیا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المقدس سے مکہ مکرمہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے ملاقات کے لیے براق پر سوار تشریف لائے تھے گویا حضرت جبریل علیہ السلام کا اشارہ جنس براق کی جانب ہے (واللہ اعلم)۔

اور براق کی شوخی اس وجہ سے تھی۔ اب تک اس پر کسی نے سواری نہیں کی تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ براق کی یہ شوخی، ناز و طرف اور افتخار سے تھی نہ کہ بطریق استبعادہ و سرکشی۔ جیسا کہ پہاڑ کے جنبش کرنے کے سلسلے میں حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اُثْبُتْ یَا ثَبِیْرُ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ نَبِیٌّ وَّصِدِّیْقٌ وَشَهِیْدَان اے شبیر پہاڑ قائم رہ بلاشبہ تجھ پر نبی صدیق اور دو شہید ہیں۔ کہتے ہیں براق کی رکاب حضرت جبریل علیہ السلام کے ہاتھ میں اور لگام حضرت میکائیل کے ہاتھ میں تھی۔ بعض روایتوں میں آیا ہے حضرت جبریل علیہ السلام حضور کے ردیف یعنی پس پشت بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کہ پہلے رکاب تھامی ہو۔ اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے اثنائے راہ میں اپنی محبت و عنایت کے اقتضاء میں اپنا ردیف بنا لیا ہو۔ یا یہ کہ پہلے ردیف بنے ہوں گے۔ اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کی تعظیم و تکریم اور طریقہ ادب کی رعایت سے اتر کر رکاب تھام لی ہو۔ (واللہ اعلم) پھر جب حضور ﷺ کی سواری زمین نخلستان میں پہنچی تو جبریل نے عرض کیا یہاں دوگانہ پڑھیئے۔ یہ زمین یثرب ہے جسے بعد میں مدینہ منورہ کہا جائے گا۔ اس کے بعد جب ''مدین'' اور اس زمین میں پہنچے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔ ان دونوں جگہوں میں بھی حضرت جبریل نے یہی عرض کیا کہ اتر کر دوگانہ ادا کیجئے۔ اس کے بعد حضور نے دیکھا کہ ایک جانب ایک بوڑھی عورت کھڑی ہے۔ حضور نے جبریل سے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ عرض کیا حضور بڑھے چلیے۔ پھر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک جانب ایک شخص کھڑا ہے وہ آپ کو بلا رہا ہے۔ حضور نے دریافت فرمایا یہ کون ہے۔ عرض کیا حضور بڑھے چلیے۔ اس کے بعد ایک جماعت پر گزر ہوا جو حضور کو سلام عرض کر رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی **السلام علیك یا اول**، **السلام علیك یا آخر**، **السلام علیك یا حاشر** ' اس پر جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ حضور ان کے سلام کا جواب مرحمت فرمائیے۔ آپ نے ان کے سلام کا جواب مرحمت فرمایا آخر حدیث تک۔ اس وقت حضرت جبریل نے عرض کیا وہ بوڑھی عورت جسے حضور نے ملاحظہ فرمایا وہ دنیا تھی اب اس کی عمر باقی نہیں رہی ہے مگر جتنی اس بڑھیا کی عمر باقی ہے اور وہ جس نے حضور کو مخاطب کیا تھا وہ ابلیس و شیطان تھا۔ اگر حضور اس کی طرف التفات فرماتے اور اسے جواب دیتے تو آپ کی امت دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتی اور شیطان انہیں گمراہ کر دیتا۔ اور وہ جماعت جو آپ پر سلام عرض کر رہی تھی وہ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا گذر حضرت موسیٰ کی قبر انور پر ہوا تو وہ اپنی قبر شریف میں نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ میں شہادت دیتا ہوں

یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں تو وہ خدا کے حضور عبادت کرتے ہیں۔ جیسا کہ اصحاب جنت' جنت میں کریں گے۔ بغیر اس کے وہ اس کے مکلّف ہوں۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ ایسے نیک و بدلوگوں کے گروہوں اور قوموں پر گذرے جو عالم برزخ و مثال میں اپنے احوال و افعال کے ثمرات و نتائج میں مشغول و گرفتار ہیں ان کا ذکر طویل ہے۔ پھر حضورِ انور بیت المقدس پہنچے اور براق کو مسجد کے دروازے کے حلقے سے باندھا جسے اب باب محمد (ﷺ) کہتے ہیں اس کے بعد مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعت ادا کیں۔ ظاہر ہے کہ دوگانہ تحیۃ المسجد تھا۔ یہاں فرشتے حاضر ہوئے اور تمام انبیاء حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی ارواح مقدسہ متمثّل ہو کر حاضر ہوئیں۔ خدا کی حمد و ثناء کی اور حضور ﷺ پر صلوٰۃ و سلام عرض کیا۔ اور سب ہی نے حضور ﷺ کی افضلیت کا اعتراف کیا پھر اذان کہی گئی اور نماز کے لیے اقامت ہوئی اور سب نے حضور ﷺ کو امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ حضور نے امامت فرمائی اور تمام انبیاء و ملائکہ علیہم السلام نے اقتدار کی۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ نماز نفل تھی یا فرض' اگر فرض تو نماز عشاء یا نماز فجر؟ سیاق حدیث سے ظاہر ہے کہ بیت المقدس میں تشریف آوری آسمانی عروج سے پہلے ہے تو یہ نماز عشا ہو گی۔ اور اس قول کے بموجب جس نے یہ کہا کہ یہ قضیہ بعد از نزول معراج ہے تو یہ نماز صبح ہو گی اور بعض نے اس کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ حضورِ انور ﷺ جب تمام کمالات و برکات لے کر اترے تو انبیاء علیہم السلام پر اپنے فضل و شرف کے اظہار کے لیے یہ نماز پڑھی۔

اس مسکین (یعنی شیخ محقق رحمۃ اللہ) کے دل میں یہ خیال گزرا تھا کیوں نہ دونوں حالتوں میں ہوا ہو یعنی قبل از عروج بھی اور بعد از عروج بھی۔ لیکن بغیر ذکر علماء حدیث اس خیال کے لکھنے کی جرأت نہ ہوئی مگر جب ان روایتوں کے دیکھنے کا وقت آیا تو میری نظر سے شیخ کبیر عماد الدین بن کثیر جو کہ اعاظم علماء حدیث و تفسیر سے ہیں ان کا قول گزرا۔ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ حضورِ انور ﷺ نے قبل از عروج اور بعد از عروج دونوں حالتوں میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ نماز ادا کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ حدیث میں ایسے اشارے موجود ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس کی کوئی مخالف بھی نہیں ہے۔ والحمد اللہ۔ لیکن شیخ ابن کثر رحمۃ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضور نے آسمان میں اقامت کی ہے حالانکہ متاظہر و متواتر راویتوں میں یہ ہے کہ بیت المقدس میں اقامت کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بعد از رجوع فرمائی۔ اس جگہ شیخ کبیر کیوں نہ فرمائیں کہ یہ دونوں جگہوں میں تھی یا دونوں حالتوں میں تھی۔ اور کیوں نہ وہ متاظہر و متواتر ردایات و درایات سے قطع نظر فرمائیں (واللہ اعلم)

جب حضورِ اکرم ﷺ مسجد سے باہر تشریف لائے تو جبریل علیہ السلام نے ایک پیالہ شراب کا اور ایک پیالہ دودھ کا پیش کیا۔ اور عرض کیا حضور کو اختیار ہے جو پیالہ چاہیں نوش فرما سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے دودھ کے پیالہ کو پسند فرمایا۔ جبریل نے دریافت کیا آپ نے فطرت کو اختیار فرمایا۔ اس جگہ فطرت سے مراد اسلام اور اس پر استقامت ہے۔ مطلب یہ کہ آپ نے اسلام کی علامت اور استقامت کو اختیار فرمایا۔ دودھ اسلام کی علامت اس لیے ہے کہ پینے والے کے لیے سہل و طیب اور ظاہر و شائع ہے اور اس عالم میں دودھ کو دین و علم کی مثال جانتے ہیں۔ اور جو کوئی خواب میں دیکھے کہ دودھ پی رہا ہے تو اس کی تعبیر یہی ہو گی کہ علم و دین سے بہرہ ور ہو گا۔ الحمد اللہ کاتب حروف (یعنی شیخ محقق رحمۃ اللہ) نے بعض خوابوں میں دیکھا کہ نیا پیالہ ہے۔ وہ شفاف' میٹھے اور سرد دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اس سب کو پی لیا ہے'' بخلاف شراب کے وہ ام الخبائث اور حال و مآل میں گونا گوں شر و فساد کو پیدا کرنے والی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ فطرت سے مراد خلقت ہے اور خلقت کی بناء پر دودھ سے ہے اور گوشت و پوست اور ہڈیوں کی نشو و نما بھی اسی سے ہے۔ اور نو مولود بچے کی پیٹ میں جو چیز سب سے پہلے جاتی ہے جس سے اس کے پیٹ کی رگیں کشادہ ہوتی ہیں وہ یہی دودھ ہے۔ اور

یہ بات بھی ہے کہ حضور ﷺ کو دودھ بہت مرغوب تھا۔ اور شراب اگرچہ اس وقت تک مباح تھی اس لیے کہ قصہ اسریٰ مکہ میں ہوا۔ اور شراب کی حرمت مدینہ منورہ میں ہوئی لیکن چونکہ اس کا آخر امر حرمت تھی یا یہ کہ حضور کا اس سے اجتناب فرمانا اور از روئے ورع وتقویٰ اور اس تعریض کی وجہ سے تھا کہ حرام کار اسے انجام ہونا ہی ہے اور یہ بات بھی تھی کہ علم الٰہی میں عین درست تھی۔ اور جبریل نے عرض کیا۔ اَصَبْتَ الْفِطْرَةَ. آپ نے فطرت کو پالیا اور ایک روایت میں ہے کہ: اَصَبْتَ فَاَصَابَ اللّٰهُ بِكَ آپ نے راہ صواب کو اختیار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب راہ صواب دکھائے۔ اگر کہیں کہ یہ شراب تو جنت کی تھی اس کے باوجود آپ نے مشابہت اور مماثلت کی بنا پر اس سے اجتناب فرمایا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا اگر آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی اور اس کے پینے میں پڑ جاتی۔ اور آپ کی امت اس خمر کے پینے میں یعنی دنیاوی شراب میں مبتلا ہو جاتی جو کہ مادہ فساد اور مادہ خباثت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ دو پیالے آئے۔ ایک دودھ اور ایک شہد کا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تین پیالے آئے ایک دودھ کا دوسرا پانی کا تیسرا شراب کا۔ اس میں شہد کا ذکر نہیں ہے۔ بہر تقدیر حضور ﷺ کی پسند دودھ کا اختیار فرمانا ہی ہے۔ ان پیالوں کا آنا ''سدرۃ المنتہیٰ'' پہنچنے کے قریب ہی ہوا۔ اس کی تصریح حافظ عماد الدین کثیر رحمۃ اللہ نے فرمائی ہے۔

مروی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے پروردگار کی حمد وثناء کی۔ ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بھی تھے۔ اور ان کی یہ ثنا گستری اور بلیغ خطہ خوانی ان فضائل وکرامات اور معجزات پر مشتمل تھی۔ جن سے حق تبارک وتعالیٰ وتقدس نے انہیں مخصوص فرمایا۔ حق تعالیٰ نے ان کی زبان شکر گزاری کے لیے کھولی اس کے بعد سیّد عالم خاتم النبیین ﷺ نے اپنی زبان مبارک کھولی۔ اور ارشاد فرمایا تم سب نے اپنے رب العزت جل وعلی کی حمد وثنا کر لی اب میں بھی ان کی حمد وثنا کرتا ہوں۔ اور فرمایا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَرْسَلَنِیْ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا لِّلنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ وَاَنْزَلَ عَلَیَّ الْفُرْقَانَ فِیْهِ تِبْیَانُ كُلِّ شَیْءٍ وَّجَعَلَ اُمَّتِیْ وَسَطًا وَّجَعَلَ اُمَّتِیْ هُمُ الْاَوَّلُوْنَ وَهُمُ الْاٰخِرُوْنَ وَشَرَحَ لِیْ صَدْرِیْ وَوَضَعَ عَنِّیْ وِزْرِیْ وَرَفَعَ لِیْ ذِكْرِیْ وَجَعَلَنِیْ فَاتِحًا وَّخَاتِمًا.

تمام تعریفیں اس خدا کو جس نے مجھے جہان بھر کے لیے رحمت اور سب لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا۔ اور مجھ پر وہ فرقان اتارا جس میں ہر چیز کا روشن بیان ہے اور بنایا میری امت کو درمیانی اور گردانا میری امت کو کہ وہی اول ہیں اور وہی آخر ہیں۔ اور کھولا میرے لیے میرا ذکر اور بنایا مجھے فاتح اور سلسلہ نبوت کا آخری نبی۔

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بِهٰذَا اَفْضَلَكُمْ مُحَمَّدٌ. (اے محمد ﷺ) اسی بنا پر حق تعالیٰ نے تم کو سب سے افضل قرار دیا۔

اس کے بعد جنت الفردوس سے ایک سیڑھی لائی گئی۔ جس کے داہنے بائیں فرشتے تھے آپ اس سے آسمانوں پر پہنچے۔ وہاں آپ نے ان نبیوں کو دیکھا جنہیں آپ کے استقبال اور ملاقات کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ انہیں بیت المقدس میں تمثیل کے بعد آسمانوں میں متمثل فرمایا گیا ہوگا، اور اس طریق پر سلام عرض کیا۔ جس طرح حدیثوں میں مذکور ہوا ہے۔ اس واقعہ میں جو عجیب وغریب حالات وحکایات روایتوں میں مذکور ہیں وہ یہ ہیں کہ جب حضور ﷺ چھٹے آسمان پر پہنچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پایا وہاں سے جب

اوپر تشریف لے جانے لگے تو حضرت موسیٰ رونے لگے اور کہنے لگے ایک شخص جیسے میرے بعد بھیجا گیا اسے ایسا برگزیدہ فرمایا گیا کہ اس کی امت جنت میں میری امت کے جانے سے پہلے جائے گی۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ رونا معاذ اللہ حسد کی بنا پر نہ تھا۔ اس لیے کہ اس عالم میں ہر ایک مومن کے دل سے حسد کے مادہ کو نکال دیا جائے گا۔ چہ جائیکہ اس شخص سے متصور ہو جسے حق تبارک وتعالیٰ نے اپنے کلام سے ممتاز فرمایا ہو۔ اور اپنی رسالت سے سرفراز کر کے اولالعزم کیا ہو۔ بلکہ یہ اس چیز کے فوت ہونے پر اظہار افسوس وحسرت ہے جو درجہ کی بلندی پر مترتب ہوتی ہے۔ بایں سبب کہ ان کی امت سے ایسی بکثرت مخالفت واقع ہوئی جو ان کے اجر وثواب کے کمی کا مقتضی بن کر ان کے اجر وثواب کی کمی کا مستلزم ہے۔ اس لیے ہر نبی کے لیے اس کے اجر وثواب ہے جتنا ان کی اتباع کرنے والے کا اجر ہے۔ اور جتنوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتباع کیا ہے وہ ہمارے نبی ﷺ کے اتباع کرنے والوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ ایسا ہی شیخ ابن حجر نے فتح الباری میں فرمایا ہے۔

ابن ابی جمرہ جو کہ عرفائے مالکیہ میں سے ہیں فرماتے ہیں حق تعالیٰ نے ہر نبی کے دل میں اپنی امت کے لیے رحمت ومہربانی رکھی ہے۔ اور انہیں اسے طبعی طور پر خلق فرمایا اسی بنا پر بعض امورات پر ہمارے نبی ﷺ نے بھی گریہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اس پر آپ سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ آپ کو کس بات نے رلایا ہے۔ فرمایا رونا رحمت ہے اور حق تبارک وتعالیٰ رحمت کرنے والوں پر ہی رحمت فرماتا ہے۔ بلاشبہ انبیاء علیہم السلام نے رحمت خداوندی کا وافر حصہ لیا ہے تو ان کے دلوں میں رحمت بھی دیگر تمام لوگوں سے بڑھ کر اور وافر تر ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی امت پر شفقت ورحمت کی خاطر روئے کیونکہ یہ وقت' افضال وجود وکرم اور وقت قدوم حبیب کریم ہے تاکہ فضل وعمیم اور قرب کی خلعت سے فائز ہوں لہٰذا اس قبول وایصال کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے امید رکھی کہ اس وقت کی ساعت وبرکت سے حق تعالیٰ ان کی امت پر رحمت فرمائے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لفظ ''غلام'' سے ذکر کرنا اس کے معنی کم عمری کے ہیں نہ کہ کسی اور معنی میں۔ یہ اس سبب سے دیگر انبیاء علیہم السلام کی بہ نسبت آپ صغیر السن تھے۔ اور اہل عرب' مرد مستجمع السن کو کہتے ہیں جب تک اس میں قوت ودانائی ہے ''غلام'' کہتے ہیں۔ (گویا لفظ ''غلام'' بمعنی جوان' صحت مند کے ہے۔)

فتح الباری میں کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لفظ ''غلام'' بول کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ رب العزت جل جلالہ کا افضال واکرام اور اس کا انعام دائمی قوت کے ساتھ شامل ہے حتیٰ کہ سن کہولت سے سن شیخوخت میں داخل ہو جائیں اس وقت بھی آپ کے بدن شریف میں ضعف پیری اثر انداز نہ ہوگی اور حضور ﷺ کی قوت ودانائی میں ضعف ودانائی کی کوئی راہ نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ جب حضورِ انور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگوں نے آپ پر اسم ''شاب'' یعنی مرد جوان کا اطلاق کیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''اسم شیخ'' یعنی بوڑھے مرد سے مخاطب کیا۔ باجودیکہ حضورِ اکرم ﷺ کی عمر شریف حضرت ابوبکر سے زیادہ تھی (بندہ مسکین) یعنی شیخ محقق رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی بنا پر آپ پر آثار پیری نمایاں نہ تھے۔ بجز ان چند سفید بالوں کے جو آپ کے سر مبارک اور داڑھی شریف میں تھے۔ تاکہ لوگوں کی نظروں میں آپ بوڑھے اور ضعیف نہ معلوم ہوں اُمتِ محمدیہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شفقت اور اعتنا کا اثر بلاشبہ نمازوں کی کمی کے ضمن میں ظاہر ہوا کہ پچاس نمازوں سے پانچ نمازیں ہوئیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس امت مرحومہ پر اتنی رحمت وشفقت فرمانا اس بنا پر تھا کہ انہوں نے توریت میں اس امت کی صفات اور ان کی خوبیوں کو پڑھ لیا تھا اور آرزو کی تھی کہ اس امت کو ان کی امت بنا دے۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا یہ امت احمد مجتبےٰ ﷺ کی ہے۔ اس تمنا کو دل سے نکال دو۔ پھر حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے خدا تو مجھے اس احمد مجتبےٰ ﷺ کا امتی بنا دے۔

سدرۃ المنتہیٰ پہنچنا: وصل: اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کو ''سدرۃ المنتہیٰ'' کی جانب لے جایا گیا۔ اس جگہ مخلوق کے اعمال اور

ان کے علوم ختم ہو جاتے ہیں اور امر الٰہی نزول فرماتا ہے۔ اور احکام حاصل کیے جاتے ہیں۔ اور فرشتے اسی کے پاس ٹھہرتے ہیں اس سے آگے بڑھنے اور وہاں سے تجاوز کرنے کی کسی میں تاب وتواں نہیں ہے۔ یہیں پر سب رک جاتے ہیں۔ اور ہر چیز جو عالم سفلی سے اوپر جاتی ہے اور عالم علوی سے از قسم اوامر و احکام الٰہی نزول فرماتے ہیں ان سب کی انتہا یہی ہے۔ اس سے آگے کسی مخلوق نے تجاوز نہیں کیا۔ بجز سید المرسلین ﷺ کے۔ حضرت جبریل بھی اس جگہ رک گئے۔ اور آپ سے جدا ہو گئے۔ حضور نے جبریل سے فرمایا: یہ کون سی جگہ ہے اور جدا ہونے کا کون سا مقام ہے؟ یہ جگہ تو ایسی نہیں کہ دوست، دوست کو چھوڑ کر جدا ہو جائے، جبریل نے عرض کیا اگر ایک انگلی کے برابر بھی نزدیک ہو جاؤں تو میں جل جاؤں

بدوگفت سالار بیت الحرام — کہ اے حامل وحی برتر خرام
بگفتا فراتر مجالم نماند — بماندم کہ نیروی بالم نماند
اگر یک سرموئے برتر پرم — فروغ تجلی بسوزد پرم

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ سیّد عالم ﷺ نے جبریل سے فرمایا: اگر کوئی حاجت رکھتے ہو تو مجھ سے عرض کرو میں جناب باری میں پیش کروں گا۔ جبریل نے عرض کیا کیا میری تمنا یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی میں عرض کریں کہ روز قیامت میرے بازوؤں کو اور زیادہ کشادہ فرما دے۔ تاکہ پل صراط سے اپنے بازوؤں کے ذریعہ آپ کی امت کو گزار سکوں۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' چھٹے آسمان میں ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ساتویں آسمان میں ہے اور ان دونوں روایتوں کی تطبیق اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی جڑ تو چھٹے آسمان میں ہے اور اس کی شاخیں ساتوں آسمان میں۔ سدرہ جس کے معنی بیری کے درخت کے ہیں۔ اس سے اس کا نام رکھنے کی وجہ، علم شارع علیہ السلام پر مفوض و موقوف ہے۔ کہتے ہیں کہ اس درخت کی تین طرح کی صفتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سایہ طویل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا مزہ لطیف ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کی بو لطیف ہے۔ اور بمنزلہ ایمان کے ہے۔ جو قول و عمل اور نیت کا مجموعہ ہے۔ ممکن ہے یہ آسمان میں اسی طرح پیوست ہو جس طرح زمین میں درخت پیوست ہوتا ہے۔ نیز قدرت الٰہی سے بعید نہیں ہے کہ جس طرح درخت زمین میں نشو ونما پاتے ہیں اسی طرح ہوا میں ہو۔ جس طرح حضور نے ہوا میں سیر فرمائی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنت کی مٹی میں جما دیا گیا ہو۔ جس طرح جنتی درختوں کی کیفیت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اسے جمایا ہی نہ گیا ہو۔ واللہ علم بحقیقۃ الحال۔ سدرۃ المنتہیٰ سے چار نہریں نکلتی ہیں دو ظاہر ہیں اور دو باطن ہیں۔ باطن میں وہ ہیں جنت میں جاتی ہیں اور ظاہر میں وہ ہیں جو نیل و فرات کہلاتی ہیں۔ اور حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں نہریں جنت کی ہیں۔ نیل، فرات، سیحان اور جیحان۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جنت سے ان کے ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کے منافع و ثمرات دائمی اور بے شمار ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ بہشت کی جنس سے نکلے ہیں۔ (واللہ اعلم) نیل کے احوال میں بہت سی عجیب وغریب چیزیں لکھتے ہیں جن میں عقل حیران ہے اور پانی، دودھ، شہد اور شربت کی نہریں جدا ہیں جو جنت میں جاری ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم منطوق ہے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت سیّدنا انس ؓ، حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ جب ساتویں آسمان سے نکلے تو ایک نہر ملاحظہ فرمائی۔ جو یاقوت و زمرد کے سنگریزوں پر جاری ہے۔ اس کے پیالے سونے چاندی، یاقوت و موتی اور زبرجد کے ہیں۔ اور اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شریں ہے، فرمایا اے جبریل یہ کیا ہے؟ عرض کیا یہ حوض کوثر ہے جسے حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔ سیّدنا ابوسعید خدری ؓ کی حدیث میں ہے کہ جنت میں جو چشمہ جاری ہوتا ہے اور جس کا نام سلسبیل ہے اس سے دو نہریں پھوٹتی ہیں ایک کا نام کوثر اور دوسری کا نہر رحمت ہے۔ یہ وہ نہر رحمت ہے کہ جب گنہگار (جرم کی سزا بھگتنے کے بعد یا شفاعت سے) دوزخ میں جلے بھنے سیاہ نکلیں گے پھر وہ اس نہر میں نہائیں گے اور وہ اسی وقت تر

وتازہ ہو جائیں گے۔ ''سدرۃ المنتہیٰ'' کو انوار ڈھانپے ہوئے ہیں سونے کے پرندوں اور پتنگوں کی مانند۔ اور ہر ایک پتہ پر ایک فرشتہ ہے اس مقام کی تعریف وتوصیف حد قیاس وعقل سے باہر ہے۔ اس جگہ بھی یہ روایت مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو شراب' دودھ اور شہد کے پیالے پیش کیے گئے تو آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا۔ اس کے بعد ''بیت المعمور'' نمودار ہوا اور اس سے پردہ اٹھایا گیا۔ حدیث کے الفاظ ایسے ہی ہیں کہ: ثُمَّ رُفِعَ اِلَیَّ الْبَیْتُ الْمَعْمُوْرُ پھر بیت المعمور کی طرف لے جایا گیا اور اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ گویا اس کے اور بیت المعمور کے درمیان بہت سے عالم تھے اور اس کے دریافت کرنے پر قدرت نہ تھی۔ لہٰذا ان پردوں کو اٹھایا گیا۔ اور حضور ﷺ کی بصیرت اور چشم مبارک میں لایا گیا اور آپ نے خوب ملاحظہ فرمایا۔ بیت المعمور وہ مسجد ہے جو خانہ کعبہ کے محاذ ومقابل ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کا زمین پر گرنا فرض کیا جائے تو وہ کعبہ معظّمہ پر آ کر گرے۔ یہ وہ گھر ہے' جسے آدم علیہ السلام کے لیے زمین پر اترنے کے بعد بھیجا گیا۔ پھر آدم علیہ السلام کے بعد اٹھا لیا گیا۔ اور آسمان پر اس کی قدر ومنزلت ایسی ہی ہے جیسے زمین میں خانہ کعبہ کی۔ فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ اور اس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ جس طرح انسان کعبہ معظّمہ کا طواف کرتے ہیں۔ روزانہ ستر ہزار فرشتے بیت المعمور کی زیارت کو آتے اور واپس ہوتے ہیں تو دوبارہ اس کی طرف کبھی نہیں آتے۔ اسی طرح ہر روز آتے جاتے ہیں۔ یہ حال اس دن سے ہے جب سے اِسے پیدا فرمایا اور ابد تک یوں ہی رہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم تر قدرت پر دلیل ہے۔ اور کوئی مخلوق فرشتوں سے زیادہ اور بڑی نہیں ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ آسمان وزمین میں ایک بالشت بھر چپہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں کسی فرشتے نے سجدہ کے لیے اپنی پیشانی نہ رکھی ہو اور دریاؤں کا ایک قطرہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر کوئی فرشتہ موکل نہ ہو اور مروی ہے کہ آسمان میں ایک نہر ہے۔ جسے ''نہر الحیواۃ'' کہتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام روزانہ اس میں غسل کرتے ہیں۔ جب باہر آتے ہیں تو اپنے بال وپر کو جھاڑتے ہیں اور اس سے ستر ہزار پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر قطرہ سے ایک فرشتے پیدا فرماتا ہے تو یہی وہ فرشتے ہیں جو بیت المعمور کی حاضری دیتے اور نماز پڑھتے ہیں۔ پھر دوبارہ اس کی طرف آنے کی نوبت نہیں آتی۔ مواہب لدنیہ میں ایسا ہی منقول ہے۔

امام فخر الدین رحمۃ اللہ اپنی تفسیر میں زیر تفسیر ارشاد باری تعالیٰ: یَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ (پیدا فرماتا وہ چیزیں جو تم نہیں جانتے) کہتے ہیں کہ عطا' مقاتل اور ضحاک جو کہ ائمہ تفسیر میں سے ہے سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا عرش کی داہنی جانب نور کی ایک نہر ہے جو سات آسمانوں' سات زمینوں اور سات دریا کے برابر ہے روزانہ علی الصباح جبریل علیہ السلام آتے اور اس میں غسل کرتے ہیں اور اپنے نور پر مزید نور کا اضافہ کرتے اور اپنے جمال کو بڑھاتے ہیں۔ جو وہ بازوؤں کو جھاڑتے ہیں تو حق تعالیٰ اس کے ہر قطرے سے کئی ہزار فرشتے پیدا فرماتا ہے۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ جتنے فرشتے وہاں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں حق تعالیٰ ہر تسبیح سے فرشتہ پیدا فرماتا ہے۔

بندہ مسکین (شیخ محقق رحمۃ اللہ) ثبتہ اللہ علی طریق الحق والیقین فرماتے ہیں کہ اگر آسمانوں میں فرشتوں کی تسبیحات سے فرشتے پیدا ہوتے ہیں تو کیا تعجب ہے کہ زمین پر بھی حضور اکرم ﷺ' خاصان بارگاہ قدس اور صلحائے امت کی تسبیحات وتہلیلات سے پیدا ہوتے ہوں گے۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ صاحب مواہب فرماتے ہیں یہ فرشتے ان فرشتوں کے ماسوا ہیں جو دائمی عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور ان فرشتوں کے بھی ماسوا ہیں نباتات اور ارزاق اور نگہبانی بنی آدم کی تصویر کشی پر موکل ہیں۔ اور وہ فرشتے جو بادلوں کے ساتھ اترتے اور وہ جمعہ کے دن لوگوں کو لکھنے اور جنت پر خازن ومحافظ ہیں اور وہ جو رات ودن کی گردش میں آتے تاکہ دن اور راتمیں بندوں کے اعمال لکھیں اور وہ ستر ہزار فرشتے جو حضور سیّد عالم ﷺ کی روضہ انور پر حاضر ہوتے اور رعب وہیبت ڈالتے ہیں اور وہ جو نمازی کی قرأت پر آمین کہتے ہیں اور وہ جو رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہتے ہیں اور وہ جو نماز کے انتظار کرنے والوں پر دعائیں مانگتے

ہیں اور وہ جوان عورتوں پر لعنت کرنے پر مقرر ہیں جو جامہ خواب میں اپنے شوہروں سے دور رہتی ہیں۔ اور ہر ہر آسمان پر جو فرشتے مقرر ہیں ان میں سے ہر ایک کی تسبیح جدا ہے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ وہ فرشتے جو حاملان عرش ہیں ان کے چہرے اور ان کے اجسام جدا ہیں جو ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہوتے اگر ان میں سے کوئی ایک فرشتہ اپنا بازو پھیلائے تو اپنے بازو کے ایک پر سے دنیا کو ڈھانپ لے۔ اور حاملان عرش آٹھ فرشتے ہیں اتنے عظیم وجسیم کہ ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک دوسو برس کی مسافت ہے۔ اور ایک روایت میں سات سو برس کی راہ ہے۔ ابوالشیخ نے اپنی کتاب ''العظمۃ'' میں عجب العجائب چیزیں بیان کی ہیں۔ اس جگہ سے خالق و مالک، باری تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا تصور کرنا چاہیے کہ اس کی قدرت وشان کتنی عظیم ہوگی۔ حدیث مبارک میں ہے کہ سیّد عالم ﷺ نے فرمایا: جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو سب نے حضرت خلیل اللہ السلام کو بیت المعمور سے ٹیک لگائے بیٹھے دیکھا آپ کے پاس بہت خوشرو جماعت ہے۔ میں نے ان پر سلام کیا۔ انہوں نے بھی مجھ پر سلام بھیجا اور اپنی امت کو دو قسموں میں پایا ایک جماعت تو وہ جو سفید لباس میں ہے اور قراطیس (سفید کاغذ) کی مانند ہے او دوسری جماعت ایسی ہے جو ملگجے کپڑے میں ملبوس ہے تو میرے ہمراہ جو سفید لباس میں تھے بیت المعمور آئے اور وہ لوگ جو ملگجے لباس میں تھے پیچھے رہ گئے۔ پھر میں نے ان سفید لباس والوں کے ساتھ بیت المعمور میں نماز پڑھی۔ لباس کی سفیدی، حسن اعمال سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ آیہ کریمہ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. (اور اپنے لباس کو پاکیزہ رکھئے) کی تفسیر میں کہا گیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک جماعت ایسی دیکھی جو سفید رو اور خوش رنگ مانند قراطیس تھی اور ایک اور جماعت تھی جن کی رنگت تیرگی وتاریکی مائل تھی۔ پھر یہ جماعت ایک نہر پر آئی اور غسل کیا تو ان کی رنگتیں کچھ صاف ہوگئیں پھر دوسری نہر میں آئے اور غسل کیا تو اب ان کی رنگتیں مکمل طور پر اس جماعت کی مانند ہوگئیں جو سفید رو اور خوشرنگ تھی۔ پھر حضور سیّد عالم ﷺ نے ان سفید چہروں کے بارے میں دریافت کیا یہ کون لوگ ہیں؟ اور وہ تیرہ رنگت والی جماعت کون ہے اور ٹیک لگائے کون صاحب بیٹھے ہیں اور یہ نہریں کون سی ہیں جس میں آ کر انہوں کے غسل کیا؟ جبریل علیہ السلام نے کہا یہ صاحب آپ کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور یہ سفید لباس والے وہ ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کی آمیزش سے محفوظ رکھا اور یہ تیرہ رنگ والے وہ ہیں جنہوں نے اعمال صالحہ کو اعمال بد سے ملا دیا۔ پھر انہوں نے توبہ کی اور حق تعالیٰ نے ان پر رحمت فرمائی اور رہیں یہ نہریں تو پہلی نہر رحمت ہے اور دوسری نعمت اور تیسری نہر وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (اور پلایا ان کو ان کے رب نے پاکیزہ پانی) اس کے بعد حضور سیّد عالم ﷺ کی سواری اور بلند ہوئی یہاں تک کہ ان اقلام کی آوازیں سنائی دی جانے لگیں۔ جو فرشتے حق تعالیٰ کی تقدیروں کی کتابت کرتے ہیں۔ اگرچہ قضا وتقدیر الٰہی قدیم ہے لیکن ان کی کتابت حادث ہے۔ وَجَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ (اور قلم اسے لکھ کر خشک ہو گیا جو کچھ کہ آئندہ ہونے والا ہے۔) یہ اس طرف اشارہ ہے لیکن یہ کتابت (جس کی حضور نے سماعت فرمائی) فرشتوں کے صحیفوں میں ہے جو اصل سے نقل کر کے دوسری جگہوں پر ہوتی ہے۔ جیسا کہ شب نصف شعبان (شب برات) اور دیگر راتوں میں لکھا جاتا ہے۔ اس میں محو واثبات کی گنجائش ہے: يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ. (اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے) اسی کتابت در صحف ملائکہ کی تعبیر ہے۔ جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے اور صاحب مواہب لدنیہ ابن قیم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا اقلام بارہ ہیں اور مرتبے میں جدا جدا ہیں اور سب سے اعلیٰ واجل قلم قدرت ہے جس سے حق تبارک نے مخلوق کی تقدیروں کو تحریر فرمایا ہے۔ چنانچہ ''سنن ابوداؤد'' میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے رسول ﷺ کو فرماتے سنا کہ: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ سب سے پہلے جو پیدا فرمایا وہ قلم ہے۔ اور اسے حکم فرمایا: لکھ! قلم نے عرض کیا کیا لکھوں؟ فرمان جاری ہوا قیامت تک کی مخلوق کی تقدیریں لکھ۔ یہ قلم، اول القام اور اجلال اقلام ہے۔ بلاشبہ بکثرت علماء تفسیر نے اسی قلم

کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہی وہ پہلا قلم ہے جس کی حق تبارک وتعالیٰ نے قسم فرمائی ہے۔ دوسرا قلم وحی ہے‘ تیسرا قلم توقیع ہے جو اللہ ورسول کی طرف سے نشان ہے۔ چوتھا قلم طب ابدان ہے جس سے بدنوں کے صحت کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور پانچواں وہ قلم توقیع ہے جس سے نوابوں‘ بادشاہ پر نشان ہوتا ہے اس سے امور ممالک کی سیاست واصلاح کی جاتی ہے۔ اور چھٹا قلم حساب ہے اس سے ان اموال کا حساب وکتاب ہوتا ہے جو نکالے جاتے اور خرچ کیے جاتے ہیں اسے قلم ارزاق بھی کہتے ہیں۔ اور ساتواں قلم حکم ہے اس سے حکم نافذ کیے جاتے اور حقوق باقی رکھے جاتے ہیں۔ آٹھواں قلم شہادت ہے جس سے حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اور نواں قلم تعبیر ہے یہ وحی خواب میں ہے اور اسے اور اس کی تعبیر وتفسیر کو لکھنے والا ہے دسواں قلم تاریخ ووقائع عالم اور گیارہواں قلم لغت اور اس کی تفصیلات کا لکھنے والا ہے اور بارہواں قلم جامع ہے جو مبطلین کا رد کرتا اور محرفین کے شبہات کو دور کرتا ہے۔ یہ وہ اقلام ہیں جن سے مصالح عالم کا انتظام ہے۔ اور اس قلم کی جلالت وفضلیت میں کہ جس سے کتاب الٰہی لکھی گئی ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا اس کی قسم یاد فرمانا کافی ہے۔ انتہی۔ واضح رہنا چاہیے کہ بعد از قلم الٰہی جو کہ اعلیٰ واجل ہے اور اس کی حقیقت کو بجز خدا رسول ورسول کے کوئی نہیں جانتا یہ دنیا کا قلم ہے کہ اس نے علوم لکھے جاتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جو اس قائل نے بیان کیں یہ معلومات ہیں جو علوم کے متعلقات ہیں۔ اور اگر یہ سب باتیں جو کچھ اس قائل نے بیان کیں ان میں منحصر ہیں تو فبہا۔ نہیں تو یہ سب ان اقلام کے لیے مثالیں ہیں۔

اس کے بعد سیّد عالم ﷺ کے ملاحظہ میں جنت ودوزخ لائی گئی ان صفات وخوبیوں کے ساتھ جو کتاب وسنت میں مذکور ہیں۔ چنانچہ آپ نے جنت کو رحمت الٰہی کا مظہر دیکھا اور دوزخ کو حق تعالیٰ کے عذاب وغضب کی جگہ۔ اور جنت کھلی ہوئی تھی اور دوزخ بند۔ آپ نے چشمہ سلسبیل میں غسل فرمایا اور آپ کے ظاہر وباطن سے کون وحدوث کی آلائشیں پاک وصاف کی گئیں۔ اور مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کا تاج عطا فرمایا گیا۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ سیّد عالم ﷺ کو جنت کے درختوں میں سے ایک ایسے درخت پر کھڑا کیا گیا جو احسن واطیب تھا۔ پھر آپ کو اس کا پھل کھلایا گیا۔ جو آپ کی پشت میں نطفہ بن گیا۔ اور جب زمین پر تشریف لائے تو ام المومنین سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شب باشی فرمائی اور وہ خاتون جنت سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے حاملہ ہوئیں۔

اس جگہ پر ایک واضح اور صریح اشکال واقع ہے کہ سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت اظہار نبوت سے سات سال اور کچھ پہلے ہے۔ اور واقعہ معراج واسراء بعد از نبوت ہے مگر یہ حضور ﷺ کے لیے قبل از اظہار نبوت بھی اسراء کو لازم قرار دیں اور وہ خواب میں سے ہوا ہو تو یہ حکایت حضور کے ساتھ اس خواب کی ہوگی جو اظہار نبوت سے پہلے آپ کو جنت میں لے گئی ہوگی۔ اور یہ بغیر اسراء کے ہوگی اور یہ واقعہ وہاں کا ہے لیکن اس جگہ اس کا ذکر کرنا درست نہ ہوگا۔

رویت الٰہی: وصل: جب سیّد عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کو ملاحظہ فرما چکے تو اب قرب واختصاص میں باریابی اور حضوری کا وقت آیا اور آپ آخر تک پہنچے اور تمام سے انقطاع تام ہوگیا۔ آپ تنہا رہ گئے۔ کوئی فرشتہ اور انسان آپ کے ساتھ نہ رہا۔ ہنوز ستر نورانی حجاب ایسے ہیں کہ ایک حجاب دوسرے حجاب کے ہم مثل نہ تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ ہر حجاب کی تہ (موٹائی) پانچ سو برس کی راہ تھی۔ ابھی ان کا طے کرنا باقی تھا۔ چنانچہ آپ نے ان سب کو حق تعالیٰ عز اسمہ کی امداد واعانت سے قطع فرمایا۔ اس وقت خاص قسم کی حیرت ودہشت اور حق تعالیٰ کی جلالت وعظمت پیش آئی۔ منادی نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہم آوازی میں ندا دی کہ "قِفْ يَا مُحَمَّدُ فَاِنَّ رَبَّكَ يُصَلِّيْ" (اے محمد ٹھہریئے بیشک آپ کا رب صلوٰۃ بھیجتا ہے) آپ متفکر ہوئے کہ ابوبکر کی آواز کہاں سے آئی۔ آپ کو اس آواز کے ایک انس معلوم ہوا اور اس وحشت سے باہر نکلے جو در پیش تھی۔ پھر حضرت حق جل مجدہ سے ندا آئی اُدْنُ يَا خَيْرَ الْبَرِيَّةِ اُدْنُ يَا اَحْمَدُ اُدْنُ يَا مُحَمَّدُ (اے ساری مخلوق سے افضل قریب ہوجیۓ‘ اے احمد قریب ہو۔ اے محمد قریب ہو

جئے) پھر میرے رب نے مجھے اپنے سے اتنا قریب فرمایا اور میں اتنا نزدیک ہو گیا کہ جیسا کہ خود فرمایا: ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی (پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا۔ پھر خوب اتر آیا تو اس جلوہ اور محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم) پھر میرے رب نے مجھ سے کچھ دریافت فرمایا تو مجھ میں اتنی تاب نہ تھی کہ جواب دے سکتا۔ اس وقت اپنا دست قدرت میرے دونوں شانوں کے درمیان بے کیف وحد بڑھایا میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینہ گنجینہ میں محسوس کی۔ اس وقت مجھے تمام اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا اور طرح طرح کے علوم تعلیم فرمائے جن میں سے ایک علم ایسا تھا جس کے ظاہر نہ کرنے کا عہد مجھ سے لیا گیا کہ اسے کسی سے نہ کہوں اور ہر کوئی اس کے برداشت کی طاقت بھی نہیں رکھتا۔ بجز میرے۔ ایک علم ایسا تھا جس کے ظاہر کرنے اور چھپانے کا مجھے اختیار دیا گیا۔ اور ایک علم ایسا تھا جس کو اپنی امت کو ہر خاص و عام میں تبلیغ کرنے کا حکم فرمایا۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے میرے رب تیرے حضور حاضری کے وقت میں متوحش ہو گیا تھا اچانک میں نے ابوبکر صدیق ؓ کی آواز کے مشابہ سنا کہ "قِفْ يَا مُحَمَّدُ فَاِنَّ رَبَّكَ يُصَلِّيْ" (اے محمد ٹھہریئے بیشک تمہارا رب صلوٰۃ بھیجتا ہے۔) میں اس سے مستعجب ہوں کہ ابوبکر اس جگہ کہاں سے آئے اور یہ کہ پروردگار نماز گزارنے سے بے نیاز ہے حکم رب ہوا میں دوسروں کے لیے نماز گزارنے سے بے نیاز ہوں اور میں فرماتا ہوں کہ سُبْحَانِيْ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ عَلٰى غَضَبِيْ (پاک ہے مجھے میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔) اے محمد! اس آیت کو پڑھیے هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ مَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا. (خدا وہ ہے جو تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔ تاکہ تمہیں اندھیروں سے نور کی طرف لائے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ رحیم ہے) تو میری صلوٰۃ تم پر اور تمہاری امت پر رحمت ہے۔ اب رہا میرا تمہارے رفیق ابوبکر ؓ کی آواز سنوانا۔ تو یہ انسیت کے لیے ہے۔ تاکہ تم انس گیر ہو کر اس پر ہیبت مقام میں اپنے حال پر آ سکو۔ اے محمد! جب ہم نے چاہا کہ ہم تمہارے بھائی موسیٰ (علیہ السلام) سے ہم کلام ہوں تو ان پر ایک عظیم ہیبت طاری ہو گئی تھی۔ اس وقت میں نے ان سے پوچھا: وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يَا مُوْسٰى (اے موسیٰ! وہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟) تو موسیٰ علیہ السلام کو عصا کے ذکر سے انسیت ہوئی۔ اور اپنے حال پر آ گئے اسی طرح اے محمد ﷺ تمہارے لیے چاہا کہ انس پا سکو۔ تو تمہارے لیے تمہارے رفیق ابوبکر کی آواز پیدا فرمائی کیونکہ تم اور ابوبکر دونوں ایک ہی طینت پر پیدا کیے گئے ہو وہ تمہارا انیس دنیا اور آخرت میں ہے لہٰذا میں نے ایک فرشتہ کو ان کی صورت پر پیدا فرمایا کہ وہ ان کی مشابہ آواز میں ندا کرے تاکہ تم سے وحشت جاتی رہے۔ اور ہیبت سے وہ چیز تمہیں لاحق نہ ہو۔ جو تمہاری فہم کو اس سے باز رکھے جسے میں نے تمہارے لیے چاہا ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے دریافت فرمایا جبریل کی وہ حاجت جس کے بارے میں تم سے عرض کیا تھا وہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا خداوند! تو اسے خوب جانتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہوا میں نے ان کی حاجت قبول فرمائی لیکن ان لوگوں کے حق میں جو اے محبوب! تمہیں چاہتے، دوست رکھتے اور تمہاری صحبت میں رہتے ہیں۔" پھر حضور ﷺ نے فرمایا اس کے بعد میرے لیے سبز رنگ کی رفرف بچھائی گئی۔ جس کا نور آفتاب کے نور پر غالب تھا۔ اس سے میری آنکھوں کا نور چمکنے لگا۔ مجھے اس رف رف پر بٹھایا گیا وہ مجھے لے کر روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ میں عرش پر پہنچا اس کے بعد ایک ایسا امر عظیم دیکھنے میں آیا جس کی توصیف سے زبانیں قاصر ہیں۔ پھر عرش سے ایک قطرہ میرے قریب آیا اور وہ میری زبان پر گرا۔ میں نے اس چیز کو چکھا جسے کسی چکھنے والے نے کبھی اس سے زیادہ شیریں نہ چکھا ہو گا۔ اور مجھے اولین و آخرین کی خبریں حاصل ہوئیں۔ اور میرا دل روشن ہو گیا۔ اور عرش کے نور سے میری آنکھ کو ڈھانپ لیا اس وقت میں نے تمام چیزوں کو اپنے دل سے دیکھا۔ اور اپنے پس پشت بھی ایسا ہی دیکھنے لگا جیسا اپنے سامنے سے دیکھتا ہوں۔" رف رف، بچھونے کو کہتے ہیں۔ دراصل یہ اس بچھونے کو کہا جاتا ہے جو نرم ہو اور دیبا وغیرہ سے بنایا گیا ہو۔

تنبیہہ: باخبر رہنا چاہیے کہ یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ اس محل رفیع میں حجابات تھے تو یہ حجابات مخلوق کے حق میں ہیں نہ کہ خالق وعزوجل کے حق میں۔ حق تبارک وتعالیٰ پاک ومنزہ ہے کہ وہ محجوب ہے۔ اور اس کے کوئی چیز چھپا سکے۔ اس لیے کہ حجاب بمقدار محوس محیط ہوتا ہے اور خلق خدا حق تعالیٰ سے اسماء وصفات اور ان کے افعال کے معانی سے محجوب ہیں اور ساری مخلوق میں سے انوار وظلمات میں سے ہر ایک کے لیے حجاب کا ایک جانا پہچانا مقام ہے۔ اور ادراک ومعرفت کا مقررہ حصہ ہے۔ اور وہ ملائکہ مقربین جو عرش کے گرداگرد ہیں اور وہ کروبیاں جو مقربان بارگاہ قدس ہیں یہ سب حضرت حق قدوس وقیوم کی کبریائی، جلالت، عظمت اور ہیبت کے نور سے محجوب ہیں اور صفات حجاب ہیں۔ فرشتے محجوب ہیں اور ان کی طبقات مختلف ہیں اور ان فرشتوں کے لیے ایک مقام معلوم اور درجہ معین ہے۔ اور ساری مخلوق، خالق سے محجوب ودر پردہ ہیں کوئی مخلوق تو منعم کی نعمتوں کی رویت سے اور محول کے احوال کی رویت سے اور مسبب کے اسباب کی رویت سے محجوب ہے۔ اور کوئی مخلوق علم سے علم میں، فہم سے فہم میں، اور عقل سے عقل سے محجوب ہے۔ یہ سب منعم کی نعمتوں سے اور دہاب یعنی عطا فرمانے کی مواہب وعطایا سے معنی میں حجاب ہیں۔ اور کوئی مخلوق مباح شہوتوں سے اور کوئی حرام شہوتوں سے اور کوئی معاصی وسیئات سے محجوب ہیں۔ اور کوئی مخلوق مال واولاد اور دنیاوی زمینوں سے محجوب ہیں: اَللّٰهُمَّ لَاتَحْجِبْنَا عَنْكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. (اے خدا ہمیں دنیا وآخرت میں اپنے سے محجوب نہ کرنا۔) اس کلام کو بعض عارفوں نے (رحمتہ اللہ علیہم اجمعین) بیان فرمایا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جو ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی مذکور ہوا ہے اور اس کی تعبیر قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی سے کی گئی ہے یہ معراج کی حدیثوں میں مذکور ہے اور یہ اس کے سوا ہے۔ جو سورہ والنجم میں مذکو ہے۔ کیونکہ بقول مختار اس کی نسبت جبریل علیہ السلام کی رویت اور اس سے نزدیکی کی طرف کی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ کا ظاہر سیاق وسابق بھی یہی ہے۔ بعض مفسرین نے پرودگار عالم کی رویت اور اس سے قرب کی طرف محمول کیا ہے جیسا کہ کتب تفسیر میں مذکور ہے۔ اور بارگاہ ربوبیت میں اتم کمال اور غایت ادب واجلال، حد عبودیت کی نگہداشت ہے۔ اور سکون قلب، طمانیت باطن اور علو ہمت کی نہایت، بصر وبصیرت کی موافقت ہے۔ اس کے باوجود کہ بے شمار آیات کرامات کے ظہور ہوئے مگر کسی ایک کی جانب بھی توجہ والتفات نہ فرمائی اور رغبت ومیلان اظہار نہ فرمایا۔ چنانچہ حق تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: وَمَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ تو آنکھ جھپکی اور نہ بے راہ ہوئی) جس طرح کہ بندگان خاص بادشاہوں کے حضور میں حاضری دیتے ہیں اور یہ وہ کمال ہے جو اکمل بشر سید رسل صلوات اللہ تعالیٰ وسلامہٗ کے سوا کسی کو میسر نہیں۔ لوگوں کی عام عادت یہ ہے کہ جب وہ کسی بلند مقام میں ٹھہرتے ہیں تو اس مقام عالی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور بزرگی پانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام مقام مناجات اور مرتبہ کلام پر جائز ہوئے تو انہوں نے دیدار باری تعالیٰ کی خواہش ظاہر کی۔ یہ ایک قسم کی مدہوشی وخوشی ہے کیونکہ مقام قرب میں ادب کی رعایت دور ہو جاتی ہے۔ مگر ہمارے سردار سیّد عالم ﷺ جب مقام قرب میں فائز المرام ہوئے تو اس کے حقوق کو پورا فرمایا اور کسی چیز کی جانب اپنی بصر وبصیرت سے التفات نہ فرمایا۔ بجز اس مقام کے جس پر آپ جلوہ افروز تھے۔ اور کسی بات کی خواہش وتمنا نہ فرمائی۔ لہٰذا مراتب ودرجات کے تمام منازل طے فرمائے۔ اور ان میں سب سے بلند واعلیٰ مرتبہ دیدار باری تعالیٰ ہے اور وہ مقام ہے جس میں حضور ﷺ کی اللہ تعالیٰ نے اقامت کرائی اور اہل صحو اور ارباب تمکین کے مقامات میں یہ مقام سب سے اونچا اور بلند ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَكَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (جو آنکھ نے دیکھا دل نے اسے نہ جھٹلایا) اور بصیر وبصیرت دونوں ایک دوسرے کی تائید وتصدیق کرتی رہیں جو کچھ بصیرت نے پایا آنکھ نے اس کا ادراک کیا۔ اور جو کچھ آنکھ نے دیکھا دل نے اس کی تصدیق کی۔ اور سب ہی حق وصحیح تھا۔ اور حضور اکرم ﷺ نے ایسا کمال پایا کہ تمام اولین وآخرین پر

سبقت لے گئے اور تمام انبیاء ومرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین غبطہ کرنے لگے اور آپ دنیا وآخرت میں صراط مستقیم پر مستقیم ہوئے اور آپ کے اس استقامت کو حق تعالیٰ نے قسم سے یاد فرمایا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰسٓ Oوَالْقُرْآنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَO
عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍO

(اے سیّد عالم) قسم ہے حکمت والے قرآن کی یقیناً بلاشبہ آپ رسولوں میں سے ہیں' صراط مستقیم پر قائم ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے وہ جس کو چاہے نوازے۔ وہی بڑے فضل والا ہے اس کے بعد فرمایا: فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (پھر وحی فرمائی اپنے بندہ خاص پر جو وحی فرمائی) اور تمام علوم ومعارف حقائق وبشارات' اشارات واخبار' آثار وکرامات اور وہ کمالات جو اس ابہام کے احاطہ میں ہیں سب داخل ہیں اور اس کی ہر کثرت وعظمت کو شامل ہے۔ کیونکہ مبہم صیغہ لایا گیا ہے اور اس اشارے کو بیان نہ فرمایا۔ اس لیے کہ بجز علام الغیوب اور رسول محبوب ﷺ کے کوئی اس پر احاطہ کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ مگر اتنا ہی جتنا حضور نے بیان فرمایا۔ اسی قدر' جتنا آپ کی روح اقدس کے مقابلہ ومحاذات کرنے سے باطنوں پر القا ہوا۔ چنانچہ بعض اکمل اولیاء کرام جنہوں نے آپ کے اتباع سے استعداد وشرافت حاصل کرلی وہ کچھ ان امور مبہمہ سے مشرف ہوئے۔ (واللہ اعلم)۔

بیان کرتے ہیں کہ جب حضور سیّد عالم ﷺ عرش پر پہنچے تو عرش نے دامن اجلال کو تھام کر زبان حال سے عرض کیا اور کہا آپ ہی ہیں اے محمد ﷺ کہ حق تعالیٰ نے اپنے جلال احدیث سے مشاہدہ کرایا اور اپنے جمال صمدیت سے مطلع فرمایا۔ اور میں غم زدہ آہیں بھرتا ہوں کوئی راہ نہیں پاتا کہ کس رستہ سے داخل ہوکر کیونکر اپنے کام کی گرہ کھولوں۔ باوجودیکہ حق تعالیٰ نے مجھے اعظم خلق بنایا اور میں ہیبت وتحیر اور خوف میں اے محمد ﷺ واقعتہً ہوں جب پرودگار نے مجھے پیدا فرمایا تو میں اس کی ہیبت وجلال سے کانپنے لگا۔ پھر میرے پایہ پر لکھا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو ہیبت سے میں اور کانپنے لرزنے لگا پھر جب لکھا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تو میرا قلق ٹھہر گیا۔ اور میرا اضطراب کم ہوگیا۔ آپ کا اسم گرامی میرے دل کے چین کا سبب اور میرے سر کے اطمینان کا باعث ثابت ہوا۔ مجھ پر آپ کے اسم گرامی کی یہ برکت رونما ہوئی۔ اب تو کیسی کچھ برکتیں حاصل ہوں گی اے محمد ﷺ آپ کی نظر مبارک مجھ پر پڑگئی۔ اَنْتَ الْمُرْسَلُ رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ آپ تو سارے جہان کے لیے رسول رحمت ہیں لازمی آپ کی اس رحمت میں میرا بھی حصہ ہوگا۔ اے میرے حبیب میرا حصہ یہ ہے کہ آپ میری برات کی گواہی دیں۔ ان چیزوں سے جن کی طرف مکر وافترا والے نسبت کرتے ہیں۔ اہل غرور مجھ پر بہتان رکھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی گنجائش ہے کہ میں اس ذات کو سما سکوں جس کا کوئی مثل نہیں۔ اور میں اس کا احاطہ کرسکوں جو حد وکیف سے خارج ہے۔ اے محمد ﷺ جس ذات قدس کی کوئی حد وکیف نہ اور جس کے صفات بے عدد شمار ہوں وہ ذات میری کیسے محتاج ہوگی۔ اور وہ کیونکر مجھ پر سوار ہوسکے گی۔ جب کہ رحمٰن اس کا نام ہے اور استوائی اس کی صفت ہے۔ اور اس کی صفت اس کی ذات سے متصل ہے تو وہ کس طرح مجھ سے متصل یا مفصل ہوسکتی ہے اے محمد ﷺ قسم ہے مجھے اس کی عزت وجلال کی میں وصل کے ساتھ اس سے قریب ہوں اور فصل سے اس سے بعید نہیں۔ اور نہ میں اس کا حامل ہوں اور نہ اس کو اپنے میں سمونے والا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے پیدا فرمایا اگر وہ مجھے اپنے عدل سے نیست ونابود کردے تو میں اس کی قدرت اور اس کی حکمت کا محمول ومعمول ہوں۔ سیّد عالم ﷺ نے اپنی زبان حال سے عرش کو جواب دیا۔ مجھ سے ایک طرف ہوجا۔ میں تجھ سے بے پروا اور تجھ سے بے نیاز ہوں۔ میرے صفائے وقت کو مجھ پر مکدر نہ کر اور میری خلوت وتنہائی کو پراگندہ نہ بنا۔ اس کے بعد آپ نے عرش کی جانب توجہ والتفات کی نظر ڈالی۔ مگر اس کی طرف مکمل طور پر مائل نہ ہوئے۔ اور جو کچھ اس پر لکھا ہوا تھا اسے نہ پڑھا۔ اور مَآ اَوْحٰی اِلَیْہِ (جو کچھ ان کی طرف وحی کی گئی) اس بھید کا ایک حرف وکنایہ یہ بھی ہے وَمَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ ان کی آنکھ بھٹکی اور نہ بے راہ ہوئی)۔

بیان کرتے ہیں کہ جب حضورِ انور ﷺ مرتبہ ''قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی '' پر فائز ہوئے تو آپ نے امت کے احوال پیش کیے۔ عرض کیا اے رب! تو نے بہت سی امتوں پر عذاب فرمایا۔ کسی کو پتھروں سے کسی کو حسف سے یعنی زمین دھنسا کر اور کسی کو مسخ سے یعنی صورتوں کو بگاڑ کے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا میں ان پر رحمت نازل کروں گا اور ان کی بدوں کو نیکی سے بدل ڈالوں گا۔ اور جو کوئی مجھ سے دعا کرے گا میں اسے لبیک کہوں گا اور جو مانگے گا اسے عطا فرماؤں گا۔ جو مجھ پر توکل کرے گا میں اسے کفایت کروں گا۔ اور دنیا میں اس کے گناہوں کو چھپاؤں گا اور آخرت میں تمہیں ان کا شفیع بناؤں گا اگر نہ ہوتا حبیب' تحت معاتبہ حبیب' تو میں ان سے حساب نہ لیتا۔

مراجعت از معراج شریف: جب حضورِ اکرم ﷺ نے اس عالم میں واپسی کا ارادہ فرمایا تو بارگاہ قدس میں عرض کیا اے رب! ہر مسافر کے لیے واپسی کا تحفہ ہوتا ہے۔ میری امت کے لیے اس سفر کا تحفہ کیا ہے۔ حق تبارک وتعالیٰ نے کہا زندگی بھر میں ان کا ہوں۔ مرنے کے بعد بھی ان کا ہوں اور قبروں میں بھی میں ان کا ہوں اور حشر میں بھی میں ان کا ہوں۔ غرضیکہ ہر حال میں ان کا مددگار ہوں۔

فَطُوْبٰی لَكُمْ یَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَّبُشْرٰی لَكُم تو خوشی ہے تمہارے لیے اے امت محمد اور بشارت ہو تمہیں۔ اور جب رسول اکرم ﷺ واپس تشریف لائے اور صبح ہوئی تو آپ نے لوگوں سے اس کا تذکرہ فرمایا تو کچھ ضعیف الایمان لوگ اس پر مرتد ہو گئے اور کچھ مشرکین دوڑ کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے پاس پہنچے۔ کہنے لگے کچھ اپنے یار اور رفیق کی خبر ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں ''آج رات مجھے بیت المقدس لے جایا گیا۔'' حضرت ابوبکر ؓ نے دریافت کیا کیا یقیناً ایسا فرماتے ہیں؟ مشرکین نے کہا ہاں یہی فرماتے ہیں۔ ابوبکر صدیق نے فرمایا۔ پھر تو وہ جو فرماتے ہیں ٹھیک ہی فرماتے ہیں۔ میں اس پر ایمان لاتا ہوں۔ مشرکین کہنے لگے کیا تم اس کی تصدیق کرتے ہو کہ رات میں محمد ﷺ بیت المقدس تشریف لے گئے اور صبح سے پہلے یہاں واپس تشریف بھی لے آئے۔ انہوں نے فرمایا ہاں۔ میں تو اس سے دورتر کی بھی تصدیق کرتا ہوں اگر آپ یہ فرمائیں کہ میں آسمان پر گیا اور پھر واپس آ گیا تو میں اس کی بھی تصدیق کروں گا۔ بیت المقدس کیا چیز ہے؟ چنانچہ اسی دن سے حضرت ابوبکر ؓ کا لقب ''صدیق'' مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد سیّدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ' بارگاہ رسالت میں آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا حضور بیت المقدس کی علامات ونشانیاں ان لوگوں کو فرمائیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں بتاؤں گا۔ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بیان فرمایئے۔ میں وہاں گیا ہوں اور اسے میں نے دیکھا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے نشانیاں بیان فرمائیں اس پر حضرت صدیق نے کہا ''اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' (میں شہادت دیتا ہوں یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں)۔ حضرت صدیق کا یہ مطالبہ کرنا از طریق شک وتردد نہ تھا۔ وہ تو کفار کی زبانوں سے محض سنتے ہی تصدیق فرما چکے تھے بغیر اس کے کہ آپ سے نشانیاں دریافت کریں۔ بلکہ یہ ' یافتگی' حضور ﷺ کی صداقت کے اظہار میں اپنی قوم کے لیے تھی۔ اس لیے کہ قوم کو حضرت صدیق ؓ کی خبر پر وثوق تھا۔ اور آپ کی تصدیق ان کے لیے حجت تھی اس کے باوجود علامت دریافت کرنے اور حقائق واضح کرانے کے مقام میں آئے۔ اور حضور ﷺ سے بیت المقدس کے احوال واوصاف دریافت کیے تو حضور ﷺ نے سب باتیں بیان فرمائیں۔ مسلم شریف کی حدیث میں کہ حضور ﷺ نے فرمایا بعض باتوں کا تفصیلی جواب مجھے حاضر نہ ہوا تو میں بہت زیادہ فکر مند ہوا۔ اور ایسا فکر مند ہوا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا فکر مند نہ ہوا تھا۔ اس وقت بیت المقدس میرے پیش نظر کیا گیا تو جو کچھ انہوں نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے دو احتمال ہیں یا تو مسجد اٹھا کر حضور ﷺ کے سامنے لائی گئی جس طرح کہ بلقیس کا تخت پلک جھپکنے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے لایا گیا تھا۔ یا اس کی مثل حضور ﷺ کے آگے لایا گیا۔ جس طرح کہ جنت

ودوزخ کونماز میں متمثل کیا گیا۔ ایسا ہی علماء بیان کرتے ہیں۔ ایک اور احتمال یہ ہے کہ وہاں سے بیت المقدس تک تمام پردے اٹھادیئے گئے۔ اور آپ کے پیش نظر بیت المقدس کردیا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام مسجد اقصےٰ کوعقیل کے گھر کے پاس میری نظر کے سامنے اٹھا کرلائے۔ میں اسے دیکھتا جاتا تھا اور جو وہ دریافت کرتے جاتے تھے جواب دیتا جاتا تھا۔ ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا بیت المقدس کے کتنے دروازے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا۔ میں نے اس کے دروازوں کونہیں گنا تھا۔ اب جو مجھ پرمکشوف ہوا اور اسے اٹھا کرلایا گیا تو میں نے گن کرانہیں بتایا۔

بیان کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ جب سفر اسریٰ سے تشریف لارہے تھے تو قریش کا ایک قافلہ غلہ لاد کرلا رہا تھا اس قافلے میں دو غرارے تھے ایک سیاہ اور ایک سفید جب اٹھا کراونٹ کے سامنے لائے تو اونٹ بھاگ گیا ان میں سے ایک اسے گھیر کرلے آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ میں نے ان لوگوں پر سلام کیا۔ وہ کہنے لگے یہ آواز تو محمد ﷺ کی ہے جو آرہا ہے۔ پھر حضور ﷺ قبل از صبح تشریف لائے اور اس قوم کواس کی خبردی۔ اور جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا۔ اور فرمایا اس کی نشانی یہ ہے کہ میں نے تمہارے اونٹوں کوفلاں مقام پر آتے ہوئے چھوڑا ہے۔ ان کا ایک اونٹ گم ہوگیا تھا جسے فلاں شخص گھیر کرلایا تھا۔ اور قافلے کے آگے سفید وسیاہ رنگ کا اونٹ ہے جس پرسیاہ پالان ہے۔ اور دوغرارے فلاں روز یہاں پہنچیں گے۔ اور جب وہ دن آیا اور قافلہ نہ پہنچا تو لوگ انتظار کرنے لگے اور نصف دن تک قسم قسم کی چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ آدھا دن تھا کہ قافلہ پہنچ گیا اور اسی شان سے حضور ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ اور دشمنوں اور منکروں کے چہروں پرخاک پڑگئی۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے خبردی کہ قافلہ بدھ کے دن آئے گا لیکن وہ سورج غروب ہونے تک نہ آیا اس وقت حضور ﷺ نے دعا فرمائی اور سورج کوغروب ہونے سے بازرکھا گیا اور قافلہ آ گیا۔

دیدار الٰہی میں اختلاف سلف: **وصل**: قدیم وجدید صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بعد والوں نے معراج میں حضورِ اکرم ﷺ کی رویت باری تعالیٰ میں اختلاف کیا ہے چنانچہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابہ وسلف رضی اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت نفی کی جانب ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ مسروق سے حدیث لائے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ اے مادر من! کیا حضور ﷺ نے اپنے پرودگار کودیکھا ہے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا: بلاشبہ میرے جسم کے رونگٹے تمہارے اس سوال سے کھڑے ہوگئے جوتم نے پوچھا۔ جوکوئی تم سے یہ کہے کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کودیکھا۔ یقیناً اس نے دروغ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے اس آیت کوپڑھا۔ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَار وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْر کوئی آنکھ اس کا ادراک نہیں کرسکتی۔ وہ آنکھوں کا ادراک فرمارہا ہے اور وہی مہربان وخبردار ہے۔ اور مسلم کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: مَنْ حَدَّثَكَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَاٰی رَبَّهٗ فَقَدْ اَعْظَمَ الْفَرِیَة (جوتم سے یہ کہے کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کودیکھا بیشک اس نے بہت بری بات کہی) امام نووی اور ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی مرفوع حدیث سے رویت الٰہی کے وقوع کی نفی نہیں کی۔ اگر حدیث مرفوع ہوتی تو اسے وہ بیان فرماتیں۔ اور انہوں نے اس آیت پر اعتماد واستنباط فرمایا۔ بلاشبہ بعض صحابہ رضی اللہ علیہم اجمعین نے ان کے اس اجتہاد کی مخالفت کی ہے۔ اور کوئی صحابی جب اپنی بات کہتا ہے اور کوئی دوسرا صحابی اس کی بات کی مخالفت کرتا ہے تو وہ قول باتفاق حجت نہیں ہوتا۔ آیہ کریمہ کی کئی توجیہات ہیں۔ ادراک، رویت سے اخص ہے۔ ادراک کی نفی سے رویت کی نفی لازم نہیں آتی۔ ادراک حقیقت کی معرفت ہے۔ اور یہ منفی ہے جس طرح کہ کوئی چاند کودیکھتا ہے اور اس کی حقیقت وکنہ اور ماہیت کونہیں پاتا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ادراک کا مطلب احاطہ یعنی گھیرنا ہے۔ اور عدم احاطہ عدم رویت کولازم نہیں آتا۔ جیسا کہ عدم احاطہ سے عدم علم لازم نہیں آتا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ لَا اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِك اے رب! مجھ سے تیری ایسی ثنا نہیں ہوسکتی جیسے تونے اپنی ثنا خود

فرمائی ہے۔" اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ثنا کی ہی نہیں گئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین رویت الٰہی کا اثبات کرتے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے کسی کو ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا کہ کیا رسولِ خدا ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہاں! اور فرمایا' حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام سے اور سیّد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کو رویت سے خاص فرمایا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہوے کہ وہ بقسم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا۔" اور ابن خزیمہ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ اس رویت باری پر کعب' زہری' معمر اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اثبات و جزم کیا ہے۔ اور اشعری کا قول بھی یہی ہے۔ اور امام مسلم علیہ الرحمۃ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے سیّد عالم ﷺ سے پروردگار کی رویت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: هُوَ نُوْرٌ اَنّٰی کَیْفَ اَرَاهُ. یعنی وہ نور ہے میں کیسے اسے دیکھ سکتا ہوں۔ یہ حدیث اس حدیث سے معارض ہے۔ جس میں واقع ہوا ہے کہ "رایت نورا" میں نے نور کو دیکھا۔ امام احمد سے بھی اثبات رویت منقول ہے۔ امام احمد سے لوگوں نے کہا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول کو کس چیز سے ہم اٹھائیں۔ فرمایا قول نبی ﷺ سے کہ فرمایا: رَاَیْتُ رَبِّیْ میں نے اپنے رب کو دیکھا اور قول نبی قول عائشہ رضی اللہ عنہا سے اکبر ہے اور نقاش امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں حدیث ابن عباس سے جواب دوں گا کہ فرمایا رَاٰهُ رَاٰهُ اسے دیکھا اسے دیکھا۔ اور برابر کہتے رہے یہاں تک کہ ان کا سانس منقطع ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ "کیا حضور ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا فرمایا ہاں"! اور سلف کی ایک جماعت نے راہ توقف اختیار کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم اثبات و نفی کی کسی جانب جزم نہیں کرتے اور قرطبی نے اس قول کو ترجیح دی ہے اور کہا کہ کسی جانب کوئی قطعی دلیل نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے جس سے استدلال کیا ان کی ظاہری عبارات متعارض ہیں اور قابل تاویل نہیں ہیں اور نہ یہ اعمال سے متعلق ہیں جو دلائل وظنیہ پر اکتفا کیا جا سکے بلکہ یہ معتقدات سے ہے اس میں قطعیات ہی اکتفا کرتی ہیں (واللہ اعلم)۔

ایک گروہ کا مذہب یہ ہے کہ دیدار الٰہی دیدہ دل سے کیا ہے نہ کہ چشم سر سے۔ اور دیدہ دل سے مراد نہ علم ہے نہ دانستن۔ کیونکہ یہ تو بروجہ اتم ہمیشہ حاصل تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے رویت کو دل میں پیدا فرمایا جیسا کہ آنکھ میں بینائی پیدا فرمائی۔ لہٰذا دل کا جاننا اور ہے اور دل سے دیکھنا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے دونوں قول کی تطبیق کرتے ہیں کہ اس میں بظاہر اختلاف آنکھ سے دیکھنے میں ہے۔ دل سے دیکھنے میں نہیں ہے۔ اس میں سب متفق ہیں۔

بندہ مسکین (یعنی شیخ محقق) عبدالحق بن سیف الدین خصہ اللہ بمزید صدق والیقین کہتا ہے کہ دلائل و اخبار اور آثار پر نظر کرتے ہوئے علماء کا کلام یہی ہے لیکن اتنا خلجان رہتا ہے کہ یہ معراج جو اتم مقامات اور اقصیٰ کمالات حضور ﷺ سے ہے اور کسی ایک نبی کی شرکت نہیں اور نہ اس مقام میں کسی انسان یا فرشتہ کی گنجائش ہے تو جائے تعجب ہے کہ اس مقام میں لیجایا جائے اور خلوت خاص میں حضوری کرائی جائے۔ اور سب سے اعلیٰ واقصیٰ مطلوب جو کہ دیدار باری تعالیٰ ہے اس سے مشرف نہ کیا جائے۔ اور حضورِ اکرم ﷺ دیدار نہ کرنے پر راضی ہوں۔ اگرچہ کمال بندگی اور حق تعالیٰ کی کبریائی کی سطوت کا ادب اس کا مقتضی ہے کہ سوال نہ کیا جائے اور ذوق کلام سے مست ہو کر خوشی و مسرت کا اظہار کریں۔ اور دیدار کی خواہش نہ کریں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ لیکن کمال محبت و محبوبیت جو کہ آپ کو جناب قدس سے ہے کہاں باز رکھتا ہے کہ درمیان میں کوئی حجاب باقی رہے۔ اور یہ دولت' طلب سے ہاتھ نہ آئے۔

اہل علم فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے طلب، سوال اور انبساط، دیدار الٰہی سے مانع رہا۔ کبھی بے مانگے دیا جاتا ہے اور کبھی مانگنے اور چاہنے سے بھی نہیں دیا جاتا۔ نادر بات یہ ہے کہ ایک قوم کہتی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام طلب کے بعد بھی اس سے محروم رہے تو بیہوش ہو گئے اور اس وقت وہ دیکھا جو ہرگز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ یہ جزا ان کی بیتابی اور جلد بازی کی تھی۔ تحقیق یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ ہنوز سید المحبوبین ﷺ کا دیدار نہ کیا تھا اور آپ اس دولت تک پہنچے نہ تھے۔ دوسرے کی کیا مجال کہ طلب کرے اور دیکھ سکے۔ اور خود تمام علماء بھی اس پر متفق ہیں کہ دنیا میں رویت باری ممکن ہے۔ پھر بعد از امکان کیا چیز مانع ہے۔ اور خود یہ مقام معراج درحقیقت عالم آخرت سے ہے۔ اور جو کچھ عالم آخرت میں دیکھنا اور پانا ہوگا وہ اب دیکھ لیا اور پالیا تاکہ خلق کو بحکم عین الیقین دعوت فرما سکیں۔ جیسا کہ کہا گیا ہے۔ مصرعہ از دیدہ بسے فرق بود تا بشنیدہ۔ (واللہ اعلم)

بابِ ششم

وہ معجزات جو رسول اللہ ﷺ کی صحتِ نبوت اور صداقت رسالت پر دلیل ونشان ہیں

معجزہ، خرق عادت کو کہتے ہیں کہ جو مدعی رسالت ونبوت کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے جس سے مقصود تحدی ہے۔ تحدی کے معنی کسی کام میں برابری کرنا۔ اور دشمن کو عاجز کر کے غلبہ حاصل کرنا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ معجزہ میں تحدی شرط نہیں ہے۔ رسول کریم ﷺ سے ایسے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے جس میں تحدی نہیں تھی۔ مگر کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ اس کی شان سے تحدی ہو۔ اس تقدیر پر ”مدعی رسالت سے واقع“ ہونے کی قید کافی ہے۔ اور یہ بات مشہور ہے کہ جو کچھ مدعی رسالت سے واقع ہوتا ہے اسے معجزہ کہتے ہیں اور جو کسی غیر نبی سے واقع ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ کمال ایمان وتقویٰ اور معرفت واستقامت جسے ولایت کہتے ہیں شامل ہے تو اس کا نام کرامت ہے۔ اور اگر کسی عام مومن وصالح سے صادر ہو تو اسے معونت کہتے ہیں اور وہ جو فاسقوں اور کافروں سے صادر ہوتا ہے اسے استدراج کہتے ہیں مگر یہ کہ توبہ واسلام پر منتج ہو۔ علم کلام میں معجزات کے ضمن میں بہت بحثیں ہیں اس جگہ اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور جتنی اس جگہ ضرورت تھی اسی قدر بیان ہمارا بیان کرنا بہتر ہے۔

تمام انبیاء ومرسلین صلوات اللہ تعالیٰ وسلامیہ علیہم اجمعین صاحب معجزات ہیں اور کوئی نبی بغیر معجزہ کے نہیں ہے۔ اور نبی سیّد عالم ﷺ کے معجزات ان سب سے زیادہ اور وافر واقوی اور روشن واظہر اور مشہور تر ہیں۔ اور کلام میں معجزات کی عبارتیں جو کہ دلائل وآیات پر مشتمل ہیں بکثرت واقع ہیں اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کے دلائل توریت وانجیل اور دیگر تمام کتب سماوی میں بے شمار خبریں واقع ہوئی ہیں۔ ان میں آپ کا ذکر اور مکہ مکرمہ سے ہجرت کا تذکرہ اس کا کچھ حصہ پہلے گزر چکا ہے اور وہ جو امور غریبہ وعجیبہ آپ کی ولادت وبعثت کے دنوں میں ظاہر ہوئے۔ مثلاً آثار کفر کا مٹانا، مشرکانہ استھانوں کا ذلیل وخوار ہونا، اہل عرب کے شیون اور ان کی چہ میگوئیاں وغیرہ ان سب کا تذکرہ اپنی جگہ تفصیل سے آئے گا۔ چنانچہ اصحاب فیل کا قصہ، فارس کی ہزار سالہ آگ کا ٹھنڈا ہونا، کسریٰ کے محل کے کنگرے گرنا، دریائے ساویٰ کا پانی خشک ہونا، پجاریوں کا خوابیں دیکھنا، غیبی نداؤں اور آوازوں کا سننا وغیرہ یہ سب آپ کی نبوت وصفات کی علامتیں ہیں۔ اور اخبار مشہور میں بوقت ولادت مبارکہ اور شیر خوارگی کے زمانہ سے بعثت وظہور کے وقت تک اور بعد از بعثت غلبہ تصرف کے سلسلہ میں جو عجیب وغریب امور کا ظہور ہوا ان سب کو نقل کیا گیا ہے۔ حالانکہ حضور سیّد عالم ﷺ کے پاس اتنا مال نہ تھا جس سے قلوب کو جھکایا جاتا اور لوگ اس کی طمع میں آپ کے گرویدہ ہو جاتے اور نہ قوت وطاقت ہی اتنی تھی کہ ان لوگوں پر قہر وغلبہ حاصل کیا جاتا۔ اور جس دین کو آپ نے فرمایا اور جس کی طرف آپ نے ان کو دعوت دی اس کو غالب کرنے کے لیے آپ ﷺ کے پاس نہ لاؤ لشکر تھا اور نہ مال وزر۔ وہ لوگ سب کے سب بت پرستی اور زمانہ جاہلیت کی رسموں اور عادتوں پر مجتمع ومتفق تھے۔ اور دین جاہلیت میں از حد تعصب وتباغض، فسق وفجور اور خونریزی میں انتہائی غلو اور انہماک تھا اور امر خیر میں اتفاق واتحاد مفقود تھا۔ اور وہ اپنے ان افعال میں عاقبت کی نظر ڈالتے ہی نہ تھے۔ نہ انہیں کسی عذاب وسزا کا خوف تھا اور نہ کسی ملامت وپشیمانی کا ڈر۔ ایسے لوگوں کے

احوال وافعال کی حضور سیّد عالم ﷺ نے اصلاح فرمائی۔ اوران کے دلوں میں باہمی محبت والفت کی لہر دوڑائی اوران سب کو ایک کلمہ پر جمع فرمادیا۔ یہاں تک ان کی آراء متفق اوران کے دل مجتمع ہوگئے۔ حتیٰ کہ وہ سب مطیع وفرماں بردار بن گئے۔ اورنصرت میں مختلف لوگ ایک دل ہوگئے۔ اورآپ کے جمال جہاں آراء کی طلعت کے عاشق وفریفتہ ہوگئے۔ اورآپ ﷺ کی محبت میں اپنے شہروں اپنے وطنوں اوراپنے گھروں کو چھوڑ دیا۔ اوراپنی قوم اوراپنے کنبوں سے منہ موڑلیا۔ اورآپ ﷺ کی نصرت میں اپنے جان ومال کو قربان اورآپ ﷺ کے اعزاز میں اپنی جانوں کو تلواروں کے مقابل کھڑا کردیا اوراس پرطرفہ یہ کہ وہ بے ساز وسامان تھے نہ ان پر مال نچھاور کیا گیا اورنہ مال ومنال ہی تھا کہ دنیا میں جس کے حصول کے لالچ میں انہیں ڈالا جاتا اوران ممالک وبلاد کا جن کے حاصل کرنے کے لیے اس جہان میں بھیجا گیا تھا۔ انہیں ان کا مالک ومتصرف نہ قراردیا بلکہ خود ﷺ ان میں تصرف فرماتے غنی کو فقیر بناتے اورشریف کو برابرومتواضع کرتے تھے۔ کیا ایسی جملہ باتیں اورایسے تمام احوال کسی ایسے شخص میں جمع ہوسکتے ہیں۔ اوراسے اتفاق پڑسکتا ہے جو باختیار عقلی اورتدبیر فکری بہ تکلف ان سب کو انجام دے سکے۔ اوران کی کشود کار کر سکے؟ حالانکہ حضور ﷺ خود یتیم‘ بے زوروزراور بے مال ومنال اور بے معاون ومددگار اورتنہا تھے۔ لیکن حق تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی عزت‘ قدرت‘ تمکنت‘ مددونصرت اورقوت وشوکت عطا فرمائی کہ آپ ﷺ سب پر غالب رہے۔ اورآپ ﷺ کو اختیارات کی مضبوط گرفت عطافرمائی۔ ”لا واللہ“ قسم ہے خدائے عزوجل کی ان سب کو مسخر وگرویدہ بنالیا۔ یہ تمام وہ باتیں ہیں جن میں کوئی عقلمند شک کبھی نہیں کرتا اورکامل یقین سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ امر الٰہی اورفیض سماوی ہے۔ قوت بشری کے ساتھ اتنی رسائی پانا از روئے عادت عاجز ہیں اورخالق وقوی کے سوابشراس پرقادرنہیں۔ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ

اُمی ہونا معجزہ ہے: حضورِ اکرم ﷺ کی دلائل نبوت میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ اُمی وناخواندہ تھے اورآپ ﷺ خط وکتابت بالکل نہیں جانتے تھے۔ آپ ﷺ اس قوم میں جو تمام کی تمام اُمی‘ جاہل اوناخواندہ تھی آپ ﷺ ان میں اُمی مولود ہوئے آپ ﷺ کی نشوونما اس شہر میں اوران ہی لوگوں میں ہوئی جن میں گذشتہ علوم کا جاننے والا کوئی بھی نہ تھا اورنہ آپ ﷺ نے کسی ایسے شہر کی طرف سفر ہی فرمایا جس میں جوئی عالم ہوتا اورآپ ﷺ اس سے تحصیل علم کرسکتے اورتوریت انجیل اورگزشتہ امتوں کے اخبار وحالات جان سکتے۔ بلاشبہ ان کتابوں کے بڑے بڑے عالم ایسے گزرے تھے جو اپنی اپنی جگہ ان کتابوں کے ماہروشناور تھے اوران کتابوں کے علماء وعرفاء میں سے چند کے سواکسی کو باقی نہ چھوڑا‘ پھران ملتوں کے ہرفریق سے حضور ﷺ نے ایسی حجت فرمائی کہ اگر جہاں بھر کے تمام عالم ونقاد جمع ہوجاتے تو بھی اس کی مثل کوئی دلیل نہ لاسکتے۔ یہ اس امر پر پہلی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کے پاس جو کچھ تھا آپ ﷺ سے اسے خدا کی طرف سے لائے تھے۔ اب تصور کرنا چاہیے اوریہ معلوم ہونا چاہے کہ بغیر تعلیم واکتساب علم‘ آپ ﷺ علم ومعرفت کے جتنے اعلیٰ مقام پر فائز تھے علوم اولین اورآخرین کی رسائی وہاں تک ناممکن ہے۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے کیا خوب کہا ہے۔ بیت

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانہ چند ملت بشست

اورمولانا جامی علیہ الرحمتہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

امی ودقیقہ دان عالم بے سایہ وسائبان عالم

اوریہ بھی دیکھنا چاہیے اورغورکرنا چاہیے کہ وہ لوگ جو جہل ونادانی اورفسق وفجور کے اسفل السافلین میں تھے وہ آپ ﷺ کی صحبت آپ کی خدمت اورآپ ﷺ کی تعلیم وتربیت سے علم وعمل کے اعلیٰ علیین پر پہنچ گئے اوریہ سب کچھ خدا تعالیٰ ہی کی جانب سے تھا۔

اوراگرتم آپ ﷺ کے اخلاق وصفات‘ کمالات واوضاع اورآداب واطوار میں غورکروگے توتم سب سے پہلی دلیل یہ پاؤگے کہ

کوئی بشر آپ کی مثل ایسا پیدا نہ ہوا جس نے نبوت و رسالت کا دعویٰ کیا ہو اور اسی طرح لوگوں کو مسخر کیا ہو تو اب کس چیز میں شک و شبہہ باقی رہتا ہے۔

اعظم معجزات قرآن کریم ہے: آپ ﷺ کے معجزات میں سب سے قوی، روشن اور باقی و مشہورتر، قرآن مجید ہے جو قیامت تک باقی و پائندہ رہے گا۔ قرآن کریم معجزات کثیرہ پر مشتمل ہے بایں حساب کہ ''اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ'' سب سے چھوٹی سورۃ ہے اس میں جتنے معجزات ہیں ان کو کوئی شمار نہیں کرسکتا چنانچہ قرآن کریم کے معجزات کا اس سورۃ سے اندازہ لگاؤ کہ ہر ایک میں کتنے معجزات ہوں گے۔

وجوہ اعجاز قرآن: وصل: قرآن کریم کے وجوہ اعجاز متعدد ہیں ان کے اعجاز کی تفصیلی معرفت، وجوہ اعجاز کی معرفت پر موقوف ہے۔ اور اجمالی طور پر معرفت اعجاز اس طرح ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ نے اس سے تحدی فرمائی اور انہیں اس کے ہم مثل مقابلہ میں ایک سورۃ ہی کے لانے کا چیلنج فرمایا ارشاد ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ	اگر تمہیں شک ہے اس میں جو ہم نے اپنے بندہ خاص پر نازل فرمایا تو اس کی مثل ایک سورۃ ہی لے آؤ۔

چنانچہ لوگ اس کے معاوضہ و مقابلہ میں کچھ پیش کرنے سے عاجز ہو گئے۔

پہلی بحث تو یہی تھی اگر وہ اس کی مثل لانے کی قدرت رکھتے تو وہ ہرگز ان ہلاکتوں میں نہ پڑتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضور سیّد عالم ﷺ نے اہل عرب پر جو کلام پیش فرمایا وہ اس کی مثل لانے سے عاجز و مجبور رہے۔ کیونکہ وہ کلام دلالت میں مردوں کے زندہ ہونے اور اندھوں اور بہروں کے تندرست ہونے کے سلسلہ میں عجیب و واضح تر ہے۔ اس لیے کہ اہل فصاحت، ارباب بلاغت اور تمام روسائے اہل زبان جو کلام لاتے ہیں وہ کلام، مطلب و مفہوم اور لفظ و معنی میں ان کی اپنی جنس سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی مثل لانے سے عاجز رہے اور ان کا یہ عجز اس سے کہیں زیادہ عجیب ہے جس نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مردے زندہ کرتے اور اندھے اور کوڑھیوں کو تندرست کرتے دیکھا ہے اس لیے کہ دیکھنے والوں کے لیے اس میں کوئی چیلنج نہ تھا اور نہ اس تک پہنچنے کا انھیں کوئی علم ہی تھا۔ لیکن جہاں تک کلام فصیح، بلاغت اور خطابت کا تعلق ہے۔ یہ تو ان کا ہنر اور پیشہ تھا۔ اور اس میں ان کا عاجز ہو جانا مفید صحت رسالت اور یہ حجت قاطع اور برہان واضح ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔

ابوسلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اعاظم علماء حدیث میں سے ہیں فرماتے ہیں کہ سیّد عالم ﷺ اپنے زمانے کے لوگوں میں سب سے زیادہ دانا اور عقلمند ہیں بلکہ علی الطلاق قطعی اور حتمی طور پر اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے زیادہ عاقل تھے۔ وہ لوگ اس کی مثل لا ہی نہ سکتے تھے۔ لہٰذا اگر آپ کا علم ایسا نہ ہوتا تو بایں سبب کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تب بھی آپ ﷺ کی خبر میں یہ خلاف واقع نہ ہوتا۔ اس وقت بھی یہ لوگ آپ ﷺ کی عقل تک نہیں پہنچ سکتے تھے اور یہ تحدی حتمی و قطعی رہتی جیسا کہ فرمایا: وَلَنْ تَفْعَلُوْا (ہرگز ہرگز وہ نہ لا سکیں گے۔) غرضیکہ حضور ﷺ نے انہیں چیلنج دیا اور لوگ معارضہ میں آمنے سامنے آنے سے عاجز رہے۔ اور بوقت مناقضہ، بلاغب میں ان کے قاصر رہنے کا حکم فرمایا حتیٰ کہ انہیں ان کے تمام حمایتیوں سمیت مجتمع ہونے کا موقع دیا۔ لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو معارضہ کے میدان میں اترتا۔ اور اس مقام پر کھڑا ہوتا۔ چنانچہ فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْ بِمِثْلِ هٰـذَا الْقُرْآنِ لَایَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا.	اگر تمام انسان وجنات اس قرآن کی مثل لانے میں اکھٹے ہوجائیں تب بھی اس کا مثل نہیں لاسکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن حضور ﷺ مسجد حرام کے ایک گوشہ میں تنہا تشریف فرما تھے کہ عتبہ بن ربیعہ جو اشقیاءِ قریش میں سے تھا۔ قریش کی مجلس میں کہنے لگا ''اے گروہ قریش! میں اس شخص (یعنی حضور ﷺ) کے پاس جاتا ہوں اور چند چیزیں عرض کرتا ہوں ممکن ہے ان میں سے کچھ کو قبول کرلیں اور اس کام سے باز آجائیں اور ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔ قریش نے کہا اے ابوالولید! ٹھیک ہے جاؤ۔'' عتبہ اٹھا اور حضور ﷺ کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ وہ آپ ﷺ سے باتیں کرنے لگا۔ اور اس نے آپ ﷺ کو مال ودولت کا لالچ دیا اس نے کہا آپ ﷺ جو کچھ چاہیں نگے حاضر ہے۔'' حضور ﷺ سب کچھ سنتے رہے اس کے بعد فرمایا اے ابوالولید! کیا تو نے اپنی بات ختم کرچکا؟ اس نے کہا ہاں! فرمایا ''اب مجھ سے بھی کچھ سن۔'' اس نے کہا فرمائیے اور جو چاہیے کہیے حضور ﷺ نے پڑھا حم۔

حٰمٓ ○ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا	یہ اتارا ہوا ہے بڑے رحم والے مہربان کا۔ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں مفصل فرمائی گئیں عربی قرآن عقل والوں کے لیے خوشخبری دیتا اور ڈرسناتا۔

الخ عتبہ اسے خاموشی سے کان دھرے سنتا رہا اور اپنے دونوں ہاتھ پس پشت لے جاکر اس پر ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ پھر جب حضور ﷺ تلاوت کرتے ہوئے اس سورۃ کی آیت سجدہ پر پہنچے تو حضور ﷺ نے سجدہ کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوالولید! تو نے سنا؟ اس نے کہا ''میں نے اس کلام کو سنا آپ اس میں مشغول رہیے اور کسی سے خوف مت کریئے۔'' اس کے بعد عتبہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ جب اس کی قوم نے اسے دیکھا تو کہنے لگے خدا کی قسم! عتبہ اترا ہوا منہ لے کر آیا ہے۔'' پھر جب عتبہ بیٹھ گیا تو کہنے لگا ''خدا کی قسم! میں نے آج وہ کلام سنا کہ اس جیسا کلام کبھی نہیں سنا۔ خدا کی قسم! نہ وہ شعر ہے نہ جادو نہ کہانت۔ اے گروہ قریش انھیں اپنے کام میں لگا رہنے دو۔ کیونکہ وہ راستی پر ہیں۔ میں اس کلام کے بارے میں قسم کھا کر کہوں گا کہ اس کی بہت بڑی شان ہے اور بخدا وہ بہت عجیب چیز ہے۔ تم جانتے ہو وہ جو کچھ کہتے ہیں جھوٹ نہیں ہوتا اور وہ جو دعا کرتے ہیں کبھی نامقبول نہیں ہوتی۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں عذاب نہ نازل ہوجائے۔ اسے بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔

حدیث میں بسلسلہ اسلام ابوذر ؓ ہے خود ہونے سے پہلے اپنے بھائی انیس نامی کو حضورِ اکرم ﷺ کے حالات شریفہ معلوم کرنے اور جستجو کرنے کے لیے بھیجا تھ۔ حضرت ابوذر ؓ بیان کرتے ہیں کہ بخدا میں نے اپنے بھائی انیس سے بڑھ کر کسی دوسرے شاعر کو نہ دیکھا اور نہ سنا اس نے بارہ شاعروں کو زمانہ جاہلیت میں شکست دی تھی اور ان میں ایک میں خود تھا۔ چنانچہ وہ مکہ مکرمہ گئے اور مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا حال آکر بتایا میں نے پوچھا ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں اس نے کہا کہ لوگوں میں سے کوئی انھیں شاعر کہتا ہے کوئی کاہن۔ خدا کی قسم! میں خود شاعر ہوں اور میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سنیں ہیں نہ تو وہ شاعر ہیں اور نہ ہی میں کاہنوں جیسی باتیں ہیں وہ صادق ہیں اور لوگ کاذب۔

اور ولید بن مغیرہ فصاحت وبلاغت میں قریش کا سب سے بڑا ہنرمند تھا اس نے بارہا قرآن کریم سن کر کہا: وَاللّٰهِ اِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةٌ وَاِنَّ عَلَیْهِ لَطَلَاوَةٌ خدا کی قسم! اس میں بڑی شیرینی ہے اور اس میں عجیب لذت ہے'' اس میں ایسی رونق وتازگی ہے جو کسی دوسرے

کلام میں نہیں ہے وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهُ لَمُغْدِقٌ. یقیناً اس کا بالائی حصہ پھل دار ہے اور اس کا نچلا حصہ سیراب ہے۔ وَمَا هُوَ قَوْلُ الْبَشَرِ. اور وہ انسان کا کلام نہیں ہے۔ وَاِنَّهُ لَيَعْلُوْا وَلَا يُعْلٰى. بلاشبہ وہ بلند ہوگا اور کوئی چیز اس پر غالب نہ ہوگی۔ اور ابن ولید اپنی قوم سے کہتا تھا کہ خدا کی قسم! تم میں کوئی بھی مجھ سے زیادہ تمہارے شعروں کا جاننے والا نہیں۔ اور نہ جنات کے شعروں کا جاننے والا ہی ہے۔ خدا کی قسم! جو کچھ وہ بیان فرماتے ہیں ان سے بہتر کسی کا کلام نہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حج کا ایک سال تھا اور قریش کے تمام قبیلے آئے ہوئے تھے۔ اس وقت ولید بن مغیرہ نے کہا کہ عرب کے تمام وفود آئے ہوئے ہیں۔ توقع ہے کہ سب کے سب ایک رائے پر مجتمع اور متفق ہو جائیں اور ایک دوسرے کی تکذیب اور باہمی اختلاف رائے نہ کریں لوگوں نے کہا ''ہم سب متفقہ طور پر کہیں گے کہ وہ کاہن ہیں۔'' ولید بن مغیرہ نے کہا خدا کی قسم! نہ تو وہ کاہن ہیں اور نہ ان میں کاہنوں کی مانند گنگناہٹ اور سجع ہے۔ پھر لوگوں نے کہا کہ ''ہم انہیں دیوانہ کہیں گے۔'' اس نے کہا ''خدا کی قسم! نہ وہ مجنون ہیں اور نہ دیوانے' وہ تو لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند ہیں۔ پھر وہ کہنے لگے کہ ہم انھیں شاعر کہیں گے۔ اس نے کہا وہ شاعر بھی نہیں۔ ہم شعر اور اس کے اقسام کو جانتے ہیں اور رجز' ہزج' قرض' مبسوط اور مقبوض کو خوب پہچانتے ہیں۔'' پھر لوگوں نے کہا ہم کہیں گے کہ وہ ساحر یعنی جادوگر ہیں اس نے کہا خدا کی وہ جادوگر بھی نہیں ہیں وہاں جھاڑ پھونک اور گنڈ ا تعویذ نہیں ہے۔ اور کہا تم انھیں جو کچھ بھی مذمت میں کہو گے ہم جانتے ہیں کہ وہ باطل ہے اسے ابن اسحاق اور بیہقی نے بیان کیا ہے۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ یہ قرآن اگر کسی جنگل و بیاباں میں کتابی شکل میں لکھا ہوا پایا جائے اور کوئی نہ جانے کہ کس نے رکھا ہے اور کون لایا ہے تو تمام عقل سلیم او فہم مستقیم گواہی دیں گے۔ یہ خدائے عزوجل کے حضور سے نازل کیا ہوا ہے اور کسی بشر کو اس کی تالیف پر قدرت نہیں ہے اور جب صادق العقول اور متقی لوگوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ کہیں گے کہ یہ خدا کا کلام ہے اور اس میں لوگوں کو تحدی اور چیلنج کیا گیا ہے کہ اس کی مانند ایک سورۃ ہی بنا کر لے آئیں اور سب عاجز رہیں گے۔ اب اور شک وشبہ کی کون سی گنجائش ہے۔ اعجاز قرآن کی معرفت میں یہ اجمالی وجوہ ہیں۔ اور اس پر آسان طریقہ ہے اور اس تحدی میں عالم و جاہل سب شریک ہیں اور اس روش سے جو مناسب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی قرآنیت کا ثبوت' نبی کریم ﷺ کے ارشاد سے ہے اور نبی کریم ﷺ کی نبوت کا ثبوت دوسرے معجزات سے ہے۔

اب رہے دوسرے تفصیلی طریقے' جس میں اعجاز قرآن کا اثبات ہے۔ مثلاً فصاحب' بلاغت عجیب وغریب اسلوب بیان اور غیبی خبریں دینا وغیرہ۔ یہ دوسری روش کے ساتھ مناسب ہے جو کہتے ہیں کہ اعجاز قرآن اعجاز قرآن کا ثبوت ان وجوہ سے ہے ایسا اثبات ان علماء کے ساتھ مخصوص ہے جو فصاحت و بلاغت کے معنی جانتے اور پہچانتے ہیں۔ لیکن معرفت اعجاز کے اقسام' متعدد ہیں۔ اول ایجاز یعنی مختصر الفاظ اور معانی بیشمار اور بلاغت ہے جیسا کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ. اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔'' ان دو کلموں میں جو گنتی کے صرف دس حرف ہیں معانی کثیرہ جمع کر دیئے ہیں۔

حضرت ابوعبیدہ ؓ سے مروی ہے کہ ایک بدوی نے کسی سے سنا کہ اس نے پڑھا ''فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ'' تو وہ سجدہ میں گر گیا اور کہنے لگا میں اس کلام کی فصاحت کو سجدہ کرتا ہوں۔ ایک اور بدوی نے کسی دوسرے شخص سے سنا کہ اس نے: فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا جب اس سے وہ سب مایوس ہو گئے تو انہوں نے اس سے کنارہ کیا۔'' تو اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے۔

بیان کرتے ہیں کہ سیّدنا عمر ابن خطاب ؓ ایک دن مسجد میں لیٹے ہوئے سو رہے تھے تو اچانک ایک ایلچی روم کے حاکموں کی

طرف سے آپ کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور دیکھتے ہی حق کی گواہی دینے لگا۔ یہ ایلچی عربی زبان کو خوب جانتا تھا اس نے کہا کہ میں نے مسلمان قیدیوں میں سے ایک قیدی سے تمہارے قرآن کی ایک آیت پڑھتے سنی ہے پھر میں نے اس پر خوب غور کیا تو میں نے دیکھا اس میں تمام وہ جو حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام پر دنیا وآخرت کے سلسلے میں اتری ہیں ان سب کو باوجود اختصار کے ایک آیت میں جمع کر دیا گیا ہے وہ آیت یہ ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ.

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اس سے تقویٰ کرے تو یہی لوگ فائز المرام ہیں۔''

اصمعی سے ایک حکایت منقول ہے کہ انہوں نے ایک لڑکی کو غایت فصیح کلام کرتے سنا تو انہوں نے اس کی فصاحت پر اظہار تعجب کیا۔ اس پر اس لڑکی نے کہا کیا تم مجھے اس کلام الٰہی کے بعد فصیح خیال کرتے ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ○	اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی کی کہ اسے جنو۔ پھر جب تم خطرہ محسوس کرو تو (صندوق) میں بند کر کے دریائے نیل میں بہا دو تم نہ تو خوف کرو اور نہ غم کرو۔ ہم اسے تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اسے بنائیں گے رسولوں میں سے۔

اس ایک آیت میں دو حکم، دو نہی، دو خبر اور دو بشارتیں جمع فرمائی گئی ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ○	اسے خوب اچھی طرح سے دور کرو پھر جب وہ تمہارے اور اس کے درمیان عداوت ہو گویا کہ وہ ولی حمیم ہے……

اسی طرح یہ ارشاد کہ: يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآئَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان پھٹ جا۔'' اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جو اختصار و ایجاز الفاظ رکھنے کے باوجود معانی کثیرہ، مفاہیم عظیمہ، حسن ترکیب الفاظ اور اتصال کلمات کے حامی ہیں۔ اسی طرح ان طویل قصوں اور قرآن میں سابقہ کی خبروں کے بیان کا حال ہے۔ جن سے فصحائے کلام کی عادت میں سستی واقع ہو جاتی ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ طویل قصہ ہے جسے قرآن پاک نے بیان فرمایا کہ کس حسن وخوبی کے ساتھ باہم کلمات کا ارتباط والتیام اور عبارت میں روانی اور دلائل کا وہ سیل رواں ہے جو غور وفکر کرنے والوں اور ارباب فہم وبصیرت کے لیے عبرت وندرت کا مقام ہے۔ اس قسم کے اعجاز کا دریافت کرنا اہل عرب کے سلیقے اور ان کے ذوق پر موقوف ہے اور ان کے کلام کا ماہر اور زبان داں ہونا شرط ہے۔ اگرچہ زبان عربی کے ماہروں نے اس فن میں علوم منضبط کیے اور کتابیں مدون کی ہیں۔ ان سب کے باوجود عرب کے جاہلوں، ان کی عورتوں اور غلاموں میں جو ان کا اپنا خاص ذوق ووجدان اور سلیقہ پایا جاتا ہے وہ غیر عرب کے علماء فن، مردان روزگار اور بزرگان ملت میں پایا جانا ممکن ہی نہیں۔

اور جو اعجاز کی دیگر قسمیں مثلاً نظم عجیب واسلوب غریب کی صورت جو کہ فواصل وقواطع مخالف اور تمام کلام عرب کے مبائن ہے اور ان کی نظم ونثر، خطابات واشعار اور ارجاز واسجاع کے طریقے جو ان کے روزمرہ کے معمولات ہیں۔ ان اعتبارات سے قرآن پاک کا ایک خاص زائد وصف ہے جو اہل عرب کے کلام سے ممتاز ہے اور یہ قرآن اہل عرب کے کلام میں نہ تو مختلط ہوتا ہے نہ مشتبہ۔ باوجودیکہ قرآن کے کلمات وحروف انہیں کے کلام کی جنس سے ہیں جو وہ اپنے نظم ونثر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس سے ان کے عقلاء حیرت زدہ ہیں اور ان کے خطباء وبلغاء متحیر وسرگرداں ہیں۔ وہ اپنے کلام کی جنس میں اس جنس جیسی خوبیاں پیدا کرنے کی راہ نہیں

پاتے۔ اور حق تعالیٰ کے دلائل قاہرہ اور براہین ساطعہ وباہرہ کے ظہور کی بناء پر ان سے معارضہ اور مقابلہ کرنے کی طاقت پاتے ہی نہیں۔ لہٰذا جب ولید بن مغیرہ نے حضور ﷺ سے قرآن کریم سنا تو اس کا دل پگھل گیا اور اس کا اسے اعتراف کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس کے پاس ابوجہل آیا اور اسے سخت وست کہنے لگا اس پر بھی وہ انکار نہ کرسکا۔ یہی حال تمام اشقیاءِ قریش کا تھا۔ باوجودیکہ وہ بلاغت وفصاحت کی صنعتوں کے حاذق وماہر اور عارف تھے۔ وہ سب اسلوب کلام اور طرز بیان سے متحیر ہوکر رہ گئے اور انہیں اعتراف کرنا پڑا۔ بعض مغرور ونادان لوگوں کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اس کا مقابلہ کرنا چاہا مگر وہ ذلیل ورسوا ہوکر رہ گئے۔ جیسے یحییٰ بن غرائی چہ بلاشبہ اپنے زمانے میں بےنظیر فصیح وبلیغ تھا اس نے قرآن سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا اور سورہ اخلاص پر نظر ڈالی۔ اور قصہ کیا کہ اس کی مثل کوئی عبارت بنائے۔ چنانچہ اس کوشش میں اس نے بڑی سختی ومشقت اٹھائی۔ مگر قادر نہ ہوسکا پھر اس میں ہیبت وخشیت الٰہی طاری ہوگئی۔ اور اس ارادہ سے توبہ کرلی۔ حالانکہ اس نے اپنے زمانے میں مقفی ومسجع اور افصح کلام بنایا تھا اور اس نے اپنے اس کلام کا نام قرآن کی سورتوں کے طرز پر ''مفصل'' رکھا تھا۔ وہ ایک دن بچوں کے مکتب کی طرف گزرا اس وقت بچے یہ آیت پڑھ رہے تھے: قِيۡلَ يٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِىۡ مَآئَكِ. کہا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے'' تو وہ لوٹ کر گھر آیا اور اس نے اپنے لکھے ہوئے کو تلف کردیا۔ اور کہنے لگا خدا کی قسم! میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کلام کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

وجوہ اعجاز قرآن کی تیسری صورت یہ ہے کہ ان غیبی خبروں پر متضمن ومشتمل ہے جو نہ واقع ہوئیں اور نہ رونما ہوئی تھیں۔ لیکن جب وہ واقع ہوئیں تو اس طرح وارد ہوئیں جس طرح ان کی خبریں دی گئیں تھیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد:

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ.
ضرور بالضرور انشاء اللہ مسجد حرام میں امن وامان کے ساتھ داخل ہوں گے۔

اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد:

وَهُمۡ مِنۡ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُوۡنَ
اور وہ اپنے غلبہ کے بعد بہت جلد مغلوب ہوں گے۔

اور اس کا یہ ارشاد کہ:

لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ.
تاکہ وہ تمام دینوں پر اسے غالب فرمائیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ اور اللہ نے تم میں سے ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں سے وعدہ فرمایا کہ وہ زمین میں تمہیں خلیفہ بنائے گا۔'' اور یہ فرمایا کہ:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ. اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَo
جب اللہ کی مدد اور فتح آئے گی۔ الخ اور اس کا یہ فرمان کہ: بلاشبہ قرآن کو ہم نے ہی اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔

چنانچہ یہی ہوا کہ بےشمار اعداء وملاحدہ اور معطلہ وقرامط نے مجتمع ہوکر مکر وحیلہ اور قوت وطاقت سے کوششیں کیں کہ قرآن کے نور کو بجھادیں مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے اور اس کے کلمات میں سے ایک کلمہ میں بھی تغیر پیدا نہ کرسکے اور مسلمانوں کو اس کے کسی حرف کے بارے میں شک میں مبتلا نہ کرسکے۔ اور فرمایا کہ:

سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَيُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَo
بہت جلد یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

اور اس کا ارشاد:

قَاتِلُوۡهُمۡ يُعَذِّبۡهُمُ اللّٰهُ بِاَيۡدِيۡكُمۡ.
ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان پر عذاب فرماتا ہے۔

اوراس کا یہ ارشاد کہ: وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗ اَبَدًا. (وہ اس کبھی بھی آرزو نہ کریں گے) اورفرمایا: وَلَنْ تَفْعَلُوْا (وہ ہرگز ہرگز ایسا نہ کرسکیں گے۔) اس قسم کے بے شمار آیات واخباء ہیں۔

وجوہ اعجاز قرآن میں چوتھی صورت میں گذشتہ لوگوں کے وہ واقعات وحوادث ہیں جنھیں کچھ لوگ تو جانتے تھے اور بہت سے نہیں جانتے تھے۔ جیسے اصحاب کہف کا قصہ اور حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کی شان اور حضرت ذوالقرنین کے احوال اور حضرت یوسف علیہ السلام اوران کے بھائیوں کا قصہ اور حضرت لقمان اوران کے بیٹوں کا قصہ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے ان کے ساتھ قصے اوراس قسم کی بے شماروہ خبریں جو گذشتہ زمانوں اور پچھلی امتوں اوران کی شریعتوں اوراگلے پچھلے علوم سے متعلق ہیں ان واقعات کو اہل کتاب میں سے وہی لوگ جانتے ہیں جن کی عمریں اس قسم کی تحصیل میں کٹی تھیں۔ ان واقعات کو قرآن میں ایسے طریقے پر لایا گیا اور انہیں اس انداز سے بیان کیا گیا کہ ان لوگوں کو اس کے صدق وصحت کا اعتراف کرنا پڑا۔ درآں حالیکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ حضور ﷺ اُمی ہیں جنہوں نے پڑھنا لکھنا نہ تو سیکھا اور نہ کسی مدرسے میں درس وتدریس کی اور نہ ان کی مجلسوں میں شمولیت فرمائی وہ ان کے سامنے سے کبھی باہر نہ گئے اوراس کے باوجود وہ خبریں بیان فرماتے ہیں جو توریت وانجیل اور صحف ابراہیم وموسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام میں ہیں۔ وجوہِ اعجاز قرآن میں یہ چار صورتیں خوب ظاہر ہیں نہ اس میں کوئی خفا ہے نہ شک وشبہ اور نزاع وجدال کی گنجائش ہے اس کے سوا جو اور وجوہات اعجاز ہیں وہ از قبیل صفات قرآن ہیں جن کو علماء بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن ممتاز ومنفرد ہے اس کے ساتھ کوئی کلام مشارکت نہیں رکھتا۔ ان میں سے ایک صفت تو یہ ہے کہ بوقت سماع قرآن' سننے اور سنانے والوں کے خوف وہیبت پیدا کرتا ہے اور تلاوت کے وقت قاریوں پر ایک رعب طاری ہوتا ہے اور یہ کیفیت کافروں اور جھٹلانے والوں پر بہت زیادہ ہوتی ہے اوراس کا قہر وجلال ان پر بہت زیادہ غالب آجاتا ہے۔ اس کیفیت میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ جھٹلانے والوں اور منکروں پر اس کا سننا بھاری ہوتا ہے اوراس سے ان میں اور نفرت بڑھتی ہے۔ اوران کے سینے تنگ ہوجاتے ہیں۔ وہ اس سے دور رہنے کو پسند کرتے اوراس کے سننے کو ناپسند کرتے ہیں۔ مومن ومصدق کے دل میں بھی اس کی ہیبت اور دبدبہ جاگزیں ہوجاتا ہے اوراس کا ذوق شوق بڑھتا ہے اوراس کا باطن' انجذاب' خفت' راحت اور انشراح کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہ انجذاب وکشش کی کیفیت' اس کے میلان' محبت قلبی اور تصدیق کی بناپر ہوتی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرمایا: تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ (قرآن سے ان لوگوں کے جسموں کے بال کھڑے ہوجاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں) اورفرمایا: ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ (پھران کے اجسام اور قلوب ذکر الٰہی کی طرف جھک جاتے ہیں) اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم اسے خشیت الٰہی سے جھکتا اور کانپتا دیکھتے۔) یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے قرآن کریم کی خاصیت وطبیعت عظیم ہے اگرچہ سننے والا اہل علم وفہم سے نہ ہو اور وہ اس کے معنی وتفسیر کو نہ جانتا ہو اس حالت کا صحیح مشاہدہ' عورتون سے اور جاہل عوام ہوتا رہتا ہے۔ وہ اس کے سننے ہی سے کافی متاثر ومتنبہ ہوتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ کلام' دوسرے کلاموں کی مانند نہیں ہے۔ ایک حکایت میں ہے کہ ایک نصرانی کا قاری پر گزر ہوا۔ تو وہ کھڑا ہوگیا اور رونے لگا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کس چیز نے تمہیں رُلایا حالانکہ تم اس کا مفہوم تک نہیں جانتے۔ اس نے کہا میں اس اسلوب کلام کی لطافت سے رونے لگا۔ اس کے سننے سے عجیب لطف وسرور حاصل ہوتا ہے۔

سماعت قرآن کریم کا یہ رعب وہیبت' اسلام وایمان لانے سے پہلے ایک جماعت پر بھی طاری ہوا تھا جس سے وہ بے توقف ومہلت اس وقت ایمان لے لائے تھے چنانچہ حضرت جبیر بن مطعم سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو نماز مغرب

میں سورہ طور کو تلاوت کرتے سنا۔ پھر جب حضور اس آیت پر پہنچے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ۝ اَمْ هُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ ۝

کیا وہ کسی اصل سے نہ بنائے گئے یا وہی بنانے والے ہیں۔

اسے سن کر قریب تھا کہ میرا دل نکل پڑے اور میری جان باہر آ جائے۔ میرا یہ حال اس وقت ہوا تھا جب کہ سب سے پہلے ایمان نے میرے دل میں اثر کیا تھا۔ اور عتبہ بن ربیعہ نے سیّد عالم ﷺ سے ''سورہ حم السجدہ'' کو سنا تو وہ مدہوش اور متاثر ہو گیا۔ پھر جب وہ اپنی قوم میں گیا تو کہنے لگا خدا کی قسم! میں نے (حضور سیّد عالم) محمد مصطفیٰ ﷺ سے وہ کلام سنا ہے جس کی مانند آج تک میں نے کوئی کلام نہ سنا۔ مجھ میں طاقت گویائی نہیں کہ کس طرح اس کی توصیف کروں۔ لیکن وہ کفر پر ثابت قدم رہا۔ ایمان نہ لایا بلکہ اس کا انکار و عناد اور زیادہ بڑھ گیا اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان عطائے باری تعالیٰ ہے۔ علم و دانش اس میں کفایت نہیں کرتا اور: یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ (وہ آپ کو اپنے بیٹوں سے زیادہ جانتے ہیں اس کے باوجود وہ اس کا انکار کرتے ہیں) اس کی دلیل ہے۔

وجوہات اعجاز قرآن میں سے ایک وجہ اعجاز یہ بھی ہے کہ قاری قرآن اکتاتا نہیں اور سننے والا اسے ناپسند نہیں کرتا۔ بلکہ یہ حلاوت، چاشنی، سرور، محبت، تروتازگی اور لذت کو بڑھاتا ہے اور تنہائی میں اس سے لذت اور اس کی تلاوت سے انس محسوس کرتا ہے۔ یہ کیفیت ہر حال میں ہے۔ بخلاف دوسرے کلاموں کے، اگرچہ وہ حسن و بلاغت میں کتنے ہی بلند پایہ ہوں مگر ان کی تکرار ناپسند معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ تجربہ شاہد ہے یہ سب ایمان و محبت کی شرط کے ساتھ ہے لیکن کفار، منافقین اور اعداء: فَلَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (تو ان کو سوائے خسارہ کے کچھ نہیں بڑھتا)۔

وجوہات اعجاز قرآن میں سے ایک وجہ اعجاز یہ بھی ہے کہ قرآن میں ان علوم و معارف کو جمع کیا گیا ہے جو عرب میں معمول نہ تھے۔ اور قبل از نبوت حضور ﷺ کو بھی ان کی معرفت نہ تھی اور پچھلی امتوں کے علماء میں سے کسی ایک نے بھی نہ انہیں قائم کیا اور نہ ان کا احاطہ کیا اور ان کی ایک کتاب بھی ان علوم و معارف پر مشتمل نہ تھی چنانچہ علم شرائع، محاسن آداب و شیم، مواعظ و حکم، سیر انبیاء و امم اور آخرت کے اخبار و آثار کو بروجہ اکمل و اُتم جمع فرما کر حق تعالیٰ جل جلالہ و عز اسمہ کی توحید اور صانع عالم کے صفات کمال پر حجج عقلیہ، براہین یقینیہ اور ادلہ مبینہ کے طریقہ پر تنبیہ فرمائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (ہم نے کسی چیز کو قرآن میں بیان سے نہ چھوڑا'') وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْآنَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ (اور ہم نے آپ پر ہر چیز کا خوب واضح بیان کرنے والا قرآن اتارا)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (اور بیشک ہم نے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر ایک مثل بیان فرمائی۔) اور فرمایا: اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ. (بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے وہ واقعات بیان فرماتا ہے جن سے ان کے اکثر لوگ اختلاف کرتے ہیں) اور فرمایا: هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ هُدًی (یہ لوگوں کے لیے بیان و ہدایت ہے۔)

سب سے عجیب و غریب بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں دلیل و مدلول دونوں جمع کیے گئے ہیں۔ اس لیے نظم قرآن اور اس کے حسن وصف و بلاغت کے ساتھ احتجاج و استدلال کیا جاتا ہے اور اسی کے درمیان اس کا حکم، اس کی ممانعت اور وعدو عید کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جملہ غور و فکر کرنے والا جب اس بارے میں سوچتا ہے اور اس سے حجت حاصل کرتا ہے تو ساتھ ہی ایک ہی کلام میں حکم بھی معلوم لیتا ہے۔

انہیں وجوہات اعجاز میں ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے نظم کے پیرایہ میں رکھا ہے نہ کہ نثر کے۔ اس لیے منظوم نفوس پر زیادہ آسان، دلوں کو کھینچنے والا، کانوں کو سبکتر، اور فہموں پر زیادہ مرصع ہے اس کی جانب طبیعتیں مائل ہوتیں اور خواہشیں دوڑتی ہیں۔

انہیں وجوہات اعجاز میں ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے متعلموں اور حافظوں پر اس کا حفظ کرنا آسان وسہل فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ. اور ہم نے یاد کرنے کے لیے قرآن کو آسان بنایا۔

پچھلی امتیں اپنی کتابوں کو یاد نہیں کرتی تھیں۔ بجز ایک دو شخص کے۔ چہ جائیکہ جماعت کثیرہ یاد کرے۔ باوجود درازی عمر اور مرور سنین کے، اور بچوں اور علماء کے لیے مختصر مدت میں اس کا حفظ کر لینا سہل وآسان ہے۔

انہیں وجوہات اعجاز میں سے یہ ہے کہ قرآن کریم کے اجزاء ایک دوسرے سے مشاکلت رکھتے ہیں اور انواع واقسام کے مضامین باہم پیوست ہیں اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ ایک قصہ سے دوسرے قصہ کی طرف اور ایک جملہ سے دوسرے جملہ کی طرف باوجود اختلاف معانی کے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اور ایک ہی سورۃ میں امر، نہی، خبر، استخبار، وعد، وعید، اثبات نبوت وتوحید اور ترغیب وترہیب وغیرہ مضامین بغیر اس کے کہ ان کو فصلوں میں تقسیم کیا جائے موجود ہے۔ اور اگر کسی اور کلام فصیح میں۔ اس قسم کے اختلاف مضامین لاحق ہوں تو یہ اسے فصاحت کے ضعف کی طرف لے جاتا ہے اور اس کی روانی کو کمزور اور سست کر دیتا ہے۔ اور الفاظ کا تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔ اور عبارتیں متزلزل ہو جاتی ہیں مگر قرآن پاک میں یہ انداز بیان نرالا ہی حسن وخوبی بڑھاتا اور اس کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔

اور انہیں وجوہ اعجاز میں سے یہ ہے کہ اس کی آیتیں باقی رہنے والی ہیں۔ اور حق تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ہم ہی نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔ حالانکہ دوسری کتابوں کی حفاظت رہبان واحبار کے سپرد کی گئی یقیناً انہوں نے اس میں تغیر وتبدل اور تحریف اور تصرف کیا۔ حق تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ کوئی باطل اس میں نے سامنے سے نہ پیچھے سے آسکے گا۔ انبیاء علیہم السلام کے تمام معجزات اپنے اوقات وزمانہ گزارنے کے بعد منقضی اور ختم ہو گئے اور ان میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ لیکن قرآن کریم حضور ﷺ کا وہ معجزہ جس کی آیتیں روشن ہیں۔ جس کے معجزات ظاہر اور آج تک کہ ایک ہزار پینتیس سال گزر چکے ہیں (یہ مدراج النبوۃ کی تالیف کا سن ہے) باقی ہیں۔ ہر زمانہ میں اہل بیان، ماہرین زبان، ائمہ بلاغت، شہسوار خطابت اور ملاحد واعدائے دین دنیا میں موجود رہے۔ لیکن قرآن کے معارضہ ومقابلہ میں کوئی چیز نہ لا سکے۔ البتہ! اس کے مناقضہ میں کوئی تالیف پیش نہ کر سکے۔ اور نہ ہی طعن صحیح وقدح صریح پر قادر ہو سکے بلکہ جس نے بھی ایسا ارادہ کیا وہ عاجز ہو کر رہ گیا۔ اور میدان چھوڑ بھاگا۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اعجاز قرآن میں ائمہ کرام نے وجوہ کثیرہ بیان کیے ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر اس کی بلاغت وفصاحت ہی کی طرف راجع ہیں لیکن ہر شخص کا فصاحت وبلاغت میں ماہر ہونا واجب نہیں ہے۔ ہر ایک نے وجہ منفرد اور علیحدہ باب اختیار فرمایا ہے مگر فنون بلاغت اور حقیقت اعجاز کے ذکر کا مقصود وہی چار وجوہ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کے ماسوا قرآن کے خواص اور اس کی صفات کے عجائب ہیں۔ (وباللہ التوفیق)۔

معجزہ شق قمر: وصل: تمہیں معلوم ہو چکا کہ حضور سید المرسلین، خاتم النبیین ﷺ کے معجزات میں سے سب سے عظیم واعلیٰ معجزہ قرآن مجید ہے لیکن چاند کے ٹکڑے کرنا، پانی کا چشمہ بہانا، کھانے کو زیادہ کرنا اور جمادات کا بولنا وغیرہ بھی عظیم معجزے ہیں۔ ان میں سے بعض معجزے تو حد تواتر وشہرت تک پہنچ گئے ہیں اور بعض معجزے اگرچہ خبر واحد سے ہیں۔ لیکن تعدد طرق واسناد سے منجر بحد تواتر

ہیں۔ حضور ﷺ کے کچھ معجزے تو قبل از زمان بعثت ظاہر ہوئے جنہیں ''ارہاصات'' کہا جاتا ہے۔ ارہاص کے معنی بنیاد رکھنے کے ہیں۔ گویا وہ نبوت ورسالت کے تاسیس کے حکم میں ہیں۔ اور کچھ معجزے زمانہ اظہار نبوت میں ظاہر ہوئے۔ معجزے کی ایک اور قسم بھی ہے۔ یہ بعد از رحلت ظاہر ہوتے رہتے ہیں جیسے اولیائے کرام کی کرامات وغیرہ۔ کیونکہ یہ سب حضور ہی کے معجزے ہیں اور وہ آپ کی نبوت کی صحت اور آپ کی رسالت کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن شق قمر یعنی چاند کا ٹکڑے کرنا معجزات میں روشن وتابندہ تر ہے کیونکہ اس سے عالم علوی میں تصرف فرمایا گیا ہے۔ جو کسی نبی سے واقع نہیں ہوا۔ یہ معجزہ قرآن کریم میں بھی بیان کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (قیامت قریب آ گئی اور چاند ٹکڑے ہوگیا) اس آیت کریمہ کا اشارہ دنیا میں اسی واقعہ کی طرف ہے۔ اور مفسرین اس کی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ رہا اس کا روز قیامت انشقاق پر محمول کرنا تو اس کا رد اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کر دیتے ہیں کہ: وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَةً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (اگر وہ کسی نشانی کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو پرانا جادو ہے) اس لیے کہ کفار ''سحر مستمر'' روز قیامت کے لیے نہیں کہتے۔

یقیناً حدیث شریف میں آیا ہے کہ سیّدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اقدس میں چاند کے دو ٹکڑے ہوئے ایک ٹکرا پہاڑ کے ادہر اور دوسرا ٹکڑا پہاڑ کے نیچے تھا۔ اس روایت کو صحابہ کرام کی جماعت کثیرہ نے نقل فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کفار قریش نے حضور ﷺ سے معجزہ طلب کیا اور کہنے لگے اگر صادق ہو تو چاند کے دو ٹکڑے کر دو؟'' حضور ﷺ نے چاند کی جانب اشارہ فرمایا وہ دو ٹکڑے ہوگیا اور لوگوں نے کوہ حرا کو دونوں ٹکڑوں کے درمیان دیکھا پھر حضور ﷺ نے فرمایا ''اشہدو'' گواہ رہو۔ اس پر کفار کہنے لگے۔ بلاشبہ ابن ابی کبشہ نے تم پر جادو کیا ہے ان میں سے ایک نے کہا اگر وہ جادو کر سکتے ہیں تو تم پر کر سکتے ہیں۔ تمام روئے زمین والوں پر تو جادو نہیں کر سکتے چنانچہ جب آفاق سے مسافر وہاں آئے اور انہوں نے چاند کے ٹکڑے ہونے کی خبر دی تو ابو جہل علیہ اللعنۃ نے کہا ''هٰذَا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ'' یہ پرانا جادو ہے۔''

ابن عبدالبر جو اکابر علماء حدیث سے ہیں فرماتے ہیں کہ چاند کے ٹکڑے ہونے والی حدیث کو صحابہ کرام کی جماعت کثیرہ نے اور اسی طرح تابعین کی جماعت کثیرہ روایت کرتی ہے اور ان سے ایک جم غفیر نے اسی طرح ہم تک یہ روایت پہنچی اور آیہ کریمہ نے اس کی تائید فرمائی۔ انتہی۔

اسی طرح متقدمین ومتاخیرن کی حدیث کی کتابیں بکثرت طرق اور متعدد اسانید سے مملو اور بھری ہوئی ہیں۔

مواہب لدنیہ میں منقول ہے کہ علامہ ابن سبکی رحمتہ اللہ مختصر ابن حاجب کی شرح میں فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انشقاق قمر یعنی چاند کے ٹکڑے ہونا متواتر ہے اور قرآن میں منصوص علیہ ہے اور صحیحین وغیرہما میں بطرق کثیرہ صحیحہ مروی ہے جس کے تواتر اور اس کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ! اس معجزہ کا بعض مبتدعہ نے انکار کیا ہے۔ یہ ملت کے ان مخالفوں کی راہ میں موافقت میں ہے جو کہتے ہیں کہ اجرام علویہ خرق والتیام کو قبول نہیں کرتے۔ اور ملت کے متبعین کے علماء اس بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں عقلاً کوئی استحالہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ چاند وسورج خدا کی مخلوق ہیں وہ جو چاہے اس میں کرتا ہے جیسے کہ نصوص میں احوال قیامت کے ضمن میں مذکور ہے۔

اب رہا بعض ملحدوں کا یہ کہنا کہ اگر اس معجزہ کی حدیث بطریق تواتر واقع ہوتی تو اس کی معرفت میں روئے زمین کے تمام لوگ شریک ہوتے اور یہ اہل مکہ کے ساتھ مخصوص نہ ہوتے۔ اس لیے کہ یہ ایسا معاملہ ہے جو حس ومشاہدہ میں آتا ہے۔ اور اس قسم کے عجیب وغریب ونرالی باتوں کے دیکھنے کی طرف لوگوں کو شوق ہوتا ہے اور غیر عاری چیز کی نقل میں خاص جذبہ کام کرتا ہے۔ اگر اس کی کوئی صحت

واصلیت ہوتی تو ہمیشہ تاریخوں میں لکھی جاتی۔ نہ اس کا تذکرہ تاریخوں میں ہے نہ علم نجوم کی کتابوں میں۔ اس کا ذکر و بیان نہ کرنا اوران کا اتفاقیہ طور پر چھوٹ جانا یا غفلت برتنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ معاملہ بہت عظیم اور واضح تھا۔

علمائے کرام اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ قضیہ ان باتوں سے خارج ہے جن کا وہ تذکرہ کرتے ہیں' یہ وہ چیز ہے جس کا ایک قوم نے اور خاص لوگوں نے مطالبہ کیا تھا۔ اور یہ کہ واقعہ یہ رات میں ہوا تھا۔ رات میں اکثر لوگ سوئے ہوتے ہیں اگر کچھ لوگ جاگتے بھی ہوں تو وہ گھروں اور کونوں میں آرام کرتے ہیں۔ ان کی صحرا میں موجودگی اور بیداری اتفاقیہ اور شاذ شاذ ہے۔ اور یہ کہ یہ واقعہ ایک لحظہ کے لیے واقع ہوا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت تمام لوگوں کے لئے اس کے مشاہدہ کی راہ میں رکاوٹیں ہوں۔ مثلاً بادل یا پہاڑ حائل ہوں یا لوگ کسی تفریحی مشغلہ میں ہوں۔ مثلاً قصے کہانیاں وغیرہ سنتے سناتے ہوں۔ اور وہ اس کے دیکھنے سے رہ گئے ہوں۔ اور یہ بات بھی عادتاً بعید ہے کہ لوگ چاند پر ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہوں اور ایک لحظہ کے لیے صرف نظر نہ کرتے ہوں۔ ایسی صورت میں اسی وقت متصور ہوسکتی ہے جب کہ انھیں پہلے سے اسے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کے لیے تیار و آمادہ کیا گیا ہو۔ اور ایک تاریخ و وقت مقرر کر کے سارے جہان میں اس کا اعلان واشتہار دے دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ چاند اپنی اس منزل میں ہو۔ جس سے افق پر کہیں تو ظاہر ہوتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا۔ گویا کہ ایک قوم کے تو نظروں کے سامنے ہے اور دوسری قوم سے مستر و پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ چاند گرہن اور سورج گرہن میں ہوتا رہتا ہے کہ کسی شہر میں تو دیکھا جاتا ہے اور کسی میں نہیں۔ کہیں کچھ حصہ گرہن کا نظر آتا ہے اور کہیں کچھ حصہ۔ بعض شہر تو ایسے ہوتے ہیں جو گرہن کو جانتے ہی نہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو حساب سے اس علم کے دعویدار ہیں۔ اور یہ کہ اہل حق کے نزدیک دیکھنا یا نہ دیکھنا قدرت الٰہی میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دکھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے نہیں دکھاتا۔ مقصود تو محض ان لوگوں کو دکھانا تھا جن سے تحدی کی گئی تھی اور جنہوں نے اس معجزہ ونشانی کا حضور ﷺ سے مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دیکھ لیا تھا ممکن ہے کہ دوسروں نے دیکھا ہو۔ پھر یہ کہ جب گردوپیش کے مسافر آئے تو انہوں نے اس کی خبر دی تو اب تمام عالم کے دیکھنے کی کیا حاجت ہے۔

تنبیہ: مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں کہ بعض قصہ گو جو یہ بیان کرتے ہیں کہ ''نبی کریم ﷺ کے دامن مبارک میں چاند داخل ہو کر آپ کی آستین شریف سے باہر آیا۔'' یہ بے اصل ہے۔ جیسا کہ شیخ بدرالدین زرکشی نے اپنے شیخ عمادالدین بن کثیر سے نقل کیا ہے۔ (واللہ اعلم)

سورج کا لوٹانا: اب رہا ردِشمس یعنی غروب ہونے کے بعد سورج کا لوٹانا تو یہ بھی حضور ﷺ کا معجزہ ہے۔ حضرت اسماء بنت عمیس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ پر اس حالت میں وحی نازل ہوئی جب کہ آپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ران پر سر مبارک رکھے ہوئے تھے حضرت علی نے اس وقت تک نماز عصر ادا کر لی تھی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے علی! کیا تم نے نمازِ عصر ادا کر لی تھی؟ عرض کیا نہیں۔ اس وقت حضور نے مناجات کی اور کہا اے خدا یہ تیرا (علی) تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھے تو تو اس کے لیے سورج کو لوٹا دے۔ اسی وقت سورج لوٹ آیا۔ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میں نے سورج کو غروب ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد میں نے بعد از غروب طلوع ہوتے بھی دیکھا اور اس کی شعاعیں پہاڑوں اور زمینوں پر پھیل گئیں۔ یہ واقعہ مقام ''صہبا'' کا ہے۔ اس حدیث کی مکمل بحث' غزوۂ خیبر میں انشاءاللہ آئے گی۔

انگشت ہائے مبارک سے پانی کا چشمہ جاری کرنا: وصل: نبی کریم ﷺ کے مشہو معجزوں میں سے ایک یہ پانی کا معجزہ بھی ہے۔ جو بار بار متعدد مقامات پر اجتماع عظیم کے سامنے رونما ہوا۔ اور یہ اس قدر کثیر سندوں سے مروی ہے جو علم قطعی بتواتر معنوی کا افادہ کرتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی انگشت ہائے مبارک کے درمیان پانی کا چشمہ جاری ہوا ہے۔ ایسا معجزہ کسی نبی کے بارے میں نہیں سنا

گیا۔ اگر چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک کے ذریعہ پتھر پر عصا مارنے سے پانی کے چشمے جاری ہوئے تھے مگر اس میں شک نہیں کہ انگلیوں سے پانی نکالنا پتھر سے پانی نکالنے کے اعجاز کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ پتھر سے پانی عادتاً نکلا ہی کرتا ہے۔ بخلاف گوشت پوست اور ہڈیوں سے پانی نکالنا۔ بلاشبہ اس حدیث کو صحابہ کرام کی جماعت کثیرہ نے روایت کیا ہے۔ ان میں سے حضرت انس، جابرؓ اور ابن مسعود ؓ کی حدیث ہے۔ لیکن حضرت انس ؓ کی حدیث بخاری و مسلم میں واقع ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ نماز عصر کا وقت آ گیا اور لوگ چاروں طرف پانی کو تلاش کر رہے تھے لیکن پانی نہ پاتے تھے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس پانی لایا گیا آپ نے اپنا دست مبارک پانی کے برتن میں رکھ دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس سے وضو کریں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے انگشت ہائے مبارک کے درمیان سے چشمہ کی مانند پانی ابل رہا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ انگلیوں اور اس کے پوروں سے پانی نکل رہا تھا۔ چنانچہ ساری جماعت نے وضو کر لیا لوگوں نے حضرت انس سے پوچھا تم کتنے آدمی تھے۔ فرمایا ہم تین سو اشخاص تھے۔

ابن شاہین کی حدیث حضرت انس ؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں غزوہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا مسلمانوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ! ہم اور ہمارے اونٹ اور جانور پیاسے ہیں۔ فرمایا تھوڑا بہت جتنا بھی پانی ہو لاؤ۔ وہ لوگ مشکیزوں میں سے جمع کر کے چند گھونٹ پانی لائے آپ نے فرمایا برتن میں لوٹ دو اس کے بعد آپ نے اپنا دست مبارک اس پانی میں رکھ دیا۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کی انگشت ہائے مبارک سے چشمے اُبل رہے ہیں۔ پھر ہم نے اپنے اونٹوں اور جانوروں کو پانی پلایا۔ اور باقی پانی ہم نے مشکیزوں میں بھر لیا۔

بیہقی سیّدنا انس ؓ سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا حضور ﷺ قبا کی جانب تشریف لے گئے وہاں ایک شخص اپنے گھر سے چھوٹا سا پیالہ لے کر آیا۔ حضور نے اپنا دست اقدس پیالہ میں رکھا مگر پورا دست مبارک پیالہ میں نہ آ سکا تو آپ نے اپنی چار انگلیوں کو رکھا۔ انگوٹھا باہر رہا۔ پھر انگشت ہائے مبارک سے پانی بہنے لگا۔ (آخر حدیث تک)۔

بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ کے دن ہم سب پیاسے تھے اور حضور کے سامنے ایک چھاگل تھی جس سے حضور وضو فرما رہے تھے۔ صحابہ کرام نے حضور کے گرد حلقہ ڈال دیا حضور ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے۔ کیوں حلقہ بنائے کھڑے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس پانی نہیں ہے جو وضو کریں اور پئیں بجز اس پانی کے جو حضور کے سامنے ہے۔ حضور نے اپنا دست مبارک چھاگل میں رکھ دیا جس سے پانی چشموں کی مانند جوش مارنے لگا۔ پھر ہم نے پانی پیا۔ اور وضو بھی کیا۔ لوگوں نے حضرت جابر سے پوچھا تم کل کتنے آدمی تھے۔ انہوں نے فرمایا اگر ہم ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی ہمیں کفایت کر جاتا لیکن ہم صرف پندرہ سو تھے۔ صحیح مسلم میں سیّدنا جابر ؓ سے حدیث مروی ہے بیان کیا کہ ہم غزوہ بواط میں تھے ہمارے پاس مشکیزہ میں چند قطروں کے سوا پانی نہ تھا اسے پیالہ میں نچوڑا گیا۔ حضور ﷺ نے انگشت ہائے مبارک کو اس پیالے میں پھیلا دیا۔ تو انگلیوں کے درمیان سے پانی جوش مارنے لگا۔ تو پیالہ ویسا ہی بھرا ہوا تھا۔ حضرت جابر سے امام احمد بیہقی اور ابن شاہین نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔

اب رہی حضرت ابن مسعود ؓ کی حدیث! تو صحیح بخاری میں بروایت علقمہ مروی ہے کہ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہمارے پاس پانی نہ تھا۔ حضور نے ہم سے فرمایا کہ تلاش کر کے کسی کے پاس سے تھوڑا سا پانی لے آؤ۔ ہم پانی لے کر حضور کے پاس آئے اسے ایک برتن میں ڈالا۔ آپ نے دست مبارک پانی میں رکھ دیا (آخر حدیث تک) یہ حدیثیں اگر چہ ایک ایک صحابی مثلاً حضرت انس سے یا حضرت جابر وغیرہ سے منقول ہیں لیکن وہ تمام حضرات جو اس وقت موجود تھے۔ گویا وہ

سب راوی اور حکایت کرنے والے ہیں۔ اگر وہ اس کا انکار کرتے تو یقیناً ان سے خاموشی ناممکن ہے۔ جیسا کہ انسانی خصلت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت شریفہ ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ خبر واحد اگر صحابہ کرام کی جماعت کے سامنے بیان کی جائے اور وہ سب خاموش رہیں تو اس کا حکم یہ ہے کہ گویا وہ سب روایت کرنے والے ہیں۔ (فتدبر)

سوال: اس طرح انگشت ہائے مبارک سے چشمے کے جاری ہونے کے سلسلے میں سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی بطریق متعددہ حدیثیں مروی ہیں۔ اب اس حدیث میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کیا حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلے تو پیالہ میں پانی ڈلواتے اس کے بعد اس میں دست اقدس رکھتے جس سے چشمے ظاہر ہوتے کیوں نہ پہلے ہی چشمے جاری ہو گئے۔

جواب: جواب میں علماء فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی کا ادب ملحوظ تھا۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہی بے اصل مادہ ومعدومات کے ایجاد وابداع (یعنی از سرنو کسی چیز کو وجود میں لانے) میں منفرد ویکتا ہے۔ بلکہ پانی اصل معجزہ تھا۔ معجزہ اور حضور ﷺ کی دعا سے اس میں برکت حاصل ہوئی۔ (کذا قالو واللہ اعلم)۔

کم پانی کو زیادہ کرنا: اسی کے مشابہ اور اسی زمرہ میں کم پانی کو زیادہ کرنے اور اس کے جاری کرنے کا معجزہ ہے۔ یہ حضور ﷺ کی دعا اور برکت سے ہوتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے غزوۂ تبوک کے سلسلے میں مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا: تم انشاء اللہ طلوع آفتاب کے وقت چشمہ تبوک پر پہنچ جاؤ گے۔ تم میں سے جو بھی وہاں پہنچے پانی کو ہاتھ نہ لگائے جب تک میں وہاں نہ پہنچ جاؤں۔ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ جب ہم چشمہ پر پہنچے تو دو آدمی وہاں ہم سے پہلے پہنچے ہوئے تھے۔ اس چشمہ سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا پھر حضور نے ان دونوں سے دریافت فرمایا کیا تم نے پانی کو ہاتھ لگایا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں'' ! حضور نے انہیں ملامت فرمائی۔ اور فرمایا خدا جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ صحابہ نے اپنے ہاتھوں سے چشمہ کھودا کہ کچھ پانی اکٹھا ہو جائے۔ پھر اس پانی سے ایسی چیز نکلی جیسے تیز آندھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنا چہرۂ انور اور دونوں دستہائے مبارک دھوئے اور غسالہ شریف کا پانی اس چشمہ میں ڈال دیا جس سے چشمہ میں پانی بہت ہو گیا۔ اور لوگوں نے پانی پیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم اس جگہ میں عمارتوں اور باغوں کو دیکھو گے چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا۔ یہ خبر دینا بھی حضور ﷺ کے معجزات اور غیبی خبریں دینے میں ہے۔ اس قسم کے معجزات تو انگنت اور بے حد وشمار ہیں۔

قضیہ حدیبیہ میں آیا ہے کہ حضور سیّد عالم ﷺ چار سو صحابہ کے ساتھ حدیبیہ کے کنویں پر تشریف لائے۔ اس کنویں سے پچاس بکریوں کو بھی پانی نہیں پلایا جا سکتا تھا۔ صحابہ نے اس کنویں کا تمام پانی کھینچ لیا اس میں ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا۔ اس وقت حضور ﷺ اس کنویں کی ایک جانب تشریف فرما ہوئے۔ ڈول سے پانی نکالا گیا۔ اس سے وضو فرمایا اور اپنے دہن مبارک کا پانی اس میں ڈالا اور دعا فرمائی تو اسی وقت پانی جوش مارنے لگا۔ اور سطح آب بلند ہو گئی۔ پھر تمام صحابہ سیراب ہوئے اور اپنے اونٹوں کو بھی پلایا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا۔ اور کنویں میں تیر مارا تو پانی جوش مارنے لگا۔ یہاں تک کہ سب سیراب ہوئے۔

حدیث جابر میں بھی ایسا ہی گزرا ہے اور مقام حدیبیہ میں حضور ﷺ کی انگشت ہائے مبارک کے درمیان سے چشمہ آب کے جاری ہونے کی روایت بھی آئی ہے۔ اور ان دونوں قصوں کے درمیان مغائرت ہے۔ علماء دونوں قصوں کو ایک وقت کے ساتھ جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ حدیث جابر کا وقت وہ ہے جب کہ نماز کا وقت آیا تو حضور نے وضو فرمایا اور سب سیراب ہوئے اور ڈول کا بقیہ پانی کنویں میں ڈال دیا گیا جس سے اس کا پانی زیادہ ہو گیا اس طرح دونوں روایتوں کی تطبیق کرتے ہیں۔

حضرت ابوقتادہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ سیّد عالم ﷺ نے ہمیں ایک سفر میں اطلاع بخشی اور فرمایا کہ تم رات بھر چلو

گے اور کل صبح انشاء اللہ تعالیٰ تم پانی پر پہنچ جاؤ گے تو لوگ ادھر ادھر پانی کی جستجو میں بھٹکتے رہے۔ اور حضور ﷺ کی مصاحبت کا بھی خیال نہ رکھا۔ اور پانی کی تلاش میں آگے نکل گئے۔ جب رات کا پچھلا پہر آیا تو حضور ﷺ اپنا سر مبارک رکھ کر محوِ خواب ہو گئے۔ اور صحابہ سے فرمایا: نماز فجر کا خیال رکھنا' یعنی بیدار رہنا اور نماز فجر کے وقت کا انتظار کرنا۔ تاکہ نماز فجر کا وقت فوت نہ ہو جائے مگر وہ سب کے سب سو گئے۔ سب سے پہلے بیدار ہونے والے نبی کریم ﷺ تھے اس وقت جب کہ آفتاب آپ کی پشت مبارک پر دھوپ ڈال رہا تھا۔ آپ نے فرمایا: سوار ہو جاؤ۔ یہ شیطان کی جگہ ہے تو سب سوار ہوئے۔ یہاں تک کہ سورج خوب اونچا ہو گیا۔ اس کے بعد پڑاؤ کیا اور پانی کا چھاگل طلب فرمایا۔ یہ میرے پاس تھی۔ اس میں تھوڑا سا پانی تھا آپ نے وضو فرمایا اور باقی ماندہ پانی کی چھاگل مجھے عنایت فرما کر فرمایا اس کو محفوظ رکھنا اس سے ایک عظیم معجزہ رونما ہوگا۔ اس کے بعد حضرت بلال نے نماز کے لیے اذان دی۔ پھر فجر کی نماز ادا فرمائی اور سوار ہو کر چل دیے۔ جس وقت آفتاب کی گرمی تیز ہو گئی اور ہر چیز تپنے لگی تو ہم نے عرض کیا ''یارسول اللہ! ہم پیاس سے مرے جا رہے ہیں فرمایا'' تم پیاس سے ہلاک نہ ہو گے۔ پھر مجھ سے وہ چھاگل طلب فرمائی۔ اس کے دہانہ پر اپنا دہن مبارک رکھا۔ ہمیں معلوم نہیں آپ نے اس میں اپنا لعاب ڈالا یا پھونک ماری (واللہ اعلم) تو چھاگل سے پانی بہنے لگا اور مجھے پلانے کا حکم دیا۔ لوگ ہجوم کر کے آ گئے۔ فرمایا: ہجوم نہ کرو اطمینان رکھو سب کو پانی ملے گا۔ چنانچہ سب سیراب ہو گئے۔ اس قوت ہم تین سو آدمی تھے۔ اس کے بعد میں اور حضور دو ہی آدمی پانی کے پینے سے باقی رہ گئے تھے۔ حضور ﷺ نے پانی میری طرف بڑھا کر فرمایا: ''پیو'' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جب تک آپ نہ پئیں گے میں نہ پیوں گا۔ فرمایا: اِشْـرَبْ سَاقِیْ الْقَوْمِ اٰخِرُهُمْ شُرْبًا. پیو قوم کو پلانے والا آخر میں پیتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیا اور آخر میں حضور نے پیا۔

سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ''جیش عسرت'' کے ضمن میں مروی ہے کہ لوگوں کو پیاس نے اس حال پر پہنچا دیا کہ لوگ اپنا اونٹ ذبح کر کے اس کا اوجھ نچوڑ کر پینے لگے تھے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں دعا کی استدعا کی۔ حضور نے دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ابھی حضور نے اپنے دست ہائے مبارک کو واپس نہ کیا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ اور جس جس کے پاس برتن تھے پانی سے بھر گئے۔ کمال یہ ہے کہ اس بارش نے لشکر کے باہر تجاوز نہ کیا۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ اور حضرت ابوطالب ایک سواری پر سوار سفر کر رہے تھے ابوطالب نے عرض کیا اے بھتیجے مجھے سخت پیاس لگی ہے۔ اور میرے پاس پانی بھی نہیں ہے حضورِ اکرم ﷺ سواری سے نیچے اترے اور اپنا قدم مبارک زمین پر مارا۔ زمین سے پانی ابلنے لگا۔ فرمایا اے چچا لو پانی پیو۔

بخاری و مسلم میں حضرت عمرا بن حصین سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ لوگوں نے پیاس کی شکایت کی تو آپ نے ان سے فرمایا اور اپنے دو صحابیوں کو بلایا ان میں سے ایک حضرت علی ابن ابی طالب تھے۔ ان سے فرمایا: جاؤ پانی کو تلاش کرو۔ تمہیں ایک عورت ملے گی جس کے اونٹ پر پانی کی دو مشکیں ملیں گی۔ یہ دونوں تلاش میں نکلے اور اس عورت کو پا لیا جو پانی کی دو مشکیں لیے ہوئے تھی۔ یہ دونوں اس عورت کو مع پانی کے بارگاہ رسالت میں لے آئے۔ اور اس کے اونٹ سے مشکوں کو اتارا گیا اور حضور نے پانی کے برتن طلب فرمائے۔ اور پانی ان میں لوٹ دیا پھر لوگوں سے فرمایا: آؤ اور پانی پیو اور پلاؤ۔'' وہ عورت کھڑی دیکھ رہی تھی کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضور ﷺ نے اس عورت کا پانی لوٹایا اور میں نے خیال کیا کہ یہ پہلے سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اس عورت کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ لوگوں نے کھجوریں' آٹا اور ستو جمع کر کے اس کی چادر میں باندھ کر اونٹ پر رکھ دیا۔ اس کے بعد حضور نے اس عورت سے فرمایا: ''جاؤ۔ تم جانتی ہو

ہم نے تمہارا پانی کچھ کم نہیں کیا۔ لیکن خدا نے ہمیں اپنی قدرت سے پانی عطا فرمایا۔'' جب وہ عورت اپنے قبیلہ میں پہنچی تو لوگوں سے اس نے کہا میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ دو شخص مجھے اس شخص کے پاس لے گئے جسے وہ لوگ اپنا آقا کہتے تھے اس کے بعد اس نے تمام قصہ بیان کیا۔ اور کہا خدا کی قسم! یا تو وہ لوگوں میں سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ خدا کا سچا رسول ہے پھر اس نے کہا کیا تم میں سے کسی کو اسلام لانے کی تمنا ہے۔ (آخر حدیث تک جو کہ طویل ہے) کذا فی المواہب لدنیہ' اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ لوگوں نے اس عورت کا کہنا مانا اور اسلام لے آئے۔ (واللہ اعلم) اس ضمن میں احادیث بکثرت ہیں۔ احادیث استسقاء بھی اسی زمرہ سے تعلق رکھتی ہیں جن کا ذکر انشاء اللہ اپنے مقام میں آئے گا۔

معجزات وطعام وغیرہ: جس طرح کم پانی کے زیادہ کرنے میں احادیث مروی ہیں اسی طرح کم کھانے کو زیادہ فرمانے میں بھی مروی ہیں۔ یہ دونوں معجزے نبی کریم ﷺ کی تربیت اور مالک نعمت ہونے کے اثرات کو ظاہر کرتے ہیں جس طرح کہ روحانیت کے اعتبار سے آپ عالم جسمانیت میں قلوب وارواح کی تربیت فرماتے اور انہیں کامل بناتے ہیں۔ نیز آپ ہی پرورش فرمانے والے اور جسموں کو کھانا پینا وغیرہ عطا فرمانے والے ہیں۔ بیت

شکر فیض تو چمن چوں کند اے ابر بہار
کہ اگر خار و گر گل ہمہ پروردہ تست

حدیث جابر: اس خصوصیت میں حضرت جابر ؓ کی حدیث مشہور ہے۔ جسے غزوہ خندق کے ضمن میں بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے پاس آیا ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس کچھ کھانا ہے کیونکہ میں نے حضور ﷺ کے چہرے پر سخت بھوک کے آثار دیکھے ہیں تو میری بیوی نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع کے قریب جو تھے اور ایک فربہ بکری کا بچہ تھا۔ میں نے اسے ذبح کیا بیوی نے جو کا آٹا پیسا۔ گوشت بنا کر دیگچی میں چڑھا کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے ایک بکری کا بچہ ذبح کیا ہے اور میری بیوی نے جو کا آٹا پیسا ہے۔ حضور اپنے چند صحابیوں کو لے کر میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے با آواز بلند فرمایا۔ جابر نے کھانا تیار کیا ہے آؤ ان کے یہاں چلیں۔ (اس جگہ حضور نے بوقت اعلان لفظ ''سور'' بضم سین وسکون واو بمعنی طعام استعمال فرمایا یہ لفظ فارسی کا ہے جو کہ بے ساختہ حضور ﷺ کی زبان مبارک پر جاری ہوا۔) پھر حضور نے حضرت جابر سے فرمایا: میرے پہنچنے تک دیگچی کو چولہے سے نہ اتارنا اور گوندھے ہوئے آٹے کو یونہی رکھنا۔ پھر حضور ایک ہزار صحابہ کے ساتھ تشریف لائے۔ ہم آٹے اور دیگ کو حضور کے ملاحظہ میں لائے تو حضور نے اپنا لعاب دہن مبارک ان میں ڈالا۔ اور برکت کی دعا فرمائی اور میری بیوی سے فرمایا: روٹی پکاؤ اور کسی ایک اور عورت کو اپنے ساتھ ملا لو۔ اور دیگ سے گوشت نکالتے رہو' مگر میں جھانک کر نہ دیکھنا۔ وہ فرماتے ہیں خدا کی قسم ان ہزار آدمیوں نے شکم سیر ہو کر کھایا اور دیگ میں بدستور گوشت جوش مار رہا تھا اور آٹا بھی باقی تھا۔

حدیث انس: حضرت انس ؓ کی حدیث بھی بخاری ومسلم میں مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ابوطلحہ نے ام سلیم سے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے یا رسول اللہ ﷺ کی آواز میں سخت نقاہت محسوس کی ہے۔ بھوک نے آپ کو بہت نڈھال کر دیا ہے تو کیا کھانے کی کچھ چیز ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ام سلیم نے جو کی چند روٹیاں نکالیں۔ اور کپڑے میں لپیٹ کر مجھے دے دیں۔ میں انہیں لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس بہت سے آدمی جمع تھے۔ حضور نے دریافت فرمایا کیا تمہیں ابوطلحہ نے بھیجا ہے۔ میں نے عرض کیا ''ہاں! یا رسول اللہ!'' حضور نے اپنے صحابہ سے فرمایا: اٹھو چلو! اور حضور نے انہیں اپنے ہمراہ لے کر چل دئے۔ میں ان سے پہلے چل دیا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کی اطلاع ابوطلحہ کو دی کہ حضور تشریف لا رہے ہیں۔ اس پر

ابوطلحہ نے ام سلیم سے کہا ''اے ام سلیم رسول اللہ ﷺ جماعت صحابہ کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ اور ہمارے پاس ان چند روٹیوں کے سوا ان کے کھلانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے ان چند روٹیوں کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔'' ام سلیم نے کہا خدا اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔ یعنی جو کچھ کہ واقعتاً موجود ہے گویا رسول اللہ ﷺ کا ہمارے حال کے علم کے باوجود جماعت صحابہ کے ساتھ تشریف لانا حکمت کے بغیر نہیں ہے۔ یقیناً کوئی معجزہ ظاہر ہوگا۔ پھر ابوطلحہ، رسول اللہ ﷺ کے خیر مقدم اور استقبال کے لیے چل دیے۔ رسولِ خدا نے تشریف لا کر ام سلیم سے فرمایا: ''اے ام سلیم لاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہے ام سلیم نے وہی بھیجی ہوئی چند روٹیاں پیش کر دیں۔ آپ نے فرمایا: انہیں ریزہ ریزہ کر کے تھوڑا سا گھی ملا کر ملیدہ بنالو اور کسی برتن میں رکھ کر لے آؤ۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور دعائے برکت فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا: دس، دس کی ٹولیاں بنا کر کھاؤ یہاں تک کہ دس دس کی ٹولیاں آتیں اور خوب شکم سیر ہو کر چلی جاتیں۔ تقریباً ستر یا اسی (شک راوی ہے) مسلم کی ایک روایت میں بغیر شک راوی اسی آدمی آئے ہیں۔ سب کے بعد حضور نے اور ابوطلحہ کے گھر والوں نے باقی ماندہ ملیدہ کو کھایا۔ ایک روایت میں آٹھ آٹھ آدمیوں کی ٹولیاں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہوگا۔ اس لیے کہ بخاری و مسلم میں اکثر روایتیں دس دس کی ہیں۔ (وکذا فی المواہب واللہ اعلم)۔

اور ایک ایک ٹولی کر کے بلانے اور سب کو یکبارگی نہ بلانے کی حکمت میں علماء فرماتے ہیں کہ اگر سب کو یکبارگی بلایا جاتا تو ان کی نظریں کھانے پر پڑتیں اور اسے کم جانتیں اور گمان رکھتیں کہ یہ کافی نہ ہوگا تو ان کی یہ سوئے ظنی برکت کے جانے کا موجب بنتی۔ یا یہ وجہ ہے کہ جگہ تنگ ہوگی۔ سب کے بیٹھنے کی گنجائش نہ ہوگی۔ یا یہ کہ تھالی ایک ہوگی اور جماعت کثیر کی گنجائش دشوار ہوگی۔ اور گڑبڑ وازدحام کا اندیشہ ہوگا۔ (واللہ اعلم)۔

حدیث ابو ہریرہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ تبوک میں (جو رسول اللہ ﷺ کا آخری غزوہ تھا) جب لوگ بھوک سے بیتاب ہو گئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ لوگوں کو حکم فرمایئے کہ جو کچھ بچا کھچا کھانا ہے جمع کر کے لائیں اور حضور ان پر دعائے برکت فرمائیں'' فرمایا ہاں ٹھیک ہے میں دعا کروں گا۔ چنانچہ جب حضور نے اعلان فرمایا تو لوگ بچا کھچا توشہ لانے لگے کوئی ایک مٹھی ستو لایا کوئی روٹی کا ٹکڑا لایا ایک شخص تھا جو ایک صاع (تقریباً ساڑھے چار سیر) کھجوریں لایا۔ جب دستر خوان پر یہ تھوڑی چیزیں جمع ہو گئیں تو حضور نے برکت کی دعا فرمائی پھر حکم فرمایا کہ اپنے اپنے توشہ دانوں میں بھر لو تو لشکر اسلام کا کوئی فرد ایسا نہ رہا جس کا توشہ دان نہ بھر گیا ہو سب نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ پھر بھی دستر خوان پر کھانا بچ گیا۔ اس غزوہ تبوک میں لشکری (ایک روایت کے مطابق) ستر ہزار تھے۔ اور جب حضورِ اکرم ﷺ نے اس معجزے کا مشاہدہ فرمایا تو راوی کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً میں اللہ کا رسول ہوں۔'' فرمایا جو کوئی اس شہادت کے ساتھ حق تعالیٰ سے ملے گا یقیناً اس کا مسکن جنت ہوگا۔

بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق رحمتہ اللہ علیہ) ثبتہ اللہ فی مقام الصدق والیقین کہتا ہے کہ امت جو مشاہدہ معجزہ کے وقت شہادت دیتی ہے تو وہ نبی کے دعویٰ نبوت میں تصدیق ویقین حاصل ہونے کی وجہ سے ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کا اس مقام میں شہادت دینا کس عالم سے ہے یا تو یہ حضور وغیب کی حالت میں ہے چونکہ یہ دونوں حالتیں متفاوت وجداگانہ ہیں اس میں یقین وایمان کی زیادتی حاصل ہونے کی وجہ سے ہے یا یہ شہادت امت کو تنبیہہ و تلقین کے لیے ہے۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)۔

حدیث انس: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ام المومنین سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کے وقت حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ام سلیم نے ''حیس'' کا ایک بڑا پیالہ میرے ہاتھ بھیجا۔ حیس ایک خاص قسم کا کھانا ہے جسے کھجور، گھی اور ستو وغیرہ ملا کر بنایا جاتا ہے۔ ام

سلیم نے انس سے فرمایا: اے انس! اسے حضور ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ اور عرض کرو کہ یارسول اللہ یہ طعام میری والدہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا ہے اور سلام عرض کیا ہے اور حضور سے کم مقدار میں بھیجنے کی معذرت کرنا۔ حضرت انس اسے بارگاہ نبوی میں لائے آپ نے فرمایا رکھ دو۔ اور فرمایا فلاں فلاں لوگوں کی جماعت کو بلاؤ۔ اور نام بنام ارشاد فرمایا اور فرمایا راستہ میں جو بھی ملے اسے بھی بلاتے لاؤ چنانچہ میں نے ہر اس جماعت کو جس کا حضور نے نام بتایا تھا اور ہر اس شخص کو جو راستے میں ملا، بلاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ جب میں واپس آیا تو میں نے کاشانہ اقدس کو لوگوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ صحابہ نے حضرت انس سے پوچھا کتنے حضرات ہوں گے؟ بتایا کہ تقریباً تین ہزار ہوں گے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک کو اس حیس کے برتن کے اوپر رکھ کر کچھ پڑھا اس کے بعد دس دس ٹولیوں کو اپنے پاس بلا کر انہیں کھانے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ہر شخص بسم اللہ پڑھ کر اپنے آگے سے کھاتا جائے اسی طرح گروہ در گروہ لوگ آتے اور کھا کر چلے جاتے یہاں تک کہ سب کے سب شکم سیر ہو کر فارغ ہو گئے اس کے بعد فرمایا اے انس برتن اٹھا لاؤ۔ میں نے برتن اٹھایا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں حیس رکھتے وقت پہلے زیادہ تھا یا اب اٹھاتے وقت زیادہ تھا۔ اسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

حدیث ابوایوب انصاری: حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے سیّد عالم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے اتنا کھانا پکایا جتنا ان دونوں حضرات کے لیے کافی ہو۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے ابوایوب انصاری سے فرمایا: اشراف انصار میں سے تین آدمیوں کو بلا لاؤ، تو وہ بلا کر لائے انہیں کھلایا گیا مگر کھانا پھر بھی باقی رہا پھر ساٹھ آدمیوں کو بلایا گیا انہیں بھی کھانا کھلایا گیا لیکن کھانا پھر بھی باقی رہا۔ پھر ستر انصار کو طلب فرمایا۔ انہوں نے بھی آ کر کھانا کھایا اور کھانا باقی رہا۔ ان سب لوگوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اسلام لا کر اور بیعت کر کے نہ نکلا ہو۔ حضرت ابوایوب انصاری فرماتے ہیں کہ میرے اس کھانے کو ایک سو اسی آدمیوں نے کھایا تھا۔

حدیث سمرہ بن جندب: حضرت سمرہ بن جندب کی حدیث میں مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے خدا کی قسم! ہم نے یکے بعد دیگرے صبح سے شام تک لوگوں کو کھانا کھلایا۔ دس آدمی کھڑے ہوتے اور دس آدمی بیٹھتے اور کھاتے رہتے۔ کسی نے پوچھا یہ برکت کہاں سے آتی تھی انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں سے آتی ہے۔ اسے دارمی، ابن ابی شیبہ، ترمذی، حاکم، بیہقی اور ابونعیم نے روایت کیا۔

حدیث عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق: حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سو تیس افراد تھے۔ تقریباً ساڑھے چار سیر آٹا گوندھا گیا اور ایک بکری کا سالن تیار کیا گیا۔ پھر بکری کا جگر گردہ اور دل بھنا گیا۔ خدا کی قسم! ہم ایک سو تیس اشخاص میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے حضورِ اکرم ﷺ نے اس کا ٹکڑا عنایت نہ فرمایا۔ اس کے بعد اس بکری کے سالن کو دو بڑے برتنوں میں رکھا گیا اور سب نے خوب سیر ہو کر کھایا اور دونوں برتنوں میں جو باقی بچا اسے اپنے برتنوں میں بھر کر اونٹ پر لاد لیا۔

دیگر حدیث ابوہریرہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں اہل صفہ کو بلا کر لاؤں چنانچہ میں انہیں تلاش کر کے لایا۔ حضور کے سامنے ایک پیالہ کھانے کا رکھا ہوا تھا اسے ہم سب نے خوب سیر ہو کر کھایا جب ہم کھانے سے فارغ ہو گئے تو پیالہ ویسا ہی بھرا ہوا تھا جیسا کہ پہلے رکھا تھا بجز اس کے کہ اس میں انگلیوں کے نشان تھے، حدیث میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں بہت سخت بھوکا تھا حضور ﷺ کے سامنے پیالہ دودھ کا رکھا ہوا تھا۔ آپ نے ''اصحاب صفہ'' کو بلانے کا حکم فرمایا اس وقت میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ دودھ تو بہت کم ہے کاش مجھے عنایت فرما دیتے تو میں سیر ہو کر پی لیتا۔ لیکن اب شارع علیہ السلام

کے فرمان اور آپ کے حکم کی بجا آوری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تو میں حضور کے حکم سے باہر آیا اور اصحاب صفہ کو بلا کر لے گیا۔ ان سب نے پیا اور بجز میرے اور حضور علیہ السلام کے کوئی باقی نہ رہا۔ پھر پیالہ مجھے عنایت فرمایا۔ سب کے بعد حضور نے پیا اور فرمایا ساقی القوم اخرھم قوم کا ساقی ان کے آخر میں پیتا ہے۔

حدیث علی مرتضیٰ: حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت عبدالمطلب کی اولاد کو جمع فرمایا یہ چالیس افراد تھے اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو سالم ایک ایک بکرا چٹ کر جاتے تھے اور اس کا شوربہ تک پی جاتے تھے مگر حضور ﷺ نے ان کے لیے صرف ایک برتن کھانے کا تیار کرایا تو ان سب نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور کھانا اتنا ہی باقی رہا جتنا پہلے تھا۔ پھر ایک پیالہ پانی کا طلب فرمایا ان سب نے پیا اور سیراب ہو گئے۔ لیکن پیالہ میں پانی جوں کا توں رہا۔ اسے الشفاء نے بیان کیا ہے۔

حدیث جابر: حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ ام مالک انصاریہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک کپی گھی بھیجا کرتی تھیں او وہ اس کپی کو ہمیشہ گھی سے بھرا ہو پاتی تھیں۔ ایک روز ام مالک کے فرزندوں نے سالن مانگا گھر میں سالن کی قسم سے کچھ نہ تھا تو وہ اس کپی کی طرف گئیں جس میں حضور کو گھی بھیجا کرتی تھیں اور اس میں ہمیشہ گھی ملا کرتا تھا تو انہوں نے اس کپی سے تمام گھی نچوڑ لیا۔ (اس کے بعد اس میں گھی نہ ملا) پھر ام مالک نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال بیان کی۔ حضور نے فرمایا تم نے اس کپی کو نچوڑ لیا اگر تم اسے نہ نچوڑتیں تو تم اس سے ہمیشہ گھی نکالتی رہتیں۔"

افادہ: بندۂ مسکین (یعنی شیخ محقق رحمۃ اللہ) فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سید المرسلین ﷺ کی جو بھی خدمت بجالائے اور آپ کی محبت میں جو کچھ بھی کچھ خرچ کرے اللہ تعالیٰ اپنے دیے ہوئے رزق میں برکت دیتا ہے۔

دیگر حدیث جابر: حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے حضورِ اکرم ﷺ سے کچھ کھانا مانگا۔ حضور نے اسے ساٹھ صاع جو عنایت فرمادئے بعد میں وہ شخص ہمیشہ اپنے بیوی' بچوں اور مہمانوں کے ساتھ اسے کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک دن اسنے اسے ناپ لیا (تو وہ ختم ہو گیا) پھر اس نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا فرمایا اگر تم اسے نہ ناپتے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ تمہارے لیے باقی رہتا اور تم اسے کھاتے رہتے۔

افادہ: اہل علم بیان کرتے ہیں کہ کپی سے گھی نچوڑنے اور جو کے ناپنے سے جو برکت جاتی رہی ہے اس کی حکمت یہ ہے کہ نچوڑنا اور ناپنا' اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ رکھنے کے خلاف اور متضمن تدبیر و اخذ بحول وقوت ہے۔ چنانچہ اس کے فاعل کو ردال نعمت کے ساتھ سزا دی گئی۔ اسے امام نووی نے بیان فرمایا ہے اور اسی کی مانند وہ نکتہ ہے۔ جس میں دیگ اور آٹے میں نظر نہ ڈالنے کی ممانعت ہے۔ جو تکثیر طعام کی حدیث میں گزر چکی ہے۔ (واللہ اعلم بالاسرار والحکم)۔

اس سلسلہ میں وہ حدیث بھی مشہور ہے جسے بخاری نے حضرت جابر ؓ کے والد حضرت عبداللہ انصاری کے قرضہ کی ادائیگی کے سلسلے میں روایت کی ہے کہ قرض خواہوں نے اصل رقم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور کوئی عذر تسلیم نہ کیا۔ کیونکہ ان کے کھجوروں کے باغ میں اتنی کھجوریں نہ تھیں جن سے ان کی اصل رقم ادا ہو سکتی۔ اس وقت حضرت جابر ؓ نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! آپ خوب جانتے ہیں کہ میرے والد روز احد شہید ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے بہت قرضہ چھوڑا ہے۔ میری خواہش ہے کہ حضور کے ملاحظہ میں کھجوریں لائی جائیں لیکن وہ اتنی مقدار میں نہیں ہیں جس سے بار قرض اتارا جا سکے۔) حضور نے فرمایا "جاؤ کھجوروں کی ڈھریوں کو علیحدہ علیحدہ ایک گوشے میں اکٹھا کر لو۔" چنانچہ جیسا کہ فرمان تھا اس کے مطابق میں نے کیا۔ پھر میں حضور کو لے کر چلا۔ جب

قرض خواہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو میرے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ جب حضور نے ان کو دیکھا تو آپ نے کھجوروں کی ڈھیریوں کے چاروں طرف چکر لگایا اور سب سے بڑی ڈھیری کے پاس بیٹھ گئے اور فرمایا ''اپنے قرض خواہوں کو بلاؤ۔'' پھر حضور نے ان کو ناپ ناپ کر دینا شروع فرمایا یہاں تک کہ میرے والد مرحوم کا بار قرض اتر گیا اور میں خوش تھا کہ میرے والد کی امانت ادا کر دی جائے خواہ میری بہنوں کے لیے کوئی چیز باقی نہ رہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی نو بہنیں تھیں۔ جن کو ان کے والد ماجد نے چھوڑا تھا۔ حضور نے اس بڑے ڈھیر ہی سے سب کا مطالبہ پورا فرما دیا۔ اور باقی تمام ڈھیریاں یوں ہی رہ گئیں۔ اور میں نے جب اس بڑے ڈھیر پر نظر ڈالی جس پر رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے تو وہ بھی جوں کا توں تھی۔ اس میں سے ایک کھجور بھی کم نہیں معلوم دیتی تھی۔ اس وقت تمام قرض خواہ بھی تعجب کرنے لگے۔

دیگر حدیث ابو ہریرہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ سخت بھوک میں مبتلا تھے۔ حضور ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا اے ابو ہریرہ تمہارے پاس کچھ ہے عرض کیا ''ہاں'' یا رسول اللہ! توشہ دان میں کچھ کھجوریں ہیں فرمایا انہیں میرے پاس لے آؤ۔ پھر حضور نے اپنا دست مبارک توشہ دان میں ڈالا اور ایک مٹھی کھجوریں نکال کر برکت کی دعا مانگی۔ پھر دس دس آدمیوں کو بلایا یہاں تک کہ تمام لشکر سیر ہو گیا۔ اس کے بعد حضور نے مجھ سے فرمایا: ''جو کچھ تم لائے تھے اسے لے جاؤ اور حفاظت سے رکھ لو جب تمہیں ضرورت ہو اس توشہ دان میں اپنا ہاتھ ڈال کر نکال لیا کرنا۔ نہ کبھی اسے شمار کرنا نہ کبھی توشہ دان کو الٹ کر جھاڑنا۔'' تو میں نے جتنا لایا تھا اس سے زیادہ پایا۔ اس کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کی تمام مدت حیات اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک کھایا اور کھلاتا رہا۔ پھر جب حضرت عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے اور میرے گھر کو لوٹا گیا تو وہ توشہ دان مجھ سے جاتا رہا۔ ایک اور روایت میں آیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کتنے ہی وسق اس سے کھجوریں نکال کر راہ خدا میں تقسیم کی ہیں یا اونٹ پر لاد کر دی ہیں۔ خیال رہے کہ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ اور ایک صاع ساڑھے چار سیر کا۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ توشہ دان میں کل کھجوریں دس دانوں سے زیادہ نہ تھیں اور بعض کہتے ہیں کہ اکیس دانوں سے زیادہ نہ تھیں۔ (واللہ اعلم)

روضۃ الاحباب میں اس ضمن میں ایک بیت بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے۔

لِلنَّاسِ هَمٌّ وَلِیْ فِی الْیَوْمِ هَمَّانِ   هَمُّ الْجِرَابِ وَهَمّ الشَّیْخَ عُثْمَانَ   (واللہ اعلم)

مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اونٹوں پر کھجوریں بار کرنے کا حکم فرمایا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر میں کھجوروں سے چار سو اونٹوں کو بار کر دیا اور وہ کھجوریں یوں ہی رہیں گویا ان میں سے ایک دانہ کم نہ معلوم ہوتا تھا۔

غرضیکہ تکثیر طعام کے سلسلے میں بکثرت حدیثیں ہیں۔ ان میں بالاتر غزوہ تبوک کی حکایت ہے کہ بچے کھچے کمتر زاد راہ کو ایسی برکت عطا فرمائی کہ ستر ہزار لشکری اس سے نہ صرف شکم سیر ہوئے بلکہ اپنے اپنے برتنوں کو میں بھی محفوظ کر لیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی سید کائنات فخر موجودات علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل التحیات کی برکتوں سے محروم نہ رکھے اور فقر وفاقہ کو حضور ﷺ کی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے متبدل فرما دے۔ (آمین) اس وقت مجھے وہ حکایت یاد آ گئی کہ مکہ مکرمہ زادہا اللہ تعظیماً وتکریماً کے بازار میں ایک لکڑی فروش اپنی لکڑیوں پر پانی چھڑکتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا:

یَا بَرکة النبی تعالٰی وانزلی ثم تر تحلی اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ.

حیوانات کا کلام اور اطاعت بجالانا

جس طرح انسان پر حضورِ اکرم سیّد عالم ﷺ کے احکام اور آپ کے دین و شریعت کی اطاعت' فرمانبرداری اور امتثال امر واجب وفرض ہے اسی طرح جانوروں کو بھی حضور کا مطیع وفرماں بردار کیا ہے۔ کیونکہ سعادت مندی کا طغرہ انسانوں میں سے اہل ایمان کو حاصل ہوا۔ اسی طرح حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے بطریق اعجاز وخرق عادات' تمام حیوانات کو آپ کا مطیع ومنقاد بنایا۔ اسی بنا پر ارباب تحقیق واہل باطن فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی رسالت تمام حیوانات' نباتات' جمادات اور ساری مخلوق کی طرف ہے لیکن چونکہ وہ دائرہ عقل اور امر ونہی کی تکلیف سے خارج ہیں اس لیے ان سے بجز طاعت وایمان اور صدق رسالت کی شہادت کے کچھ اور مقصود نہیں اور وہ معصیت سے موسوم نہیں ہوتے۔ جس طرح کہ آدمی ہوتے ہیں۔

کلام حیوانات: اب رہا حیوانات میں معجزات کا ظہور! تو ان میں سے ایک تو اونٹوں کا سجدہ کرنا اور حضور ﷺ کی بارگار میں اپنی شکایتیں پیش کرنا ہے۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک ؓ سے مروی ہے کہ ہر ایک اہل بیت انصار اونٹوں کو پالتے تھے ان میں سے ایک نے سیّد عالم ﷺ کی بارگاہ میں آ کر عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارا ایک اونٹ ہے جس پر ہم پانی لاد کر لاتے ہیں اب وہ سرکشی وسختی کرنے لگا ہے۔ اور وہ اپنی پشت پر بوجھ لادنے سے ہمیں منع کرتا ہے۔ ہمارے نخلستان اور باغات سب پیاسے ہیں۔ اس پر حضورِ اکرم ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ اٹھے اور اونٹ کی جانب تشریف لے چلے۔ جب باغ میں پہنچے اور کھڑے ہوئے تو اونٹ اس کے ایک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ انصار عرض کرنے لگے یا رسول اللہ یہ ہے وہ اونٹ جو کتوں کی مانند کاٹتا ہے ہمیں ڈر ہے کہ کہیں حضور کی ذات ستودہ صفات کو بھی یہ گزند نہ پہنچائے۔ فرمایا میرا کوئی خوف نہ کرو۔ پھر جب حضور ﷺ اونٹ کے سامنے آئے تو اس نے اپنا سر اٹھایا دیکھتے ہی سر کو آپ کے آگے سجدہ میں رکھ دیا۔ پھر حضور نے اونٹ کی پیشانی کے بال پکڑے اور اسے کام میں لگا دیا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ حیوان لایعقل یعنی بے سمجھ جانور ہے جب یہ آپ کو سجدہ کرتا ہے تو ہم تو زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کسی بشر کو یہ نہ چاہیے اور نہ یہ اسے سزاوار ہے کہ دوسرے بشر کو سجدہ کرے۔ اگر جائز ہوتا کہ ایک بشر دوسرے بشر کو سجدہ کرے تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کے عظیم حقوق کی بنا پر اسے سجدہ کریں اسے امام احمد ونسائی نے روایت کیا ہے۔ اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس مقام میں حضور ﷺ نے فرمایا آسمان وزمین میں کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جو یہ نہ جانتی ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ بجز نافرمان جنات وانسان کے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ وہ لوگ اس اونٹ کو ذبح کرنا چاہتے تھے تو اونٹ نے حضورِ اکرم ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اونٹ نے حاضر ہو کر اپنی گردن کو حضور کے سامنے رکھ دی اور اپنی آواز میں فریاد کرنے لگا اس کے بعد حضور نے اس کے سر کے بال پکڑ کے اٹھایا اور اس کے مالک سے فرمایا: اس اونٹ کو میرے ہاتھ فروخت کر دو اس نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے لیکن یہ اونٹ گھر والوں کے لیے ہے ان کے لیے اس کے سوا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے فرمایا یہ اونٹ کام کی زیادتی اور چارہ کی کمی کی شکایت کرتا ہے۔ تم اس کے ساتھ نرمی برتو اور اس کے حقوق کا خیال رکھو۔ یہ حدیث بطریق متعددہ بالفاظ مختلفہ مروی ہے اور صحیح ہے۔

حضرت انس ؓ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا علیہ التحیۃ والثناء حضرت ابوبکر وعمر ؓ کے ساتھ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے وہاں ایک بکری تھی۔ اس نے حضور کو سجدہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم زیادہ سزاوار ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ فرمایا ''کسی بشر کو زیبا نہیں کہ وہ دوسرے بشر کو سجدہ کرے (آخر حدیث تک)

ایک مرتبہ ایک اونٹ نے نبی کریم ﷺ کے حضور آ کر اپنی قوم کی شکایت کی کہ وہ نماز عشا پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ حق تعالیٰ ان پر عذاب نازل کرے حضور نے اس قوم کو بلایا اور انہیں نماز عشا سے پہلے سو جانے کی ممانعت فرمائی۔

سیّدہ عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں کہ ہمارے گھر میں ایک بکری تھی جب حضورِ انور ﷺ ہمارے یہاں خواب استراحت فرماتے تو وہ بکری خاموش پرسکون اور آرام وچین سے رہتی اور حضور باہر تشریف لے جاتے تو وہ بکری، پریشان و بے قرار اور متوحش بن کر ادھر ادھر ماری ماری پھرتی۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضورِ انور ﷺ جب اونٹوں کی قربانی فرماتے تو ہر اونٹ ایک دوسرے کو ہٹا کر حضور کے قریب آنے کی کوشش کرتا تاکہ حضور پہلے اسے ذبح فرمائیں۔

مروی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنا دست مبارک ام معبد کی بکری کے تھنوں پر پھیرا جن کا دودھ خشک ہو گیا تھا وہ اسی وقت دودھ سے لبریز ہو گئے۔ آپ نے انہیں دوھ کر خود بھی پیا اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو بھی پلایا۔ ام معبد کی اس بکری کا مشہور قصہ انشاء اللہ باب ہجرت میں تفصیل سے آئے گا۔ اس قسم کی چند حدیثیں تکثیر طعام میں بھی ذکر کی گئیں ہیں اور حیوانات کی اطاعت وفرمانبرداری میں بھی مذکور ہیں۔

کلام گرگ: اسی ضمن میں بھیڑیئے کا کلام کرنا اور حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت پر شہادت دینے کا واقعہ بھی ہے۔ بھیڑیئے کے کلام کرنے کی حدیث کو جماعت صحابہ نے بطریق متعددہ روایت کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد رحمۃ اللہ حضرت ابوسعید خدری ؓ سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک بھیڑیا ایک بکری پر جھپٹا اور بکری کو اپنے چنگل میں لے لیا لیکن چرواہے نے دوڑ کر بکری کو اس کے چنگل سے چھڑا لیا۔ اس کے بعد درندوں کی عام عادت کے مطابق بھیڑیا اپنی دم پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا ''چرواہے تو خدا سے نہیں ڈرتا کہ تو میرے اس رزق کو چھینتا ہے جسے خدا نے میرے قبضہ میں دیا تھا'' چرواہے نے کہا ''سبحان اللہ تعجب ہے کہ بھیڑیا آدمیوں کی مانند بات کرتا ہے۔'' اس پر بھیڑیئے نے کہا کیا تجھے اس سے تعجب خیز بات بتاؤں کہ محمد ﷺ مدینہ منورہ میں لوگوں کو گزری ہوئی باتوں اور خبروں کی اطلاع دے رہے ہیں۔ اور لوگ ہیں کہ آپ پر ایمان نہیں لاتے۔'' پھر تو چرواہا ان بکریوں کو ایک گوشے میں اکٹھا کر کے چھوڑ کر چل دیا۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں نبی کریم علیہ الصوۃ والتسلیم کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور حضور کو تمام احوال سنایا اس پر حضور نے لوگوں کو بلانے کے لیے اعلان عام کا حکم دیا۔ جب لوگ جمع ہوئے تو حضور نے چرواہے سے فرمایا کہ جو کچھ تم نے سنا اور دیکھا ہے انہیں بتاؤ۔ اسی طرح بیہقی نے سیّدنا ابن عمر ؓ سے اور ابونعیم نے حضرت انس ؓ سے روایت کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ ؓ کی روایت بسند صحیح میں مذکور ہے کہ بھیڑیئے نے کہا اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ایک شخص حرمین کے درمیان کھجوروں کے باغوں میں گزشتہ اور آئندہ کے حالات بتا رہا ہے۔'' یہ چرواہا یہودی تھا۔ تو وہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا اور ایمان لے آیا۔ بعض اسناد میں حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ بھیڑیئے نے چرواہے سے کہا کہ میرے مقابلے میں تیرا حال عجیب تر ہے کہ تو اپنی بکریوں کے ریوڑ پر کھڑا ہے اور ایسے برگزیدہ نبی کو چھوڑے ہوئے ہے جن سے بلند تر اور عظیم المرتبت کوئی نبی حق تعالیٰ نے مبعوث نہیں فرمایا۔ بلاشبہ ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دئے گئے ہیں۔ اور اہل جنت اور اس کے اصحاب مشرف ہو چکے ہیں۔ اور وہ ان کے شہداء کے منتظر ہیں۔ مطلب یہ کہ جنت کے حور وغلمان اور فرشتے حضور کے اصحاب کا استقبال کریں گے اور وہ منتظر ومشتاق ہیں کہ کب وہ مقتول وشہید ہو کر جنت میں داخل ہوں گے اس کے بعد بھیڑیئے نے چرواہے سے کہا تیرے اور ان کے درمیان بجز اس تودہ پہاڑ کے کچھ حائل نہیں۔ تو پہاڑ سے حضرت کی بارگاہ میں جا اور اپنے آپ کو خدا کے لشکروں میں شامل کر۔ چرواہے نے کہا پھر بکریاں کون چرائے

گا۔ بھیڑیئے نے کہا میں اس کی نگہداشت کروں گا۔ تو وہ بارگاہِ نبوی میں آیا اور اسلام لایا اور ان میں سے ایک بکری اس نے بھیڑیئے کے لیے ذبح کر دی۔

اسی کے مشابہ حضرت ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ سے بھی ایک روایت ہے کہ ایک بھیڑیا ایک ہرن کا پیچھا کر رہا تھا۔ جب ہرن حدودِ حرم میں داخل ہو گیا تو بھیڑیا لوٹ گیا لوگ اس پر تعجب کرنے لگے۔ اس پر بھیڑیا نے کہا اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں محمد بن عبداللہ ﷺ تم کو جنت کی طرف بلاتے ہیں اور تم لوگوں کو جہنم کی طرف کھینچتے ہو؟ اس پر ابوسفیان نے صفوان سے کہا قسم ہے لات و عزیٰ کی اگر تم اس کا تذکرہ مکہ مکرمہ میں کر دو تو مکہ کی عورتیں بغیر مردوں کے زندگی گزاریں اور ابوجہل اور اس کے ساتھیوں سے بھی اسی کی مانند لوگ حکایت کرتے ہیں۔

اسی قبیل سے ضب یعنی سوسمار (گوہ) کی حدیث ہے کہ اس نے کلام کیا اور حدیث مشہور ہے جسے بیہقی نے احادیث کثیرہ میں روایت کیا ہے اور قاضی عیاض نے کتاب الشفاء میں حضرت عمر ؓ سے بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ اپنے صحابہ کرام کی محفل میں تشریف فرما تھے کہ اچانک بنی سلیم کا ایک بدوی گوہ کا شکار کر کے لایا اسے اس نے اپنی آستین میں اسی لیے چھپا رکھا تھا کہ وہ اسے اپنی قیام گاہ میں لے جا کر بھون کر کھائے گا۔ جب اس بدوی نے ایک جماعت کو بیٹھے دیکھا تو کہنے لگا جماعت درمیان میں یہ کون شخص ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا یہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس نے گوہ کو اپنی آستین سے نکالا اور کہنے لگا قسم ہے لات و عزیٰ کی میں اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لاؤں گا جب تک یہ گوہ آپ کی شہادت نہ دے یہ کہہ کر گوہ کو حضور کے سامنے ڈال دیا۔ حضور نے گوہ کو آواز دی اے گوہ! گوہ نے سنجیدہ زبان میں جواب دیا ''لبیك وسعديك۔'' حاضر ہوں' فرماں بردار ہوں'' جسے ساری جماعت نے سنا۔ پھر فرمایا اے گوہ! قیامت میں کون آئے گا؟ گوہ نے جواب دیا ساری مخلوق آئے گی۔ پھر پوچھا تو کس کی عبادت کرتی ہے۔ گوہ نے جواب دیا اس خدائے پاک کی جس کا عرش آسمان میں ہے اور جس کی سلطنت زمین میں ہے اور جس کا دریاؤں پر غلبہ ہے۔ اور جنت میں اس کی رحمت ہے اور جہنم میں اس کا عذاب ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے جواب دیا آپ رسول اللہ' رسول رب العالمین اور خاتم النبیین ہیں: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ صَدَّقَكَ وَخَابَ مَنْ كَذَّبَكَ یقیناً وہ کامیاب ہے جس نے آپ کی تصدیق کی اور وہ نامراد ہے جس نے آپ کی تکذیب کی۔ یہ سن کر وہ بدوی اسلام لے آیا۔

کلام آہو: اسی باب سے حدیث غزالہ ہے جسے ائمہ حدیث متعدد طریقوں اور سندوں سے روایت کر کے ایک کو دوسرے سے قوی بناتے ہیں۔ قاضی عیاض نے الشفاء میں اور ابونعیم نے دلائل میں ام سلیم سے روایت کیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ صحرا میں گشت فرما رہے تھے کہ اچانک تین مرتبہ ''یا رسول اللہ'' کی آواز سماعت فرمائی۔ حضور اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے دیکھا ہرنی بندھی ہوئی پڑی ہے اور ایک بدوی چادر اوڑھے لیٹا ہے۔ آپ نے ہرنی سے دریافت فرمایا ''بتا کیا حاجت ہے؟'' ہرنی نے کہا مجھے اس بدوی نے شکار کر کے باندھ رکھا ہے۔ میرے دو بچے اس پہاڑ کی کھو میں ہیں اگر آپ مجھے آزاد کر دیں تو میں اپنے بچوں کو دودھ پلا کر آ جاؤں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تو ایسا کرے گی اور لوٹ آئیگی۔ ہرنی نے کہا اگر میں لوٹ کر نہ آؤں تو خدا مجھے وہ عذاب دے جو محصول لینے والوں پر عذاب کرتا ہے۔'' اس پر حضور نے رہا کر دیا اور وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آئی اور حضور ﷺ نے اسے باندھ دیا۔ جب بدوی بیدار ہوا تو کہنے لگا یا رسول اللہ کوئی خواہش ہے؟ فرمایا خواہش یہ ہے کہ تو اس ہرنی کو رہا کر دے تو اس بدوی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ خوش خوش جنگل میں دوڑتی اور چوکڑیاں بھرتی چلی گئی وہ کہتی جاتی تھی ''وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ.''

مروی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ ایک لشکر میں جلوہ افروز تھے۔ لشکر کے تمام آدمی پیاسے تھے وہ پانی کی جگہ اترے اس وقت ایک ہرنی حضور کے قریب آئی آپ نے اس کا دودھ دوہا۔ اور تمام لشکر کو سیراب فرمایا یہ لشکری تقریباً تین سو تھے۔ اور حضرت رافع سے جو حضور کے غلام تھے فرمایا اس ہرنی کی نگہداشت کرو اس نے اسے باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو وہ بھاگ گئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اِنَّ الَّـذِیْ جَآءَ بِهَا وَهُوَ الَّذِیْ ذَهَبَ بِهَا. جو اسے لایا تھا وہی اسے لے گیا۔

کلام حمار: انہیں میں سے حمار یعنی گدھے کا کلام کرنا ہے۔ اسے ابن عساکر نے روایت کیا ہے کہ جب حضورِ اکرم ﷺ نے خیبر فتح کیا تو ایک گدھے نے حضور سے باتیں کیں۔ حضور نے گدھے سے پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا میرا نام یزید بن شہاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری جد کی نسل سے ساٹھ ایسے گدھے پیدا فرمائے ہیں جس پر بجز نبی کے کسی نے سواری نہیں کی ہے اور میں یہ تمنا رکھتا ہوں کہ حضور ﷺ کی سواری کا شرف حاصل کروں۔ میرے جد کی نسل میں میرے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے اور آپ کے سوا کوئی نبی بھی اب آنے والا نہیں ہے۔ اس نے کہا آپ سے پہلے میں ایک یہودی کے قبضہ میں تھا۔ جب وہ مجھ پر سواری کا ارادہ کرتا تو میں قصداً اچھل کود کر اسے گرا دیتا اور اسے اپنے پر سوار نہ ہونے دیتا۔ وہ یہودی غصے میں مجھے بھوکا رکھتا تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے اس سے فرمایا: آئندہ تیرا نام ''یَعْفُوْر'' ہوگا۔ یہ یَعْفُوْر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ حضورِ اکرم ﷺ جب اسے کسی کو بلانے بھیجتے تو وہ اس کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے سر سے دروازے کو کوٹتا جب مالک مکان باہر آتا تو وہ اشارہ کرتا کہ رسول اللہ ﷺ نے تجھے بلایا ہے اور وہ اسے لے کر آ جاتا۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی تو یَعْفُوْر نے رنج والم اور فراق وجدائی کے غم میں ابوالسہم بن السہان کے کنوئیں میں چھلانگ لگا کو خود کو مار ڈالا۔

تسخیر شیر: اور اسی باب سے شیر کا مسخر ہونا اور حضرت سفینہ ؓ کا اس کی چاپلوسی کرنا ہے۔ جب کہ حضرت سفینہ لشکر سے دور ہو کر راہ بھٹک گئے تھے۔ اور انہوں نے شیر سے کہا تھا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا غلام ہوں مجھے راہ بتاؤ تو شیر نے ان کو لشکر تک پہنچا دیا تھا۔

ابن وہب روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ پر جن کبوتروں نے مکہ معظّمہ پر سایہ کیا تھا پھر حضور نے ان کے لیے برکت کی دعا فرمائی۔ اسی طرح غار ثور میں ہجرت کے وقت مکڑی کا جالا بننے اور ان پر کبوترون کا انڈے دینے کا واقعہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ غار ثور میں جن کبوتروں نے انڈے دئے تھے اسی کی نسل سے حرم کے کبوتر ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک چھوٹے سے درخت کو حکم دیا کہ وہ بقدر آدمی بلند ہو کر غار کو چھپا لے اسے قاضی عیاض رحمۃ اللہ نے الشفاء میں بیان کیا اور فرماتے ہیں کہ کلام حیوانات اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری میں حدیثیں بکثرت ہیں۔ ان میں سے جو مشہور تھیں اور ائمہ نے ان کا کتابوں میں ذکر کیا تھا۔ ہم نے بھی انھیں کا ذکر کر دیا۔

اطاعت نباتات

وصل: جس طرح تمام حیوانات، رسول اللہ ﷺ کے مطیع ومنقاد تھے اسی طرح آپ کی فرماں برداری وطاعت میں نباتات بھی ہیں۔ اس باب میں حضور ﷺ سے درختوں کا کلام کرنا۔ آپ پر سلام عرض کرنا، آپ کی رسالت کی گواہی دینا اور آپ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے۔

ام المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب سے میری طرف وحی بھیجی گئی اس وقت سے ہر شجر وحجر مجھ پر السلام علیک یارسول اللہ عرض کرتا ہے۔

مولائے کائنات سیّدنا علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ' فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ کے بعض اطراف میں چلے' راہ میں جو بھی درخت یا پہاڑ ملتا وہ کہتا ''السلام علیك یارسول اللہ'' اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یہ روایتیں وہ ہیں جو آپ کے ابتدائے عہد کی ہیں۔ جیسا کہ پہلی حدیث میں گزرا یا یہ کسی اور زمانے کی ہیں۔ (واللہ اعلم)

حاکم نے مستدرک میں باسناد جید سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ ایک بدوی سامنے آیا جب وہ حضور ﷺ کے قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا اپنے اہل وعیال کی طرف۔ فرمایا کیا تجھے بھلائی کی رغبت ہے۔ یعنی تو چاہتا ہے کہ نیکی وسعادت اپنے لیے حاصل کرے اس نے پوچھا وہ کیا ہے۔ فرمایا: گواہی دینا اس کی کہ: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ بدوی نے کہا کیا آپ اس پر کوئی شہادت رکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جو کچھ فرمایا کوئی اس کا گواہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ یہ درخت میرا گواہ ہے۔ پھر حضور نے اس درخت کو بلایا جو وادی کے کنارے پر تھا۔ وہ درخت زمین کو چیرتا ہوا حضور کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر آپ نے اس سے تین مرتبہ شہادت لی اور اس درخت نے گواہی دی۔ اس کے بعد وہ درخت اپنی جگہ پلٹ گیا۔ (آخر حدیث تک) دارمی بھی اسی کی مانند روایت کرتے ہیں۔

غزوہ احد کی لڑائی میں بدنہار کافروں نے رسول اللہ ﷺ کے رخسار مبارک کو گزند پہنچایا اور آپ کے دندان مبارک کو ضرر پہنچایا اور جسم اطہر خون آلود ہو گیا۔ اس وقت حضور ﷺ ایک گوشہ میں تشریف فرما ہو گئے۔ جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر مزاج پرسی کی۔ جبریل نے آپ کو غمگین پا کر عرض کیا۔ کیا پسند فرمائیں گے کہ میں آپ کو ایک ایسی نشانی دکھاؤں جس سے حضور کو تسلی خاطر ہو۔ اس کے بعد جبریل نے اس درخت پر نظر ڈالی جو وادی کے پیچھے تھا۔ اور عرض کیا حضور اس درخت کو بلائیں چنانچہ حضور نے اس درخت کو بلایا تو وہ چلتا ہوا آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جبریل نے عرض کیا اب اسے اپنی جگہ لوٹ جانے کا حکم دیں آپ نے حکم دیا تو وہ لوٹ گیا اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حسبی' حسبی' مجھے کافی ہے۔ اسے دارمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

حضرت بریدہ اسلمی سے مروی ہے کہ ایک بدوی نے رسول اللہ ﷺ سے معجزہ مانگا تو حضور نے بدوی سے فرمایا: اس درخت سے کہو کہ رسول اللہ تجھے بلاتے ہیں اس درخت نے ادھر ادھر اور آگے پیچھے جنبش کی اور زمین سے اپنی پھیلی جڑوں کو نکالا اور پھر زمین کو چیرتا ہوا اور جڑوں کو گھسیٹتا ہوا حضور کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا السلام علیک یا رسول اللہ! پھر بدوی نے کہا اب درخت کو اپنی جگہ واپس ہونے کا حکم دیجئے تو وہ لوٹ کر اپنی جگہ چلا گیا۔ اس کے رگ وریشے زمین میں پیوست ہو گئے اور زمین ہموار ہو گئی۔ اس کے بعد بدوی نے عرض کیا مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کو سجدہ کروں۔ حضور نے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر اس نے عرض کیا تو مجھے دست مبارک اور قدم شریف کے بوسہ لینے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ حضور نے اس کی اجازت دے دی۔

منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں ایک اونٹ پر سوار تاریک رات میں محو خواب تشریف لیے جا رہے تھے کہ سواری کے آگے بیری کا درخت آ گیا وہ فوراً دو ٹکڑے ہو گیا اور حضور کو سلامتی کے ساتھ گذرنے کی راہ چھوڑ دی۔ اس بنا پر اس واقعہ سے مستفاد اس بیری کے درخت کا نام ''سدرۃ النبی'' ﷺ مشہور ومعروف ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک بدوی نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں کس طرح جانوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں آپ نے فرمایا اس طرح کہ کھجور کی ٹہنی کو بلاتا ہوں۔ وہ گواہی دے گی کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ چنانچہ وہ ٹہنی درخت سے ٹوٹ کر گر پڑی۔ حضور نے اس ٹہنی سے فرمایا: ''اپنی جگہ قائم ہو جا''۔ تو وہ ٹہنی اٹھ کر اپنی جگہ نصب ہو گئی۔ پھر وہ بدوی اسلام لے آیا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا اور اپنی جگہ صحیح بتایا ہے۔ حضور کے پاس درختوں کے

سے مستغنی رہے میں اسے مانگنے والے سے زیادہ دیتا ہوں۔

اور بعض کا خیال ہے کہ زبان کو دعا میں مشغول رکھے اور دل کو مقام رضا پر قائم رکھے۔ تا کہ اس میں دونوں خوبیاں جمع ہو سکیں۔ اور اس حال کے صحت کی علامت یہ ہے کہ دعا بحکم عبودیت وتذلل اور امتثال امرالٰہی میں ہو اور کسی خواہش کے ارادے اور حصول مقصد کی تمنا کے بغیر ہو۔ اور قبولیت کی تاخیر سے ناراضگی کا اظہار نہ کرے۔ اور اپنے رب کریم پر تہمت نہ رکھے۔ کیونکہ قبول فرمانا اور نہ قبول فرمانا دونوں اس کے حضور برابر ہیں۔

امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اوقات مختلف ہیں: بعض حالتوں میں سکوت سے دعا بہتر ہوتی ہے اور وقت کا ادب اسی میں ہوتا ہے اور بعض حالتوں میں دعا سے سکوت افضل ہوتا ہے اور اس میں ادب یہی ہوتا ہے اور اس بات کی شناسائی بھی وقت میں ہی ظاہر ہوتی ہے اس لئے کہ علم بھی وقت میں ہی حاصل ہوتا ہے اور اگر اپنا دل دعا کی جانب اشارہ کرے تو دعا اولیٰ ہوتی ہے۔ اور اگر سکوت کی جانب اشارہ کرے تو سکوت اولیٰ۔ نیز اگر علم، وقت میں غالب ہو تو دعا اولیٰ ہے۔ اس لئے کہ اس کا ہونا عبادت ہے اور اگر غالب، معرفت و

[redacted]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو بیہقی ''دلائل نبوت'' میں بسند ضعیف بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے اس میں وتر یعنی کمان کے چلہ کو پایا جس میں گیارہ گرہ تھیں اور سورۂ الفلق اور سورۂ والناس نازل ہوئی ان کی ہر آیت پڑھی جاتی تو ایک ایک گرہ کھلتی جاتی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت عمار رضی اللہ عنہما کو بھیجا انہوں نے کھجور کی کونپل پائی جس میں گیارہ گرہیں تھیں۔ فتح الباری کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اندر اترا اس نے اس میں کچھ کھجور کی کونپل پائی۔ جس میں

بظاہر یہ مشکل ہے اس لئے کہ ہر نبی سے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار مقبول دعائیں واقع ہوئی ہیں اور اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر نبی کے لئے صرف ایک ہی مقبول دعا ہوتی ہے۔ اس اشکال کا علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ مقبول دعا کا مطلب یہ ہے کہ اس کی مقبولیت کو قطعی اور یقینی طور پر ذکر کر دیا گیا ہو اور ان کے ماسوا ان کی جتنی دعائیں ہیں وہ قبولیت کی امید کے درجہ میں ہیں۔ اور بعض علماء یہ جواب دیتے ہیں کہ ان کی تمام دعاؤں میں افضل دعا ایک ہی ہے۔ اگرچہ ان کے لئے اور بھی دعائیں ہوں اور بعض کہتے ہیں کہ ہر نبی کے لئے ایک دعائے عام ہے جو ان کی امت کے حق میں مستجاب ہے خواہ امت کی ہلاکت میں ہو یا ان کی نجات میں، لیکن مخصوص دعائیں لو کچھ مقبول ہیں اور کچھ نہ مقبول یا یہ مراد ہے کہ ہر نبی کے لئے ایک دعا ہے خواہ امت کے بارے میں ہو جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے مانگی:

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا ۔ اے میرے رب روئے زمین پر کسی کافر کو بستا نہ چھوڑ۔ یا نبی کی وہ دعا جو اپنی ذات خاص کے لئے ہو جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے مانگی: فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ تو میرے لئے اپنی طرف سے ایسا ولی دے جو میرا وارث ہو۔ یا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے مانگی: رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ اے میرے رب مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لئے سزاوار نہ ہو۔

کرمانی نے شرح بخاری میں سوال کیا ہے کہ کیا نبی کے حق میں یہ جائز ہے کہ اس کی دعا مقبول نہ ہو اس کا جواب دیا کہ ہر نبی کی ایک دعا ضرور مقبول و مستجاب ہے اور باقی دعائیں مشیت باری تعالیٰ میں ہیں۔ علامہ عینی حنفی شارح بخاری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ یہ سوال اچھا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس میں ایک قسم کی شناعت ہے اور ہم شک نہیں رکھتے کہ انبیاء علیہم السلام کی تمام دعائیں مقبول و مستجاب ہیں۔ اور حضور کا یہ ارشاد کہ ’’ہر نبی کی ایک خاص دعا ہوتی ہے اس سے حصر مراد نہیں ہے۔ انتہی۔

بعض محققین فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ معزز و مکرم ہیں کہ آپ اپنے رب سے کوئی دعا مانگیں اور وہ اسے قبول نہ فرمائے اور ایسی کوئی دعا منقول نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی دعا مانگی ہو اور وہ قبول نہ ہوئی ہو یا رب۔ مگر یہ کہ اس میں کوئی کامل مصلحت ہو جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ میں نے اپنی امت کے لئے تین دعائیں مانگیں۔ ایک یہ کہ میری امت کو زمین میں نہ دھنسایا جائے دوسرے یہ کہ ان کو قحط سے ہلاک نہ کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ ان میں آپس میں خونریزی واقع نہ ہو تو پہلی دو دعاؤں کو تو شرف قبول حاصل ہوا۔ اور تیسری دعاء سے منع کر دیا گیا۔ یہ احتمال رکھتا ہے کہ منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے آپ سے فرمایا ہوگا کہ آپ ایسی دعا نہ کریں یہ مطلب نہیں کہ دعا کرنے کے بعد قبولیت سے منع کر دیا گیا۔ اگرچہ یہ بات اس عبارت میں غیر متعارف ہے۔ (واللہ اعلم)۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی جب کہ ان کی والدہ ام سلیم رضی اللہ عنہ ان کو لے کر آئیں۔ دعا کی درخواست کرتے ہوئے عرض کیا یا رسول اپنے خادم انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائیے۔ حضرت انس جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو وہ آٹھ یا نو سال کے تھے۔ اور انہوں نے حضور کی دس سال خدمت کی اس پر حضور نے ان کے لئے دعا مانگی اور فرمایا: اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْ مَالِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَاَطِلْ حَيَاتَهٗ اغْفِرْ لَهٗ۔ اے خدا اس کے مال و اولاد میں برکت دے۔ اور اس کی عمر میں درازی دے اور اسے بخش دے۔‘‘ اور ایک روایت میں ہے: و ادخله الجنة۔ اور اسے جنت میں داخل فرما دے تو ان کی عمر ایک سو سال سے متجاوز ہوئی۔ تین سال یا سات سال اور کم سے کم جو روایت کی گی ہے وہ ننانوے سال ہے۔ اور ان کے کھجوروں کے باغوں میں سال میں دو مرتبہ پھل لگا کرتے تھے۔ ترمذی نے ابوالعالیہ سے روایت کی ہے کہ حضرت

انس رضی اللہ عنہ کا ایک باغ ایسا تھا جس میں سال میں دومرتبہ پھل آتے تھے اور ان میں ایسی خوشبو آتی تھی جو مشک نافہ سے فائق تھی۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور ان کی اولاد پوتے پرپوتے یہ سب سو سے متجاوز تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میری بیٹی امینہ نے جو کہ میری آخری صلبی اولاد ہے اس نے میری اولاد میں سے ایک سو دو کو دفن کیا ہے۔ اور ایک روایت میں ایک سو بیس ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تین دعاؤں کو پالیا ہے یعنی کثرت مال و اولاد اور طول حیات کو اب چوتھی دعا کا امیدوار ہوں۔ وہ انشاء اللہ تعالیٰ جنت کا داخلہ ہے۔

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مالک رضی اللہ عنہ بن ربعیہ سلولی کے لئے دعا فرمائی کہ ان کی اولاد میں برکت دی جائے تو ان کے ستر لڑکے پیدا ہوئے اسے ابن عساکر نے روایت کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتضےٰ کے پاس کسی کو بھیجا تو اس نے آ کر عرض کیا وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں پھر حضور نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اس وقت ان کا درد جاتا رہا اور یہ دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْہُ الْحَرَّ وَالْبَرْدَ ۔ اے خدا ان سے گرمی و سردی کو دور رکھ تو وہ نہ گرمی پاتے نہ سردی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ مرتضےٰ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو انہوں نے عرض کیا میں قضا جانتا نہیں کہ کس طرح مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس پر حضور نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر رکھ کر دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَلْبَہٗ وَسَدِّدْ لِسَانَہٗ اے خدا ان کے دل کی ہدایت فرما اور ان کی زبان کو سیدھا چلا'' حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتضےٰ فرماتے ہیں خدا کی قسم مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں کبھی شک و تردد نہ ہوا اسے ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ مرتضیٰ کی ایک بیماری میں عیادت کرتے ہوئے دعا کی: اَللّٰھُمَّ اشْفِہٗ اَللّٰھُمَّ عَافِہٗ. اے خدا! انہیں شفا دے دے اس کے بعد فرمایا کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد درد نے کبھی عود نہ کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت ابوطالب بیمار ہوئے تو انہوں نے کہا اے میری بھتیجے اپنے رب سے میرے لئے دعا کیجئے کیونکہ آپ نے میری بیمار پرسی کی ہے کہ وہ مجھے صحت دے پھر حضور نے دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اشْفِ عَمِّیْ. اے خدا میرے چچا کو شفا دے تو ابوطالب فوراً کھڑے ہو گئے گویا کہ ان کے بندھے پاؤں کھول دئے گئے۔ پھر ابوطالب نے کہا اے بھتیجے آپ جس رب کی عبادت کرتے ہیں وہ آپ کو دیتا ہے اور جو آپ چاہتے اور جو دعا مانگتے ہیں اسے قبول فرماتا ہے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا اے میرے چچا اگر تم بھی اس رب کی عبادت کرو اور اس کی اطاعت کرو تو وہ تمہیں بھی جو چاہو گے دے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ اَللّٰھُمَّ اَعْطِہِ الْحِکْمَۃَ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ. اے رب انہیں دین کی سمجھ دے۔ اے خدا حکمت عطا فرما اور انہیں تفسیر کا علم سکھا۔ اسے بیہقی اور ابونعیم نے روایت کیا۔ بخاری میں ہے: اَللّٰھُمَّ عَلِّمْہُ الْکِتٰبَ اے خدا! انہیں قرآن کا علم سکھا۔ اسی دعا کا ثمرہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ''خبر الامتہ'' بحر علم، رئیس المفسرین، ترجمان القرآن، بلند درجہ، صاحب مقام رفیع ہوئے۔ (رضی اللہ عنہ)۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نابغہ جعدی کی بتیسی بہت پسند آئی تو آپ نے ان کے لئے دعا فرمائی، اے خدا! ان کے دانتوں کو نہ گرائے تو ان کی عمر سو سال سے متجاوز ہوئی۔ ایک روایت میں ہے ایک سو سے کچھ اوپر ہوئی مگر ان کا ایک دانت نہ گرا اور تمام لوگوں سے ان کے دانتوں کی آب و تاب اور خوبصورتی زیادہ تھی۔ ایک روایت میں ایسا آیا ہے کہ جب کوئی دانت گرتا تو دوسرا دانت اس جگہ نمودار ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ عمرو بن اخطب نے حضور کو پیالے میں پانی پلایا انہوں دیکھا کہ پانی میں بال پڑا ہے، بال نکال کر پھینک دیا اس پر حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ''اَللّٰھُمَّ جَمِلِّهُ '' اے خدا انہیں صاحب جمال بنا اور انہیں خوبصورتی عطا فرما تو ان کی عمر ننانوے سال کی ہوئی مگر ان کے سر اور داڑھی کا ایک بال سفید نہ ہوا۔ ظاہر تعلق اور پانی کے پیالہ سے بال نکالنے سے مناسبت حسن و جمال اور جوانی ہے۔ اور اسی حسن و جمال کی ان کے لئے دعا مانگی۔ اکثر جوانی کے حسن و جمال سے داڑھی کی سیاہی مراد لیتے ہیں۔ اول کتاب میں حلیہ شریف اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے ہائے مبارک میں سفیدی نہ ہونے کے ضمن میں بحث لکھی جا چکی ہے۔

بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک سے کوئی چیز نکال جو داڑھی مبارک میں تھی مثلاً تنکا وغیرہ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰھُمَّ جَمِلِّهُ۔ تو اس یہودی کے داڑھی کے بال باوجود یہ کہ سفید تھے سیاہ ہو گئے نیز مروی ہے کہ ایک یہودی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اونٹنی کا دودھ دوہا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ جَمِلِّهُ تو اس کے بال سیاہ ہو گئے اور وہ نوے سال تک زندہ رہا مگر بوڑھا نہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر و بیگانے لوگ بھی حضور کے دستر خوان نعمت و برکت سے محروم نہ رہتے تھے تو مسلمانوں اور محبت کرنے والوں کا کیا اندازہ۔

نیز اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کی خدمت و رضا جوئی میں خاص تاثیر ہے اور کافروں پر بھی خیر و برکت کا افاضہ ہوتا ہے اگرچہ اخروی خیر و برکت سے محروم، مایوس رہیں مگر دنیا میں محروم نہیں رہتے۔ اگرچہ اونٹنی کے دودھ دوہنے اور حسن و جمال کی دعا دینے میں کوئی معنوی و مناسبت ظاہری نہیں ہے لیکن اتفاق ایسا ہی پڑا۔ ممکن ہے وہ یہودی ظاہری حسن و جمال رکھتا ہو۔ اس پر مزید زیادتی کے لئے دعا فرمائی ہو (واللہ اعلم)۔

ایک اور شخص کے لئے فرمایا: اَللّٰھُمَّ مَتِّعْهُ بِشَبَابِه. اے خدا اسے جوانی نصیب فرما۔ اس پر اسی سال گزر گئے مگر ایک بال سفید نہ نکلا۔ مروی ہے کہ ایک دن حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اس حال میں آئیں کہ ان کے چہرۂ انور پر بھوک کی زردی پھیلی ہوئی تھی جب حضور نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو اپنا دست مبارک ان کے سینہ پر رکھ کر دعا کی۔ اے خدا بھوکوں کو سیر فرما۔ اے خدا فاطمہ رضی اللہ عنہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھوکا نہ رکھ فوراً ان کے چہرے پر سرخی دوڑ آئی۔ سیّدہ زہرہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں اس کے بعد میں کبھی بھوکی نہ رہی اسے ابن یعقوب اسفرائی نے ''دلائل الاعجاز'' میں بیان کیا ہے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عروہ بن ابی الجعد بارقی کے لئے دعا فرمائی کہ: اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَهٗ فِي صَفْقَتِهٖ اے خدا ان کی خرید و فروخت میں برکت دے تو وہ جو چیز خریدتے اس میں انہیں نفع ہوتا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے اموال میں غنا و برکت کی دعا فرمائی تو وہ تونگری کے اس مقام پر پہنچے کہ وہ خود فرماتے ہیں اگر میں پتھر کو بھی اٹھاتا تھا تو امید رکھتا تھا کہ اس کے نیچے سونا چاندی ہوگا۔ اور مصر پر قحط کی دعا کی تو وہ قحط میں ایسے مبتلا ہوئے کہ کھالیں اور مردار کھانے لگے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا قصہ جو عتبہ بن ابولہب پر فرمائی کہ: اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِّنْ كِلَابِكَ. اے خدا اس پر اپنے کتوں میں سے کوئی کتا مسلط کر دے۔'' مشہور ہے ایک شخص نے حضور کے سامنے بائیں ہاتھ سے کھایا۔ حضور نے اسے داہنے ہاتھ سے کھانے کا حکم فرمایا۔ اس نے کہا میں نہیں کر سکتا فرمایا کبھی تو نہ کر سکے گا تو وہ کبھی اس کے بعد اپنے داہنے ہاتھ کو منہ تک نہ اٹھا سکا۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے درخت کے آگے نماز پڑھ رہے تھے تو ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان سے گزرا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ہماری نماز کو قطع کیا اللہ تعالیٰ اس کے قدموں کو قطع کرے۔ تو وہ شخص بیٹھ گیا اور کبھی کھڑا نہ ہو سکا ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلایا انہوں نے آنے میں دیر لگائی لوگوں نے کہا وہ کھانا کھا رہے ہیں فرمایا اللہ عزوجل اس کے پیٹ کو کبھی سیر نہ کرے تو معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے بعد کبھی شکم سیر نہ ہوئے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں

علماء نے بیان کیا ہے اور یہ سب آپ کے دریائے معجزات کا ایک قطرہ ہے ان کے ماسوا بے شمار مثالیں ہیں۔ اور دعا کی اجابت وقبولیت تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور پیرووں میں سے اولیاء وصلحاء امت کو بھی حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہو گی؟ حق یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دعائیں مقبول مستجاب ہیں جیسا کہ کہا گیا۔

اب رہا استغفار فرمانا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر گھڑی استغفار کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْن مَرَّۃً بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ سے روزانہ ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں ایک روایت میں ستر مرتبہ سے زیادہ ہے۔ اور ایک روایت میں سو مرتبہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ کثرت استغفار اور اس میں مبالغہ مراد ہے نہ کہ یہ مخصوص عدد (واللہ اعلم)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے وہ فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مجلس میں کھڑے ہونے سے پہلے سو مرتبہ اسے پڑھتے گنا کرتے تھے: اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ ایک روایت میں ہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمِ الخ۔ اور ایک روایت میں ہے ابن عمر ہی سے یہ ہے کہ ہم گنا کرتے تھے کہ حضور ایک مجلس میں اسے سو مرتبہ پڑھتے تھے رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغُفُوْرُ۔ بخاری میں شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا ''سید الاستغفار'' یہ ہے کہ پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُکَ وَاَنَا عَلٰی عَھْدِکَ وَوَعْدِکَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ
شَرِّمَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَکَ بِنِعْمَتِکَ عَلَیَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَاِنَّہٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ

اور ایک روایت میں اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّمَا صَنَعْتُ. الخ۔ آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اسے دن میں یقین کامل کے ساتھ پڑھے اور شام ہونے سے پہلے مر جائے تو وہ جنت میں جائے گا اور جو اسے رات میں کہے صبح ہونے سے پہلے مر جائے تو جنت میں جائے گا۔

علماء فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا امت کی تعلیم وتشریع کے لئے ہے۔ تاکہ وہ ہمیشہ استغفار کرنے اور توبہ کرنے والے رہیں۔ ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ومغفور ہیں آپ کو استغفار وتوبہ کی کیا ضرورت ہے۔ یا یہ استغفار امت کے لئے فرماتے تھے (واللہ اعلم)۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ (الحدیث) بلاشبہ بعض اوقات میرا دل در پردہ ہوتا ہے تو میں خدا سے استغفار کرتا ہوں۔ یغان غین سے ماخوذ ہے غین اس رقیق ولطیف پردے کو کہتے ہیں جو آفتاب پر آ جاتا ہے اور اس غین ودر پردہ کی حقیقت کو پانے سے علماء وعرفاء عاجز وحیران ہیں۔ اکثر کا یہ خیال ہے کہ یہ غین ایک پردۂ رقیق ولطیف ہے جو بحکم بشریت لوگوں سے ملنے جلنے، دین وملت کے امور کا اہتمام کرنے مخلوق کو دعوت دینے اور احکام شریعت بیان کرنے سے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدۂ شہود پر مشاہدۂ وحدت سے یک گونہ فرق وغفلت طاری ہوتا ہے نور وحدت کے ظہور وذکر کی آگ سے جو اشتغال واضمحلال رونما ہوتا ہے اس حالت کے پیش آنے پر حضور استغفار کرتے تھے: حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْنَ. نیکوکاروں کی نیکیاں مقربین کی بدیاں ہوتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر لمحہ مقام قرب میں ترقی در ترقی تھا۔ اور تجلیات حق کے رنگ میں آپ کے مشاہدات کی حد ونہایت نہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر آن نور جلال کا پردہ دکھائی دیتا تھا اور نورانی تجلی پر اور نورانی تجلی کا اضافہ ہوتا جاتا تھا آگے کے مقام کے مقام منکشف ہو جانے کے بعد پہلے مقام کے توقف

پر استغفار کرتے تھے کہ کیوں اس وقت تک اسی مقام میں توقف ہے۔ آپ اسے اپنی خطا جانتے ہیں۔ بعض صوفیاء اسے کہتے ہیں غَیْنُ الْاَنْوَارِ لَاغَیْنُ الْاَغْیَارِ انوار کا پردہ ہوتا تھا نہ کہ غیریت کا پردہ۔ طیبی شرح مشکوٰۃ میں شیخ ابوالوقت شیخ شہاب الدین سہروردی سے نقل کرکے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس ہمیشہ مقام ترقی وشوق اور رفیق اعلیٰ سے ملنے اور عالم ملکوت سے ملحق ہونے میں جو ان کا مقام اصلی ہے رہتی تھی۔ اور قلب روح کے تابع اور نفس قلب کے تابع ہوتا ہے۔ اور شک نہیں ہے قلب کی حرکت ورفتار، نفس کی حرکت سے زیادہ تیز اور قائم ہے تو لامحالہ نفس مقام قرب اور حریم عزت کے عروج میں روح اور قلب کے مصاحبت ورفاقت سے جدا ہو جاتا ہے جو علاقہ عنصری سے انقطاع کا موجب ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور اس کی غیر متناہی رحمت ومہربانی ہے خلق کی تکمیل وارشاد کے لئے آپ کے عنصر شریف کی بقاء کا اقتضا فرماتی ہے۔ اور جلد ہی یہ غین اور اس پردہ کو قلب شریف کی حرکت کم کرنے کے لئے ڈالتی تھی تاکہ بالکلیہ قلب، روح کی طرف چلا نہ جائے۔ اور عالم قدس سے نہ مل جائے۔ اور حضور کمال شوق اور جہان میں جذب ہونے کی وجہ سے قلب کی حرکت کے کم ہونے کے باعث استغفار کرتے تھے۔ باوجود اس بات کے کہ اس میں حکمت ومصلحت ہے۔ اور تکمیل امت کی خواہش کمال درجہ ہے مگر ترقی کے لئے استغفار اور عذر خواہی کرتے تھے۔

اصمعی سے جو علم لغت کے بڑے عالم ہیں لوگوں نے غین کے بارے میں پوچھا کہ یہ کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے فرمایا سائل اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غین کے سوا، کے بارے میں پوچھتا تو میں اس کا جواب جو کچھ میں جانتا دے دیتا۔ لیکن قلب مصطفیٰ اور اس کے احوال وصفات کے بارے میں دم مارنے کی سکت نہیں ہے۔ مجھے اصمعی کی یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس کو قلب مصطفوی کے اداب واحترام کی توفیق مرحمت فرمائی جس کو سوا خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ اور جو بھی جو کچھ کہتا ہے اپنی معرفت وقیاس کے مطابق کہتا ہے۔ اور آپ کا مقام ان سب سے بلند وارفع ہے جو کوئی مقام کی خبر دیتا ہے۔ اور حقیقت حال کا انکشاف کرتا ہے وہ متشابہات کی تاویل کے درپے ہوتا ہے۔ حالانکہ متشابہات کا علم اور اس کی تاویل بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا۔

قرأت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت ترتیل وتفسیر کے ساتھ ایک ایک حرف صاف ہوتی تھی۔ حروف مد میں مد کرتے اور آیت کے سرے پر وقف کرتے تھے۔ چنانچہ پڑھتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور وقف فرماتے اس کے بعد پڑھتے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وقف کرتے اس کے بعد پڑھتے مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ اور وقف کرتے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اسے وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ اہل فن قرأت کے وقف میں کچھ قاعدے ہیں جو باعتبار تمام کلام اور اس کے مابعد سے عدم تعلق اور مابعد کا ماقبل سے انقطاع تعلق، تقسیم کرتے ہیں اسی بنا پر وقف کو وقف تام، وقف حسن اور وقف کافی نام رکھتے ہیں۔ جیسا کہ تجوید کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سورت کو ترتیل سے پڑھتے حتیٰ کہ وہ سورت اس سورت سے بھی بڑھ جاتی جو سورۃ درازتر ہے اور حضور کی خوش آوازی اور خوش قرأت سے زیادہ کوئی دوسرا نہ تھا اور حضور اپنی قرأت میں تغنی یعنی لحن صوت کا بھی لحاظ فرماتے۔ اور بسا اوقات اس سے آواز کو بلند فرماتے۔ جیسا کہ فتح مکہ کے روز، سورۂ انا فتحنا کی قرأت میں آواز کی خوش اسلوبی کا لحاظ فرمایا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مغفل نے حضور کی ترجیع کو تین الف سے تعبیر کیا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے ظاہر ہے کہ حضور کی ترجیع کا عمل یعنی آواز کو بڑھا بڑھا کر پڑھنا آپ کا اختیاری عمل تھا نہ کہ بطریق اضطرار اور اونٹنی کی جنبش سے۔ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ اگر اونٹنی کی جنبش سے ہوتا تو عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مغفل اسے بیان نہ کرتے۔ اور اس کی خبر نہ دیتے تاکہ لوگ اس میں آپ کی پیروی کرتے۔ اور ترجیع کو فعل رسول کی طرف نسبت نہ کرتے۔ اور یہ نہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجیع فرمائی جیسا کہ ظاہر ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ یعنی اپنی خوش آوازی سے قرآن کو آرائش دو

فرمایا: لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جس نے قرآن کو خوش آوازی سے نہ پڑھا اور فرمایا حق تعالیٰ کسی چیز کو ایسا نہیں سنتا۔ اور متوجہ نہیں ہوتا جیسا کہ نبی کی خوش آواز سے پڑھنے کو سنتا اور متوجہ ہوتا ہے یعنی وہ قرآن کو خوش آوازی اور جہر سے پڑھتا ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لِكُلِّ شَيْءٍ حِلْيَةٌ وَّحِلْيَةُ الْقُرْاٰنِ حُسْنُ الصَّوْتِ یعنی ہر چیز کی ایک زیبائش ہے اور قرآن کی زیبائش خوش آوازی ہے۔ مروی ہے کہ ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قرأت توجہ سے سماعت فرمائی کیونکہ وہ حد درجہ خوش آواز اور خوش خواں تھے۔ ان کی مدح میں حضور نے فرمایا: اُعْطِيَ مِزْمَارٌ مِّنْ مَّزَامِيْرَ آلِ دَاوٗدَ۔ یعنی آل داؤد کے لحنوں میں سے ایک لحن انہیں عطا کیا گیا ہے۔ جب دن ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی سماعت فرمانے کی خبر دی، حضرت ابوموسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا افسوس، اگر میں جانتا کہ یا رسول اللہ آپ سن رہے ہیں تو میں اس سے زیادہ تحسین و تزئین کے ساتھ پڑھتا۔

علماء نے تغنی بالقرآن کے مسئلہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے مطلقاً جائز رکھا ہے یعنی اگرچہ مد میں زیادتی اور حرکات میں اشباع وغیرہ لازم آئے اگرچہ وہ علم موسیقی کے قوانین پر ہو اور بعض مطلقاً منع کرتے ہیں اور حق جو دائرۂ انصاف کا مرکز ہے یہ ہے کہ خوش آوازی اور تغنی دو وجہ پر ہے ایک یہ کہ طبعیت اسے چاہے، تکلف، بناوٹ اور تعلیم کے بغیر ادا کرے۔ بلکہ جب اسے اس کی طبعیت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اسے خوش آوازی، خوش الحانی کے ساتھ ادا کرے تو یہ جائز ہے۔ اگرچہ تزئین و تحسین کی زیادتی کے ساتھ ادا کرے۔ جیسا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر میں جانتا کہ حضور سن رہے ہیں تو اور زیادہ تزئین و تحسین یعنی آراستہ اور سنوار کے پڑھتا۔ اور جس پر خوشی، بیخودی اور شوق کا غلبہ ہو وہ اپنے نفس کا مالک نہ رہے اور قرأت میں خوش آوازی، آراستگی اور تزئین صوت میں اختیار نہ رہے۔ وہ مطبوع ہے۔ یعنی طبعی صفت ہے منطبع نہیں یعنی اس میں بناوٹ نہیں ہے۔ صوت عرب اور لحن عرب سے یہی مراد ہے اور یہ ایک قسم کی تغنی ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کرتے اور سنتے تھے یہ تغنی محمود ہے کیونکہ اس سے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ علم موسیقی کی صنعتوں میں سے کوئی صنعت ہو وہ از قسم طبائع نہیں ہو اور تصنع بناوٹ اور تکلف سے حاصل ہوتا ہو۔ جیسا کہ طرح طرح کے مرکب وغیر مرکب موسیقی کے سر ہیں جو مخصوص تھاپ اور اختراعی آوازوں کے قواعد و اصول سے بنتے ہیں۔ اور یہ بغیر تعلیم و تکلف کے حاصل نہیں ہوتا تو اس قسم کو علماء سلف مکروہ جانتے ہیں اور اس وجہ سے قرأت کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اور جسے اسلاف کے احوال کا علم ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ اسلاف موسیقی کے سروں سے بیزار تھے کیوں کہ اس کی تمام باتوں میں تکلف اور بناوٹ ہوتی ہے یہ حضرات اس طریقے پر قرآن پڑھنے سے بیزار و مجتنب ہیں اور اسے جائز نہیں رکھتے۔ بلکہ سوز و گداز، خوش آوازی اور خوش خوانی سے پڑھنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جو سب طبعیتوں میں موجود ہے۔ اور شارع علیہ اسلام نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی۔ بلکہ اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور لوگوں سے اس طرح پڑھوایا ہے اور خبر دی ہے کہ حق تعالیٰ ایسے پڑھنے کو خوب سنتا ہے۔ اور فرمایا جو خوش آوازی سے قرآن نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔

ابن ابی شیبہ، عقبہ رضی اللہ عنہ بن عامر سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا ہے قرآن کو سکھاؤ اور اسے خوش آوازی سے پڑھو اور حدیث کو لکھو.. یہ سب مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔

حکایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ اسلام جب چاہتے کہ بنی اسرائیل سے کلام فرمائیں اور انہیں زبور سنائیں تو سات دن بھوکے رہتے اور اپنی ازواج پر تشریف نہ لاتے اس کے بعد سلیمان علیہ السلام سے فرماتے کہ اطراف و جوانب، دشت و جبل ہر جگہ اعلان کر دو کہ داؤد فلاں دن اجلاس کریں گے اور کلام کریں گے۔ اس کے بعد منبر نکال کر میدان میں بچھایا جاتا اس پر حضرت داؤد

تشریف فرما ہوتے ان کے پیچھے حضرت سلیمان علیہ السلام کھڑے رہتے۔ جن وانس، وحش وطیور اور حشرات الارض جمع ہوکر چاروں طرف بیٹھ جاتے۔ کنواری اور پردہ نشین عورتیں آتیں۔ ذکر کو سنتیں اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام حمد وثنائے الٰہی سے ابتدا فرماتے اور زبور کی تلاوت کرتے اس پر سننے والوں کی ایک جماعت مرجاتی۔ اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام گنہگاروں کی طرف متوجہ ہوکر نصیحت شروع فرماتے۔ اس پر بھی ایک جماعت سننے والوں کی مرجاتی۔ اس کے بعد جب کثیر تعداد مرنے والوں کی ہو جاتی تو حضرت سلیمان علیہ السلام عرض کرتے اے اللہ کے نبی لوگوں کی موتیں بہت کثرت سے ہوگئی ہیں۔ اور سننے والوں کے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام چہرے کے بل گر پڑتے اور بیہوش ہو جاتے اور انہیں اٹھا کر گھر لاتے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام لوگوں میں اعلان فرماتے کہ جس کا خویش واقارب اور دوست ہے وہ لاشوں کو تلاش کر کے نکال کے لئے جائے تو عورتیں تختوں کو لے کر آتیں اور اپنے شوہروں، فرزندوں اور بھائیوں کو اٹھا کر بستی میں لے جاتیں۔ اور جب حضرت داؤد علیہ السلام دوسرے دن ہوش میں آتے تو حضرت سلیمان علیہ السلام سے دریافت کرتے کہ بنی اسرائیل کے لوگوں کا کیا حال ہے؟ عرض کرتے اے اللہ کے نبی فلاں فلاں مرگیا ہے اور سب کے نام گناتے۔ اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں کو سر اور منہ پر مار کر مناجات کرتے، اے خدا! تو کیا داؤد علیہ السلام سے ناراض ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ اسے موت سے ہمکنار نہیں کیا۔ جو تیرے خوف اور شوق میں مرگئے ہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام کا دوسری مجلس تک یہی حال رہتا۔ اور وہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے۔ جبتک کہ اللہ عزوجل نے چاہا۔

کوئی یہ گمان نہ کرے کہ بنی اسرائیل کا حال، اس امت کے حال سے اکمل واعلیٰ تھا۔ لیکن غنا اور مزمار میں حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری کا حال بہت کافی ہے۔ جو کہ ان کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انہیں آل داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار دیا گیا ہے۔ لیکن خوف وشوق سے مرنا تو اس کا جواب دو طرح پر ہے۔ ایک یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ اس امت کو وہ قوت عطا فرمائی گئی ہے جو ہر اس حالت کو جو درپیش ہو برداشت کرلیتی ہے۔ اور اس کی قوت جسمانیہ فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ تائیدات الٰہیہ سے قوت روحانیہ پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس امت کی قوت کی زیادتی اور اس پر قائم رہنے کی بنا پر ہے کہ سماع موعظہ کا حال اور عدم سماع کا حال برابر ہے۔ بلکہ پے درپے احوال ذکر واطوار سے یقین ہی بڑھتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے: لَوْ كُشِفَ الْغِطَآءُ مَاازْدَادَتْ يَقِيْنًا اگر حجابات اٹھا دئے جائیں تو یقین ہی زیادہ ہو۔ یا جس طرح کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حال ہے کہ باوجود یہ کہ وہ اصحاب مزامیر اور اس کے اخص اخواص تھے۔ امت سے افضل ہیں۔ موت کا انہیں اتفاق نہ ہوا جس طرح کہ دوسروں کو موت کا اتفاق پڑا۔ یہ نہ تھا مگر اس بنا پر کہ ان کا حال تمکین وقوت اور اس ربانی قوت کی بناء پر جو ان کی مدد کر رہی تھی لیکن حضرت داؤد علیہ السلام کا نہ مرنے پر توجہ فرمانا اور اس سے ان کا معذرت خواہ ہونا تو یہ تواضع وانکسار اور امت پر ان کی شفقت میں سے ہے نہ یہ کہ اپنے کسی امتی کے مرتبہ سے کمتر ہونے میں ہے۔ (معاذ اللہ) اور اس قوت الٰہیہ اور قلب کے متحمل ہونے کی جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ایک دن ایک شخص کو قرآن کریم سننے کے وقت روتے اور بیچین و بے خود ہوتے دیکھا تو فرمایا ہم بھی ایسے ہی تھے لیکن اب ہمارا دل سخت ہوگیا ہے انہوں نے قوت وتحمل کو بر بنائے تواضع وانکسار، قسوۃ وسختی سے تعبیر فرمایا حالانکہ ان کا مرتبہ محفوظ ان کی منزلت بہت بلند اور وہ ہر برائی سے مرفوع ہیں۔

منقول ہے کہ حضرت سہیل تستری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن کسی سے قرآن کریم سنا تو ان کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اور بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔ بعد کو لوگوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا حال نہ تھا۔ فرمایا حال کی کمزوری ہے۔ لوگوں نے کہا اگر یہ کمزوری ہے تو قوت پھر کیا ہے؟ فرمایا۔ ”قوت یہ ہے کہ سب جذب کرے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اور قائم رہے۔

اور دوسرا طریقہ اس کے جواب کا یہ ہے کہ اس امت میں بھی بہت سے اگلے پچھلے لوگ، سماع قرآن کی مجلس میں خوف وشوق میں مرے ہیں۔ اور ذوق وشوق میں اس جہان سے چل بسے ہیں۔ مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ ابواسحٰق ثعلبی نے ایسے حضرات کے اسماء میں کئی جلدیں لکھی ہیں اور کتاب ''نفحات الانس'' میں بھی ان حضرات کا ذکر ہے جو سماع قرآن کی مجلس میں جان، جان آفریں کے سپرد کر چکے ہیں۔

مسئلہ سماع: وصل: اب جب کہ قرآن کو خوش آوازی سے پڑھنے کی بات چل نکلی ہے تو اگر مجملاً مسئلہ سماع کا بھی اشارہ کر دیا جائے تو بعید نہ ہوگا۔

واضح رہنا چاہئے کہ اس مسئلہ میں قدیم وجدید اور قول وفعل میں بہت اختلاف ہے۔ بعض اباحت پر قائم ہیں۔ اور بعض شک وتردد میں ہیں اور کہتے ہیں نہ ہم اسے کرتے ہیں اور نہ انکار کرتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ سماع کا مَشَارٌ اِلَیْہِ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ جو باتﷺ کو سنتے اور اس پر خوب پیروی کرتے ہیں۔ ارشاد باری ہے: وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ اور جب سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا تو دیکھئے کہ عرفان حق سے ان کی آنکھیں ابل پڑتی ہیں۔ عوارف میں کہتے ہیں کہ یہ وہ سماع ہے جس کی حقانیت پر سب کا اتفاق ہے اور کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ یہ سماع اپنے رب سے رحمت کے حصول کا موجب ہے۔ البتہ اختلاف، اشعار وقصائد کو بالحان مطربہ موسیقیہ کے سماع میں ہے اور اس میں کثرت اقوال اور تبائن احوال ہے۔ بعض اسے ممنوع قرار دیتے ہیں اور فسق وفجور کے ساتھ ملاتے ہیں اور بعض اسے جائز اور اسے حق واضح شمار کرتے ہیں اور دونوں گروہ میں افراط وتفریط ہے (انتہی کلام العوارف)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تین راہیں ہیں۔ ایک مذہب فقہاء کا ہے یہ حضرات اس کا شدت وسختی کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔ اور مسلک تعصب وعناد کی راہ پر گامزن ہیں۔ اور اس فعل کو ذنوب وکبائر کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور کفر وزندقہ اور الحاد سے اسے اعتقاد کرتے ہیں۔ اور یہ افراط وزیادتی ہے اور طریقہ اعتدال وانصاف سے خروج ہے انہیں اس پر اتنی جرأت نہ کرنی چاہئے۔ خصوصاً اختلافی مقامات میں۔ ہاں اس پر علماء مذہب کے جو حرمت وکراہت پر دلائل ہیں اسے نقل کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا مذہب محدثین کا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس کی حرمت میں حدیث صحیح اور نص صریح کوئی ثابت نہیں ہے بلکہ اس ضمن میں جتنی حدیثیں مروی ہیں وہ یا تو موضوع ہیں یا مطعون، اسی طرح آیات قرآنیہ میں ہے اگرچہ بعض مفسرین نے ایسی تفسیریں کی ہیں جو حرمت غنا پر دلالت کرتی ہیں لیکن ان کی تاویلیں اور محمولات اور بھی ہیں جن کو ان کے سوا دیگر مفسرین وعلماء نے بیان کیا ہے لہٰذا جب حرمت ثابت نہ ہو تو حل واباحت ثابت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد دلیل ہے کہ وَاُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ تمہارے لئے طیبات حلال بنائی گئیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ دلیل قطعی سے نہ ان کی حرمت ثابت ہوتی ہے اور نہ ان کی اباحت، لہٰذا مسئلہ مبنی بر اصل اشیاء میں جو حظر واباحت ہے قرار پائے گا۔

اور تیسرا مذہب، سادات صوفیائے کرام کا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کا مذہب مختلف اور افعال مجتذب مروی ہیں۔ بعض اجتناب کرتے ہیں اور بعض اس میں شغف رکھتے ہیں اور چاہئے کہ ان کا انکار اشد اور ان کا اجتناب وتشدید اقوی ہو اس لئے کہ ان کا مذہب، عزیمت کو اختیار کرنا اور تمام اوقات واحوال میں اقوال وافعال میں احتیاط کرنا ہے لیکن ان میںؒ سے کچھ حضرات شغف وثوق سکر محبت، صحِ حال اور وجد وہیجان وغیرہ میں اتنے مغلوب ہیں کہ ان کا حکم فریفتہ ودلدادہ اور مدہوشی کا حکم رکھتا ہے۔ اور نغمات کا نفوس میں اثر انداز ہونے میں شک وشبہ نہیں ہے کہ یہ دلوں کو طرب انگیز کرتا اور باطن میں سرایت کرتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ظاہر وعیاں ہے حتیٰ کہ

بعدنماز ذکرودعا: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعداذ کارودعائیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے یعنی سلامت کرتے تو تین بار استغفار کرتے اور دعا مانگتے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تبَارَكْتَ يَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ.

سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اتنی دیر بیٹھے رہتے جب تک آپ یہ دعا پڑھتے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ان دونوں حدیثوں کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بخاری میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ جب آپ سلام کرتے تو تھوڑی دیر اپنی جگہ ٹھہرے رہتے تھے۔ ہم گمان کرتے ہیں کہ یہ ٹھہرانا اس لیے تھا کہ مسجد سے عورتیں پہلے نکل جائیں تا کہ مردوں سے ان کا اختلاط نہ ہو۔

اس نفی سے مراد کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس ہیئت پر جس میں سلام سے پہلے تھے زیادہ دیر نہ بیٹھتے تھے مگر اسی قدر اس کے بعد حضور کبھی داہنی جانب اور کبھی بائیں جانب اور کبھی صحابہ کی طرف رخ انور کر کے پھر جاتے تھے۔ اور دعا وذکر فرماتے تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ صحابہ کی جانب رخ انور کرنا اس وقت ہوتا جب آپ قرآنی آیت یا کوئی نازل شدہ حکم بیان فرماتے۔ اور نماز کے بعد ادعیہ اور اذکار ان کتب احادیث میں بکثرت مذکور ہیں جو اس ضمن میں مرتب کی گئی ہیں۔ جیسے جزری کی ''حصن حصین'' اور امام نووی کی ''الاذکار'' وغیرہ کتابیں۔ یہ لازم نہیں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سب دعاؤں کو ہمیشہ ہی پڑھا کرتے تھے بلکہ ان میں سے جو چاہا پڑھا کبھی کل کو اور کبھی بعض کو۔ جتنا بھی اجر وفضیلت اور اتباع سنت کے لیے ضروری ہوتا اس مفہوم کی تصریح امام محی الدین نووی نے دعاؤں کے شروع میں اور ان کے سوا مقامات میں فرمائی ہے اور ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل شریف بھی اسی نہج پر تھا نہ یہ کہ تمام دعاؤں کو اور تمام اوقات میں لازماً پڑھتے۔ اسی بنا پر بعض کتابوں میں کچھ ایسی دعائیں ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔ اور صحابۂ کرام نے ان میں سے جس دعا کو سنا وہ اسی پر عمل کرنے لگے اور اسی کی روایت کرنے لگے۔ اسی طرح تمام اعمال' نوافل اور مستحبات میں یہی صورت حال ہے۔ اور ان میں اختلاف کا موجب بھی یہی صورت حال ہے۔ نیز علما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مستحبات کو یاد دلانے اور ان کے پڑھنے میں رغبت وشوق پیدا کرنے اور اذکار ودعوات میں ترغیب دینے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ان کا وجوب لازم نہیں آتا۔ (واللہ اعلم)

اب ہم اس جگہ بعض ایسے اذکار اور دعاؤں کو بیان کرتے ہیں جن میں کوئی نکتہ اور بات مذکور ہے ان میں پہلی دعائے استغفار ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین مرتبہ ان لفظوں سے پڑھتے: اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ اور مسلم وترمذی میں مطلقاً آیا ہے کہ جب سلام پھیرتے تو تین بار استغفار کرتے' اوزاعی سے جو کہ امام اہل شام ہیں پوچھا گیا کہ استغفار کی کیفیت کیا ہے فرمایا۔ فرماتے: استغفر اللّٰه' استغفر الله، استغفر الله. ''اور بعض نادان لوگ اس میں استحالہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز کے بعد استغفار کرنا اس امر کا وہم پیدا کرتا ہے کہ نماز بھی گناہوں کے زمرے میں سے ہے جیسا کہ اس گمراہ فرقہ سے جیسے مہدویہ کہتے ہیں منقول ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جو کوئی نماز کے بعد کلمہ توحید پڑھتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے اور ان غلطیوں کا صدور' جو نماز میں درپیش آئیں نماز خود ہی استحباب استغفار میں کافی ہے حالانکہ سنت صحیحہ کے وارد ہونے کے بعد ایسی باتیں ساقط الاعتبار ہیں۔

نماز کے بعد پڑھتے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تبَارَكْتَ يَاذَالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اسے مسلم نے روایت کیا اور بعض روایت میں ''منک السلام'' کے بعد ''والیک یرجع السلام'' بھی زیادہ آیا ہے اور مشائخ کے وردوں میں اس سے بھی زیادہ ہے وہ کہتے ہیں: فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَالسَّلَامِ اور صحیح روایتوں میں یہ مروی نہیں مگر اسی قدر جتنا گزرا۔ جیسا کہ شیخ ابن حجر مکی

جانوروں میں نادانوں میں اور بچوں میں بھی اس کا اثر دیکھا گیا ہے۔ اور جوان میں سے متمکن و متحمل اور بساط حکم و آداب پر ثابت قدم رہنے والے ہیں ان کے نہ قدم ڈگمگائے ہیں اور نہ اہل شوق کی مانند متلون، متریخ اور غلبہ وجد و عزام سے متشعر ہیں۔

بعض عرفاء فرماتے ہیں کہ سماع ان لوگوں کے لئے ہے جو تجلیات صفات کے اہل اور ارباب وجد میں سے ہیں جن پر احوال مختلفہ اور صفات متبانیہ کا گزر ہوتا رہتا ہے لیکن جن پر ذات کی تجلی ہوتی ہے ان کا مقام سب سے بلند و ارفع ہے۔

اس جماعت اہل طریقت نے سماع کے آداب و شرائط کی تحقیق کی ہے جو طالب اتباع کے لئے کافی ہیں اور وہ احکام و معارف کے درمیان جامع ہیں۔ ان کو کتاب ''عوارف'' میں ملاحظہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں ایک باب رد و انکار میں، ایک باب قبول و ایثار میں ایک باب سماع سے ترفع و استغفار میں ذکر آداب و اعتنا میں باندھا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

صاحب کتاب ''الامتاع باحکام السماع'' فرماتے ہیں کہ سماع کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جو عام طور پر رائج ہے۔ اور اسے دلوں کی خوشی، کاموں کی آسانی، بوجھوں کے اٹھانے اور حج کی مسافت کو طے کرنے میں استعمال کرتے ہیں اس میں خانہ کعبہ اور زمزم شریف کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ رزمیہ اشعار پڑھتے ہیں جس میں مقام جنگ و جہاد اور اس کی تعریف و توصیف ہوتی ہے جیسے حداد، نصب وغیرہ یا بچوں کو بہلانے کے لئے عورتوں کا گنگنانا وغیرہ یہ سب مباح ہیں۔ اگر ان میں فواحش و محرمات کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ مندوب و مستحب ہے کیونکہ اعمال مرفوع پر موجب نشاط ہے دوسری قسم وہ ابتحال و گانا ہے جسے فنکار فن موسیقی کے تحت گاتے اور اشعار میں گدازگی اختیار کرتے ہیں اور آوازوں میں ایسا اتار چڑھاؤ کرتے ہیں جس سے نفس میں ہیجان و سرور آتا اور دلوں کو خوشی و مسرت سے گرماتا ہے، یہ قسم علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ ایک گروہ مباح رکھتا ہے۔ اور ایک گروہ حرام قرار دیتا ہے۔ اور ایک گروہ مکروہ بتاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ امام مالک امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور احمد رحمہم اللہ سے زیادہ مشہور و اصح قول کراہت میں ہے۔ اگرچہ حرام کا اطلاق بھی ہے۔ چنانچہ قاضی ابوالطیب، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حرمت کا قول نقل فرماتے ہیں۔ اور شیخ شہاب الدین سہروردی عوارف میں فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ غنا کو ذنوب و معصیت سے شمار کرتے ہیں۔ اسی طرح قاضی ابوالطیب اس کی حرمت، عامر شعبی، سفیان ثوری، حماد، نخعی اور فاکہی رحمہم اللہ سے اس سند کے ساتھ جوان کی ہو نقل کرتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ کسی نے ان سے گانے کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو فرمایا یہ اس ہوا کی مانند ہے جو ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتی ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ اس کے اباحت کی جانب اشارہ ہے۔ اور اہل کوفہ، اہل مدینہ اور اہل عراق سے اس کی حرمت نقل کی گئی ہے۔ اور ایک جماعت اس کی اباحت کی طرف گئی ہے۔ اس میں انہوں نے قول کو مطلق رکھا اور مرد، عورت اور لڑکوں کے درمیان تفصیل نہیں کرتے ان سب کو برابری دیتے ہیں لیکن اس میں واقع ہونے اور فتنہ سے محفوظ رہنے کی شرط لگاتے ہیں اور بعض قلیل و کثیر اور مرد و عورت کے درمیان کرتے ہیں اور اباحت کے قائل حضرات کہتے ہیں کہ صحابۂ کرام کی جماعت کثیرہ جس میں عشرہ مبشرہ کے بھی کچھ حضرات ہیں اور تابعین و تبع تابعین و اتباع تبع اور دیگر علماء محدثین و علماء دین کا جم غفیر جو صاحبان زہد و تقوی اور ارباب علم و عبادت ہیں ان سے غنا اور اسکا سماع مروی ہے اور انہوں نے ان سے اس باب میں اتنی روایات و حکایات بیان کی ہیں۔ جو بہت کافی ہیں۔ اور بلاشبہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اس میں ائمہ دین اور اکابر اہل یقین اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا سماع غنا میں مشغول ہونا مستفیض و مشہور ہے اور ان کو جن فقہا حفاظ اور ارباب تواریخ نے دیکھا ہے اسے نقل کیا ہے اور ابن عبدالبر ''استیعاب'' میں فرماتے ہیں کہ ان کے سماع میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا اور ان کے زمانہ میں ان کے چچا حضرت علی مرتضٰے بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امیر المومنین تھے اور وہ جمیلہ کے گھر جاتے جو بہترین گانے والی تھیں اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ ان کے سوا کسی کے لئے اپنے گھر میں نہیں غنا کروں گی تو وہ ان کے

لئے گاتی اور اس نے چاہا کہ اس کے گھر میں آ کر ان کو سنائے اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے تو انہوں نے اس سے منع فرما دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر کے ہمسایہ بتاتے ہیں کہ وہ گاتی تھیں اور ان کے لئے بربط بجائی جاتی تھی۔

منقول ہے کہ حضرت سعید بن المسیب جو کہ افضل تابعین تھے اور تقویٰ اور پرہیز گاری میں ضرب المثل تھے غنا سنتے اور اس کے سماع سے لطف اندوز ہوتے تھے اسی طرح حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر اور قاضی شریح رضی اللہ عنہم جلالت شان اور کبرسنی کے باوجود باندیوں سے غنا سنا کرتے تھے۔ اور حضرت سعید بن جبیر جو کہ اعاظم تابعین سے تھے باندیوں سے سنتے تھے جو گاتی اور دف بجاتی تھیں اسی طرح عبدالمالک بن جریج جو کہ علماء وحفاظ اور فقہاء عباد میں سے تھے جن کی عدالت وجلالت پر اجماع ہے۔ وہ غنا کو سنتے اور قواعد موسیقی سے واقف تھے اور ابراہیم بن سعد وہ شخص تھے جو فقہ اور روایت میں امام عصر تھے وہ طلبا کو حدیث اس وقت تک نہ سناتے جب تک کہ انہیں غنا نہ سنواتے۔ اور ہارون رشید کی محفل میں غنا کی حلت کا فتویٰ دیا۔ ان سے لوگوں نے امام مالک کا احوال دریافت کیا تو فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ یربوع کے قبیلے میں ان کی دعوت تھی اور اس قبیلہ کے لوگوں کے پاس بربط وغیرہ ساز تھے جو گاتے اور اس سے کرتب دیکھاتے ہیں اور امام مالک کے پاس چوکور دف تھا جسے بجایا جاتا۔ اور گایا جاتا تھا (واللہ اعلم)۔

صاحب تذکرہ نے حکایت نقل کی ہے کہ لوگوں نے امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری رحمہما اللہ سے غنا کا مسئلہ پوچھا تو دونوں نے فرمایا غنا نہ کبائر میں سے ہے نہ صغائر میں سے۔ منقول ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا ایک ہمسایہ تھا جو ہمیشہ رات کو اٹھ کر گاتا بجاتا تھا اور امام اس کے غنا پر کان دھرتے تھے ایک رات اس کی آواز نہ سنی تو اس کے گھر والوں سے پوچھا کیا بات ہے آج رات اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بتایا کہ آج وہ باہر نکلا تو سپاہیوں نے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا اس کے بعد امام صاحب نے اپنا عمامہ باندھا امیر کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے چھڑانے کی سفارش فرمائی۔ امیر نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا عمر رضی اللہ عنہ ہے اس پر امیر نے عمر نام کے تمام قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ امام صاحب نے اس شخص سے فرمایا رات کو تو جو کچھ کرتا ہے کرنا۔ چونکہ امام صاحب کا اس کے غنا پر کان رکھنا اور اسے منع نہ فرمانا ان کے نزدیک غنا اور اس کے سماع کے مباح ہونے پر دلالت ہے اور اس کے برعکس حکم کو اس غنا پر محمول کرتے ہیں جو فحش کلامی پر مبنی ہے۔ اور یہ آپ کے قول وفعل کی جمع تطبیق میں ہے حالانکہ اس کی حرمت نہیں پائی جاتی مگر ان کے فعل کے اقتضاء سے نہ کہ ان کے قول کے نص سے جیسا کہ دعوت ولیمہ میں مروی ہے کہ ایک دن امام ابویوسف کے سامنے غنا کا مسئلہ بیان کیا گیا تو انہوں نے امام صاحب کے پڑوسی کے غنا کا قصہ بیان کیا۔ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اکثر ہارون رشید کی محفل میں ہوتے تھے اور اس کی مجلس میں غنا ہوتا تھا تو آپ سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے غنا کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا اپنے شہروں میں میں نے علماء کو پایا ہے جو اس کے منکر نہیں ہیں اور وہ اس میں بیٹھتے ہیں اور فرمایا اس کا منکر وہی ہے جو اندھا، جاہل اور عراقی ہے اور جس کی طبعیت مردہ ہے اسی طرح امام غزالی نے اس میں نقل فرمایا ہے۔ اور امام قشیری، استاد ابوالمنصور اور قفال وغیرہ سے اس کی اباحت کی حکایت کی گئی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جو مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اسے فاسق وفاجر ہی سنتے ہیں تو یہ اس غنا پر محمول ہے جس میں فحش کلامی اور منکر باتیں ہوں یہ ان کے قول وفعل میں جمع وتطبیق میں ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان جسے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان کے مذہب میں غنا حرام نہیں ہے۔ میں نے بھی اس قول کو ان کی کتابوں میں بہت تلاش کیا مگر اس کی حرمت میں ان کی کوئی نص نہ دیکھی۔ اور استاد ابوالمنصور بغدادی فرماتے ہیں کہ ان کے مذہب میں سماع کی اباحت ہے اس شرط کے ساتھ کہ مرد، مرد سے یا باندی سے یا بیوی سے یا اس عورت سے جس پر نظر ڈالنا حلال ہے اس کی آواز سے یا تو اپنے گھر میں سنے یا اپنے مخصوص دوستوں کے گھر میں سنے اور سر راہ اسے نہ سنے اور کوئی خلاف شرع، منکر چیز کو سماع میں شامل نہ کرے اور اس کے سبب نماز کے اوقات کو ضائع نہ کرے۔

ابومنصور بغدادی، یونس بن عبدالاعلیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ایسی مجلس میں شریک ہونے کے لئے بلایا جس میں ایک شخص گا رہا تھا جب گانا ختم ہوا تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کیا تمہیں پسند آیا میں نے کہا نہیں۔ فرمایا اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو تمہاری حس صحیح نہیں ہے مطلب یہ کہ غنا کو پسند کرنا سلامتی حس وطبع کی علامت ہے اور اسے ناپسند کرنا طبیعت کی کجی اور حس کی کمی کا نشان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دلیل شرعی اس کی حرمت یا کراہت میں نہیں ہے اگر ہوتی تو طبیعت کو اسے پسند کرنا کیا کام دیتی ہے۔ اس لئے کے طبیعت میں نغمہ کی تاثیر سے کسی کو کلام نہیں ہے۔ یہ تاثیر تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ آدمی، امام شافعی سے منقول ہے کہ ''اَلْغِنَاءُ لَهْوٌ مَّكْرُوْهٌ يُّشْبِهُ الْبَاطِلَ'' غنا ایک کھیل ہے جو مکروہ ہے اور باطل کے مشابہ ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ممکن ہے مکروہ سے مراد یہ ہے کہ اس کا ترک اولیٰ ہے۔ کیونکہ اس کا اطلاق اس معنی میں بھی آتا ہے اور امام غزالی فرماتے ہیں کہ یہ قول حرمت وکراہت پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ اگر صرف باطل ہی فرماتے تب بھی اس پر دلالت نہ ہوتی۔ اس لئے کہ باطل کے معنی یہ ہیں کہ جس میں فائدہ نہ ہو۔ اور مباح وہ ہوتا ہے جس میں فائدہ نہ ہو۔ (امام غزالی فرماتے ہیں کہ وہ روایتیں جن کے الفاظ غنا کی تغلیظ پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ اگر صرف باطل ہی فرماتے تب بھی اس پر دلالت نہ ہوتی۔ اس لئے کہ باطل کے معنی یہ ہیں کہ جس میں فائدہ نہ ہو۔ اور مباح وہ ہوتا ہے جس میں فائدہ نہ ہو)۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ وہ روایتیں جن کے الفاظ غنا کی تغلیظ پر دلالت رکھتے ہیں۔ وہ ان پر محمول ہیں جو فحش یا منکر کلام پر مبنی ہیں۔ لہٰذا حرمت کسی عارضی کی بنا پر ہے نہ اس معنی میں کہ غنا اپنی ذات میں حرام ہے۔ خلاصہ بحث یہ ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول وفعل سے تحقیق کے ساتھ وہ چیز صحت کو پہنچتی ہے جو اس کے مباح ہونے میں صریح ہے اور حرمت میں کوئی نص نہیں ہے۔

لیکن امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے اپنے فرزند حضرت صالح کے یہاں گانا سنا ہے۔ چنانچہ ابوالعباس فرغانی روایت کرتے ہیں کہ میں نے صالح بن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں سماع کو پسند کرتا تھا اور میرے والد ناخوش جانتے تھے تو میں نے ابن حنادہ سے وعدہ لیا کہ ایک رات تم میرے یہاں رہو۔ تو وہ میرے ہاں رہا۔ جب میں نے اطمینان کرلیا کہ میرے والد سو گئے ہیں تو ابن حنادہ نے گانا شروع کیا اتنے میں' میں نے چھت پر چلنے کی آواز سنی تو میں نے چھت پر جا کر دیکھا کہ میرے والد چھت پر چادر لپیٹے گانا سن رہے ہیں اور آہستہ ٹہل رہے ہیں۔ گویا کہ وجد کی کیفیت میں ہیں۔ اسی قصہ کی مانند عبداللہ بن امام احمد بن حنبل سے بھی منقول ہے یہ دلالت کرتی ہے کہ ان کے نزدیک سماع مباح ہے اور اس کے برعکس جو ان کا قول منقول ہے وہ غنائے مذموم پر محمول ہے جو فحش ومنکر پر مبنی ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے قوالی کو اپنے فرزند صالح کے پاس سنا اور انکار نہ کیا اس پر ان کے صاحبزادے نے عرض کیا اے پدر بزرگوار! کیا آپ اس کا انکار نہ فرماتے اور مکروہ نہ جانتے تھے فرمایا مجھے ایسی خبر دی گئی ہے کہ اس کے ساتھ منکرات کا استعمال کرتے ہیں۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ سماع میں تشریف لاتے تو ان کی کمر سماع میں سیدھی ہو جاتی تھی باوجود یہ کہ کبرسنی کے باعث ان کی کمر جھک گئی تھی۔ یہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ بڑے عالم، فقیہہ، حنفی اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص تھے۔

فقیہہ وعالم ناصر الدین ابوالمنیر اسکندری اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں کہ اگر سماع اپنے شرائط کے ساتھ اپنے محل اور اپنے اہل میں ہو تو صحیح ہے اور اس قول کو ابوبکر فلال صاحب جامع اور ان کے مصاحب عبدالعزیز رحمہما اللہ نے جو کہ دونوں حنبلی ہیں اختیار کیا ہے اور کتاب ''مستوعب'' کے مصنف نے حنبلیوں کی ایک جماعت سے سماع کو نقل کیا ہے جن میں سے حضرت صالح اور حضرت عبداللہ امام احمد کے صاحبزادے بھی ہیں اور اسے حافظ ابوالفضل مقدسی وغیرہ، ظاہریہ نے اختیار کیا ہے۔ اور اسے ابومحمد خرم نے اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے۔ اور ان کا اس ضمن میں ایک رسالہ ہے۔ اور ابن طاہر نے اپنی تصنیف میں صحابہ وتابعین کا اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اور اپنی

روایتوں کے راویوں کو مضبوط کیا ہے اور شیخ تاج الدین عبدالرحمٰن فرادی شافعی دمشق کے شیخ و مفتی نے نقل کیا ہے کہ ابن قتیبہ سماع پر اہل حرمین کا اجماع نقل کرتے ہیں اور ابن قتیبہ نے اکثر اہل عراق سے نقل کیا ہے۔ اور ابن طاہر اپنی سند سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم اہل مدینہ کو کسی چیز پر اجماع کرتے دیکھو تو جان لو کہ یہ سنت ہے۔ یونس عبدالاعلیٰ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام شافعی سے اہل مدینہ کا سماع کی اباحت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا میں حجاز کے کسی ایسے عالم سے واقف نہیں جس نے سماع کو مکروہ جانا ہو۔ البتہ انہیں جانتا ہوں جنہوں نے اس کی تعریفیں کی ہیں۔

اور ابویعلیٰ حنبلی نے بیان کیا ہے کہ یوسف بن یعقوب ماجشون اور ان کے دیگر بھائیوں نے سماع کی اجازت دی ہے اور یحییٰ بن معین نے جو کہ اعاظم علمائے حدیث ہیں فرمایا کہ ہم یوسف ماجشون کے پاس آتے تو وہ ہمیں گھر میں حدیث سنایا کرتے اور ان کے ہمسائے کے دوسرے گھر سے گانے باجے کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ یہ وہ ثقہ علماء و محدثین ہیں جن کی حدیثیں صحاح میں شامل ہیں اور عبدالعزیز بن سلمہ ماجشون جو کہ مفتی اہل مدینہ تھے فرماتے ہیں کہ ان سے ائمہ محدثین نے روایتیں لی ہیں اور ان سے تخریج کرنے کے بعد حدیثوں کو بخاری و مسلم میں شامل کیا ہے۔ یہ حضرات بربط کی اجازت دیتے تھے صاحب نہایہ نے شرح ہدایہ میں احناف سے حرمت کا قول نقل کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ بعض احناف اس وقت میں غنا کی اباحت کے قائل ہیں۔ جب کہ استعارات حاصل کرنے اور نظم کے قوافی درست کرنے اور زبان کو فصیح بنانے کے لئے گنگنایا جائے اور کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں اور بعض احناف کہتے ہیں کہ اگر تنہا ہو اور وحشت کو دور کرنے کے لئے اپنے آپ میں گنگنائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ اسے شمس الائمہ سرخسی نے اخذ کیا ہے اور اس سے استدلال کرتے ہیں کہ انس بن مالک رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر میں ہوتے تھے تو اُسے بطریق کھیل کے نہ کرتے تھے اور فرماتے ہیں کہ جو مطلقاً کراہت کا قائل ہے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو مباح اشعار پر محمول کرتے ہیں اور صاحب بدائع نے جزم کیا ہے کہ احناف سے شمس الائمہ سرخسی نے جو چیز ذکر کی ہے اور اسے سماع غناء بزم سے معلول کیا ہے کہ وہ دل میں گنگنائے اور صاحب ذخیرہ نے احناف سے نقل کیا ہے کہ بعض احناف عرسوں میں سماع کو کوئی مضائقہ نہیں بتاتے۔ اور بعض نے عیدین اور تمام مباح خوشی کے اوقات میں کوئی مضائقہ نہیں کیا ہے۔ اسے علماء متقیین میں سے شیخ اسلام ابومحمد بن عبدالسلام اور ان کے مصاحب شیخ محمد بن دقیق العید نے اختیار کیا ہے۔

صاحب کتاب ''امتاع'' فرماتے ہیں کہ بلاشبہ صوفیائے کرام میں بکثرت فقہاء و محدثین اور علوم شرعیہ کے انواع کی معرفت رکھنے والے ہوئے ہیں جیسے استاد ابوالقاسم قیشری، شیخ ابوطالب مکی اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ، یہ تمام حضرات اپنے رسائل و تصانیف میں وہ چیزیں بیان کرتے ہیں جو سماع کی اباحت پر قول و فعل سے دلالت کرتے ہیں اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایسے فقیہہ تھے جو مذہب ابوثور پر فتویٰ دیتے تھے اور ان سے امام قشیری اور شیخ سہروردی وغیرہ رحمہما اللہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت جنید رحمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ صوفیائے کرام کی جماعت پر رحمت الٰہی کا نزول تین وقتوں میں ہوتا ہے ایک کھانے کے وقت اس لئے کہ وہ نہیں کھاتے مگر فاقہ کے وقت۔ دوسرے ہم نشینی اور مکالمت کے وقت، اس لئے کہ یہ حضرات صدیقین انبیاء و مرسلین کے مقامات میں ان کے قائم مقام ہو کر کلام فرماتے ہیں اور تیسرے سماع کے وقت اس لئے کہ یہ حضرات اس وقت حق و تعالیٰ کے وجد و شہود میں ہوتے ہیں۔ اور صحابۂ کرام کے علماء کی جماعت نے اس باب میں بہت زیادہ حکایتیں نقل کی ہیں جن کا ذکر ان حضرات نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

مسئلہ سماع میں نصیحت: وصل: جاننا چاہئے کہ صاحب کتاب ''متاع'' نے سماع کے بارے میں تین قول ذکر کئے ہیں۔ حرمت، کراہت اور اباحت۔ اس کے بعد ہر مذہب کے دلائل بیان کرنے کے بعد مذہب اباحت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کا مدعا ہے اور حرمت و کراہت کے استدلات اور تمسکات کا جواب دیا ہے۔ اور مذہب اباحت کے اثبات میں کلام کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اور اسے کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے ثابت کیا ہے اور قیام کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ سنت صحیحہ میں تغنی بالقرآن کا جواز ثابت ہے تو شعروں میں بھی جائز ہوگا اور اجتماع سے اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن میں تغنی یعنی خوش آوازی سے سوز وگداز 'ورشوق بڑھتا ہے۔ اور خشوع وخضوع کو خوب پیدا کرتا ہے تو یہ بات اشعار میں بھی ہے کیونکہ یہ طاعات ومناجات اور دنیا میں زہد اور آخرت کے شوق کو خوب اضافہ کرتا ہے اور محبت الٰہی عزاسمہ اور متابعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادتی کا موجب ہے تو یہ بھی جائز ہوگا اور بعض اہل عرب کی حدی، نصب اور نشید وغیرہ کی قسموں پر قیاس کرکے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ تمام اقسام باتفاق جائز ومباح ہیں تو یہ بھی جائز ہے۔ یہ سب بحثیں اسی تقدیر وصورت میں رونما ہو رہی ہیں کہ غنا کی حرمت وکراہت پر کوئی قطعی نص ثابت نہیں ہے۔ ورنہ نص کے مقابلے میں قیاس کرنا لازم آتا ہے اور اباحت کے قائلین کہتے ہیں کہ اس جانب یعنی حرمت وکراہت پر کوئی نص نہیں پائی جاتی۔ اگر کوئی نص پائی بھی جاتی ہے تو وہ مرتبہ صحت کو نہیں پہنچتی۔ اور کاتب الحروف کا اباحت کے قائلین کے اقوال کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے تاکہ معلوم ہو جائے یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور ایک جانب جزم کرنا اور اس کی ترجیح دینا اور اس میں تعصب دکھانا طریقہ اختلاف کے مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی کو اس میں وقت کی اصلاح نظر آتی ہے تو توقف کرے۔ اور احتیاط ملاحظہ کی روش اختیار کرے اور خلاف ونزاع کے بھنور میں نہ پڑے۔ اور اس میں اپنے حال کی سلامتی دیکھے اور اس میں احتیاط وتقویٰ نظر آئے تو مبارک ہے لیکن چاہئے کہ قال وحال کی زبان کو بزرگان دین پر طعن وتشنیع اور تضلیل وتفسیق سے آلودہ نہ کرے اور ان کے حالات میں پڑے بھی نہیں باوجود یہ کہ دلائل متعارض ہیں اور طریقے متبائن ہیں اور دوسری جانب بھی علماء وفقہا اور عرفا موجود ہیں تو کسی ایک جانب کو ترجیح دینے اور دوسرے کو مرجوح کرنے سے باز رہے اور انصاف کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ بیت ؎

صحبت وعافیت است گرچہ خوش افتادے دل　　　جانب عشق عزیز است فرومگزارش

اور اباحت کے قائلوں کو مناسب نہیں ہے کہ تعصب برتیں اور علماء کے اقوال کے منکر ہو جائیں خصوصاً وہ حضرات جو دیانت و نصیحت کے طریقے کے مالک ہیں: وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ اور ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جسے وہ اختیار کرتا ہے تو تم بھلائی میں سبقت کرو۔ دونوں گروہوں کو چاہئے کہ تمیز وتفصیل کے طریقہ کی رعایت کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ تمام کاموں میں توقف واحتیاط محمود ہے اور ہر جگہ افراد وتفریط مذموم وبرا ہے وَبِاللہ التوفیق و منه العصمة.

ساز ومزامیر: اسی طرح صاحب کتاب ''امتاع'' نے ساز ومزامیر میں بھی بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ چاروں ائمہ کے مذاہب میں مزامیر حرام ہے۔ اس کے باوجود بعض علماء شوافع اور اصحاب ظواہر اور امام غزالی وغیرہ۔ ن کے خلاف نقل کرکے آلات و مزامیر کے اقسام کا ذکر کیا ہے۔ لیکن دف مختلف فیہ ہے۔ بعض نے مطلقاً مباح کہا اور بعض نے مطلقاً حرام رکھا ہے اور بعض نے جھانجہ دار اور بغیر جھانجہ سے تفریق کی اور درست بات یہ ہے کہ نکاح میں یہ مباح ہے اور بعض بوقت اعلان دف کو مستحب قرار دیتے ہیں اور شبابہ یعنی بانسری میں بھی اختلاف مذکور ہے اور مزامیر میں سے عود ہے جسے بربط بھی کہتے ہیں اور اس میں بہت سے تار ہوتے ہیں۔ جس سے آواز میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے اور فرماتے ہیں کہ مذاہب اربعہ میں معروف یہ ہے کہ ان کا بجانا اور سننا دونوں حرام ہیں اور علماء کی ایک جماعت اس کے جواز کی طرف گئی ہے۔ اور وہ حضرت عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا سننا بیان کرتے ہیں وہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تو ان کے آگے باندی کو بربط بجاتے دیکھا اس پر حضرت عبداللہ بن جعفر نے حضرت عبداللہ بن عمر سے کہا آپ اس میں کوئی مضائقہ دیکھتے ہیں۔ فرمایا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور علماء حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت امیر معاویہ بن ابوسفیان، حضرت عمرو بن العاص اور حسان

بن ثابت رضی اللہ عنہم اور غیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عبدالرحمٰن بن حسان، خارجہ بن زید جو کہ فقہاء سبعہ مدینہ میں سے ہیں اس کا سننا نقل کرتے ہیں۔ استاد ابومنصور نے زہری سے اور سعید بن المسیّب نے ابن ابی رباح، شعبی اور عبداللہ بن ابی العتیق وغیرہ فقہا مدینہ منورہ سے نقل کیا ہے۔ اور خلیلی، عبدالعزیز بن ماجشون سے نقل کرتے ہیں کہ وہ عود یعنی بربط کی اجازت دیتے تھے اور ابن سمعانی نے طاؤس سے نقل کیا ہے اور ابراہیم بن سعد سے مروی ہے کہ خلیفہ رشید کے پاس انہوں نے کہا عود لاؤ۔ اس پر رشید نے کہا عود جلانے کی یا عود باجے کی۔ فرمایا عود، باجے کی، پھر رشید نے عود یعنی بربط منگایا اور اسے ابراہیم بن سعد نے بجایا اور غنا اور عود کے مباح ہونے کا فتویٰ دیا۔ اور فاکہی نے تاریخ مکہ میں باسناد خود نقل کیا کہ موسیٰ بن الغرہ انجی سے منقول ہے کہ انہوں نے عطا بن ابی ریاح کو بلایا جب وہ آئے تو وہاں کچھ لوگوں کو بربط بجاتے اور گاتے پایا اس پر لوگوں نے انہیں آتے دیکھ کر گانا باجا بند کر دیا انہوں نے فرمایا میں نہیں بیٹھوں گا جب تک بربط نہ بجاؤ اور جو گا رہے تھے نہ گاؤ تو وہ بیٹھے اور لطف اندوز ہوئے۔

صاحب ''امتاع'' نے اس عود و بربط کو اصل قرار دے کر تمام آلات و مزامیر کو بھی اس پر قیاس کر کے نقل کیا۔ اور فرمایا کہ حرمت کے قائلوں کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ یہ باجا گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ متاخرین شوافع کا مذہب یہ ہے کہ یہ صغیرہ ہے۔ یہ چند کلمے کتاب مذکور سے نقل کئے گئے ''والعہدۃ علیہ۔'' اس نقل کرنے سے مقصد وغرض یہی ہے کہ اگر کبھی اس جماعت صوفیا سے کوئی ایسی چیز منقول ہو جائے تو تشدید و تجہیل، تشنیع و تفسیق اور تضلیل میں مبالغہ نہ دکھانا چاہئے اور قوم کے عیوب و لغزشوں کے چھپانے کا شیوہ اور اپنا شعار بنانا چاہئے۔ اور عوام کی حفاظت میں مشغول رہنا چاہئے۔ ان کی اس میں پیروی نہ کریں: فَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَحْکَمُ اس ضعیف نے اس مسئلہ میں متعدد جگہوں میں بحث کی ہے۔ اور ہر جگہ تفصیل و تردید اور توسط کے طریقہ کو ملحوظ رکھا ہے یا قدرے حرمت و کراہت کی جانب میلان کیا ہے لیکن اس کتاب میں اقوال کے نقل میں اباحت کی جانب غلبہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا رخ ذہنوں میں مشہور و مقرر ہو چکا ہے ان کے نقل کی حاجت نہ تھی۔ ہماری نیت یہی ہے کہ جو کسی نے کہا ہے شعر ؎

عیب می چوں ہمہ گفتی ہنرش نیز بگو
نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ وَالْعَاقِبَۃُ بِالْخَیْرِ

جاننا چاہئے کہ ہر زمانہ میں ابتدائے حال سے لے کر آج تک جو بھی تغنی و سماع کی اباحت کی جانب قول و فعل سے گیا ہے۔ اور جس نے اس کا انکار و استبعاد کیا اور اس کی طرف توجہ دی ہے اس نے ان تمام حکایتوں اور روایتوں کو جو اس باب میں مروی ہیں واضح کیا ہے۔

مشکوٰۃ میں مروی ہے کہ ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ جن کو بدری بھی کہتے ہیں یا تو اس سبب سے کہ وہ غزوۂ بدر میں حاضر ہوئے یا اس سبب سے کہ ان کا مسکن بدر میں تھا وہ اور ایک اور صحابی ساتھ بیٹھتے تھے اور وہ گاتے تھے یہ سنتے تھے۔ ایک اور شخص جو موجود تھا اسے ان کا گانا سننا گراں گزرا اس نے اعتراض کیا اور کہا'' اے صاحبی رسول اللہ انتم'' مطلب یہ کہ تم دونوں رسول اللہ کے صحابی ہو اور گانا سن رہے ہو تو انہوں نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو تم بھی سنو اور ہمارے ساتھ بیٹھ جاؤ اور سنو ورنہ چلے جاؤ۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے کہ ہم سنیں، اور یہ شادی کا موقع تھا اس میں باتفاق تغنی مباح ہے اور اس سے بالاتر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ تھے وہ تو اس میں بہت ہی شغف رکھتے تھے۔ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس میں ان کے ساتھ شریک و موافق تھے اور ان دونوں میں باہمی بہت محبت و دوستی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن جعفر پر اعتراض کیا اور ان کو برا کہا اور کہا کہ ان کا تو یہ حال ہے تم کس بنا پر ان کے معتقد ہو گئے ہو۔ دوسرے دن حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھر آئے تو انہوں نے کثرت کے ساتھ نماز پڑھی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ سے کہا اب انہیں دیکھو کہ یہ کیا کر رہے

ہیں۔ اس کے بعد ان کی زوجہ نے زبان اعتراض بند کر لی۔

اس حقیقت حال اور منشاء اختلاف سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گانا سننا اور آلات ومزامیر کا بجانا زمانہ قدیم میں بے قید لوگوں، فاسقوں اور شراب خوروں اور لہو ولعب میں مشغول لوگوں کا کام تھا اسی بنا پر حدیث صحیح میں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بھیجا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ میں معازف یعنی آلات ومزامیر کو جو کھیل کود میں بجتے ہیں مٹاؤں اور شراب پینے اور زنا کرنے سے روکوں۔

دراصل غنا کا نام ہی لہو ہے اور اس کا ذکر ملاہی میں کرتے ہیں۔ اور ان ملاہی کے محو وفنا ہونے اور ان ممنوعات ومنکرات کے رفع وازالہ ہو جانے کے بعد جو عام رسم وعادت تھی نہ رہی تو مسلمان وصلحاء اور پارسا حضرات اس سے محفوظ ہوئے اور فسق ومنکرات کی آمیزش اور فساق وفجار سے اختلاط کے بغیر اس سے لطف اندوز ہوئے۔ اور جب دوسری جماعت نے دیکھا کہ یہ تو بے قید فاسقوں کی عادت وعلامت ہے۔ اور ان کی حالت کے مشابہ ہے تو اس خوف سے کہ کہیں اس کا سرا ان سے نہ مل جائے۔ بچنے لگے اور ڈرانے لگے۔ اور شارع علیہ السلام نے بھی اگر اسی کے پیش نظر ڈرایا اور وعید صادر فرمائی ہو تو بعید نہیں۔ اور یہ جو محدثین فرماتے ہیں کہ شارع علیہ السلام کی ممانعت ثبوت تک نہیں پہنچتی۔ اور اس باب میں کوئی صحیح حدیث نہیں ملی۔ اسے برقرار رکھتے ہوئے بات یہ ہے کہ دائرۂ صحت، ان کی اصطلاح کے بموجب بہت تنگ ہے۔ اور ان کی مراد یہ ہوگی کہ اس کی مطلقاً ممانعت اور اس کی حرمت فی نفسہٖ غنا میں ثابت نہیں ہے جس طرح کہ شراب اور زنا وغیرہ میں فی نفسہ حرمت ہے۔ اور یہ جو اہل ظواہر کہتے ہیں کہ کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی ہے تو یہ مکابرہ سے خالی نہیں اس کی مثال ان برتنوں اور پیالوں کے قضیہ کی سی ہے جن کا نام خم، فرقت، نفیر اور وبا ہے۔ جسے وہ اباحت خمر کے وقت استعمال کرتے تھے۔ اور ان میں شراب پیتے تھے۔ اور جب شراب حرام ہوئی تو اس قسم کے برتن وپیالے جن میں وہ شراب پیتے تھے ان کا استعمال بھی کچھ عرصے تک حرام رہا۔ تاکہ ان کے آثار کا قطعی طور پر قلع قمع ہو جائے۔ جب شراب کی حرمت رچ بس گئی اور ثابت ومقرر ہوگئی اور اس کی علامتوں اور نشانیوں کے قلع قمع کرنے کی حاجت نہ رہی تو ان برتنوں سے ممانعت اٹھا لی گئی۔ اس کے باوجود علماء دائمہ دین کے دو فرقے ہو گئے۔ ایک جماعت تو ان کی ممانعت پر قائم رہی اور دوسری جماعت اس کے جواز کی جانب آ گئی جیسا کہ اس کے مقام میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس میں بھی دو فرقے ہو گئے۔ ایک فرقہ تو قدیم عادت کے پیش نظر کہ یہ فساق وفجار کا کام تھا ممانعت اور احتیاط کی روش کو اختیار کرنے میں ثابت قدم رہا ہے۔ اور دوسرا فرقہ اس کی حقیقت حال اور معنی کے پیش نظر اس سے ملحق رہا ہے کیونکہ اگر اس میں فسق وفجور اور ممانعت شرعی کی آمیزش ہے تو حرام ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو مباح ہے (واللہ اعلم وعلمہ احکم)۔

اس کے بعد ان حضرات کے درمیان تعصب وتشدد رونما ہو گیا۔ مانعین افراط سے کام لیتے ہوئے ان کے مرتکبین کو مطلقاً فسق وکفر اور زندقہ سے منسوب کرنے لگے اور اسے مباح جاننے والے اس کو خاص طاعت اور محض عبادت قرار دینے لگے۔ اور ہر وقت خود بھی اس میں مشغول رہنے لگے۔ اور دوسروں کو بھی مشغول رکھنے لگے۔ اور مجمع اور معرکہ بنانے لگے۔ اور یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو اہل ونااہل قرار دینے لگے اور انصاف کا رشتہ جس کے معنی ''نِصْفٌ لِیْ وَنِصْفٌ لَكَ'' ہے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور طریقہ ادب کو جس کی حقیقت ہر چیز کی حدوں کو محفوظ رکھنا ہے ملحوظ نہ رکھا۔ ایک کا منشائے اختلاف یہ ہے کہ ایک گروہ نے باطن میں نغمے کے تصرف وتاثیر پر نظر رکھی اور وہ بے خود ہو گئے۔ اور دوسرے گروہ کو فقہی جواز وعدم جواز نظر آیا تو وہ اپنی جگہ قائم رہا۔

شیخ ابن العربی فرماتے ہیں کہ بالذات نغمہ کی تاثیر، روح حیوانی پر ہوتی ہے۔ اور حرکت واضطراب میں لانا اس کا کام ہے۔ اور روح انسانی اس سے منزہ وپاک ہے۔ کیونکہ وہ معانی کا محل ورود ہے اور سکون وتوانائی اس کی صفت ہے۔ لیکن اس جگہ کسی کو یہ بات کہنے کا کہاں حق ہے۔ ہاں نغمہ کی تاثیر بالذات، روح حیوانی پر ہوگی لیکن اگر اتصال وہمسائیگی کی واسطہ سے جو روح حیوانی اور روح انسانی

میں ہے یہ حالت اس میں سرایت کر جائے تو کون مانع ہے۔

شیخ ابن العربی فرماتے ہیں کہ باطن میں قرآن کی تاثیر کی علامت ہے کہ غنا اور بغیر غنا کے یکساں ہو اور وہ جو نغمہ سے اثر نمودار ہوتا ہے تو وہ قرآن کی تاثیر نہیں ہے بلکہ یہ نغمہ کی تاثیر ہے نہ کہ قرآن کی۔ یہ بات تکلف سے خالی نہیں ہے۔ نغمہ قرآن کا زیور اور اس کی زینت ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ زَيِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ۔ اپنی خوش آوازی سے قرآن کو زینت دو۔ اور نغمہ اور بغیر نغمے کے دونوں حالتوں میں یکساں ہونا دائرۂ امکان سے خارج ہے۔ مگر وہ شخص جسے مجرد ذات وصفات الٰہی مکشوف ومشہود ہے۔ اس میں یہ تاثیر ممکن ہے۔

فائدہ: صاحب ''امتاع'' فرماتے ہیں کہ علماء کا اختلاف ہے کہ عرب میں سب سے پہلے کس نے نغمہ گایا۔ اس پر ابو بلال عسکری کہتے ہیں کہ اکثر اہل علم کا خیال ہے کہ اس کا نام ''طویس'' ہے یہ اس طرح شروع ہوا کہ جب ابن زبیر کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو فارس وروم کے لوگ خوش آوازی سے گاتے جاتے تھے۔ اور جب عرب کے گانے والوں نے اسے سنا تو انہوں نے اس کو عربی میں منتقل کر لیا سب سے پہلے جس نے پہل کی وہ طویس تھا اور طویس کو ''میشوم'' بھی کہتے ہیں جس کے معنی نامبارک کے ہیں۔ یہ اس بنا پر کہ اس کی پیدائش اس دن ہوئی جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے وفات کے دن اس کا دودھ چھوٹا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وفات کے دن وہ بالغ ہوا تھا اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے وفات کے دن اس نے نکاح کیا اور حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ اور کہتے ہیں کہ اس غنائے موسیقی کے نقل سے پہلے عرب میں غنا از قسم حسن صوت تھا۔ مثلاً نصب، نشید اعراب، حدی اور رکبانی وغیرہ یہ تمام قسمیں مباح ہیں اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور جو لوگ حرمت کے قائل ہیں وہ گانے کو غنائے موسیقی پر محمول کرتے ہیں۔ اور وہ جو صحابۂ کرام، تابعین وغیرہ اسلاف سے جو اخبار وآثار مروی ہیں اور جو ان کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے انہیں غنائے موسیقی پر محمول نہیں کرتے بلکہ قدیم اہل عرب کی خوش آوازی میں سے نصب، نشید حدی وغیرہ پر حمل کرتے ہیں البتہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جیسے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ کا باندی سے غنائے موسیقی سننا مروی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بعض گانے والیوں سے بھی سنتے تھے۔ حقیقت میں ایسے تمام گانوں کی صورتیں ایک ہی ہیں جو صوت حسن کی طرف راجع ہیں۔ اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے (قواعد موسیقی کے زمرے میں نہیں ہیں۔) البتہ قرأت قرآن میں فرق کرتے ہیں کیونکہ غنائے موسیقی میں تمطیط وتغییر یعنی مد وجزر بہت ہے۔ لیکن غنا وسماع اس اعتبار سے کہ اس میں سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور اصحاب وتابعین کا اقتضاء ہے۔ اس تقرب وتعبد کے طریقے پر اس کا اجتماع کر رہے ہیں۔ اس میں خلجان اور اشتباہ باقی ہے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محل ومقام دوسروں کے اوضاع ومشارب سے برتر واعلٰی اور مختلف ہے۔ دوسروں میں کہیں تورع واتقاء غالب ہے اور دامن احتیاط ملحوظ خاطر ہے۔ اور طاعت وعبادات میں ذوق وشوق اور اس کی جمعیت میں مستغرق ہیں۔ اور کہیں سکر ومستی نے غلبہ کر رکھا ہے۔ اور ان کا ذوق وشوق سماع میں پڑ گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ ایسا معاملہ ہے۔ جو مختلف فیہ ہے اور مختلف فیہ معاملہ میں ایک دوسرے پر عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں ہونی چاہئے ہر ایک کو اپنے اپنے حال میں رہنا چاہئے: فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلاً۔ تو تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون شریعت میں زیادہ ہدایت یافتہ ہے:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَيْهِ الْمَرْجِعُ وَالْمَاٰبُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى سَيِّدِ الْخَلْقِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ هُدَاةِ طَرِيْقِ الْحَقِّ وَمُحْيِي عُلُوْمِ الدِّيْنِ اٰمِيْنَ۔

باب یازدہم

کھانے، پینے، پہننے، نکاح کرنے اور سونے میں عبادت شریف

نوعِ اوّل درطعام وآب: جاننا چاہئے کہ کھانا پینا ضروریات زندگی میں سے ہے، اور قوت وطاقت کا قیام اور عبادات میں صدور حرکات اس کے بغیر محال عادی کے قسم سے ہے۔ لہٰذا عبادت گزاروں پر لازم ہے کہ بقدر احتیاج ان کا استعمال کریں اور حرص وطمع سے اجتناب کریں۔ اور ان کی شہوتوں میں مبتلا نہ ہوں۔ مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاعمر شریف شکم سیری نہ فرمائی۔ عطاء فرماتے ہیں کہ شکم سیری ایسی بدعت ہے جو قرن اول کے بعد ظاہر ہوئی اسے امام نووی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے مقدام رضی اللہ عنہ بن معدی کرب کی اس حدیث کی صحت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن آدم نے اپنے پیٹ سے بدتر کسی برتن کو نہیں بھرا ہے۔ حالاں کہ اسے اتنے لقمے کافی تھے کہ جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی کھڑی ہو سکے۔ اگر وہ زیادہ ہی کھانا چاہتا ہے تو پیٹ کے برتن کے تین حصے کرے۔ ایک حصہ کھانے کے لئے اور ایک حصہ پانی کے لئے اور ایک حصہ سانس کے لئے بنائے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اگر بقراط اس تقسیم کو سنتا تو حیرت وتعجب کرتا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ مسلمان ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔ اہل تشریح کہتے ہیں کہ آدمی کی سات آنتیں ہیں ایک معدہ اور تین اس کے قرب کی آنتیں جن کو بواب، صایم اور رقیق کہتے ہیں۔ اور تین اور ہیں جن کو اعور، قولون اور مستقیم کہتے ہیں اور مستقیم پیخانہ کی آنت ہے۔ اور اس کے قریب دبر یعنی مقعد ہے۔ اور یہ غلیظ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمانے کا مقصد، مسلمان کی کم خوری اور کافر کی بسیار خوری ہے۔ اور بسیار خوری کی جانب مبالغہ فرمانا ہے۔ حقیقۃً آنتوں کی گنتی مراد نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمان جب کھاتا ہے تو عبادت کے اسباب کی حفاظت کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کھانے سے بھوک کو مارنا اور عبادت پر مدد کرنا ہے نہ کہ تن پروری وہ قدر ضرورت سے زیادہ نہیں کھاتا۔ رہا کافر تو اس کا مقصود ومطلوب بدن پروری اور نفسانی شہوت کی تکمیل ہے۔ اس کی حالت مسلمان کے برخلاف ہے لیکن واضح رہنا چاہئے کہ یہ بات ہر مسلمان اور ہر کافر میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان اپنی عادت کے موافق یا کسی طبعی عارضہ سے یا اپنے کسی مرض کے باعث بسیار خوری کرتا ہو اور کافر کم خور ہو خواہ وہ ضعف معدہ کی وجہ سے یا اطباء کے اصول صحت کی وجہ سے یا راہبوں کے طریقہ پر ریاضت کی وجہ سے ہو۔ علماء فرماتے ہیں جس کی فکری قوت زیادہ ہوتی ہے اس کی غذا کم ہوتی ہے اور اس کا دل نرم ہوتا ہے۔ اور جس کی فکری قوت کم ہوتی ہے اس کی غذا زیادہ ہوتی ہے اور وہ سخت دل ہوتا ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ جس کا معدہ کھانے سے بھرا رہتا ہے اس میں حکمت ودانائی پیدا نہیں ہوتی اور جس کا معدہ کھانے سے کم پر ہے اس کا پینا بھی کم ہے اور اس کا سونا بھی کم ہے۔ اور جس کا سونا کم ہے اس کی عمر میں برکت ہے اور جس کا سونا بہت زیادہ ہے اس کی عمر میں بے برکتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میں شکم سیر لوگ، آخرت میں بھوک والے ہیں۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی شکم سیری نہ فرمائی۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل وعیال میں تشریف فرما ہوتے تو آپ ان سے نہ کھانا طلب فرماتے اور نہ خواہش کا اظہار فرماتے اگر وہ کھانا پیش کر دیتے تو نوش فرما لیتے۔ اور جو کچھ بھی پیش کرتے قبول فرما لیتے۔ اور جو پلاتے پی لیتے۔ علماء فرماتے ہیں کہ پیٹ کا نہ بھرنا اور شکم سیری کی نفی فرمانا یہ اس شکم

سیری پر محمول ہے جس سے گرانی لاحق ہو۔ جو بسا اوقات عبادت سے روک دیتی ہے۔ اور کاہل اور سست بنا دیتی ہے۔ اور نیند غالب کر دیتی ہے۔ ایسی شکم سیری مکروہ ہے۔ اور کبھی ایسی تحریم پر منتہی ہوتی ہے جس پر فساد و بطلان مرتب ہوتا ہے اور عادۃً شکم سیری مکروہ نہیں ہے۔ غرض کہ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں مروی ہے کہ بھوک کی حالت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ باہر تشریف لائے اور ایک انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ اس نے بکری ذبح کی اور سب نے کھایا اس میں ہے کہ خوب شکم سیری ہو گئے۔ (الحدیث) شیخ محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں شکم سیری کا جواز ہے۔ اور دیگر احادیث جو اس کی کراہت میں ہیں وہ مداومت پر محمول ہیں۔ (انتہی) اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شکم سیری ثابت ہے تو دوسروں کے لئے بھی بلاشبہ درست ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں نے کبھی مسلسل تین دن پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا یہاں تک کہ حضور اس دنیا سے تشریف لے گئے اسے شیخین نے روایت کیا ہے اس حدیث کے دو مفہوم ہیں ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیری مسلسل تین دن تک نہ تھی۔ اگر تھی تو اس سے کم تر میں تھی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ تین روز تک بھوکے رہتے اور کسی دن سیری نہ ہوتی۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد دوسرا مفہوم ہے۔ (واللہ اعلم) جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل و عیال کو مسلسل راتیں گزر جاتیں مگر رات کے کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔ حالانکہ جو کی روٹی غذا تھی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اور صحیح کہا ہے۔ مسلم میں ہے کہ آل محمد دو روز تک گندم سے شکم سیر نہ ہوتے مگر یہ کہ ان دو دنوں میں ایک دن کھجور کی غذا ہوتی تھی۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حالت میں تشریف لے گئے کہ آپ کا شکم اطہر ایک دن میں دو کھانوں سے نہ بھرا اگر کھجور سے سیر ہوئے تو جو کی روٹی سے سیر نہ ہوئے اور اگر جو کی روٹی سے سیر ہوئے تو کھجوروں سے شکم سیری نہ فرمائی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ قسم ہے خدا کی آلِ محمد میں ایک صاع کھانے سے شام نہ ہوئی۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نو گھر تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات رزق الٰہی کو کم سمجھنے میں نہیں فرمائی بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ امت اس میں آپ کی پیروی کرے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے دنیا کی تین چیزیں پسند آتی ہیں ایک خوشبو، دوسرے ازواج، تیسرے طعام، تو اول دو چیزیں یعنی خوشبو اور ازواج تو موجود تھیں لیکن تیسری چیز طعام نہ تھا۔

ترمذی، شمائل میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ، سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ کو ''دقل'' میں سے اتنی چیز نہ ہوتی کہ اس سے آپ شکم سیر ہوتے ''دقل'' ایک قسم کا ایسا کھانا جس میں کھجوروں کے ساتھ دوسری اجناس ملی ہوتی ہیں اور یہ فقراء کی خوراک ہے۔

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اہل بیت ہیں جہاں ایک ایک مہینے تک گھر میں آگ نہ جلتی تھی اور ہمیں سوائے کھجور و پانی کے کوئی غذا میسر نہ ہوتی تھی ایک روایت میں ہے ہمیں دو ماہ اس حال میں گزر جاتے۔ ہمارے بعض انصاری ہمسایہ دودھ بھیج دیا کرتے اسی کو ہم سب پی لیا کرتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ راہ خدا میں اتنی بلا و مشقت پہنچی ہے کہ اتنی کسی کو نہ پہنچی ہوں گی اور دین خدا میں مجھے اتنی ایذائیں پہنچائی گئی ہیں کہ اتنی کسی کو نہ پہنچی ہوں گی اور یقیناً مجھے اور بلال رضی اللہ عنہ کو دن رات گزر جاتے مگر اتنا کھانا نہ ہوتا جسے کوئی ذی روح کھا سکتا مگر اتنا جسے بلال رضی اللہ عنہ کی بغل چھپا لیتی۔ مطلب یہ کہ اتنی کم مقدار میں ہوتی جو بلال رضی اللہ عنہ کی بغل میں چھپ جاتی اسے ترمذی نے روایت کیا اور صحیح کہا ہے۔

نے شرح مشکوٰۃ میں بیان کیا ہے۔

اور پڑھتے ل لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْـدَهٗ لَاشَـرِيْكَ لَـهٗ لَـهُ الْمُلْكُ وَلَـهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ لَامَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِىَ لِمَا مَنَعْتَ لَايَنْفَعُ ذَاالْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ.

دونوں جگہ الجد، جیم کے زبر سے ہے جس کے معنی بخت وغنٰی کے ہیں یا اس کے معنی آباء واداد کے ہیں مطلب یہ کہ خدا کے حضور غنا ونسب کام نہیں آئیں گے۔ وہاں عمل درکار ہوگا اور بعض جیم کے زیر سے بھی پڑھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کام، فضل ورحمت سے نکلے گا۔ کوشش ومحنت، علت وسبب سے نہیں علماء فرماتے ہیں کہ زیر کے ساتھ پڑھنا ضعیف ہے اور مختار زبر ہے اور پڑھتے:

لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَـعْبُـدُ اِلَّا اِيَّاهُ وَلَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَـهُ الثَّنَآءُ وَالْحَسَن لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَـهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ

امام نووی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سلام کے بعد تمام انواع ذکر پر مروی شدہ استغفار کو مقدم رکھنا چاہیے اس کے بعد اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ اس کے بعد لَآاِلٰـهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْـدَهٗ قَدِيْرٌ تک پڑھنا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث میں ہمارے شیخ الشیوخ، شیخ ابن حجر مکی نے شرح مشکوٰۃ میں بیان کیا ہے اور مسلم کی حدیث میں ہے کہ اس ذکر کو بلند آواز سے پڑھتے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ ذکر ودعا کے تمام اقسام میں افضل، اخفاء یعنی آہستہ سے پڑھنا ہے خواہ امام ہو یا منفرد اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جہر فرمانا تعلیم امت کے لیے تھا اور اگر کسی جگہ امام جہر واعلان میں مصلحت دیکھے اور تعلیم واعلام مقصود ہو تو درست ہے بلکہ مستحسن ہے۔

اور ہر نماز کے بعد معوذتین پڑھنا بھی آیا ہے اور یہ حدیث حد درجہ صحیح ہے اور موذتین، واؤ کے زیر سے، مراد معوذتین یعنی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہے۔ یہ اقل قلیل مذہب کے بموجب دونوں کو جمع کرتا ہے۔ کیونکہ حضرات سورۂ اخلاص بلکہ سورہ قل یا ایہا الکفرون کو بھی داخل کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں شرک سے برات ہے اور یہ استعاذہ کے معنی میں ہے یا وہ آیتیں مراد ہیں جو متضمن معنی استغاذہ، تفویض اور توکل کو شامل ہیں۔ معوذتین بھی انہیں میں شامل ہیں جیسے قول باری تعالیٰ: قُلْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنَ. یا جیسے اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىْ وَرَبِّكُم۔ یا جیسے: وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ وغیرہ یا کلمات معوذہ مراد ہیں اور ایک روایت میں معوذتین بھی آیا ہے۔

ہر نماز کے بعد دس مرتبہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' پڑھنا بھی آیا ہے اس میں فضل عظیم ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی کہ ہر نماز کے بعد اَللّٰهُمَّ اَعِنِّى عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ'' پڑھو اور فرمایا: اے معاذ رضی اللہ عنہ! بخدا میں یہ تمہارے پسند کرتا ہوں لہٰذا تم ہر نماز کے بعد اس کا پڑھنا نہ چھوڑنا۔ یہ حدیث علماء کے درمیان معروف ہے اور ''وَاللّٰهِ اِنِّىْ لَاُحِبُّكَ'' کے ساتھ مسلسل ہے۔ اور یہ فقیر بھی علماء کے طریقہ پر اس کی برکت سے مشرف ہوتا ہے اور نماز فجر ونماز مغرب کے بعد مشہور وردوں میں سے ایک ورد یہ مروی ہے کہ کلام کرنے سے پہلے اور ایک روایت میں ہے کہ بعد کے دوگانہ کے لیے اٹھنے سے پہلے نشست بدلے بغیر دس مرتبہ پڑھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْـدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَـهٗ لَـهُ الْمُلْكُ وَلَـهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ یہ ورد نیکیوں کو قائم رکھنے، بدیوں کو مٹانے اور درجات کی بلندی کے لیے عظیم تاثیر رکھتی ہے۔

اور بعض فرائض کے مشہور ترین ورد، ذکر معقبات (بکسر وتشدید قاف) ہے یہ وہ کلمات ہیں جو یکے بعد دیگرے مسلسل آتے ہیں وہ یہ کہ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ'' 33 بار اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ 33 بار وَاللّٰهُ اَكْبَرُ 33 بار اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْـدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَـهٗ لَـهُ الْمُلْكُ وَلَـهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ'' ایک مرتبہ پڑھ کر سو کی تسبیح مکمل کرے اسے مسلم نے

اور بعض غزوات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ درختوں کے پتے کھاتے یہاں تک کہ ان کے گلے زخمی ہو جاتے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چپاتیاں اور میدہ کی روٹیاں کبھی نہ دیکھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چھانی بھی نہ تھی۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ میں نے کتابوں میں بہت تلاش کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوراک کی روٹیاں چھوٹی ہوتی تھیں یا بڑی۔ لیکن میں نے اس بارے میں کوئی صحیح روایت نہیں پائی۔ بعض روایتوں میں اتنا حکم واقع ہوا ہے کہ چھوٹی روٹی بناؤ کیونکہ یہ برکت کا موجب ہے۔ ان کی سندیں ضعیف ہیں اور حضور کا سالن سرکہ ہوتا اور فرماتے ہیں کہ نعم الادام الخل سرکہ بہترین سالن ہے۔

جاننا چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی یہ تنگی اور معیشت میں کمی جو مذکور ہوئی دائمی نہ تھی اور سکونہ تھی اور اگر تھی بھی تو احتیاج وافلاس اور نہ پانے کی وجہ سے نہ تھی بلکہ کبھی جود وایثار کی وجہ سے نہ ہوتا اور کبھی شکم سیری کو برا جاننے کی وجہ سے۔ اور ایک ماہ مسلسل نہ کھانا ریاضت کے اختیار کرنے کی وجہ سے تھا۔ یہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں حال تھا۔ اور جب ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے تو اہل مدینہ نے مکانات، عطیات، اموال، باغات اور کھیتیاں انہیں نذر کیں۔ اور صاحب ثروت صحابۂ کرام مثلاً حضرت ابوبکر، عمر عثمان، طلحہ، سعد بن ابی وقاص وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین یہ سب حضرات اپنا جان و مال حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کرتے اور حضور نے انہیں مال پیش کرنے کا حکم فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تمام مال اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نصف مال پیش کیا۔ حضور نے جیش عسرت میں اغنیاء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مدد دینے کی ترغیب دی اور انہیں ابھارا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہزار اونٹ مع ساز وسامان کے پیش کئے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک سال تک کھانے کا انتظام اپنے گھر والوں کے لئے رکھا کرتے تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج کے موقع پر سو اونٹ لے کر چلے اور ان کی قربانی دی۔ اور امساکین کو کھانا کھلایا اور بحرین سے آئے ہوئے ایک لاکھ درہم اسی گھڑی تقسیم فرمائے اور ہوازن اور حنین میں اونٹ بکری اور سونا چاندی کی اتنی زیادہ بخشش فرمائی جو احاطہ قیاس سے باہر ہے۔ جس کی تفصیل واحوال اس کے مقام میں آئے گی۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وسعت و کشادگی کے امکان کے باوجود، فقر کو اختیار فرمایا جیسا کہ ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ارشاد فرمایا کہ بطحا اور مکہ کی پہاڑیاں میرے لئے سونے کی کر دیں جائیں مگر میں نے عرض کیا نہیں اے رب! شکم سیر ہوتا ہوں تو تیرا شکر بجالاتا ہوں اور بھوکا رہتا ہوں تو تیری ثنا کرتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کوہ صفا پر تشریف فرما تھے تو ایک ہولناک آواز سنی جس سے خوف معلوم ہوا۔ فرمایا جبریل علیہ السلام یہ دہشتناک آواز کیسی ہے کیا قیامت قائم ہوگئی ہے۔ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا قیامت نہیں ہے لیکن آپ کے رب نے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو حکم دیا ہے کہ اتر کر زمین کی کنجیاں لے جاؤ اس کے بعد اسرافیل علیہ السلام آئے اور عرض کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کروں کہ تہامہ کے پہاڑ آپ کے ہمراہ کر دوں۔ اور انہیں زمرد، یاقوت اور سونے چاندی کا بنا دوں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ کا رب فرماتا ہے کہ آپ کی تمام قدر و منزلت اور اس ثواب کے باوجود جو آپ کو حاصل ہے اور جبریل علیہ السلام نے عرض کیا آپ نبی سلطان ہونا چاہتے ہیں یا نبی بندہ ایک روایت میں آیا ہے کہ اس وقت آپ کا ایک غلام موجود تھا اس نے کہا یا رسول اللہ اسے اختیار فرمایئے تاکہ کچھ دن تو آسائش سے گزاریں اس پر جبریل علیہ السلام نے حضور کو اشارہ کیا کہ تواضع اختیار فرمایئے اور بندگی پسند کیجئے۔ علماء راضی نہیں ہیں کہ حضور کو فقر واحتیاج سے موصوف کریں اور زہد وضرورت کے ساتھ تعریف کریں۔

صاحب مواہب لدنیہ حلیمی در ''شعب الایمان'' سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم یہ ہے کہ آپ کو

تمام صفتوں سے یاد کر سکتے ہیں لیکن ان اوصاف سے جو ضعیف و مساکین کی صفتیں ہیں ان سے تعریف نہ کی جائے۔ اور یہ نہ کہا جائے کہ آپ فقیر تھے یا آپ مفلس تھے اور بعض علماء نے تو آپ کے حق میں زہد کے اطلاق سے بھی منع کیا ہے۔

صاحب ''نثر الدار'' محمد بن واسع سے حکایت کرتے ہیں کہ ان کے سامنے کہا گیا کہ فلاں زاہد ہے انہوں نے پوچھا دنیاوی مال کتنا رکھتا ہے جسمیں وہ زہد کرتا ہے۔ اسے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے شفا میں نقل کیا ہے اور شیخ تقی الدین سبکی نے ''السیف المسلول'' میں نقل کیا ہے کہ فقہائے اندلس نے متفقہ طور پر اس شخص کے قتل کرنے اور سولی چڑھانے کا فتویٰ دیا جس نے مناظرہ کے دوران، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف کیا اور آپ کو یتیم کہہ کر نام لیا اور کہا کہ آپ کا زہد ضروری تھا۔ اور قصد و اختیار سے نہ تھا اگر اچھے کھانوں پر قدرت پاتے تو کھاتے'' (انتہی)

نیز منقول ہے کہ ایک مصری شخص نے دوسرے سے بطریق طعن و استخفاف کہا تو کون ہے تیرا باپ تو بکریاں چراتا تھا اس نے کہا اگر میرا باپ بکریاں چراتا تھا تو نبی نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔'' اس پر بعض علماء نے تعزیر کا حکم دیا اور بعض نے اس کے قتل کا حکم دیا کیونکہ اس نے اپنی ذات سے عیب و عار کو اٹھانے کے لئے اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استخفاف کیا ہے ہاں اگر بطریق مسئلہ یا بیان حکم کے کہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بکریاں چرائی ہیں تو درست ہے۔

نیز صاحب مواہب، درالدین زرکشی سے نقل کرتے ہیں کہ بعض فقہائے متاخرین کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مال سے کبھی بھی فقیر نہ تھے لیکن آپ کا حال فقراء کے حال کے مشابہ تھا۔ بلکہ تمام لوگوں سے کہیں زیادہ غنی تھے۔ اللہ تعالیٰ دنیاوی امور میں آپ کی اور آپ کے اہل و عیال کی کفایت فرماتا تھا اور آپ اپنی دعا میں فرمایا کرتے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْكِیْنًا اے خدا مجھے مسکینی کی زندگی عطا فرما۔ اس سے مراد دل کی تسکین و طمانیت ہے نہ کہ وہ مسکینی جو دنیاوی مال کے نہ ہونے سے ہوتی ہے اور وہ جو آپ کے کفایت کے ضمن میں آیا ہے اور جو اس کے برخلاف اعتقاد رکھے اس کے انکار میں شدت کرتے تھے۔ (انتہی)۔

اور یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَبِهٖ اَفْتَخِرُ ۔ (فقر میرا فخر ہے اور میں اس پر فخر کرتا ہوں) شیخ الاسلام حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ (فتدبر واللہ اعلم)۔

فائدہ: حدیثوں میں آیا ہے اور مشہور ہو چکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک کے وقت میں شکم مبارک پر پتھر باندھے ہیں۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی پتھر باندھنا روایت کیا گیا ہے۔ حضرت ابن جبیر سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھوک معلوم ہوئی آپ نے پتھر کو شکم اطہر پر رکھ کر فرمایا خبردار رہو۔ بہت سے طمع کرنے والے اور نعمتوں والے دنیا میں ایسے ہیں جو آخرت میں بھوکے اور ننگے ہوں گے۔ اور آگاہ رہو بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے نفس کی بڑائی کرتے اور خود کو بزرگ بناتے اور تکبر کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ نفس ان کی اہانت کرنے والا ہوتا ہے اور بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو نفس کو ذلیل کرنے والے اور اس کو جھکانے والے ہیں حالانکہ وہ نفس ان کی عزت کرنے والا ہوتا ہے اسے ابن ابی الدنیا نے روایت کیا۔

حضرت انس، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھوک کی شکایت کی اور ہم میں سے ہر ایک نے اپنا پتھر کھول کر دکھایا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شکم اطہر پر دو پتھر دکھائے۔ ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کو میں نہیں جانتا۔ البتہ اس مفہوم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو غزوۂ خندق کے دن کی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کدال لئے کھڑے دیکھا حالانکہ آپ کے شکم اطہر پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ صاحب قصیدہ بردہ شریف فرماتے ہیں شعر

وَشَدَّ مِنْ سَغَبٍ اَحْشَاءَ ہٗ وَ طَوٰی　　تَحْتَ الْحِجَارَةِ كَشْحًا مُتْرَفَ الْاَدَم

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ ابو حاتم بن حبان نے ان حدیثوں کا انکار کیا ہے جو بطن شریف پر بھوک سے پتھر باندھنے میں ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث باطل ہے اور انہوں نے صوم وصال کی حدیث سے تمسک واستدلال کیا ہے کہ فرمایا: يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کو کھلاتا پلاتا ہے۔ جب صوم وصال رکھتے ہیں تو آپ بھوک میں پتھر باندھنے کے کیوں محتاج ہوں گے۔ اور کہا کہ بھوک میں پتھر باندھنا نہ کوئی فائدہ پہنچاتا ہے نہ اثر رکھتا ہے۔

ابن حبان فرماتے ہیں کہ لفظ حجر، زاء سے ہے اور حجز کے معنی اس پٹکے کے ہیں جسے بھوک کے وقت مضبوط کر کے باندھتے ہیں جس طرح کہ کمزوری میں کمر کو باندھتے ہیں۔ (انتہیٰ)۔

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ درست یہ ہے کہ حدیثیں صحیح ہیں اور اس کا باندھنا بھوک کی بعض تکلیفوں سے تسکین پہنچاتا ہے۔ اس لئے کہ بھوک کی تکلیف، معدے کی حرارت غریزی کی شدت سے ہے اور جب معدہ کھانے سے بھر جاتا ہے تو وہ حرارت کو کھانے کی طرف مشغول کر دیتی ہے اور جب معدے میں کھانا نہ ہو تو حرارت، جسم کی رطوبات حاصل کر کے جلاتی اور اسے کھاتی ہے تو انسان اس حرارت سے درد و تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اور جب کوئی چیز پیٹ پر لپیٹ لی جائے تو معدے کی حرارت کسی قدر دب جاتی ہے۔ اور تکلیف کو کم کر دیتی ہے اور تسکین پہنچاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھوک سے تکلیف اٹھانا اجر کو اس سے مزید بڑھانے کے لئے ہے جو حفظ قوت، نضارت جسم اور رنگت کے نکھار کو زیادہ کرنے کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ خوشحالی اور اہل تنعم رکھتے ہیں اور یہ حضور کا ایسا عجیب معجزہ ہے کہ اہل دنیا تو جسم کے رنگ روپ اور اس کے نکھار کو مرغوب ولذیذ کھانوں کے کھانے سے اور نرم و نازک لباسوں کے پہننے سے اور گدیلے فرشوں پر بیٹھنے سے حاصل کرتے ہیں مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کو نان جویں کی خوراک اور کھردرے کپڑوں کے لباس اور سخت و درشت بستر سے حاصل فرماتے تھے اور آپ کے حسن و جمال اور لطافت و نظافت کی کوئی حد و غایت ہی نہیں۔ صلے اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ علی قدر حسنہ و جمالہ وحسب فضلہ وکمالہ۔

بعض کہتے ہیں کہ اہل عرب کی عموماً اور اہل مدینہ کی خصوصاً عادت تھی کہ جب ان کے بطون یعنی پیٹ خالی ہوتے اور ان کے شکم اندر دھنس جاتے تو تکلیف کی تکسین تخفیف کے لئے اس پر پتھر باندھتے تھے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی باندھا تاکہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان لیں اور معلوم ہو جائے کہ آپکے پاس کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے بھوک کو ختم کر سکیں اس لئے اس حال سے اظہار فرماتے تھے۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ صواب و درست یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل اپنے اختیار اور حصول ثواب کے لئے تھا نہ کہ محض حال کے بتانے اور اظہار کرنے کے لئے (واللہ اعلم)۔

بندۂ مسکین نور اللہ قلبہ بنور الیقین (صاحب مدارج رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں کہ ابن حبان کا یہ کہنا کہ رب تعالیٰ اپنے حبیب کو صوم وصال میں کھلاتا پلاتا تھا تو بھوک کی درد و تکلیف کی تسکین کے لئے پتھر باندھنے سے کیا فائدہ۔ یہ اس بات میں داخل ہو سکتا ہے کہ وہ فرمان صوم وصال کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ یہ حالت ذوق و شوق کی ہے۔ اور دائمی نہیں ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال مختلف تھے کبھی ایسا اور کبھی ویسا اور حق تعالیٰ کی حکمتیں تصرف و تحویل میں اپنے حبیب کے ساتھ ایسی خاص ہیں جو عقل و قیاس میں نہیں سما سکتیں۔ ہاں اگر ان حدیثوں کی سندوں میں کلام کریں تو بات دوسری ہے (واللہ اعلم)۔

غذائے مبارک: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ریاضت نفس، طعام کی جانب عدم التفات اور قضائے شہوت اور اس کی مقتضیات کو پورا نہ کرنے کے باوجود جنس نفس میں کسی مخصوص غذاؤں کا تکلف نہ فرماتے تھے اور تکلف کی روش اختیار نہ کرتے اور امت پر

وسعت ملحوظ خاطر رکھنے اور رہبانیت کی راہوں کو مسدود کرنے کی وجہ سے اہل مدینہ کی عادت کے موافق تناول فرماتے تھے اور جو کچھ موجود ہوتا، گوشت، ترکاری، پھل اور کھجور وغیرہ میں سے جو کچھ آتا تو نوش فرماتے تھے۔ نیز علماء فرماتے ہیں کہ کسی مخصوص غذا کو خاص کر لینا طبیعت کے لئے مضر ہے۔ اگر چہ وہ غذا کتنی ہی بہترین اور بھوک بڑھانے والی ہو اسی بنا پر شیرینی اور شہد کو نوش فرماتے اور انہیں پسند کرتے تھے۔ اسے بخاری وترمذی نے روایت کیا ہے۔ ''حلو'' ہر وہ میٹھی چیز جو کھائی جائے اسے کہتے ہیں۔

خطابی کہتے ہیں کہ حلوا اس مٹھائی کو کہتے ہیں جو کاریگری سے بنائی گئی ہو (اسی وجہ سے مٹھائی بنانے والے کو حلوائی کہتے ہیں) لہٰذا شہد کو حلوہ نہ کہیں گے اور کبھی پھلوں پر بھی بولا جاتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو پسند فرمانا، کثرت خواہش، شدت میلان اور طبیعت کا اس کو چاہنے کے معنی میں نہ تھا بلکہ اگر موجود ہوتا تو شوق کے ساتھ مزہ بدلنے کی حد تک نوش فرماتے۔ تاکہ اس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے اور انہیں پتہ چل جائے کہ آپ اسے پسند فرماتے ہیں۔

صاحب مواہب نے ثعلبی سے فقہ کی لغت میں نقل کیا ہے کہ وہ حلوہ (شیرینی) جسے حضور پسند فرماتے تھے اس کا نام ''مجیع'' (بفتح میم وکسر جیم) تھا یہ ایک قسم کی کھجور تھی جسے دودھ کے خمیر سے بناتے تھے۔ نیز مروی ہے کہ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا ایک قافلہ آیا جس کے ساتھ شہد اور آٹا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ آٹا، میدہ، گھی اور شہد تھا تو آپ ان میں سے تھوڑا تھوڑا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے پھر حضور نے ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی اور دیگچی منگائی اور آگ پر رکھی اور حلوہ تیار کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا اسے کھاؤ یہ وہ چیز ہے جسے اہل فارس ''حبیص'' کہتے ہیں۔ نیز مروی ہے کہ حضور شکر کو پسند فرماتے اور اسے صدقہ میں دیتے تھے۔ طحاوی میں ایک حدیث مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری شخص کی شادی میں تشریف لائے اس کے بعد باندیاں بادام وشکر کے طباق لائیں تو لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی بنا پر اس میں ڈالنے سے باز رکھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اسے لوٹتے نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ہی نے تو لوٹنے کی ممانعت فرمائی ہے فرمایا شادی میں اسے منع نہیں فرماتا اس کے بعد حضور قوم کی جانب اُسے اچھالتے تھے اور قوم اسے لوٹتی تھی۔ امام طحاوی اس حدیث کو لٹانے کے مکروہ نہ ہونے پر حجت میں لائے ہیں۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ ؒ کا اس جانب مذہب ہے اور انہوں نے اس حدیث سے ان صحیح حدیثوں پر جو لوٹنے اور مٹانے کی ممانعت میں وارد ہیں حکم فرمایا ہے لیکن بیہقی نے اس حدیث کو ثابت نہ گردانا اور اس بنا پر امام طحاوی پر لوٹنے کے قائل ہونے میں تشنیع کی بندۂ مسکین خصہ اللہ بمزید الیقین (صاحب مدارج رحمتہ اللہ) کہتا ہے کہ بلاشبہ حج کی قربانی میں لوٹنے کا حکم وارد ہوا ہے یہ بھی امام صاحب کے قول کی موافقت میں ایک حجت ودلیل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے گوشت کو تناول فرمایا اور گائے کے گوشت کو خصوصی طور سے تناول فرمانا معلوم نہیں ہوا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور نے اپنی ازواج مطہرات کی جانب سے ایک گائے ذبح فرمائی۔ ظاہر ہے کہ اسے آپ نے بھی تناول فرمایا ہوگا (واللہ اعلم)

گوشت کی تعریف: گوشت کی تعریف میں متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں مثلاً اَللَّحْمُ سَيِّدُ الطَّعَامِ اَهْلِ الْجَنَّةِ جنتیوں کے لئے گوشت کھانے کا سردار ہے ایک روایت میں آیا ہے: سَيِّدُ الطَّعَامِ اَهْلِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ دنیا اور آخرت والوں کے لئے گوشت کھانے کا سردار ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ابن ابی الدنیا نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے لیکن اس کی شاہد وہ حدیث ہے جسے علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ نے بیان فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''دنیاوی کھانے کا سردار گوشت ہے اس کے بعد چاول۔'' اسے ابونعیم نے ''الطب النبوی'' میں نقل کیا ہے اور اس کے کھانے سے ستر قوتیں بڑھتی ہیں اسے زہری نے کہا ایسا ہی مواہب میں ہے۔

نیز علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ گوشت کھانا، خون کو صاف کرتا اور خصلت کو اچھا بناتا ہے اور جو شخص اسے چالیس دن تک نہ کھائے اس کی خصلت بری ہو جاتی ہے کذافی المواہب۔ جس طرح کہ مسلسل اتنی مدت تک نہ کھانے میں یہ خاصیت واقع ہوئی ہے اسی طرح مسلسل اتنی مدت تک کھانے میں قساوت قلب اور سختی طبع کی تاثیر بھی وارد ہوئی ہے۔

نیز بعض آثار میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کھانوں میں پسندیدہ تر گوشت تھا فرمایا کرتے گوشت کھانا سماعت کو زیادہ کرتا ہے اور دنیا میں گوشت تمام کھانوں میں بہترین ہے اگر میں اپنے رب سے چاہوں کہ وہ گوشت کھلائے۔ تو وہ روزانہ مجھے گوشت کھلائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ گوشت کھانا عقل کو بڑھاتا ہے مروی ہے کہ حضور کو دست کا گوشت بہت پسند تھا نیز اسی بنا پر ایک یہودیہ نے زہر آلود دست بھیجی تھی۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دست کے گوشت کی پسندیدگی اس وجہ سے تھی نہ تو روزانہ گوشت ہوتا تھا اور نہ روزانہ نوش فرماتے تھے البتہ کبھی کبھی تناول فرماتے تھے تو دست کا گوشت جلدی پک جاتا ہے تو حضور اس کے تناول فرمانے میں جلدی کرتے تھے۔

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَطْیَبُ اللَّحْمِ لَحْمُ الظَّهْرِ بہترین گوشت پیٹھ کا گوشت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ دست کے گوشت کی پسندیدگی اس وجہ سے تھی کہ وہ مواضع نجاست سے بہت دور ہے اس توجیہہ کی تائید میں وہ روایت ہے کہ حضور گردوں کو ناپسند فرماتے تھے کیونکہ وہ پیشاب کی جگہ سے قریب ہے لیکن حافظ عراقی نے کہا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گوشت کو نھش فرماتے۔ یعنی ہڈی سے گوشت کو دانتوں سے چھڑا کر تناول فرماتے اور نہش، شین معجمہ اور مہملہ دونوں سے آیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ معجمہ کے ساتھ، تمام دانتوں سے کھانا اور مہملہ کے ساتھ، دانتوں کے سروں سے کھانا اور گوشت کو چھری سے کاٹ کر بھی تناول فرماتے بخاری یک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں چھری لے کر بکری کے شانہ سے گوشت چھیل کر تناول فرمایا۔ پھر نماز کے لئے ندا کی گئی تو دست مبارک سے اس چھری کو چھوڑ دیا جس سے چھیل رہے تھے اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ وضو نہ کیا۔ (دست مبارک نہ دھوئے) اور حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گوشت کو چھری سے نہ کاٹو کیونکہ یہ عجمیوں کا کام ہے اور اسے دانتوں سے کھاؤ کیونکہ یہ بہت ہاضم اور زیادہ دل پسند ہے۔ ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث قوی نہیں ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی شاہد، صفوان بن امیہ کی مروی حدیث ہے جسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ بعض روایتوں میں نہش کا حکم آیا ہے بغیر قطع کی ممانعت کی صراحت کے علماء ان میں اس طرح تطبیق کرتے ہیں کہ نہش یعنی دانتوں سے کاٹنا چھوٹی ہڈی سے ہے اور قطع یعنی چھری سے کاٹنا بڑی ہڈی سے ہے اور حضور نے گوشت کو بھنا ہوا تناول فرمایا ہے۔ سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے بھنا ہوا باز و حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ نے اس میں سے تناول فرمایا۔ اس کے بعد بغیر وضو کئے نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ (یعنی دست مبارک نہ دھویا) یہ حدیث صحیح ہے اسے ترمذی نے روایت کیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قدید کو یعنی خشک شدہ گوشت کو تناول فرمایا جیسا کہ سنن میں مروی ہے کہ ایک صحابی نے بیان کیا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بکری ذبح کی اور ہم مسافر تھے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس گوشت کی اصلاح کرو تو میں اس میں سے حضور کو گوشت تناول کرتا رہا یہاں تک کہ ہم مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ گوشت کی اصلاح سے مراد قدید بنانا ہے۔ اور حضور نے بھنا ہوا جگر تناول فرمایا ہے۔ اور مرغی کا گوشت تناول فرمایا ہے۔ اسے بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے حمار وحشی کا گوشت تناول فرمایا ہے اسے گورخر اور نیل گائے بھی کہتے ہیں۔ شیخین نے اسے روایت کیا ہے اور اونٹ کا گوشت تو سفر وحضر میں تناول کیا ہے۔ خرگوش کا گوشت بھی تناول کیا ہے اور بحری دواب یعنی دریائی جانور تناول کئے ہیں اسے مسلم نے روایت کیا ائمہ کرام کی دریائی جانوروں کے کھانے میں تفصیل ہے۔ بعض کے نزدیک تو مطلقاً جائز ہے اور بعض کے نزدیک غیر السنان بحری وخزیر بحری۔ لیکن ہمارے مذہب میں بجز مچھلی کے کچھ جائز نہیں ہے۔

ثرید: حضور نے ثرید تناول فرمایا ہے فارسی میں ثرید کو شکنہ کہتے ہیں۔ ثرید۔ روٹی کو توڑ کر گوشت کے شوربے میں اور کبھی گوشت کے ساتھ بھی تیار کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ فَضْلُ عَآئِشَةَ عَلَى النِّسَآءِ كَفَضْلِ الثَّرِيْدِ عَلٰى سَائِرِ الطَّعَامِ عورتوں پر عائشہ کی فضیلت ایسی ہے جیسی تمام کھانوں پر ثرید کی فضیلت۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تمام کھانوں میں پسندیدہ ثرید خبز اور ثرید حیس تھا۔ ثرید خبز تو روٹی اور شوربے سے بنایا جاتا ہے اور ثرید حیس کھجور، گھی اور روٹی سے بنایا جاتا ہے۔ اور حضور نے گھی اور مکھن سے روٹی تر کر کے تناول فرمایا ہے اور روغن زیتون چپڑ کر بھی روٹی تناول فرمائی ہے اور ہریسا تناول فرمانے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ جسے محدثین وضع کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ طبرانی نے اوسط میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبریل علیہ السلام نے مجھے اتنا ہریسہ کھلایا کہ میری کمر قیام کے لئے قوی ومضبوط ہوگئی۔ کہا گیا ہے کہ اس حدیث کی سند میں محمد بن حجاج لخمی ہے اس نے اس حدیث کو وضع کیا ہے۔

کدو: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کدو کو تناول فرمایا۔ اور اسے پسند فرمایا ہے۔ اگر کسی سالن میں پکا ہوتا تو پیالے کے کناروں سے تلاش فرما کر اسے نوش فرماتے یہ اسے پسند کرنے کی بنا پر ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو دیکھا ہے مجھے کدو سے محبت ہوگئی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ مستحب ہے کہ کدو سے محبت رکھیں اور ہر اس چیز سے محبت رکھیں جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا ہے اور حضور نے سلق یعنی چقندر کو جو کی روٹی کے ساتھ تناول فرمایا ہے۔ چقندر ایک مشہور ترکاری ہے اسے ترمذی نے شمائل میں اس طرح روایت کیا ہے کہ ایک دن امام حسن بن علی، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم سلمٰی رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے جو حضور کی خادمہ تھیں انہوں نے کہا اے سلمٰی رضی اللہ عنہ ہمارے لئے وہ کھانا تیار کرو جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھا۔ سلمٰی رضی اللہ عنہ نے کہا اے صاحبزادو آج میں تمہیں اس کھانے سے خوش نہیں کر سکتی۔ مطلب یہ کہ تم لذیذ و مرغوب کھانے کھاتے ہو یہ کھانا تمہیں کیا خوش کرے گا۔ انہوں کہا کہ ہاں ہمیں اچھا معلوم ہوگا ہمارے لئے تیار کرو۔ اس کے بعد آش جو کے لے کے اسے دیگچی میں ڈال کر اوپر سے کچھ زیتون کا تیل اور مرچ اور دیگر ضروری چیزیں ڈال کر تیار کر دیا اور دیگچی ان کے سامنے رکھ کر کہا یہ وہ کھانا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رغبت سے تناول فرماتے اور پسند فرماتے تھے۔

لپٹا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حزیرہ یعنی لپٹے کو بھی نوش فرمایا ہے۔ جسے آٹے سے پتلا کر کے بنایا جاتا ہے ایسا ہی طبری نے کہا ہے۔ اور جوہری کہتے ہیں کہ گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بہت سا پانی ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ جب پک کر نرم وملائم ہو جاتا ہے تو آٹا ڈال کر تیار کرتے ہیں۔ اگر گوشت نہ ہو تو اسے عصید کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آٹے کو گھول کر چھانتے ہیں تا کہ بھوسی نکل جائے پھر پکاتے ہیں۔ حزیرہ، خاء کے ساتھ وہ ہے جو بھوسی سے بنایا جاتا ہے۔ اور حزیرہ حاء کے ساتھ وہ ہے جو دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ میرے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، چاشت کے وقت خوب دن چڑھے تشریف

لائے تو میں نے خزیرہ کو ان کے لئے تیار کیا۔ اور حضور نے اقط یعنی پنیر کو نوش فرمایا جسے دودھ سے مسکہ نکال کر جماتے ہیں جو ترش اور سخت ہوتا ہے پھر پگھلا کر کھانوں اور سالنوں میں ڈالتے ہیں۔

پھل: اور حضور خشک کھجور، تر کھجور اور گدری کھجور تناول فرمائی ہے۔ اور حضور نے کباث کو نوش فرمایا ہے۔ کباث اراک کا پھل ہے جو پکا ہو۔ اور اراک مسواک کے درخت کو کہتے ہیں جسے ہندی میں پیلو کہتے ہیں اور کھجور کے گودے کو بہت پسند فرماتے تھے جو کھجور کے درخت سے گوند کی مانند نکلتا ہے۔ اسے شحمۃ النخل کہتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبن نوش فرمایا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبن لایا گیا۔ تو آپ نے چھری منگا کر بسم اللہ کہہ کر اسے کاٹا اور ابوداؤد نے روایت کیا اور بعض فقہاء نے اس میں کلام کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوے کو کھجور سے نوش فرمایا۔ اور خربوزہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ پھلوں میں سے تھا۔ خربوزے کی تعریف میں کئی حدیثیں آئی ہیں۔ اور اس میں رسالے لکھے گئے ہیں۔ مگر محدثین ان پر وضع کا حکم دیتے ہیں (واللہ اعلم)۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ محمد بن اسلم خربوزہ کو نہ کھاتے تھے۔ اس لئے کہ منقول نہیں ہوا ہے کہ اسے حضور کس طرح نوش فرماتے تھے۔ ایک روایت میں ککڑی نوش کرنا کھجور کے ساتھ اس طرح آیا ہے کہ ایک دست مبارک میں ککڑی تھی اور دوسرے دست مبارک میں کھجور تھی کبھی اسے نوش فرماتے اور کبھی اسے۔ اسی طرح خربوزے اور کھجور کو۔ کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ کھجور اور خربوزہ ملا کر نوش کرتے اس کے دو احتمال ہیں۔ یا تو دونوں کو منہ میں رکھ کر چباتے تھے۔ یا کبھی اسے اور کبھی اسے اور نادر حدیثوں میں سے ایک حدیث یہ ہے جسے ابن ماجہ نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں میری والدہ میرے مٹاپے کا اعلاج کرتی تھیں اور میری والدہ اس میں جلدی کرتی تھیں تاکہ حضور کی خدمت میں مجھے بھیجا جائے مگر کوئی علاج درست نہ بیٹھتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے کھجور اور ککڑی ملا کر کھائی تو میرا مٹاپا ٹھیک ہو گیا ایسا ہی مواہب نے بیان کیا ہے۔ جاننا چاہئے کہ شارحین راویان حدیث کا خیال ہے کہ حضور کا اس سے مقصد یعنی ککڑی اور تر کھجور کو ملا کر نوش کرنے سے تر کھجور کی گرمی مارنا تھی نہ کہ ککڑی کی برودت کو کم کرنا اور اسے اعتدال پر لانا یہ طبی اصول سے تھا جیسا کہ ابی امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو بروایت ہشام آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ککڑی کو تر کھجور کے ساتھ اس لئے نوش فرماتے تھے کہ ککڑی کی برودت کو کھجور کی گرمی سے اور کھجور کی گرمی کو ککڑی کی برودت سے اعتدال پر لائیں۔ کہتے ہیں کہ ترکیب اطعمہ میں یہ ایک بڑی اصل و قاعدہ ہے حتیٰ کہ کہتے ہیں کہ بطیخ کو تر کھجور سے ملا کر کھانے سے مراد، بطیخ اخضر یعنی ککڑی ہے جو سرد ہے نہ کہ بطیخ اصغر یعنی خربوزہ جو گرم ہے۔ جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے بطیخ اصغر (خربوزہ) بمقابلہ تر کھجور کے یک گونہ سرد ہے اگرچہ شیرینی کی وجہ سے قدرے حرارت ہے۔ اس مسکین کا خیال ہے کھجور اور بطیخ کو ملانے سے ایک دوسرے کی حرارت و برودت کو توڑنے اور معتدل بنانے کی جو علت بیان کی ہے جب کہ قوم کہتی ہے تو یہ ایک تکلف ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ ملانا اتفاقی امر تھا ممکن ہے کہ خربوزہ میٹھا نہ ہو اور ککڑی تو بالکل ہی میٹھی نہیں ہوتی ملا کر نوش فرمایا تاکہ شیریں ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ جو سرد اور خشک ہے اور کھجور گرم و تر۔ لہٰذا دونوں کو ملا کر کھانا بنانا جو کی سردی اور کھجور کی گرمی مارنا ہے یہ اچھی تدبیر و تعدیل ہے **(واللہ اعلم بحقیقتہ الحال)**۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کو مکھن کے ساتھ نوش فرمایا اور اسے پسند فرمایا آج بھی یہ غذا ہمارے شہروں میں رائج اور بازاروں میں فروخت ہوتی ہے۔ اور کھجور کے سرے پر مکھن رکھتے ہیں اکثر تر کھجور ساتھ کھاتے ہیں تاکہ مکھن کی چکناہٹ تر کھجور کی عفونت کو مار دے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم روٹی کو سالن کے ساتھ نوش فرماتے جو بھی موجود ہوتا کبھی گوشت کا سالن کبھی ترکاری کا کبھی کھجور کا اور مروی ہے کہ کھجور اور جو کی روٹی کے ٹکڑے کو زبان پر رکھ کر فرمایا ''نانخورش'' یہ ہے۔ اور کبھی سرکہ سے نوش کرتے اور فرماتے ''نِعْمَ الْاَدَمُ الْخَلُّ''

سرکہ بہترین سالن ہے۔ اسے مسلم، خطابی اور قاضی عیاض رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس ارشاد سے مراد کھانے کی چیزوں میں میانہ روی اور لذیذ کھانوں سے اجتناب کرنے کی تلقین ہے۔ مطلب یہ کہ روٹی کے ساتھ سالن، سرکہ وغیرہ ہوتا تھا اور بآسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔ نادر الوجود نہیں ہے اور شہوت میں رغبت نہ کرے۔ کیونکہ یہ دین کو فاسد کرتا ہے اور بدن کو بیمار بناتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ تعریف خاص سرکہ کے لئے ہے کیونکہ اس میں منافع بکثرت ہیں رہا کھانے پینے میں میانہ روی اور شہوت کو ترک کرنا تو یہ دوسری حدیثوں اور دیگر قواعد سے ظاہر ہے۔

ابن قیم کہتے ہیں کہ سرکہ کی یہ تعریف وقتی اقتضائے حال کے بموجب ہے اس سے دیگر سالنوں پر فضیلت دینا مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات خیال کرتے ہیں۔ اس حدیث کی شان وقوع یہ ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے پیچھے گھر تشریف لائے اور خشک روٹی لاکر پیش کی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس سالن نہیں ہے۔ انہوں نے کہا ہمارے پاس سالن تو نہیں ہے البتہ سرکہ ہے فرمایا ''**نعم الادام الخل**'' سرکہ بہترین سالن ہے۔ مقصود یہ ہے کہ سالن کے ساتھ روٹی کھانا حفظ صحت کے اسباب میں سے ہے۔ کیونکہ یہ روٹی کی اصلاح کرتا اور اسے نرم بناتا ہے۔ جو حفظ صحت کے لئے ہے بخلاف ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنا۔ اس میں سرکہ کی فضیلت، دودھ، گوشت، شہد اور شوربے پر نہیں ہے اور اگر دودھ یا گوشت موجود ہوتا تو اور زیادہ تعریف فرماتے لہٰذا حضور کا یہ فرمانا ان کی خاطر اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے ہے۔ دیگر سالنوں پر اسے فضیلت دینے کے لئے نہیں ہے۔ اور حضور اپنے شہر مبارک کی ترکاریوں اور پھلوں کو پکنے کے بعد تناول فرماتے اور ان سے اجتناب نہ فرماتے تھے۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ یہ حفظ صحت کے اسباب میں بہت بڑی چیز ہے اس لئے کہ حق تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ہر بستی میں ایسے پھل پیدا فرمائے ہیں جس سے ان کے وقت میں وہاں کے رہنے والوں کو نفع پہنچتا ہے۔ اس بنا پر اسباب صحت اور اپنی عافیت کے لحاظ سے انہیں کھاتے ہیں۔ اور بہت سی دواؤں کے استعمال سے بے نیاز رہتے ہیں بہت کم لوگ ہیں جو بیماری و کمزوری کے خوف سے اپنے شہروں کے پھلوں سے بچتے اور پرہیز کرتے ہوں مگر یہ کہ کوئی بہت ہی زیادہ بیمار اور بہت ہی کمزور و ناتواں ہو اور ان کی صحت و قوت اس کی متحمل نہ ہو لہٰذا جو کوئی ان کو ان کی فصل میں کھائے گا وہ بہت سی بیماریوں کے لئے نافع و مفید رہے گا۔ (انتھی)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انگور کے خوشے تناول کرتے دیکھا ہے۔ یہ اس طرح کہ خوشہ منہ میں رکھ کر اس کے دانے توڑتے اور تنکوں کو باہر خالی کر کے کھینچ لیتے۔ اور متعارف یہ ہے کہ ہاتھ سے دانے توڑ کر منہ میں ڈالتے ہیں بعض کہتے ہیں اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیاز کو تناول نہیں فرمایا اور نہ امت کو اس سے منع فرمایا۔ اور جو پیاز کھاتا ہے اسے چاہئے کہ مسجد میں نہ آئے۔ اسی پر دیگر اجتماعات کو بھی قیاس کیا گیا ہے ابوداؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور نے جو آخری کھانا تناول فرمایا ہے اس میں پیاز تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اثبات اور تاکید جواز کے لئے تناول فرمایا ہے یا پکی ہوئی تھی۔ اور اس کی بو دور کر دی گئی تھی۔ کراہت تو کچی پیاز کے کھانے میں ہے۔ کیونکہ اس سے بو آتی ہے۔ ابتدائے ہجرت کے وقت جتنے عرصے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان میں رہے وہ جب ایسا کھانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے جس میں پیاز کی بو ہوتی تو حضور خود تناول نہ فرماتے دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیج دیتے۔ لہسن کا بھی یہی حکم ہے بلکہ اس کا حکم اس سے زیادہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لہسن پیاز اور گندنے کے حکم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں علماء اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر حرام تھا لیکن اصح یہ ہے کہ مکروہ تھا کراہت تنزیہی کے ساتھ نہ کہ کراہت تحریمی کے

ساتھ۔ اس بناپر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھنے پر کہ کیا یہ حرام ہے؟ فرمایا نہیں یہ عام ہے اور جو حضور کے لئے حرمت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ ''نہیں'' ۔ فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم پر حرام نہیں ہے (واللہ اعلم)۔

صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ محبت صادق میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں لہسن و پیاز کے نہ کھانے اور اسے مکروہ جاننے میں واجب ہے اور ہر اس چیز کو مکروہ جاننے میں جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکروہ جانا۔ اس لئے کہ یہ محبّ صادق کے اوصاف میں سے ہے کہ جس چیز کو محبوب پسند کرے وہ محبوب ہو اور جس چیز کو محبوب مکروہ جانے وہ مکروہ ہے انہوں نے جو کچھ فرمایا سچ فرمایا اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے۔

بسا اوقات حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عنایت و مہربانی کی خاطر، رخصت و اباحت کو اختیار فرماتے کیونکہ خدا کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کہ انہیں رخصت عطا فرمائے جس طرح کہ وہ پسند فرماتا ہے کہ انہیں عزیمتیں دے۔ اس بنا پر ان کا صدور واقع ہو جاتا ہے۔ وہ چیزیں اور ہیں جن کے بارے میں حق تعالیٰ نے فرمایا عفا اللہ۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی مرتضٰے رضی اللہ عنہ کسی دور جگہ میں تھے۔ حضرت علی مرتضٰے نے اپنے آپ کو ایک باغ میں پانی سینچنے کی مزدوری میں ایک شخص کو دے دیا۔ اس شخص نے روٹی اور گندنا آپ کو پیش کیا۔ حضور نے روٹی خود تناول فرمائی اور گندنا حضرت علی مرتضٰے رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ کذا ذکر فی تاریخ مدینہ۔

کھانے کا مسنون طریقہ: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ تھی کہ آپ تین انگلیوں سے یعنی انگوٹھا، کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے کھانا نوش فرماتے تھے اسے ترمذی شمائل میں روایت کیا ہے اس لئے کہ ایک انگلی یا دو انگلی سے کھانا متکبروں کا کھانا ہے اور اس طرح کھانے میں لذت بھی معلوم نہیں دیتی۔ اور اس سے معدہ سیر نہیں ہوتا مگر طویل زمانے کے بعد اور پانچوں انگلیوں سے کھانا حرص و طمع کی علامت ہے صاحب مواہب ایک حدیث مرسل لاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچوں انگلیوں سے کھایا ہے۔ یہ حدیث ماسبق حدیث کے ساتھ اس طرح جمع ہو سکتی ہے کہ اکثر اوقات تین انگلیوں سے نوش فرماتے۔ اور بعض اوقات پانچوں سے اور کھانے کے بعد حضور انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ رومال سے پونچھیں اور بعض روایتوں میں چاٹنے اوز برتن صاف کرنے کا حکم آیا ہے۔ مروی ہے کہ برتن کو پونچھنے کی بنا پر وہ برتن اس کے لئے استغفار کرتا ہے اور چاٹنے کی علت میں یہ آیا ہے کہ یہ بات نہیں جانی جاسکتی کہ کھانے کے کون سے جزو میں برکت ہے اور سب انگلیوں سے چاٹنا شرط نہیں ہے۔ ایک ایک انگلی کو زبان پر رکھ کر یا ہونٹوں پر رکھ کر چاٹنا کافی ہے۔ بعض اوقات حضور انگلیوں کو بچوں یا خادموں کو چٹایا کرتے تھے اور کھانے کے درمیان انگلیوں کو چاٹنا مکروہ ہے اور کھانے کے دوران جو چیز دسترخوان یا پیالہ سے گر جائے اسے اٹھا کر کھالینا بھی ثواب ہے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اس میں محتاجی، برص اور کوڑھ سے حفاظت ہے۔ اور جو اسے کھاتا ہے اس کی اولاد حماقت سے محفوظ رہتی ہے اور انہیں عافیت دی جاتی ہے۔ دیلمی نے عباس خلفاء کے رشید سے باسناد نسب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ فرمایا جو دسترخوان پر گری ہوئی چیز اٹھا کر کھاتا ہے اس کی اولاد حسین و جمیل پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے محتاجی دور کر دی جاتی ہے۔ متکبروں سے انْ باتوں کی پیروی ظہور میں نہیں آتی اور وہ اسے مکروہ جانتے ہیں۔ اگر وہ حقیقت سے غور کریں تو اس میں کوئی کراہت کی وجہ نہیں ہے۔ اسی کھانے ہی کے تو اجزاء ہیں۔ جسے انہوں نے انگلیوں سے کھایا تو انگلیوں اور پیالوں کو چاٹنا کیوں برا معلوم ہوتا ہے آخر اسی کھانے کا یہ حصہ ہے خصوصاً اس وقت جب کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک کو بھی سن لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اس بات سے گھن کھاتا اور برا جانتا ہے جس کی نسبت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے تو اس پر سخت چیز لازم آتی ہے۔ (نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ ذٰالِكَ).

صاحب مواہب ایک بزرگ سے نقل کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ایک شخص کلی کرتا ہے اور اپنے منہ میں انگلیاں ڈالتا ہے اور انگلیوں سے دانتوں کو ملتا ہے اس سے کوئی بھی گھن نہیں کھاتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر کھانا تناول نہ فرماتے آپ فرماتے ہیں میں بندہ ہوں اور بندوں کی مانند بیٹھتا ہوں۔ اور ایسے ہی کھاتا ہوں جیسے بندے کھاتے ہیں۔ ٹیک لگانے کی تفسیر میں اختلاف کیا گیا ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ جو محققین شراح حدیث میں سے ہیں شفاء میں فرماتے ہیں کہ اتکاء یعنی ٹیک لگانے سے مراد جم کر بیٹھنا اور کھاتے وقت چوکڑی مار کے سرین پر بیٹھنا ہے۔ یہ اس بیٹھنے کی مانند ہے جو کسی چیز کو اپنے نیچے رکھ کر ٹیک لگا کر بیٹھے۔ اس ہیئت پر بیٹھنے والا کھانا زیادہ کھاتا ہے۔ اور اس طرح اظہار تکبر کرتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست اس قسم کی تھی کہ گویا گھٹنوں کے بل ابھی کھڑے ہو جائیں گے۔ بطریق اقعا، کہا گیا ہے کہ حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی جانب جھک کر ٹیک لگائی جائے۔ جیسا کہ محققین کے نزدیک ہے۔ (انتہی)۔

''اقعا'' سے مراد یہ ہے کہ سرین کو زمین کی جانب کرے۔ اور پنڈلیوں کو کھڑا کرے اور پیٹھ کے بل سیدھا رہے۔ یہی وہ نشست ہے جسے نماز میں منع فرمایا گیا ہے۔ صاحب مواہب کہتے ہیں کہ اسی معنی کو نقل کیا گیا ہے جس کی تفسیر قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اور اتکاء کی تفسیر میں یہی بات، اکمال میں خطابی سے جو ائمہ شراح حدیث اور معتمد علیہ ہیں منقول ہے۔ اور خطابی فرماتے ہیں کہ اتکاء کی ایک جانب جھکنے کی جنہوں نے تفسیر کی ہے اس کی مخالفت کی گئی ہے۔ خطابی فرماتے ہیں کہ عوام کا خیال ہے کہ متکی وہ ہوتا ہے جو ایک جانب جھک کر کھانا کھاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ متکی وہ ہے کہ جو چیز اس کے نیچے بچھی ہوئی ہو اس پر جم کر بیٹھے۔ (انتہی)۔ ابن جوزی کے نزدیک اتکاء کے معنی یہی ہیں کہ ایک جانب جھک کر بیٹھے۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ اتکاء کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز سے ٹیک لگائی جائے۔ خواہ دیوار سے یا تکیہ وغیرہ سے۔ اور بعضوں نے کہا بائیں ہاتھ سے ٹیک لگانا مراد ہے۔ اور بعض حدیثوں میں اس کی صراحت سے ممانعت بھی آئی ہے۔ ابن اثیر نے نہایہ میں کہا ہے کہ جس نے اتکاء کے معنی ایک جانب جھکنے کے لئے ہیں اس نے فن طب کے موافق تاویل کی ہے ابن قیم نے کہا کہ ٹیک لگا کر کھانا، کھانے والے کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے کہ طعام کے لئے اس کے راستے سے گزرنے میں یہ ہیئت مانع ہوتی ہے۔ اور بسرعت معدے میں کھانا نہیں پہنچتا۔ اور معدہ میں گردش کرتا ہے۔ اور مستحکم نہیں ہوتا۔ اور معدہ کا منہ غذا کے لئے نہیں کھلتا۔ اور معدہ ایک جانب جھک جاتا ہے۔ سیدھا نہیں رہتا۔ اور بسرعت غذا معدے میں نہیں جاتی۔ لیکن کسی چیز سے ٹیک لگانا یہ متکبروں اور فرعونوں کی نشست سے ہے۔ جو طریقہ عبودیت کے خلاف ہے۔ اسی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اُکُلُ کَمَا یَاْکُلُ الْعَبْدُ. بعض کہتے ہیں کہ ٹیک لگا کر کھانے کی ممانعت، حضور کی خصوصیات میں سے ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ عام ہے ہاں اگر مجبوری ہو اور اس سے ادب کی رعایت ممکن نہ ہو تو یہ دوسری بات ہے۔ (تیج المحد ذورات)۔

صاحب سفر السعادۃ لکھتے ہیں کہ اتکاء کی پانچ صورتیں ہیں۔ یہ سب ہیئتیں جن کا ذکر ہوا انہوں نے شمار کیں۔ صاحب مواہب کہتے ہیں کہ جب ثابت ہو گیا کہ ٹیک لگانا مکروہ ہے یا خلاف اولیٰ۔ تو کھانے کے وقت اس ہیئت پر بیٹھنا مستحب ہوا۔ جو یہ ہے کہ دونوں رانوں کو کھڑا کرے۔ اور دونوں قدموں کی پشت پر نشست کرے۔ یا اس طرح کہ داہنے پاؤں کو کھڑا کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے۔ اور ابن قیم نے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تواضع و ادب کی خاطر بائیں قدم کے اندر کی جانب کو داہنے قدم کی پشت پر رکھتے تھے۔ یہ ہیئت کھانا کھانے کی دوسری نشستوں سے زیادہ مفید و نافع ہے۔ اس لئے کہ تمام اعضا اپنی اس طبعی حالت پر برقرار رہتے ہیں جس پر حق تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اور جب حضور اپنے دست مبارک کو کھانے کی جانب بڑھاتے تو بسم اللہ کہتے۔ اور افضل یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہے۔ اور اگر محض بسم اللہ کہے تو کافی ہے اور سنت کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ اور حضور کھانے کے بعد

حمد الٰہی کہتے۔ حمد کے کلمات متعدد ماثور ہیں۔ اتنا پڑھنا ہی کافی ہے کہ کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور یہ دعا بھی صحت کے ساتھ پہنچتی ہے کہ فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَطْعَمْتَ وَسَقَیْتَ وَاَغْنَیْتَ وَاَقْنَیْتَ وَهَدَیْتَ وَاَحْیَیْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ عَلٰی مَاۤ اَعْطَیْتَ اور داہنے ہاتھ سے تناول فرماتے۔ اور اس کا حکم دیتے اور فرمایا: غُلَامَ سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِیَمِیْنِكَ وَمِمَّا یَلِیْكَ۔ اے بندے اللہ کا نام لے اور داہنے ہاتھ سے کھا اور جو تیرے قریب ہے اس طرف سے کھا۔ اور بعض شوافع نے اس حکم کو مستحب پر محمول کیا ہے اور صواب یہ ہے کہ اس کے ترک پر وعید وارد ہونے کی وجہ سے واجب ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے تو فرمایا داہنے ہاتھ سے کھا اس نے کہا میں کھا نہیں سکتا۔ فرمایا کبھی نہ کھا سکے گا۔ اس کے بعد وہ کبھی اپنے داہنے ہاتھ کو منہ تک لا ہی نہ سکا اور جو حضرات مستحب ہونے پر استدلال کرتے ہیں وہ اس قرینہ سے کہ حضور نے فرمایا ''وَكُلْ مِمَّا یَلِیْكَ'' (جو تیرے قریب ہے اس سے کھا۔) اور یہ واجب نہیں ہے تو اس کا جواب وہ حضرات جو وجوب کے قائل ہیں یہ دیتے ہیں کہ اس کا ترک، ممانعت کے معلوم ہونے کے بعد گناہ و معصیت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر کھانا ایک ہی ہو تو اپنے قریب سے کھائے اور اگر متعدد کھانے ہوں مثلاً فواکہ وغیرہ تو جائز ہے اور ایک حدیث بھی اس ضمن میں روایت کرتے ہیں مگر وہ حدیث ضعیف ہے (کذا قیل) اگر کوئی یہ کہے کہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیالوں کے کناروں سے کدو کے قتلوں کو تلاش فرماتے تھے۔ تو یہ حدیث اپنے قریب سے کھانے کی حدیث سے معارض ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ممانعت اس تقدیر پر ہے۔ کہ اگر ساتھی راضی نہ ہوں اور کون ہے جو حضور سے راضی نہ ہو اور بعض کہتے ہیں کہ حضور تنہا تناول فرما رہے تھے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ شامل تھے (واللہ اعلم)۔ اور حضور کھانے سے پہلے دست ہائے مبارک کو دھویا کرتے اور بعد طعام بھی۔ اور فرمایا بَرَكَةُ الطَّعَامِ فِی الْوُضُوْءِ قَبْلَهٗ وَالْوُضُوْءُ بُعْدَهٗ۔'' کھانے سے پہلے بھی وضو ہے اور کھانے کے بعد بھی وضو۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھانا لایا گیا۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کیا حضور کے لئے پانی نہ لاؤں کہ وضو فرمائیں۔ فرمایا میں مامور نہیں ہوں کہ وضو کروں مگر اس وقت جب کہ نماز کے لئے کھڑا ہوں۔ اس جگہ وضو سے مراد، وضوء شرعی ہے جو نماز کے لئے ہیں۔ اور جن حدیثوں میں ہاتھ دھونے کو وضو کہا گیا ہے وہ لغوی معنی میں ہے۔ جس کے معنی نظافت و پاکیزگی کے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم گرم کھانا نوش نہ فرماتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور کی خدمت میں کھانے کا ایک پیالہ لایا گیا۔ جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی اس پر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگ کھانے کا حکم نہیں فرمایا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور گرم کھانے اور اسے بگھار یعنی داغ دینے کو مکروہ جانتے اور فرماتے ٹھنڈا کر کے کھانا کھاؤ کیونکہ اس میں برکت ہے اور گرم کھانے میں برکت نہیں ہے اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب حضور کے پاس گرم کھانا لایا جاتا تو آپ اسے اس وقت تک ڈھانپ کے رکھے رہتے جب تک کہ اس کا جوش نہ ختم ہو جاتا۔ اور فرمایا کہ میں نے حضور سے سنا ہے کہ سرد کھانے میں عظیم برکت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک لکڑی کا پیالہ تھا۔ جس پر لوہے کی چادر منڈھی ہوئی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور کو اس پیالے میں پانی۔ نبیذ اور شہد وغیرہ تمام مشروبات پلائے ہیں۔ اور بخاری میں عاصم احوال کی حدیث ہے کہ میں نے حضور کے اس پیالہ کو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس دیکھا ہے میں نے اس میں پانی پیا ہے۔ وہ کچھ شکستہ ہو گیا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس پر چاندی کا خول چڑھا دیا تھا۔ اور وہ پیالہ چوڑا اور اچھی لکڑی کا تھا۔ علماء بیان کرتے ہیں کہ وہ پیالہ جھاؤ کی لکڑی کا تھا اور اس کا رنگ زردی مائل تھا اور ابن سیرین کہتے ہیں کہ اس پر لوہے کا حلقہ چڑھا ہوا تھا پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ اس حلقے کے بجائے سونے یا چاندی کا حلقہ چڑھائیں تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اس

سے باز رکھا۔ اور کہا کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔ اور امام ابوعبداللہ بخاری روایت کرتے ہیں کہ میں نے اس پیالے کو بصرہ میں دیکھا ہے۔ اور میں نے ااس میں پانی پیا ہے اسے نضر بن انس کی اولاد سے آٹھ ہزار درہم میں خریدا گیا ہے۔ (کذافی المواہب)۔ اور حضور نے کبھی خوان پر کھانا نہ کھایا چپاتیاں کھائیں لیکن سفرہ پر نوش کیا اور وہ سفرہ چمڑے یا پتے کا ہوتا تھا اور آج بھی حرمین شریفین میں خرمے کے پتے کے سفرے رائج ہیں۔ مواہب میں کتاب ہدیٰ سے نقل کیا گیا ہے کہ بعض طبیبوں نے کہا ہے کہ جو چاہتا ہے کہ صحت محفوظ رہے تو رات کے کھانے کے بعد سو قدم کی تعداد میں ٹہلا کرے۔ اور کھانے کے فوراً بعد نہ سو جائے۔ کیونکہ یہ مضر ہے۔ اور کھانے کے بعد نماز پڑھنا ہضم میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

پانی پینا: وصل: اب رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پینے کی کیفیت، تو بلاشبہ حضور آب شیریں وسرد کو پسند فرماتے تھے۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ اجمعین آپ کے لئے بیرسقیا سے پانی لاتے تھے۔ بیرسقیا مدینہ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے۔ اور چھتیس میل کی مسافت ہے۔ اور ٹھنڈا وشیریں پانی طلب کرنا زہد کے منافی نہیں ہے اور نہ ترفہ مذموم میں داخل ہے۔ اور ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ حلانکہ سید الزاہدین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے لیکن پانی کو مشک وگلاب سے خوشبودار بنانا ترفعہ اور تنعم میں داخل ہے۔ اور یہ مذموم ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی کراہت منقول ہے کہ انہوں نے اپنے شاگرد سے فرمایا اے فرزند من! پانی کو ٹھنڈا کر کے پیو۔ کیونکہ ٹھنڈے پانی سے دل کی گہرائیوں سے شکر ادا ہوتا ہے۔ شاگرد نے عرض کیا اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جس نے پانی کو دیوار پر ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا اور پھر اس پر دھوپ آگئی۔ اور اسے نہ اٹھایا اور گرم ہوگیا اور اسی گرم پانی پی لیا اور کہا کہ اے بھائی میں اپنے نفس کی لذت کے لئے نہیں چاہتا۔ فرمایا وہ شخص صاحب حال ہے اس کی پیروی نہیں چاہئے۔ کہتے ہیں کہ اس شخص سے مراد، حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

منقول ہے کہ حضور نے شہد میں پانی ملا کر نوش فرمایا اور علی الصباح نوش جان فرماتے۔ اور جب اس پر کچھ گھڑی گزر جاتی اور بھوک معلوم ہوتی تو جو کچھ کھانے کی قسم سے موجود ہوتا تناول فرماتے صاحب مواہب ابن قیم سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا اس میں حفظ صحت ہے اس پر فاضل طبیبوں کے سوا کسی کو دسترس نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ شہد کا شربت یا شہد کو ناشتے میں چاٹنا بلغم کو چھانٹتا اور معدے کے حمولات کو دھوتا اور اس کے لزوجت سے پاک وصاف کرتا اور اس کے فضلات کو دور کرتا اور اعتدال کے ساتھ معدے کو گرم کرتا ہے۔ اور جوڑوں کو کھولتا ہے اور ٹھنڈا پانی، سردتر ہے جو گرمی کو کاٹتا ہے اور صحت کی حفاظت کرتا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے کہ ''حضور سرد وشیریں پانی کو پسند فرماتے تھے'' اس سے مراد یہی شہد ملا شربت ہے یا کھجور ومنقی کا نقیع یعنی تر کردہ شربت یا نبیذ ہے اس میں عظیم نفع ہے اور قوتوں کو زیادہ کرتا ہے۔

نقیع ونبیذ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ کھجور یا منقیٰ کو کوٹ کر پانی میں ڈال کر رکھ دیتے ہیں تا کہ پانی شیریں ہوجائے۔ اگر اسے دو روز رکھے رہیں تا کہ شیرینی سے لب چپکنے لگیں تو اسے نبیذ کہتے ہیں اور اگر فوراً بنا کر پی لیں تو اسے نقیع کہتے ہیں۔ اس سے تیز کرنا مکروہ ہے۔ اور اگر کف یا جھاگ اٹھ آئے تو حرام وخمر ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دودھ کو پسند فرماتے تھے آپ نے فرمایا کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو کھانے اور پینے دونوں کا کام دے بجز دودھ کے۔ کھانے کے بعد دعا کرتے: زِدْنَا خَیْرًا مِّنْهُ. (اس سے ہماری بھلائی زیادہ کر) اور دودھ پینے کے بعد فرماتے زونا منه (اس سے ہمیں زیادہ کر) نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں اگر کوئی دے تو منع نہ کرنا چاہئے۔ دودھ، تکیہ اور خوشبودار تیل۔ ایک اور حدیث میں تیل کی جگہ طیب یعنی خوشبو آیا ہے یہ اس سے زیادہ معروف ہے اور آپ کبھی خالص دودھ نوش فرماتے اور

کبھی سرد پانی ملا لیتے۔ یعنی ''لسی'' اس لئے کہ دوہتے وقت دودھ گرم ہوتا ہے اور ان ممالک میں گرمی غالب ہے تو دودھ کی گرمی کو پانی کی سردی سے مارتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ٹھنڈا دودھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج لطیف کے مناسب وموافق تر آتا ہے۔ بخاری میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ ایک صحابی تھے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ انصاری اپنے باغ میں پانی دے رہا تھا۔ حضور نے انصاری سے فرمایا اگر تمہارے پاس پرانے مشکیزہ میں رات کا بھرا ہوا ٹھنڈا پانی ہو تو لاؤ ورنہ اس کیاری سے پانی پیتا ہوں۔ اس انصاری نے عرض کیا ہاں میرے پاس باسی بانی ہے جو پرانے مشکیزہ میں ہے پھر اس نے پیالے میں پانی لیا اور اپنے جھونپڑے میں جا کر بکری کا دودھ دوہ کر اس میں ملایا۔ پھر حضور نے اس پانی کو نوش فرمایا۔ جاننا چاہئے کہ اس حدیث میں لفظ کرع آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں پانی میں منہ ڈال کر پینا۔ جیسے کو چوپائے پیتے ہیں۔ لیکن شراح حدیث فرماتے ہیں کہ اس جگہ مراد یہ ہے کہ ہاتھوں سے پانی پینا نہ کہ منہ ڈال کر۔ گویا کرع کی حقیقت کو حضور کے مقام رفیع، درجہ بلند کے مناسبت پر محمول کرنا بعید جانا۔ حالانکہ حضور کی بے تکلفی سے یہ بعید نہ تھا۔ ممکن ہے کہ اس طرح پانی پینے میں کوئی ذوق پاتے ہوں (واللہ اعلم)

یہ فقیر یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ ایک مرتبہ ایک بزرگ زمانہ، صالح کی صحبت میں تھا۔ جو علم حدیث کے جاننے والے تھے۔ (رحمتہ اللہ علیہ) باغ میں اسی طرح پانی کیاریوں میں بہہ رہا تھا اس عزیز نے کرع کیا۔ یعنی منہ سے پانی پیا۔ اس وقت تو حقیقت حال منکشف نہ ہوئی۔ لیکن جب مجھے حضرت جابر رضی اللہ عنہ، کی یہ حدیث معلوم ہوئی تو جانا کہ اس عزیز کا وہ فعل اس حدیث کے اتباع میں تھا۔ حضور کھانے کے بعد پانی نوش نہ فرماتے کیونکہ مفسد ہضم ہے۔ جب تک کہ کھانا ہاضمہ کے قریب نہ ہو پانی نہ پینا چاہئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ پانی بیٹھ کر نوش فرماتے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلم میں ہی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں چاہئے کہ کوئی کھڑے ہو کر پانی نہ پئے۔ اگر بھول کر پی لیا ہے تو قے کر دے اور پانی کو پیٹ سے خارج کر دے۔ بخاری ومسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور کی خدمت میں آب زمزم کا ڈول لایا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے وضو فرمایا پھر کھڑے ہو کر بقیہ آب وضو کو نوش فرمایا۔ اور فرمایا لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو مکروہ جانتے ہیں حالانکہ میں نے اللہ کے نبی کو ایسا کرتے دیکھا ہے جیسا کہ میں نے کیا۔ اور یہ سب حدیثیں صحیح ہیں ان میں جمع وتطبیق اس طرح ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مکروہ تنزیہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بیان جواز کے لئے تھا۔ اور شارع علیہ السلام کو جائز ہے کہ بیان جواز کے لئے فعل مکروہ کو اختیار کریں۔ کیونکہ یہ آپ پر واجب ہے۔ اور اس کی نسبت آپ کی جانب مکروہ نہیں ہے اور قے کرنے کا حکم مذہب واستحباب پر محمول ہے۔ لہٰذا جو کھڑے ہو کر پئے اسے مستحب ہے کہ اس صحیح وصریح حدیث کے بموجب قے کر دے۔ خواہ بھول کر پئے یا قصداً اور حدیث میں نسیان یعنی بھولنے کی تخصیص سے، اس طرف اشارہ ہے کہ مومن سے جس چیز کا ترک کرنا افضل واولیٰ ہے اس سے قصداً کیسے واقع ہوگا۔ (کذا قالوا)۔ اور مالکیوں کا مذہب ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ وہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑے ہو کر پانی پیتے دیکھا ہے۔ امام مالک ؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ یہ تمام حضرات کھڑے ہو کر پانی پیتے تھے۔ اور شیخ عبدالحق جو ائمہ حدیث میں سے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، کی حدیث کا جواب دیتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ

کھڑے ہوکر پانی پینا آب وضواور آب زمزم کے ساتھ خاص ہےاور بعض کہتے ہیں کہ ممکن ہے یہ ممانعت خاص اس شخص کے لئے ہو جو اپنے ساتھیوں کے لئے پانی لایااوران کے پلانے سے پہلے خود کے پینے میں جلدی کی اوراس نے اس قاعدہ واصول کی خلاف ورزی کی کہ: سَاقِيْ الْقَوْمِ اٰخِرُهُمْ مُشْرَبًا ۔قوم کو پانی پلانے والا اپنے پینے میں ان سب کے بعد ہےاس وجہ پرحمل کرنا محض احتمال ہے۔ اور حدیث کی عبارت اس طرف دلالت نہیں کرتی۔

اورآب وضوکوکھڑے ہوکر پینے میں یہ بات ہے کہ یہ حدیثیں اصل جواز پردلالت کرتی ہیں اوروہ حدیثیں جس میں ممانعت ہے استحباب میں ہیں۔ بشرطاس قاعدے کہ بیٹھ کر پینا افضل واولیٰ ہے۔ اورشراح حدیث کے بعض کلام سے ایسامترشح ہوتا ہے کہ کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت قواعدطبیہ پرمبنی ہے۔ اورحضورصلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی رعایت فرماتے ہوئے ایساارشادفرمایا۔ مقتضائے کلام یہ ہے کہ اس کواپنی عادت نہ بنائے اگرکبھی پی لےتوممنوع نہ ہوگا۔ (واللہ اعلم۔)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے دیکھا ایک شخص کھڑے ہوکر پانی پی رہاہےتوانہوں کہا اس پانی کوقے کردے۔ اس شخص نے کہا کس لئے میں قے کروں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''کیا تمہیں اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ بلی پانی پیئے۔'' اس شخص نے کہا میں اچھانہیں جانتا۔ فرمایا بلاشبہ تیرے ساتھ جس نے پانی پیا ہے وہ بلی سے بدتر ہے کہ وہ شیطان ہے۔''

اورحضورصلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی آپ تین سانسوں میں پانی نوش فرماتے اورفرماتے کہ یہ سیراب کرنے والا۔ پسندیدہ تر اورشفابخشنے والا ہے۔ ہرسانس میں منہ سے پیالہ جداکرتے پھرسانس لیتے۔ اور پیالے میں پھونکنے سے منع فرماتے۔ اور جب دہن شریف سے پیالےکوقریب لاتے توبسم اللہ پڑھتے۔ اور جب جدافرماتے توحمد بجالاتے۔ اسی طرح تین مرتبہ کرتے۔

مروی ہے کہ پہلے سانس میں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ جَعَلَهٗ عَذَبًا فُرَاتًا بِرَحْمَةٍ وَلَمْ يَجْعَلْهُ مِلْحًا اُجَاجًا بِذُنُوْبِنَا ۔'' نیز مروی ہے کہ حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے پانی کوچوس چوس کرپیو۔ اورغٹ غٹ کرکے نہ پیواس سے معلوم ہوا کہ لوٹے کی ٹوٹی خوب منہ کے اندرنہ لینی چاہئے۔ جیسا کہ لوگ کرتے ہیں یہ ممنوع ہےاس لئے کہ مص یعنی چسکی ہونٹوں اورلبوں سے ہوتی ہے لیکن ٹوٹی کومنہ سے علیحدہ رکھنایامنہ سے دوررکھنابھی چسکی کے معنی کے موافق نہیں ہے۔

اورحضورصلی اللہ علیہ وسلم اپنے مہمانوں سے کھانے کے لئے اصرارفرماتے اور بار بارکہتے ایک مرتبہ ایک شخص کودودھ پلانے کے بعداس سے بار بارفرمایا ''اشرب اشرب'' اور پیواور پیو۔ یہاں تک کہ اس شخص نے قسم کھاکرعرض کیا۔ قسم ہےاس خدائے برتر کی جس نے آپکوحق کے ساتھ بھیجااب اورگنجائش نہیں ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا۔ اور جب آپ جماعت کوکھاناکھلاتے پلاتے توآپ ان سب کے بعدتناول فرماتے۔ مطلب یہ کہ ابتداء میں تناول نہ فرماتے آخرمیں ان کے ساتھ موافقت فرماتے۔ اورحدیث میں آیا ہے کہ جب دسترخوان بچھایاجائے توچاہئے کہ جب تک سب فارغ نہ ہوں نہ تواٹھےاورکھانے سے ہاتھ نہ کھینچےاگرچہ سیرہوچکاہو۔ کیونکہ یہ ساتھیوں کی شرمندگی کاموجب ہےاورممکن ہے کہ ابھی اسے کھانے کی احتیاج باقی ہواوراگرکوئی حضورصلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کرتااور میزبانی کاشرف پاتااورکوئی اورشخص آپ کے پیچھے پیچھے آجاتاتوحضورصلی اللہ علیہ وسلم میزبان کوخبرکردیتے کہ یہ شخص میرے ساتھ چلا آیا ہےاگرتم چاہوتولوٹ جائے۔ (الحدیث)۔

اکابروپیشواؤں کے ساتھ خدام وتوابع اورطفیلی ہوتے ہیں اور یہ جائز ہےاوراس حدیث کااقتضاءیہ ہے کہ صاحب خانہ کوبتاکراس سے اجازت لے لے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی جماعت کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تو جب تک ان کے لئے دعائے خیر نہ فرماتے باہر تشریف نہ لاتے اور فرماتے: اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْلَهُمْ وَارْحَمْهُمْ۔‘‘

نوع دوم - درلباس مبارک

وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ، لباس شریف میں وسعت اور ترک تکلف تھا۔ مطلب یہ کہ جو پاتے زیب تن فرما لیتے اور تعیین کی تنگی اختیار نہ فرماتے۔ اور کسی خاص قسم کی جستجو نہ فرماتے۔ اور کسی حال عمدہ و نفیس کی خواہش نہ فرماتے۔ اور نہ ادنی وحقیر کا تکلف فرماتے۔ جو کچھ موجود و میسر ہوتا پہن لیتے۔ اور جو لباس ضرورت کو پورا کر دے اسی پر اکتفا فرماتے۔ اکثر حالتوں میں چادر پیرہن اور ازار ہوتا جو کہ سخت اور موٹے کپڑے کے ہوتے اور پشمینہ بھی پہنتے۔ منقول ہے کہ آپ کی چادر شریف میں متعدد پیوند لگے ہوئے تھے۔ جسے آپ اوڑھا کرتے تھے۔ اور فرماتے میں بندہ ہی ہوں اور بندوں ہی جیسا لباس پہنتا ہوں اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔ اگر کبھی شاہان عجم عمدہ اور نفیس بیش بہا ہدیے میں بھیجتے تو ان کی تالیف قلوب کی خاطر زیب تن فرماتے مگر جلد ہی بدن شریف سے اتار دیتے۔ اور لوگوں کو عطا فرما دیتے۔ اور لوگوں میں انصاف اور علو ہمتی کے پیش نظر تقسیم میں برابری فرماتے۔ اور عمدہ و نفیس پہننا اور اس کے ساتھ مزین کرنا اور اس پر فخر و مباہات کرنا صاحبان شرف وجلالت کے شایان شان نہیں ہے۔ بلکہ عورتوں کی صفات اور ان کی نشانیاں ہیں لیکن صاف ستھرا اور پاکیزہ لباس رکھنا اور اس میں میانہ روی اختیار کرنا ہم جنسوں کے مشابہ ہونا محمود ہے یہ خلاف مروت نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی تمام خوبیوں میں لباس کا ستھرا رکھنا اور کم پر راضی ہونا بہت پسند ہے۔ اور حضور میلے اور گندے کپڑوں کو مکروہ و ناپسند جانتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور نے ایک شخص کو دیکھا جو بہت میلے اور غلیظ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ فرمایا کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں رکھتا جس سے یہ کپڑوں کو دھولے اور آپ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے بال الجھے ہوئے اور میل بھرے ہوئے ہیں اور بری حالت میں ہے۔ فرمایا کیا تم میں کوئی ایسا آیا ہے؟ مطلب یہ کہ شیطان ہے۔ اور حضور تزئین میں تکلف اور مبالغہ کو بھی محمود نہ جانتے تھے۔

سفر السعادۃ میں ہے کہ حضور کی عادت کریمہ، لباس میں ترک تکلف تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لوگ دو قسموں میں بٹ گئے بعض نے تزئین و آرائش اور نفیس لباس پہننے کو اختیار کیا اور وہ اس کے دلدادہ ہو کر رہ گئے اور بعض نے سخت و درشت لباس پہننے اور خستہ حالت میں رہنے کو اختیار کیا۔ اور وہ اسی میں مست ہو کے رہ گئے۔ یہ دونوں روشیں، طریقہ نبوی کے خلاف ہیں۔ میانہ روی۔ عدم فریفتگی اور عدم تکلف ہر حالت میں محمود ہے اس میں شک نہیں کہ اسلاف کی سیرت اور ان کے علماء وزہاد اور عبادت گزاروں کی خستہ حالی میں رہی ہے۔ اور حدیثوں میں بھی ان کی مدح و تعریف اور ترغیب آئی ہے۔ اور مروی ہے کہ: اَلْبَذَاوَةُ مِنَ الْاِيْمَان. خستہ حالی ایمان میں سے ہے اور آراستگی، تحسین ہیئت اور صاف ستھرے کپڑوں کے باب میں بھی حدیثیں آئی ہیں۔ اور جب حضور تکبر و غرور کی مذمت فرماتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرض کرتے یا رسول اللہ آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتیاں عمدہ ہوں۔ اس پر حضور نے: اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّيُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبْرُ بَطِرُ الْحَقِّ بلاشبہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ اور تکبر حق تعالیٰ سے سرکشی کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ لباس و ہیئت میں تجمل و تحسین مستلزم تکبر نہیں ہے کبر تو حق تعالیٰ کے ساتھ سرکشی کرنا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ نَظِيْفٌ يُّحِبُّ النَّظَافَةَ۔ بلاشبہ اللہ پاک وصاف ہے اور وہ پاکی و صفائی کو پسند فرماتا ہے۔ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس حال میں دیکھا کہ میرے جسم پر کم قیمت کے کپڑے تھے فرمایا کیا تیرے پاس از قسم مال ہے؟ میں نے

عرض کیا ہاں! اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال و دولت سے نوازا ہے۔ اونٹ بھی ہیں اور بکریاں بھی ہیں۔ فرمایا پھر تو خدا کی نعمت اور اس کی بخشش کو تمہارے جسم سے ظاہر ہونا چاہئے۔ مطلب یہ کہ تونگری کی حالت کے مناسب کپڑے پہنو۔ اور خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہئے کہ خدا کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو چاہئے کہ خدا کی نعمت کا اثر تمہارے جسموں سے دیکھا جائے اور اس کی عنایتیں تم سے ظاہر ہوں۔ اور الجھے ہوئے بالوں والے پریشان حال سے فرمایا کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس سے اپنے سر کو تسکین دے۔ اور اس شخص کو دیکھا جس پر میلے اور غلیظ کپڑے تھے۔ فرمایا کیا یہ شخص کوئی ایسی چیز نہیں پاتا ہے جس سے اپنے کپڑوں کو دھولے۔ مروی ہے کہ اللہ پسند فرماتا ہے کہ بندے پر اپنی نعمتوں کا اثر دیکھے۔ لہٰذا یہ ظاہری جمال و آرائش اس شکر نعمت کا موجب ہے جو جمال باطن ہے اور ''لِبَاسُ التَّقْوٰی'' کا اشارہ اسی جانب ہے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: یَا بَنِیْ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْر. اے بنی آدم ہم نے تم پر ایسا لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا اور زینت بخشتا ہے اور تقوے کا لباس اتارا یہ بہت بہتر ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہئے کہ اپنے ظاہر و باطن کو صاف و ستھرا اور پاک رکھے اور دل و زبان کو صدق و اخلاص کے زیور سے آراستہ بنائے اور اعضاء و جوارح کو زیور طاعت و نظافت سے مزین کرے۔ اسی مقام پر نجاستوں اور ناپاکیوں سے بدن کی طہارت کا حکم اور مکروہ بالوں کو مونڈنا یعنی بغلوں کے بال اور موئے زیر ناف کو صاف کرنا، ختنے کرانا، ناخنوں کو ترشوانا وارد ہوا ہے۔ یہ سب باتیں مسنون ہیں اور فطرت اس کی خواستگار ہے۔ فطرت کے معنی گزشتہ نبیوں کی سنتیں ہیں۔ اس کا مدار نیت پر ہے۔ اگر عمدہ لباس پہننے سے مقصود، نفسانیت کبر، غرور، دنیاوی کروفر کا اظہار، آرائش، شوکت نفس، فقراء پر فوقیت دکھانا، ان کے دلوں کو مجروح کرنا ہے تو مذموم اور بہت قبیح ہے۔ جیسا کہ منافقوں کی مذمت میں آیا ہے: وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ۔ اور جب تم انہیں دیکھو تو ان کے اجسام تمہیں حیرت میں ڈال دیں اور حدیث پاک میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَاِنَّمَا یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ. بیشک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ جیسا کہ مواہب میں مسلم کی حدیث سے مروی ہے اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ وَیَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَنِیَّاتِکُمْ ۔ بیشک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے عملوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہاری نیتوں کو دیکھتا ہے۔ اگر اس تجمل و تحسین سے تمہاری نیت، اظہار نعمت، شوکت علم، عزت دین، جمال وحال اور دینی احکام کی پیروی ہے تو ممدوح و محمود ہے۔ بکثرت علماء زہاد اور عابدوں نے نفیس ترین اور عمدہ ترین لباس پہنا ہے۔ اور ان کی نیت اس میں نیک تھی۔ چنانچہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفود کے لئے تجمل فرماتے اور جمعہ و عیدین کے لئے بھی آرائش فرماتے تھے۔ اور مستقل جدا لباس محفوظ رکھتے تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس قسم کا لباس پہننا ایسا ہے جیسے قتال کے لئے ہتھیار لگانا۔ اور بیش بہا اور فاخر لباس پہننا اور ان چیزوں میں بڑائی اور کروفر دکھانا جو کلمۃ اللہ کی برتری اور دین کی فتح مندی کو شامل ہے۔ حقیقۃً یہ اعداء دین غلظت اور ان کو جلانے اور کڑھانے کے لئے ہے۔

بعض حضرات ایسا نفیس لباس اس لئے پہنتے ہیں کہ دولت مندی اور ثروت ظاہر ہوتا کہ ان کی جانب حاجت مند اور سائل متوجہ ہوں۔ اور اپنی ضرورتیں حاصل کرسکیں اسی کی مانند ادنیٰ و حقیر لباس پہننے میں بھی تفصیل کی جاتی ہے کہ اگر خست، بخل یا لوگوں کے اموال میں لالچ اور احتیاج دکھانے کی بنا پر پہنے تو مذموم و مقبوح ہے۔ اور اگر زہد اور دنیاوی زیب و زینت اور اس کے ساز و سامان سے عدم رغبت اور جو میسر ہو اس پر قناعت و ایثار کرنے کی وجہ سے پہنے تو محمود و حسن ہے۔ اور جس کی نیت ان دونوں سے خالی ہو وہ نہ مذموم ہوگی اور نہ محمود (کذا فی المواہب)

ظاہر یہ ہے کہ یہ قسم دائرہ اباحت سے خارج نہ ہوگی۔ بلکہ زیب وزینت کی تمام صورتوں میں فضیلت واستحباب میں تو کلام ہے لیکن اصل اباحت میں کلام نہیں ہے۔

مواہب لدنیہ میں ایک کلام بطریق سوال لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ سلف صالحین کی سیرت بد ہیئت اور لباس کی کہنگی میں رہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ صوفیائے شاذلیہ اپنے لباس میں حسن وجمال اور زیب وزینت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کا طریقہ سنت کا اتباع اور سلف صالحین کی اقتدا ہے۔ اس کے جواب میں اسے نقل کرتے ہیں جو بعض عرفاء نے جامع مفید اور فیصلہ کن بحث فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سلف صالحین نے جب دیکھا کہ اہل غفلت اور دنیا میں مشغول ہونے والے ظاہری زیب وزینت میں مصروف رہتے ہیں اور دنیاوی مال ومتاع پر فخر ومباہات کرتے ہیں اور اس پر اطمینان رکھتے ہیں تو ان حضرات صوفیا نے ان کی مخالفت کی روش اس قصد وارادہ سے فرمائی کہ ظاہر کردیں کہ جس چیز کو یہ غافل لوگ اتنا عزیز جانتے ہیں وہ کتنی حقیر وذلیل ہے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کی حقارت بیان فرمائی ہے۔ اور جس چیز کے اہل غفلت اتنے محتاج وضرورتمند ہیں وہ ان سے بے نیاز مستغنی ہیں اور ان کی مرغوب ومحبوب چیزوں سے نفرت وزہد اختیار کیا اور جو کچھ خدا ان حضرات قدس کو مرحمت فرمایا ان نعمتوں پر شکر گزار ہوئے اور جب اس حال پر زمانہ دراز گزر گیا اور اس امر میں فساد نے راہ پائی اور اس کی حقیقت کے جاننے میں دل سیاہ ہوگئے اور غفلت کی راہ نے دوسرا رخ اختیار کیا اور کچھ لوگوں نے بدہیئتی اور لباس کی بوسیدگی کے پردے میں تحصیل دنیا میں حیلہ جوئی شروع کردی اور معاملہ برعکس ہوگیا اور جو طریقہ ترک دنیا کا تھا وہ خود تحصیل دنیا کا ذریعہ بن گیا تو بعض محققین اہل طریقت نے جیسے مشائخ شاذلیہ اور ان کے ان پیروں نے جو ان کے مذہب پر چلتے ہیں اسے ترک کردیا اور بدہیئتی اور لباس کی کہنگی کی روش کو چھوڑ دیا۔ اور اس امر کو حکمت وحقیقت کی نظر سے سلف صالحین کی موافقت سمجھنے لگے اور ان کی مخالفت نہیں سمجھی۔ اگرچہ ظاہر بینوں کو یہ مخالف نظر آیا۔

استاد ابوالحسن شاذلی جو سلسلہ شاذلیہ کے رئیس ومقتدا ہیں ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کوئی ان بدہیئتوں میں سے اس پر اعتراض کرتا ہے۔ اسے یہ جمال ہیئت اور تجمل لباس جواب دیتا ہے کہ اے شخص! میری یہ ہیئت اور میرا یہ لباس زبان حال سے الحمدللہ کہتا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے مخلوق سے مستغنی بنایا ہے اور تیری وہ ہیئت اور تیرا وہ لباس پکار پکار کر کہتا ہے کہ مجھے اپنی دنیا سے کچھ دو۔'' ان شاذلیوں کے افعال، دائر بر حکمت، مبنی بر معنی اور مقرون بہ نیت ہیں۔ اب ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس مبارک کے بیان اور اس کے انواع میں چند وصل بیان کرتے ہیں۔

عمامہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: وصل: جاننا چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمامہ شریف نہ اتنا وزنی و بڑا ہوتا جس سے سر مبارک پر بار معلوم ہوتا اور نہ اتنا چھوٹا اور ہلکا ہوتا کہ سر مبارک پر تنگ ہو۔ مروی ہے کہ عمامہ شریف چودہ گز شرعی سے متجاوز نہ ہوتا۔ اور کبھی سات گز شرعی ہوتا۔ شرعی گز ایک ہاتھ کا ہے۔ جو بیچ کی انگلی سے کہنی تک ہے اس کی مقدار دو بالشت ہے یعنی چوبیس انگل۔ بمقدار ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کے حروف کی گنتی کے۔ چوبیس حروف ہیں۔

اور بعض مقامات میں جیسے حوض کو ناپنے میں، ذراع کرماسی یعنی کپڑے ناپنے کے گز کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ یہ گز ہر قوم اور ہر زمانہ میں رائج ہے۔ (جو تین فٹ یا 36 انچ کا ہوتا ہے) لیکن اس کا اعتبار، عمامہ میں بھی جائز ہوسکتا ہے۔ (واللہ اعلم)۔

علماء فرماتے ہیں کہ قدر معہود پر کچھ زیادہ کرلے تو اس میں مسامحت کی جاتی ہے اور وہ جو ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ عمامہ، مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان حاجز ہے۔ یعنی امتیاز ہے تو وہ عمامہ، عذبہ یعنی شملہ کے ساتھ ہے جیسا کہ سیاق حدیث اس میں شاہد ہے (عذبہ یا شملہ اسے کہا جاتا ہے جو عمامہ کے سرے کو دونوں شانوں کے درمیان چھوڑ جاتا ہے۔) اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک

عمامہ تھا جس کا نام ''سحاب'' رکھا ہوا تھا اور حضور کے پاس جتنے کپڑے، گھوڑے اور سواری کے جانور تھے ہر ایک کے اپنے تجویز کردہ نام ہوتے تھے جیسا کہ آخر کتاب میں آئے گا اور عمامہ کے نیچے سر مبارک سے چمٹی ہوئی ٹوپی تھی۔ یہ ٹوپی سر سے پست و پیوست تھی بلند نہ تھی۔ طاقیہ (جسے آج کل کلاہ کہتے ہیں) کی مانند اور حضور کی ٹوپی تھی۔ مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق، ٹوپیوں پر عمامہ باندھنا ہے۔ یہ عبارت دو معنی کا احتمال رکھتی ہے ایک یہ کہ ہمارے عمامے ٹوپیوں پر باندھے جاتے ہیں اور ان کے عمامے ٹوپیوں پر نہیں ہوتے دوسرے معنی یہ کہ وہ بغیر عماموں کے ٹوپیاں پہنتے ہیں اور مراد پہلے ہی معنی ہیں اس لئے کہ عمامہ پہننا مشرکوں سے بھی ثابت ہے۔ (واللہ اعلم)۔

اور جب عمامہ باندھتے تو سدل فرماتے۔ یعنی سرا چھوڑتے۔ اسے ترمذی نے شمائل میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما عنہما سے روایت کیا۔ مسلم نے اتنا زیادہ کیا کہ: قَدْ اَرْخٰی طَرْفَهَا بَیْنَ کَتِفَیْهِ. بے شک عمامہ کے سرے کو دونوں شانوں کے درمیان لٹکاتے۔ اسے عذبہ، ذوابہ اور شملہ بھی کہتے ہیں اور اسے سنت عمامہ کہتے ہیں۔ نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمامہ باندھنے میں تدویر یعنی گولائی فرماتے۔ اور دستار کے پیچ کو سر مبارک پر لپیٹتے اور اس کے سرے کو عمامہ سے اڑستے اور دوسرے کو چھوڑتے اور لٹکاتے تھے۔ صحیح مسلم میں عمرو بن حریث کی حدیث مروی ہے کہ کہا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر شریف پر اس حال میں دیکھا کہ حضور کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اور اس کے ایک سرے کو دونوں شانوں کے درمیان چھوڑا ہوا تھا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ رونق افروز ہوئے تو سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ذوابہ یعنی شملہ کا ذکر نہیں ہے۔ یہ دلالت کرتی ہے کہ ذوابہ ہر جگہ دائمی نہ تھا۔ (کذا فی المواہب) بلکہ حدیث بخاری میں ہے کہ روز فتح مکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے تر سر مبارک پر خود تھا علماء فرماتے ہیں کہ دخول مکہ کے وقت جسم اطہر پر ہتھیار لگائے ہوئے تھے اور سر مبارک پر خود تھا اور دستار نہ تھی اور ہر جگہ اس کی مناسبت سے لباس زیب تن فرماتے تھے۔ بعض علماء نے دونوں قولوں کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ عمامہ خود کے اوپر تھا۔ اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے جمع میں فرمایا کہ اول دخولِ مکہ کے وقت سر مبارک پر خود تھا اور داخل ہونے کے بعد سیاہ عمامہ کے اوپر خود باندھا بدلیل قول عمرو رضی اللہ عنہ بن حریث کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اس لئے کہ خطبہ کعبہ کے دروازے پر تھا جس وقت کہ فتح مکمل ہوگئی ابن اعرابی کہتے ہیں کہ جمع میں بہ نسبت اول کے یہ اولیٰ واظہر ہے۔ مکمل تذکرہ فتح مکہ کے ضمن میں آئے گا۔ (انشاء اللہ)۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں کہ میرے سر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ باندھا تو میرے پشت پر دونوں شانوں کے درمیان سرا لٹکایا۔ مروی ہے کہ بدر و حنین کے دن فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے۔ تو اسی طرح پر عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

علماء فرماتے ہیں کہ کم سے کم شملہ چار انگل ہے اور زیادہ سے زیادہ نصف کمر تک۔ اس سے زیادہ اسبال میں داخل ہے جو حرام و مکروہ ہے اور عذبہ یعنی شملہ کی جگہ تحسنیک بھی روی ہے۔ تحسنیک یہ ہے کہ شملہ کو بائیں جانب سے تالو اور ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر داہنی جانب عمامہ میں اڑس لینا۔ علماء فرماتے ہیں کہ بغیر تحسنیک اور عذبہ کے عمامہ باندھنا مکروہ ہے یہ اس تقدیر پر ہے کہ یہ سنت موکدہ ہے۔ اگر مراد کراہت تنزیہی لیں تو اس کا مآل ترک اولیٰ اور ترک افضل ہوگا۔ (واللہ اعلم)

پیرہن مبارک اور تہبند شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرہن مبارک کی آستین پہنچے تک ہوتی تھی اس سے زائد لمبی، سرعت حرکت اور گرفت میں مانع ہوتی تھی۔ اور اس سے کم ہاتھ کو گرمی و سردی سے نہیں بچاتی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام

افعال واوضاع میں معانی وحکمتیں ہوتی ہیں جو اعتدال ومناسبت پر مبنی ہیں۔ اسی طرح حضور کے پیرہن اور چادر مبارک کا دامن نصف پنڈلیوں تک ہوتا تھا اور تہبند کو گٹوں سے نیچا نہ رکھتے تھے اور گویا انصاف لفظ جمع کے ساتھ اس طرف اشارہ ہے کہ نصف کی حقیقت جو وسط حقیقی ہے شرط نہیں ہے۔ طبرانی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میرا تہبند گٹوں سے نیچے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابن عمر رضی اللہ عنہما! جو کپڑا زمین سے چھو جائے وہ آتش دوزخ میں سے ہے اور بخاری میں ہے تہبند کا جو حصہ ٹخنوں کے نیچے ہے وہ آگ میں ہے یہ حکم مردوں کے لئے ہے اور عورتوں کو لٹکانا اور لمبا رکھنا جائز ہے۔ اور جب سیّدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! عورتیں کیا کریں؟ فرمایا ایک بالشت تک بڑھا لیں۔ عرض کیا اب بھی پاؤں برہنہ رہتے ہیں ایک ہاتھ تک بڑھا لیں۔ اس سے زیادہ نہ کریں۔ یہ حکم تہبند اور قمیص کے دامن کا ہے۔ ظاہر ہے کہ زمین سے دامن چھوانا عورتوں کے لئے جائز ہے۔

جاننا چاہئے کہ اسبال یعنی لٹکانا تہبند کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قمیص اور عمامہ کو بھی شامل ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسبال، تہبند، قمیص اور عمامہ میں ہے جو کوئی ان میں بطریق رعونت وتکبر گھسیٹتا ہے وہ...... (الحدیث) لیکن اکثر حدیثوں میں اسبال، تہبند میں آیا ہے یہ کثرت وجود کے اعتبار سے ہے اور لفظ ثوب کے ساتھ بھی مطلق آیا ہے لیکن حدیث کے مفہوم کا وجود، عمامہ میں مخفی رہتا ہے تو اس سے مراد عذبہ یعنی شملہ کی حد سے درازی ہے۔ اور آستین کو بڑھانا جیسا کہ اہل حجاز کی عام عادت ہے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

صاحب مواہب، ابن قیم سے نقل کرتے ہیں انہوں نے کہا یہ فراغ و دراز آستینیں تھیلوں کی مانند اور برجوں کی مانند عمامے باندھنے کی رسم نوایجاد ہے۔ نہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا نہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے کیا۔ یہ سنت کے خلاف، غرور وتکبر کے زمرے میں ہے۔ اور بعض دیگر علماء سے نقل کر کے کہتے ہیں کہ کسی اہل فہم وبصیرت پر مخفی نہیں ہے کہ یہ لمبی لمبی آستینیں جو عام طور پر لوگوں میں رواج پا گئی ہیں اس میں اسراف اور مال کا ضیاع ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے لیکن لوگوں کی ایک اصطلاح بن گئی ہے کہ ہر قوم کے کچھ شعار اور علامتیں ہوتی ہیں۔ جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں جو چیز، خیلا یعنی غرور وتکبر کے طریقہ پر ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور جو چیز بطریق عادت ہے اس میں حرمت اس وقت تک نہیں ہے جب تک کہ اس حد تک نہ پہنچے جس کا حکم لباس میں درازی وکشادگی میں ممانعت سے متعلق ہے اور قاضی عیاض سے منقول ہے کہ جو عادت سے زیادہ ہو اور لباس کی عام لمبائی وکشادگی سے اس میں کراہت ہے (انتہی) مذکورہ علماء کے اقوال، درازی وکشادگی کی حرمت وکراہت میں صریح ہیں لیکن لفظ عادت ومعتاد کے دخل کرنے میں ایک قسم کے جواز کا اشارہ ہے۔ اس میں انہیں معذور گردانتے ہیں۔

حرمین شرمین زادہما تَعْظِيْمًا وتَشْرِيْفًا کے بعض اکابر سے سنا گیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ لباس کا یہ انداز ہمارا عرف وشعار ہو گیا ہے اگر نہ کریں تو ہم پہچانے نہ جائیں اور ہماری عزت ختم ہو جائے لیکن کلام اس میں ہے کہ ایسا عرف وشعار کیوں بنایا گیا ہے۔ جو خلاف سنت ہے واللہ اعلم۔ بہر تقدیر تہبند وغیرہ میں اسبال ودرازی کی حرمت وکراہت کے سلسلے میں جو کچھ آیا ہے وہ خیلاء تکبر اور تزئین کے قصد کے ساتھ مقید ہے۔ اور جہاں ایسا قصد نہ ہو مثلاً سردی وغیرہ سے بچنا یا کوئی اور عذر وغیرہ تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے۔ حدیث مبارک میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عادت ووضع ایسی ہو گئی تھی کہ آپ کا تہبند نیچے لٹکا کرتا تھا اور اسبال ہی کی صورت میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جب اس بارے میں ممانعت واقع ہوئی تو آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہار کیا کہ میرے تہبند کی یہ حالت ہے میں کیا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ان میں سے نہیں ہو جو مغرور متکبر لوگوں کی عادت بنی ہوئی ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس جگہ ازار کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس کے معنی تہبند کے ہیں لیکن وہ ازار جو عجمیوں کے عرف میں ہے اور اہل عرب اسے سراویل کہتے ہیں اور جسے ہم پائجامہ کہتے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنا ہے یا نہیں۔ اس پر بعض علماء نے جزم و یقین کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہیں پہنا ہے اور ابو یعلیٰ موصلی اپنی مسند میں بسند ضعیف، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت لاتے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک دن بازار گیا تو حضور بزاز کی دکان میں تشریف فرما ہوئے پھر ایک سراویل (پائجامہ) چار درہم میں خریدا اور اہل بازار کا ایک وزان یعنی تولنے والا تھا جو درہم کو تولا کرتا تھا اس سے حضور نے ارشاد فرمایا وزن کر اور خوب اچھی طرح ٹھیک وزن کر اس پر اس وزّان نے کہا میں نے یہ کسی سے نہیں سنی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وزّان سے فرمایا افسوس ہے تجھ پر تو نہیں جانتا آپ ہمارے نبی ہیں۔ پھر تو وہ ترازو چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی طرف جھکا اور چاہا کہ حضور کے دست مبارک کو بوسہ دے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا۔ اور فرمایا: اے فلاں! ایسا عجمی لوگ اپنے بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں میں تمہیں میں کا ایک شخص ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سراویل لے لی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ میں اٹھا لوں۔ فرمایا مال کا مالک زیادہ حق دار ہے کہ وہ خود اپنے مال کو اٹھائے مگر یہ کہ وہ کمزور یا مجبور ہو۔ اور اٹھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ایسے مسلمان بھائی کی مال کے لے جانے میں مدد دینی چاہئے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا پہننے کے لئے سراویل خرید فرمائی ہے۔ فرمایا ہاں! میں اسے سفر و حضر اور دن اور رات میں پہنوں گا۔ اس لئے کہ مجھے خوب ستر پوشی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اس سے بہتر ستر پوش دوسرا لباس نہیں دیکھا اس حدیث کو بکثرت محدثین نے بسند ضعیف روایت کیا ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کو خریدنا صحت کے ساتھ ثابت ہے۔ اور ہدایہ میں ہے کہ اس کا خریدنا پہننے کے لئے تھا۔ روایت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہنا اور آپ کی اجازت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی پہنا۔ (واللہ اعلم)۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب ترین لباس قمیص مبارک تھی۔ اگرچہ تہبند اور چادر شریف بھی بہ کثرت زیب تن فرماتے تھے لیکن قمیص کا پہننا زیادہ پسندیدہ تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور کا پیرہن مبارک سوتی اور تنگ دامن و آستین والا تھا اور آپ کی قمیص مبارک میں تکمے یعنی گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ علماء محدثین اور دیار عرب کے تمام حصوں میں معروف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص مبارک میں سینہ کے مقام پر جیب تھی۔ اور یہ قمیص کی سنت ہے۔ یہ جو ماوراء النہر اور پاک وہ ہند کے لوگوں میں معروف مشہور ہے کہ گردن کے دونوں طرف دو تکمہ لگاتے ہیں عرف عرب میں یہ عورتوں کے ساتھ مشہور ہے۔ اور مردوں کے سینہ پر تکمے ہوتے ہیں اور ان شہروں میں اصطلاح اس کے برعکس ہے۔

حکایت: مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں حرم شریف میں ایک ہندی رفیق کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جس کی قمیص میں ہمارے ملک کے دستور کے مطابق تکمے لگے ہوئے تھے تو ایک عربی عالم بار بار میرے آگے آتا جاتا اور اس ہندی شخص کو دیکھتا۔ اس عرب سے کہا گیا یا سیدی کیا دیکھتے اور کیا جستجو فرماتے ہو! اس عالم نے کہا اس شخص کو شرم نہیں معلوم ہوتی کہ عورتوں جیسا لباس پہنے حرم الٰہی میں بیٹھا ہوا ہے۔

معاویہ بن قرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا تا کہ حضور کی متابعت کروں اس وقت میں نے دیکھا کے حضور کے پیرہن شریف کے تکمے کھلے ہوئے ہیں تو میں نے آپ کی قمیص مبارک کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مہر نبوت کو چھوا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص مبارک میں جیب تھی اور جسے اس کا علم نہیں وہ اس کے برعکس خیال کرتا ہے۔ (انتہی)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر شریف کی لمبائی چار گز شرعی اور اس کا عرض دو گز شرعی اور ایک بالشت تھا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ازار لئے ہوئے تھے۔ جو جنبش کرتا تھا۔ مروی ہے کہ حضورک اپنے تہبند کو سامنے کی جانب لٹکاتے۔ اور عقب میں اونچا رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیر ناف تہبند باندھے دیکھا ہے اور آپ کی ناف ظاہر تھی۔ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو ناف کے اوپر تہبند باندھے دیکھا ہے ابو بردہ بن ابی موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمارے لئے درشت مرقع تہبند اور چادر نکال کر دکھایا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت کے ساتھ ان کپڑوں میں رحلت فرمائی ہے۔ سیّدہ اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عنہما فرماتی ہیں کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضور کا جبہ شریف تھا جب ان کا وصال ہوا تو اسے میں نے لے لیا اور ہم بیماریوں کی شفا کی خاطر اسے دھو کر پلاتے تھے۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رومی جبہ تنگ آستین کا پہنا ہے اور وضو کے وقت دستہائے مبارک کو آستین سے نکال کر جبہ کو کندھوں پر یا پشت پر ڈال لیتے اس کے بعد ہاتھوں کو دھوتے۔ یہ حالت سفر کی تھی۔ کیونکہ سفر میں آپ تنگ لباس پہنا کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حرہ پہننے کو پسند فرماتے تھے۔ یہ ایک قسم کی چادر ہے جسمیں سرخ دھاریاں تھیں۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چاندنی رات میں دیکھا اور آپ کے جسم اطہر پر سرخ جوڑا تھا تو میں کبھی آپ کو دیکھتا تھا۔ اور کبھی چاند کو۔ میرے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاند سے زیادہ حسین تھے۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہ دیکھا ایک روایت میں ہے کہ کسی چیز کو نہ دیکھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سرخ جوڑے میں آپ سے زیادہ حسین ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ میں نے کسی خمدار زلفوں والے کو سرخ جوڑے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوشتر نہیں دیکھا۔ اس کی تحقیق حلیہ شریف کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ پر اپنے سرخ حلہ کو پہنا کرتے تھے۔ حلہ جوڑے کو کہتے ہیں جس میں چادر اور تہبند ہوتا ہے۔ حلہ یعنی جوڑا دو کپڑے کو کہتے ہیں۔ یا اس کپڑے کو جو استر دار ہو۔ اور حمراء یا احمر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس میں سرخ دھاریاں ہوں۔ جیسا کہ آج بھی ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ اور یہی وہ چادر شریف ہے جو ''بردیمانی'' کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس میں سرخ دھاریاں تھیں۔ اس سے وہ خالص سرخ ہونا مراد نہیں ہے۔ جس کی ممانعت کی گئی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے جسم پر سرخ رنگ کا لباس دیکھ کر فرمایا یہ کفار کا لباس ہے اسے نہ پہنو۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اس وقت میرے جسم پر سرخ رنگ کا لباس تھا۔ حضور نے فرمایا تم نے اسے کہاں سے لیا ہے۔ میں نے عرض کیا میری بیوی نے میرے لئے بنا ہے فرمایا اسے جلا دو۔

بعض لوگوں کو اس حدیث سے اشتباہ ہوتا ہے کہ سرخ لباس جائز ہو گا یہ خطا ہے سرخ سے مراد وہی ہے کہ سرخ دھاریاں تھیں۔ اسی طرح سبز رنگ کے بارے میں حضرت امنہ کی حدیث واقع ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے آپ کے جسم اطہر پر دو سبز چادریں تھیں اور عطاء بن ابی یعلیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ طواف میں سبز چادر شریف سے اصطباغ کئے ہوئے تھے۔ اس سے مراد ایسی چادر ہے جس میں سبز دھاریاں تھیں۔ اگرچہ یہ جگہ خالص سبز ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہے۔ لیکن دیار عرب میں یہی معنی مشہور و معروف ہیں اور زرد رنگ بھی اسی معنی میں ہے کہ زرد رنگ کی

دھاریاں تھیں۔ بعض لوگ حلہ یعنی جوڑے کے معنی ریشمی کپڑا سمجھتے ہیں۔ یہ بھی خطا ہے۔ تحقیق وہی ہے جو مذکور ہو چکی ہے۔

صاحب مواہب نے امام نووی سے سرخ رنگ کے بارے میں علماء کا اختلاف نقل کیا ہے۔ چنانچہ صحابہ و تابعین اور ان کے بعد کے علماء کی ایک جماعت نے مباح قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے قائل، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ ہیں۔ لیکن امام مالک نے فرمایا ہے کہ غیر سرخ لباس افضل ہے۔ اور ایک روایت میں سرخ کپڑا گھروں میں اور سراؤں میں پہننا جائز رکھا ہے۔ اور محفلوں اور بازاروں میں مکروہ قرار دیا ہے۔ اور ایک جماعت اس پر ہے کہ یہ مکروہ بکراہت تنزیہی ہے اور ممانعت کو اسی پر محمول کرتے ہیں۔ اس لئے کہ حضور سے سرخ جوڑا پہننا ثابت ہو چکا ہے۔ اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ یعنی خالص سرخ نہ تھا۔ بلکہ سرخ دھاریاں تھیں اور بعض نے اس ممانعت کو حج و عمرے کے احرام پہننے والوں پر محمول کیا ہے یہ بھی ایک تکلف ہے اس تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور مذہب حنفی میں بھی کئی قول ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ یہ مکروہ بکراہت تحریمی ہے اور اس کے ساتھ بکراہت نماز جائز ہے اور شیخ قاسم حنفی جو ائمہ احناف اور ان کے محققین میں سے ہیں مصر میں تھے انہوں نے تحقیق کی ہے کہ سرخ لباس رنگ کی بنا پر مکروہ ہے۔ خواہ معصفر ہو یا غیر معصفر۔

صاحب مواہب کہتے ہیں کہ بیہقی نے ''معرفت سنن'' میں مسئلہ کا اتفاق کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ امام شافعی نے ایک شخص کو مزعفر یعنی زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے سے منع کیا ہے اور معصفر کو مباح قرار دیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا میں نے معصفر کپڑے پہننے کی اجازت اسی بنا پر دی ہے کہ میں نے کسی ایک کو ایسا نہ پایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ممانعت اس بارے میں بیان کرے۔ بجز اس قول کے جو علی مرتضےٰ کرم اللہ وجہہ سے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس سے منع فرمایا اور ہم نہیں کہتے کہ تمہیں بھی منع کیا ہے اور بیہقی فرماتے ہیں کہ بلاشبہ ایسی حدیثیں وارد ہیں جو علی العموم مخالفت پر دلالت کرتی ہیں اور بیہقی نے مسلم کی حدیث بیان کی کہ ''یہ کفار کے لباس میں سے ہے'' اس کے بعد بیہقی نے اور حدیثیں بیان کر کے کہا کہ اگر یہ حدیثیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو پہنچتی ہے تو یقیناً وہ اس کے قائل ہو جاتے اس کے بعد بیہقی نے اپنی سندوں کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا جس وقت میرے قول کے خلاف کوئی حدیث صحت کو پہنچے تو اس حدیث پر عمل کرو اور میرے قول کو چھوڑ دو اور بیہقی فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مزعفر میں سنت کا اتباع کیا ہے اور فرمایا میں نے جو اس شخص کو منع کیا ہے وہ زعفرانی رنگ کے ساتھ ہے اور میں اسے حکم دیتا ہوں کہ وہ زعفرانی رنگ کو دھو ڈالے۔ حالانکہ ان کی متابعت معصفر میں اولیٰ تھی (انتہیٰ)۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ معصفر اور مزعفر کپڑا ممنوع ہے۔ اور حدیث صحیح میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزعفر سے باز رہنے کا حکم دیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زرد رنگ سے کپڑا رنگا ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ زعفران سے اپنے کپڑوں کو رنگا کرتے تھے۔ یعنی اپنی قمیص مبارک اور اپنے عمامہ کو اسے دمیاطی نے روایت کیا ہے۔ اور ابوداؤد کے نزدیک اس طرح کے حضور اپنے لباس کو زعفران سے رنگا کرتے تھے یہاں تک کہ عمامہ کو بھی۔ اسی طرح حضرت زید بن اسلم اور ابن سلمہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی حدیث روایت کی گئی ہے۔ لیکن علماء فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں، ممانعت کی حدیثوں سے معارض نہیں ہوتیں یا یہ منسوخ ہیں (واللہ اعلم)۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفید لباس پہننے کو پسند رکھتے تھے۔ اور فرماتے حسین ترین لباس، سفید کپڑوں کا ہے چاہئے کہ تم میں سے اسے زندہ لوگ بھی پہنیں اور اپنے مردوں کو بھی اس کا کفن دیں۔ اور حضور کبھی کالی کملی بھی اوڑھا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت باہر تشریف لے جاتے تو آپ پر کالی کملی ہوتی اور عمامہ شریف کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن داخل ہوئے تو سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اور سیاہ لباس مستحب ہے۔ اور مذہب حنفی بھی یہی ہے۔ اور پشمینہ یعنی ادنی کپڑے بھی پہنتے ہیں

لیکن تطلیس، جس کی تعریف یہ ہے کہ سر پر چادر اس طرح اوڑھنا کے چادر کے دونوں کنارے کندھوں پر پڑے رہیں تو اس کے بارے میں ابن قیم جوزی نے کہا ہے کہ یہ مکروہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے اور نہ اصحاب نبی سے بلکہ مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ دجال کے ساتھ ستر ہزار اصبہان کے یہودی نکلیں گے جن کے اوپر طیالسہ ہوگا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک جماعت دیکھی ہے جن پر طیالیہ تھا۔ پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کیا عجب ہے کہ یہودان کے مشابہ ہوں۔ جس کی خبر دی گئی ہے اور ابوداؤد و حاکم کی حدیث میں ہے کہ: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہے۔ اور ترمذی کی حدیث میں ہے: لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ لِغَيْرِنَا ۔ وہ ہم میں سے نہیں جس نے ہمارے غیروں کی مشابہت اختیار کی اور وہ جو ہجرت کی حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر اس روز تشریف لائے تو چادر لپیٹے ہوئے تھے۔'' تو یہ چھپانے کے لئے تھا تا کہ کوئی آپ کو پہچان نہ ہو سکے۔ اس لئے نہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی (انتہی)۔

ابن قیم نے یہ بات جو کہی ہے خطا ہے کیونکہ علماء کہتے ہیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے کہ ضرورت کی بنا پر یہ عمل تھا۔ اور عادت نہیں تھی۔ اس لئے کہ سہل بن ساعدی کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر چادر لپیٹا کرتے تھے اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ نیز بیہقی شعب الایمان میں اور ابن سعد، طبقات میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں کہ كَانَ يُكْثِرُ التَّقَنُّع حضور اکثر چادر لپیٹا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ حدیث اور اس کے علاوہ دیگر حدیثیں ابن قیم کے قول کو رد کر رہی ہیں جو یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے کہ چادر لپیٹی، یہ بھی اس حدیث سے مروی ہے جسے حاکم نے مستدرک میں بشرط بخاری قرہ بن کعب سے روایت کیا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک فتنہ کا ذکر کرتے سنا اور اس کا بہت جلد رونما ہونا بیان فرمایا۔ اتنے میں ایک شخص چادر لپیٹے اور خود کو چھپائے گزرا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس دن یہ شخص ہدایت پر ہوگا۔ پھر میں کھڑا ہوا۔ تا کہ اس شخص کو دیکھوں کہ وہ شخص کون ہے تو دیکھا کہ وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، تھے اور سعید بن منصور، اپنی سنن میں ابوالعلاء سے روایت کرتے ہیں۔ ابوالعلاء بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو اپنے سر پر چادر ڈالے منہ لپیٹے نماز پڑھتے دیکھا ہے اور ابن سعد، سلمان بن مغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے امام حسن رضی اللہ عنہ کو چادر میں ڈھانپے ہوئے دیکھا ہے۔ اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میں نے امام حسن کو اندقی طیلسان یعنی چادر اوڑھے دیکھا ہے۔ ابن قیم نے یہ جو یہود کے قصہ سے بیان کیا ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس سے استدلال اس وقت صحیح ہے جبکہ طیالسہ یہود کا شعار ہو۔ بلاشبہ اب زمانے کے طور و طریق بدل چکے ہیں۔ لہٰذا یہ اب عام اباحت میں داخل ہوگا۔ اور شیخ عزالدین بن عبدالسلام فرماتے ہیں کہ کو عادت مسلمانوں میں عام طور پر رائج ہو جائے اس کا چھوڑنا بے مروتی ہے جیسا کہ فرمایا کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا انکار چادر کے رنگ کی بنا پر تھا کہ وہ زرد تھی۔ یہ سب مواہب لدنیہ میں مذکور ہے۔ اور کبائر مشائخ و صلحا سے منقول ہے کہ وہ چادر سے ڈھانپا کرتے تھے۔ اور بہجۃ الاسرار میں ہے وَكَانَ الشَّيْخُ عَبْدِ الْقَادِرِ يَتَطَلَّسُ حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ خود کو چادر سے ڈھانپا کرتے تھے۔'' غالبًا ابن قیم کا انکار اسی پر تھا۔ اور حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے فعل شریف کی بنا پر اس کے انکار میں مبالغہ تھا اس لئے کہ ابن جوزی اور انکے پیروکار حضور غوث الاعظم رضی اللہ عنہ، کے انکار میں گرفتار تھے۔ (تاب اللہ علیہم واللہ اعلم)۔

اور چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں میں اطیب و الطف تھے اس لئے اس کی علامت آپ کے بدن شریف میں ظاہر تھی کہ آپ کے جسم اطہر سے لگنے کی وجہ سے آپ کے کپڑے میلے نہ ہوتے تھے۔ اور نہ آپ کے لباس مبارک میں جوں پڑتی تھی اور نہ

کپڑوں پراور نہ آپکے جسم اطہر پر مکھی بیٹھتی تھی جیسا کہ حدیث مبارک میں آیا ہے لیکن اس حدیث سے اشکال کیا جا سکتا ہے جسے امام احمد نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے شمائل میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جس وقت ان سے دریافت کیا گیا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شانہ اقدس میں تشریف فرما ہوتے تو کیا کیا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْلِيْ ثَوْبَهُ وَيَحْلِبُ شَاتَهُ وَيَخْصِفُ نَعْلَه ۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کپڑوں میں جوں تلاش کرتے اور اپنی بکری کا دودھ دوہتے۔ اور اپنی نعلین مبارک کو سیا کرتے تھے۔ علماء فرماتے ہیں کہ شاید حضور کے کپڑوں میں کسی دوسرے شخص سے جوں آ گئی ہو، بغیر اس کے بدن لطیف سے پیدا ہوئی ہو اور یہ بات بھی ممکن ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس جگہ لفظ ''فلی'' کا اطلاق خس وخاشاک کے چننے پر اور ان چیونٹیوں کے تلاش کرنے پر ہے جو زمین سے عموماً کپڑوں میں چڑھ آتی ہیں بطور مجاز ہو۔ یہ بھی ایک ''فلی'' کی ہی صورت ہے مطلب یہ کہ حضور اپنے لباس مبارک کو دیکھ بھال فرمایا کرتے اور اسے اس طرح پاک وصاف فرماتے تھے جس طرح عام طور پر لوگ کپڑوں میں جوں تلاش کرتے ہیں۔ اس مسکین (صاحب مدارج النبوۃ) کے ذہن میں یہی معنی بیٹھتے اور قرار پکڑتے ہیں۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال، علی وجہ الکمال)۔ مواہب میں اسے اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کے لحاظ سے جوں آپ کو ایذا نہ دیتی تھی۔ مگر یہ عبارت جوں کی ایذا کی نفی تو ظاہر کرتی ہے لیکن اس کے وجود کی نفی ظاہر نہیں کرتی۔ ممکن ہے کہ ملزوم کی نفی سے لازم کی نفی کی طرف اشارہ ہو۔

انگشتری مبارک: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لباسہائے مبارک میں سے انگشتری بھی تھی۔ جسے آپ پہنا کرتے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری چاندی کی تھی۔ اور وہ انگشتری آپ کے دست مبارک میں ہی رہی آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہی ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اس کے بعد حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ وہ بیراریس میں گر پڑی۔ بیراریس ایک کنوئیں کا نام ہے جو مسجد قبا کی جانب ہے۔ ترمذی میں ہے کہ یہ انگشتری معیقب کے ہاتھ سے بیراریس میں گر پڑی، معیقب، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، کے خادم کا نام تھا۔ یہ بھی صحابی ہیں (رضی اللہ عنہ،) سے مروی ہے کہ اس انگشتری کو بہت تلاش کیا گیا اور کنوئیں کا پانی تک نکالا گیا اور اسے صاف کیا گیا مگر دستیاب نہ ہوئی۔ علماء فرماتے کہ اس انگشتری میں کچھ اسرار تھے جس سے کارہائے ملک وملت کا انتظام وابستہ تھا جس طرح کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگشتری میں صفت تھی۔ کیونکہ اس انگشتری کے گم ہو جانے کے بعد ان کے ملک میں تفرقہ وفتور نے راہ پائی۔ جیسا کہ مشہور ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری گم ہو جانے کے بعد تفرقے اور فتنے ظہور پذیر ہوئے۔ اور اس کی ابتدا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل وشہادت سے ہوئی اور قیامت تک فتنے اور خون خرابے ہوتے رہیں گے۔ نیز صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری مبارک چاندی کی تھی اور اس میں حبشی نگینہ تھا۔ حبشی کے معنی میں کئی قول ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سنگ سیاہ تھا بعض کہتے ہیں کہ وہ پتھر تھا جو حبشہ میں ہوتا ہے اور اس کی کان حبشہ میں تھی۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا بنانے والا حبشی تھا اور حضور انگشتری کے رنگ کو ہتھیلی کی جانب رکھتے اور متعدد حدیثوں میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے ہاتھ میں لوہے کی انگوٹھی دیکھی۔ فرمایا کیا بات ہے کہ میں تیرے پاس جہنمیوں کا زیور دیکھتا ہوں اس کے بعد اس سے فرمایا چاندی کی انگوٹھی بنا اور اسے ایک مثقال یعنی ساڑھے تین ماشے سے زیادہ نہ کر۔ ایک روایت میں ہے کہ پورے ساڑھے تین ماشہ نہ کرنا یعنی اس سے کچھ کم رکھنا۔ اسی طرح سے ایک شخص آیا اس کے ہاتھ میں پیتل کی انگوٹھی تھی جس سے بتوں کو ڈھالا جاتا تھا۔ پیتل چونکہ سونے کا ہم رنگ ہوتا ہے اس لئے عربی میں پیتل کو ''شبہ'' کہتے ہیں۔ حضور نے فرمایا مجھے کیا ہوا کہ بتوں کی بو پاتا

ہوں۔ اس پر اس شخص نے انگوٹھی کو پھینک دیا۔ اور ترمذی کی حدیث میں ''من صفر'' (زرد رنگ) آیا ہے صفر کے معنی بھی پیتل کے ہیں۔ اسی طرح رانگ اور پیتل کی انگوٹھی مکروہ ہے۔ اور لوہے کی انگوٹھی جائز ہونا بظاہر صحیحین کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا جس نے اپنے نفس کو شوہر کے سپرد کیا کہ: اُطْلُبْ وَلَوْ خَاتِمًا مِنْ حَدِيْدٍ۔ مانگو اگرچہ لوہے کی انگوٹھی ہو۔ اس حدیث سے جواز پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ یہ ضعیف ہے اور اس لئے بھی کہ اس سے اس کا پہننا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ مراد قلیل و حقیر چیز ہے۔ اور سنن ابوداؤد میں معیقب سے باسناد جید مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری لوہے کی تھی جس پر چاندی لپیٹی ہوئی تھی۔ (واللہ اعلم)

اب رہی سونے کی انگوٹھی تو اس میں صحیحین میں براء ابن عازب اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی کو منع فرمایا ہے۔ نیز صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نے سونے کی انگوٹھی بنوائی۔ اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوائیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور دست مبارک سے اس انگوٹھی کو نکال کے پھینک دیا۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نکال کے پھینک دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوانے سے منع فرمایا۔ یہی ہے ائمہ اربعہ اور اکثر علما کا مذہب۔ اور یہ جو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ وہ سونے کی انگوٹھی رکھتے تھے ''غریب'' ہے جسے بخاری نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ ابی اسید رضی اللہ عنہ، بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھ سے ان کی موت کے وقت لوگوں نے سونے کی انگوٹھی اتار دی۔ (واللہ اعلم)

ایک روایت میں ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی سونے کی انگوٹھیاں نکال کے پھینکیں تو کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے اسے نہ اٹھایا۔ بعض نے کہا بھی کہ کیوں نہیں اٹھاتے تمہارا مال ہے انہوں نے جواب دیا ہم اسے ہرگز نہ اٹھائیں گے جس کی حضور نے ممانعت فرمائی ہے اور اسے مکروہ جانا ہے۔

عقیق کی انگوٹھی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم عقیق کی انگوٹھی پہنو اور داہنا ہاتھ زینت کا زیادہ مستحق ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ عقیق کی انگوٹھی پہنو کیونکہ یہ محتاجی کو دور کرتا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ وہ مبارک ہے اور سیّدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے عقیق کی انگوٹھی پہنی وہ خیر دیکھے گا۔ اور حدیثیں بھی مروی ہیں لیکن علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیق کی انگوٹھی پہننے کے بارے میں کچھ ثابت نہیں ہے۔ اور امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یاقوت زرد کی انگوٹھی پہننا طاعون سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

اور چاندی کے نگ کی انگوٹھی کے بارے میں بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انگوٹھی بھی چاندی کی تھی اور رنگ بھی چاندی کا تھا اور مسلم میں ہے کہ انگوٹھی چاندی کی تھی اور رنگ حبشی تھا جیسا کہ گزرا علماء فرماتے ہیں کہ ممکن ہے دو انگوٹھی ہوں۔ ایک ایسی اور دوسری ویسی کبھی اسے پہنتے اور کبھی اسے۔ اور انگوٹھی کے نقش کے بارے میں صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی اور اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ'' نقش کرایا۔ اور لوگوں کو منع فرما دیا کہ اپنی انگوٹھیوں میں اُسے نقش نہ کریں۔ اور بخاری و مسلم میں ہے کہ انگوٹھی کا نقش تین سطر میں تھا۔ ایک سطر میں محمد دوسری سطر میں رسول، اور تیسری سطر میں اللہ۔ اور فتح الباری میں ہے کہ ظاہر یہ ہے کہ کتابت اس طرح ہوگی کہ محمد کی سطر اوپر اور رسول کی سطر درمیان میں اور اس کے بعد اللہ، اور فرمایا، (لیکن بعض مشائخ کا یہ کہنا ہے) کہ اسم جلالت اوپر تھا اور اسم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اور درمیان میں رسول

تھا۔ میں نے کسی حدیث میں اس کی تصریح نہ پائی۔ بلکہ بخاری کی روایت کا ظاہر اس کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ سطر اول محمد، سطر ثانی رسول اور سطر ثالث اللہ جیسا کہ صاحب مواہب نے فرمایا۔ لیکن انگوٹھی پہننے کے باب میں اکثر اخبار و آثار اس طرح ہیں کہ داہنے ہاتھ میں بھی پہننا مروی ہے۔ اور بائیں ہاتھ میں بھی۔ اور صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ خواہ داہنے ہاتھ میں پہنے خواہ بائیں ہاتھ میں جائز ہے۔ البتہ لوگوں کا اس میں اختلاف ہے کہ کون سے ہاتھ میں افضل ہے بعض کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ مین یہ نص امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور صالح بن امام احمد رحمتہ اللہ کی روایت میں ان سے مروی ہے کہ میرے نزدیک بائیں ہاتھ میں پہننا اچھا ہے اور یہی مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے کہ بائیں ہاتھ میں پہنے۔ اسی طرح امام احمد و امام شافعی کا مذہب ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب بھی یہی ہے۔ (واللہ اعلم)

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس انگلی میں انگشتری پہنتے تھے اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کی طرف اشارہ کیا۔ اسی طرح ابوداؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ بعض حفاظ حدیث بیان کرتے ہیں کہ بائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننا عام صحابہ و تابعین سے مروی ہے اور بعض علماء داہنے ہاتھ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ قول حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ اجمعین کا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی داہنے ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کو روایت کرتے ہیں۔ اس لئے بعض حضرات کہتے ہیں کہ ممکن ہے کبھی داہنے ہاتھ میں پہنتے ہوں اور کبھی بائیں ہاتھ میں اور بعض کہتے ہیں کہ بائیں ہاتھ میں پہننا دونوں میں آخری ہے یعنی داہنے ہاتھ میں پہننا منسوخ ہے اور حق یہ ہے کہ اس کی صحت میں کلام ہے۔ یہ سب باتیں مواہب میں مذکور ہیں۔

اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور کبھی انگشتری میں یادداشت کیلئے دھاگہ باندھتے تھے تاکہ فراموش نہ کرسکیں۔ دو انگوٹھی یا زیادہ پہننا مکروہ ہے۔ خصوصاً چاندی کی۔ صاحب مواہب فرماتے ہیں کہ عبارت سے کراہت ظاہر ہوتی ہے یعنی حرام نہیں ہے۔

دراصل انگوٹھی پہننے میں بھی اختلاف ہے اکثر اس کو مباح رکھتے ہیں اور غیر مکروہ یعنی جائز اور بعضے بقصد زینت مکروہ قرار دیتے ہیں اور بعضے مطلقاً مکروہ کہتے ہیں مگر بادشاہ، صاحب سلطنت اور حکم کے لئے مکروہ نہیں ہے۔ حدیث میں بھی ایسا ہی آیا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو انگوٹھی بنوائی تھی وہ اسی غرض کے لئے تھی۔ مطلب یہ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں اور امرائے وقت یعنی قیصر و کسریٰ اور حبشہ کو فرمان لکھنا چاہا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ لوگ بغیر مہر کے خط کو قبول نہیں کرتے اور نہ اسے پڑھتے ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنوائی اور اس میں محمد رسول اللہ نقش کرایا۔ اور ابن عبدالبر نے مطلقاً کراہت نقل کی ہے۔ اور وہ حدیث لائے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنوائی مگر پہنی نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چندروز پہنی پھر اتار دی (واللہ اعلم)

خفین شریف: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزے پہنے ہیں اور اس پر مسح کرنا صحت کو پہنچا ہے ترمذی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نجاشی شاہ حبش نے حضور کے لئے بطور نذرانہ سیاہ دسادہ دو موزے بھیجے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ مغیرہ رضی اللہ عنہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ حضرت وحیہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دو موزے بھیجے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنا۔

نعلین مبارک: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نعلین شریف پہنا کرتے تھے اگر پاؤں کو بالکل ڈھانپ لے تو وہ موزہ کہلاتا ہے ورنہ نعلین کہتے ہیں۔ بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعلین دو قبال کی تھیں۔ قبال جوتی کے فیتوں کو کہتے ہیں اور فیتے و تسمے دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ ترمذی نے شمائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت

کی ہے کہ دو تسمے تھے جو ورتہ کے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں جو کوئی جوتی پہنے اسے چاہئے کہ پہلے دائیں پیر سے شروع کرے اور جب اتارے تو بائیں سے (الحدیث) اور حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جوتی پہن کر چلنے سے منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ غیر عادی عمل ہے اور گرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسا بعض امراض کے پیدا کرنے کا باعث ہے۔ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ حضور نے اپنے کاشانہ میں ایک نعل مبارک پہنی ہے۔ احتمال ہے کہ ایسا شاید کسی چیز کو اٹھانے کے لئے کیا ہو اور فاصلہ کم ہو اور ایک جانب کے پاؤں ملوث ہو جانے کا خطرہ ہو اور تب انہوں نے ایسا دیکھا کہ اسی جانب نعل شریف پہنے ہوئے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ بیان جواز کے لئے ہو خصوصاً ایسی صورت حال میں۔ اور مواہب میں ابوداؤد و ترمذی سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر جوتی پہننے سے منع فرمایا ہے۔ اور بعض علماء نے نعلین شریف کی تمثال و نقشے میں علیٰحدہ رسالے لکھے ہیں اور اس سے برکت و نفع اور فضل حاصل ہونا بیان کیا ہے۔ اور مواہب میں اس کا تجربہ لکھا ہے کہ مقام درد پر نعلین شریفہ کا نقشہ رکھنے سے درد سے نجات ملی ہے اور پاس رکھنے سے راہ میں لوٹ مار سے محافظت ہو جاتی ہے اور شیطان کے مکروہ فریب سے امان میں رہتا ہے اور حاسد کے شر و فساد سے محفوظ رہتا ہے مسافت طے کرنے میں آسانی ہوتی ہے اس کی تعریف و مدح اور اس کے فضائل میں قصیدے لکھے گئے ہیں۔

بستر مبارک: وصل: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر مبارک کے بارے میں صحیحین میں سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ کا بستر مبارک جس پر آپ استراحت فرماتے تھے چمڑے کا تھا جس میں کھجور کے درخت کے ریشے کوٹے ہوئے بھرے تھے اور بیہقی نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا انہوں نے فرمایا میرے پاس ایک انصاری عورت آئی اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر شریف دیکھا کہ دوتہ کی ہوئی ٹاٹ کا بستر ہے تو اس عورت نے میرے پاس ایسا بستر بھیجا جس میں اون بھری ہوئی تھی جب حضور تشریف لائے اور اسے ملاحظہ فرمایا تو فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنہا یہ کیا ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ فلاح انصاری عورت میرے پاس آئی تھی اس نے آپ کا بستر شریف دیکھا تو یہ بستر اس نے بھیج دیا۔ فرمایا اسے واپس کر دو اے عائشہ رضی اللہ عنہا! اس کے بعد فرمایا اگر میں چاہتا تو اللہ تعالیٰ میرے ساتھ سونے چاندی کے پہاڑ حاضر کر دیتا۔ مطلب یہ کہ میرا بستر میرا زہد اور میری ریاضت ہے۔ فقر و ناپیدی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے رب کی محبت میں اور اس کی رضا میں میں نے اسے اختیار کیا ہے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کہا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر آرام فرماتے اور چٹائی کا نشان آپ کے پہلوئے مبارک پر پڑا ہوا تھا اس پر انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ، کاش کہ آپ اس سے بہتر و نرم بستر پسند فرماتے؟ فرمایا مجھے دنیا سے کیا لینا ہے۔ میرا قصہ اور میری داستان، اور دنیا کی داستان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوار گرامی میں سفر کر رہا ہو پھر ستانے کے لئے کچھ دیر ایک درخت کے نیچے بیٹھ جائے اس کے بعد وہ سفر کو چل دے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ایک گرم کوٹھری میں (گویا کہ وہ حمام ہے) چٹائی پر سو رہے تھے اور اس کا نشان آپ کے پہلوئے مبارک پر پڑ گیا میں یہ حالت دیکھ کر رونے لگا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا بات ہے۔ کس نے تمہیں رلایا اے عبداللہ رضی اللہ عنہ! میں نے عرض کیا قیصر و کسریٰ تو دیبا و حریر کے فرش پر سوئیں اور آپ چٹائی پر فرمایا اے عبداللہ رضی اللہ عنہ! ''روؤ نہیں ان کے لئے دنیا ہے اور ہمارے لئے آخرت۔'' اس حدیث کا مضمون حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس سے زیادہ مفصل مذکور ہے۔ فرمایا کہ جب حضور چٹائی پر استراحت فرما رہے تھے۔ اس وقت آپ کے جسم اطہر پر بجز تہبند کے کچھ نہ تھا اور چٹائی کے نشان آپ کے پہلوئے اقدس پر پڑ

گئے تھے اور آپ کے کاشانہ اقدس کے گوشے میں ایک صاع کے برابر جو پڑے ہوئے تھے۔ اور ایک کھال دیوار پر آویزاں تھی۔ یہ دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے خطاب کے فرزند! کس چیز نے تمہیں رولایا۔ میں نے عرض کیا'' یا نبی اللہ! میں کیوں نہ روؤں جب کہ قیصر و کسریٰ تر باغوں اور نہروں میں سونے کے تختوں پر دیبا و حریر کے بستر پر سوئیں اور آپ خدا کے نبی چٹائی پر اس حال میں آرام فرمائیں۔'' فرمایا اے ابن خطاب! کیا تم اس پر راضی نہیں کہ ان کے لئے دنیا ہے اور ہمارے لئے آخرت۔'' ایک اور روایت میں ہے کہ چٹائی پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہوئی تھی اور سر مبارک کے نیچے ٹاٹ کا تکیہ کھجور کی چھال سے بھرا ہوا رکھا تھا، مروی ہے کہ فرمایا یہ وہ قوم ہے جن کو دنیا میں اچھی اچھی چیزیں دینے میں جلدی کی گئی ہے۔ اور ہم وہ قوم ہیں جنہیں آخرت میں اچھی اچھی چیزیں دینے کے لئے دیر کی گئی ہے۔ منقول ہے کہ اگر حضور کے لئے بستر بچھا دیا جاتا تو اس پر آرام فرما لیتے تھے ورنہ زمین پر ہی استراحت فرمالیت تھے۔

نوع سوم، درنکاح مبارک

وصل: اب ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح اور جماع کے بارے میں عادت کریمہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ جماع، حفظ صحت کے اسباب میں سے ہے اور منی کا روکنا اور اس کے اخراج سے باز رہنا اور اس کی عادت بنالینا، ضعف قویٰ اور اس کی رگوں کا خشکی اور قسم قسم کے امراض ردیہ کے پیدا ہونے کا موجب و باعث ہے۔ مثلاً وسواس، جنون اور رمرگی وغیرہ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ قوت اور اعتدال مزاج اور اس میں زیادتی اور کثرت نہ ہو جس کی قوت زیادہ ہے اسے ترک جماع بہت زیادہ مضر ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت تمام مردوں سے زیادہ تھی۔ ابن سعد نے طاؤس و مجاہد سے روایت کیا ہے کہ آپ کو چالیس مردوں کے جماع کی قوت دی گئی تھی۔ ایک روایت میں ہے کہ جنتی چالیس اور چند مردوں کے کھانے پینے اور جماع کی قوت دی گئی ہے امام احمد و نسائی اور حاکم نے زید رضی اللہ عنہ بن ارقم کی حدیث مرفوعاً روایت کی ہے کہ ایک جنتی مرد کو سو مردوں کے کھانے پینے اور شہوت و جماع کی قوت دی جاتی ہے۔ صفوان بن سلیم سے مرفوعاً مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام ایک دیگ پکی ہوئی لائے اور میں نے اس میں سے کچھ کھایا تو مجھے چالیس مردوں کے جماع کی طاقت دی گئی اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ وہ دیگر ہریسہ کی تھی۔ محدثین ان حدیثوں کو وضعی قرار دیتے ہیں جیسا کہ گزرا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ نکاح کرو کیونکہ جس کی ازواج زیادہ ہیں وہ سب سے افضل ہے۔ یا تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اشارہ ہے یا عام بات ہے شیخ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی خوبی بیان کرنا ہے۔ بندۂ مسکین (صاحب مدارج) کہتا ہے کہ مراد تمام امت ہے کیونکہ اس میں اتفاق ہے کہ اہل عرب، مردوں میں جماع کی قوت پر فخر و مباہات کرتے تھے۔ اور یہ بات مسلم ہے اور اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی کہ حضور سید الانبیاء صلوات اللہ علیہ وعلیہم اس فعل کو شرف بخشتے تھے اور وظیفہ نکاح کی زیادتی میں حد، چار آزاد عورتیں ہیں اور اسے مباح کیا گیا ہے۔ ام المومنین سید عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس جہان سے تشریف نہ لے گئے جب تک کہ آپ کے لئے جنتی چاہٸں عورتیں حلال نہ ہوئیں اور آپ میں ازواج کی محبت پیدا کی گئی۔ فرمایا: اَصْبِرُ عَنِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَلاَ اَصْبِرُ عَنْهُنَّ میں کھانے پینے سے تو رک سکتا ہوں لیکن ازواج سے نہیں رک سکتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ، سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے چار خصلتوں میں لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے سماحت (جود و سخا) کثرت جماع، شجاعت، اور شدت گرفت، اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں سے جماع کی قوت انسانیت کا کمال ہے۔ اور

حضرت خلیل اللہ صلوٰت اللہ تعالیٰ وسلامہ علیہ جو کہ ابوالملت اور امام الحنفاء ہیں اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا جو کہ جہان کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسین وجمیل تھیں اور حضرت ہاجرہ جوان کی زوجہ تھیں آپ ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے صحبت کے لئے روزانہ براق پر شام سے تشریف لاتے تھے کیونکہ ان سے آپ کو خاص لگاؤ اور محبت تھی اوزان سے صبر کی تاب کم تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کی ننانوے بی بیاں تھیں انہیں اچھا معلوم ہوا کہ سو کی تعداد پوری ہو جائے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام ننانوے ازواج پر تشریف لے جاتے اور آپ کے صلب میں سو مردوں کی طاقت تھی۔ یہ ان کا معجزہ تھا ان کی تین سو بیبیاں اور ایک ہزار باندیاں تھیں۔ (کذافی المواہب)۔

اس جگہ یہ وہم نہ کرنا چاہئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس خصوص میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فوقیت تھی اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتنے فضائل کے پہلو میں یہ محو ومستور ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جماع کو بقدر کفایت اختیار فرماتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نبی اور بادشاہ تھے اور انہیں ایسا ملک دیا گیا جو ان کے بعد کسی کو نہ دیا گیا۔ اور عورتوں کی کثرت تعداد بھی ان کے ملک کی قسم میں تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت، عبودیت اور فقر کو اختیار کئے ہوئے تھے اور یہ قوت جماع جو آپ کو حاصل تھی معجزے میں داخل ہے کہ ایک رات میں تمام ازواج مطہرات پر دورہ فرماتے وہ ازواج گیارہ تھیں اور ایک روایت کے مطابق نو تھیں۔ یہ قوت کثرت سے روزے رکھنے اور صوم وصال فرمانے اور شدت بھوک میں اپنے شکم اطہر پر پتھر باندھنے کے باوجود ہے۔ اور عادت کے مطابق کھانے پینے کے قسم سے مقویات کا استعمال حضور کے حق میں نادر تھا یا معدوم۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن و جمال، رنگت کا نکھار اور رخ انور کی چمک دمک کی حالت میں جو کہ عام طور سے لذیذ ومشتہی کھانوں کے استعمال اور نرم ونازک لباسوں کے پہننے اور مخملی بستر پر سونے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے عالم ظاہر میں نہ تھیں اس کے باوجود عالم ظاہر میں آپ کی یہ حالت معجزات میں سے ہے البتہ بعض انبیاء کرم علیہم السلام اصلاح وقت کی خاطر اور حکم الٰہی سے عدیم النکاح اور قلیل الازواج بھی گزرے ہی لیکن ان میں یہ شان اور یہ کثرت نہ ہوتی اور اس میں ان کے مبالغہ کرنے کو عیب ونقص کی نظر سے نہ دیکھنا چاہئے۔ حَاشَآ لِلّٰہِ وَعَیَاذًا بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِكَ. بلکہ دوسروں کے اعتبار سے ان میں اس فضیلت وکمال کے وجود کو زیادہ افضل واکمل ماننا چاہئے۔ اور بعض متقشع زاہد جن میں جہالت اور رہبانیت کی صفت ثابت ہے اس معاملہ میں حسن اعتقاد ومعقولیت کے برعکس راہ چلتے ہیں اور اس خصلت کو محض لذات حسیہ سے خیال کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ اس میں ایسے اسرار وفوائد اور منافع مضمر ہیں جو اس کے ماسوا میں نہیں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مبارک حسن لطافت اور کثرت ازداج کے وجود کی دلیل کافی ہے نکاح وجماع کے فوائد ومنافع بہت ہیں ان میں سے عمدہ ترین، سلسلہ تناسل اور نوع انسانی کا دوام اور اس کی بقا ہے یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب تک خدا کو منظور ہے۔ اس کے سوا قضاء حاجت، حصول لذت وشوق از مباشرت اور تمتع بہ نعمت الٰہی ہے اور یہ ایسی نعمت ومنفعت ہے، جو جنت میں بھی ہوگی لیکن وہاں سلسلہ تناسل اور اخراج منی نہ ہوگی۔ اس کے سوا منی کے روکنے سے متعدد امراض پیدا ہوتے ہیں اور اسکے منافع میں سے یہ بھی ہے کہ نگاہ میں تیزی اور منی کا اخراج ہوتا ہے جس سے ضرر رساں چیزوں کا ازالہ ہو کر صحت کی حفاظت ہوتی ہے جیسا کہ گزرا اور عورت ومرد کا نفس کسی گناہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتا ہے اور عورت ومرد کی محبت نکاح کے فوائد میں سے یہ ہی کہ بیویوں کے حقوق کی ادائیگی میں زیادہ تکلیف اٹھائی جاتی ہے اور ان کی کج خلقی اور دکھ دینے والی باتوں پر صبر کرنا پڑتا ہے اور یہ وہ فائدہ ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اتم واشد طریقہ سے حاصل فرماتے تھے کیونکہ یہ اتم واکمل عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں بہت زیادہ اجر وثواب ہے اور مذہب حنفی میں مجرد رہنے سے مطلق نکاح کرنا افضل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس کی ترغیب دی ہے چنانچہ فرمایا، محبت کرنے والی اور بچے پیدا کرنے والی عورت سے نکاح کرو اس لئے کہ میں روز قیامت اپنی امت کی کثرت اور ان کی زیادتی پر دیگر امتوں پر فخر ومباہات

فرماؤں گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا میں عورتوں سے صحبت کرتا ہوں باوجود ان کی جانب میلان نہ ہونے کے۔ اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ میری پشت سے اسے پیدا فرمائے جس کی وجہ سے روز قیامت دیگر امتوں کے سامنے حضور کثرت امت پر فخر فرمائیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو روزہ رکھنے کا حکم فرمایا جو نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو کیونکہ روزہ، قوت باہ کو توڑتا اور اس کے مادہ کو فنا کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اجر و ثواب میں روزے سے نکاح اعظم ہے اس لئے کہ حضور نے روزہ رکھنے کا حکم اسی بنا پر فرمایا کہ وہ نکاح کی استطاعت نہ رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ جب نکاح سے امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی کثرت مقصود ہو تو نکاح افضل ہوگا۔ بلاشبہ حضور کا ارشاد ہے: لَارَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اور رہبانیت سے مراد ترک نکاح ہے۔ اگر ترک نکاح افضل ہوتا تو یقین ہے کہ ہمارے دین میں جو سب دینوں سے افضل و برتر ہے اسے شروع کیا جاتا۔

وجہ حکمت کثرت تزویج رسول صلی اللہ علیہ وسلم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کثرت سے نکاح فرمانا جو حضور کے ساتھ خاص ہے اس کا مقصد اندرون خانہ کے احکام کی تبلیغ تھی اور یہ کہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوبیاں معلوم ہوں۔ اور آپ کی اس سیرت پاک سے مطلع ہو جائیں چند مرد مطلع نہیں ہو سکتے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواج مطہرات ایسی تھیں جن کے باپ اور چچا مر چکے تھے۔ مثلاً سیّدہ ام صفیہ رضی اللہ عنہ اور ام حبیبہ رضی اللہ عنہ کے والد اس زمانے میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے دشمن تھے وغیر ذالک۔ اگر یہ ازواج مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کے کمال حسنِ خلق پر مطلع نہ ہوتیں تو انسانی طبیعتیں اپنے آباء و اقارب کی طرف مائل ہونے کا اقتضاء کرتیں لہٰذا ازواج کی کثرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ کے ظاہر و باطنی کمالات کا اظہار و بیان ہے۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین)۔

تنبیہہ: حدیث مبارک حُبِّبَ اِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلَاثٌ (مجھے تمہاری دنیا کی تین چیزیں محبوب کی گئی ہیں) یہ حدیث اسی طرح تمام زبانوں پر مشہور ہے۔ لیکن امام غزالی، احیاء العلوم میں اور صاحب کشاف۔ ''آل عمران کی تفسیر میں اور فقہ کی اکثر کتابوں میں اس طرح واقع ہوا ہے۔ اس عبارت پر ایک اعتراض وارد ہے وہ یہ کہ ''نماز دنیا میں سے نہیں ہے۔'' اس کے جواب میں ارباب تحقیق، محدثین فرماتے ہیں کہ طرق حدیث کے تتبع و تلاش کے بعد ہمیں پتہ چلا ہے کہ حدیث میں لفظ ثلث نہیں ہے۔ لہٰذا اعتراض جاتا رہتا ہے اور اکثر طرق میں لفظ ''من الدنیا'' بھی نہیں ہے۔ اس تقدیر پر تو اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا۔ ہم نے اس معنی کی تحقیق اور اس حدیث کی شرح اور اس کے معنی و نکات کا بیان مشکوٰۃ شریف کی شرح میں کر دیا گیا ہے۔ وہاں دیکھنا چاہئے۔

خواب واستراحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند، بقدر اعتدال تھی۔ قدر ضرورت سے زیادہ آپ سویا نہ کرتے تھے اور نہ آپ قدر ضرورت سے زیادہ اپنے آپ کو باز رکھا کرتے تھے اسی ضمن میں یہ ہے جو حدیثوں میں بھی مروی ہے کہ جو چاہتا کہ خواب میں حضور کو دیکھے تو وہ آپ کو خواب میں پاتا اور جو چاہتا کہ حضور کو نماز میں دیکھے تو وہ آپ کو نماز میں پاتا۔ مطلب یہ کہ حضور قیام بھی فرماتے اور خواب بھی فرماتے جیسا کہ نوافل و عبادات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی اور کبھی رات میں خواب بھی فرماتے۔ پھر اٹھ کر نماز پڑھتے اس کے بعد پھر سو جاتے اسی طرح چند مرتبہ سوتے اور اٹھتے تھے۔ اس صورت میں بھی یہ بات درست ہے کہ جو خواب میں دیکھنا چاہتا وہ بھی دیکھ لیتا اور جو بیدار دیکھانا چاہتا وہ بھی دیکھ لیتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں داہنی جانب قبلہ رو ہو کر آرام فرماتے۔ رخسار شریف کو داہنی ہتھیلی پر رکھتے اور بصورت تعریس ہاتھوں کو کھڑا کر کے ہتھیلی پر سر مبارک رکھتے تا کہ بیداری اور نماز کے لئے کھڑے ہونے میں آسانی ہو اور داہنی جانب کو ابتداء خواب میں اختیار فرمانا جیسا کہ مشہور ہے اس وجہ سے ہے کہ بائیں جانب میں دل معلق رہے اور جب بائیں پہلو پر سویا جائے گا تو دل قائم رہے گا

بیدار رہتا ہے۔'' یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال کے جواب میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ حالانکہ یہ سوال، وضو کے ٹوٹنے کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ مطلق سوال ہے جو وتر سے متعلق ہے۔ بغیر ایک حالت سے دوسری حالت کے ساتھ مقید کرنے کے۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ تم باتیں کرتے ہو میں سب سنتا ہوں اس کا حق جواب وہی ہے جو شیخ ابن حجر نے دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ کے بل اوندھے لیٹ کر سونے سے منع فرمایا ہے۔ سنن ابوداؤد میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص پر گزرے جو اپنے منہ کے بل اوندھا سو رہا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پائے اقدس سے ٹھوکر مار کر فرمایا ''اٹھ، بیٹھ جا، یہ جہنمیوں کا سونا ہے۔''

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ چت لیٹ کر سونا بہت برا ہے اور منہ کے بل اوندھے ہو کر سونا تو بہت ہی بدتر ہے۔ کہا گیا ہے کہ بغیر سونے کی غرض کے استراحت کے لئے چت لیٹنا نقصان دہ نہیں ہے۔

امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ سونے کی چار ہیئتیں ہیں۔ چت لیٹنا، معبروں کے لئے ہے جو آسمان اور اس کے ستاروں کو دیکھتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ اور داہنے پہلو سونا عابدوں اور شب بیداروں کے لئے ہے۔ اور بائیں پہلو پر سونا پرخوروں کے لئے ہے جو کھانے کی ہضم کے لئے راحت و آرام حاصل کرتے ہیں اور منہ کے بل اوندھے سونا بدبختوں اور احمقوں کے لئے ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی فرش پر اور کبھی چمڑے پر، کبھی ٹاٹ پر اور کبھی زمین پر سوتے تھے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرش یعنی بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی یہ وہ عادات کریمہ تھیں جو کھانے پینے اور لباس و نکاح اور خواب سے متعلق تھیں۔ جنہیں مواہب لدنیہ سے نقل کیا گیا ہے اور اس ضمن میں جزئیات، آداب اور ابواب وغیرہ بہت ہیں۔ جسے کتاب شرح سفر السعادہ اور شرح مشکوٰۃ وغیرہ میں بیان کر دیا گیا ہے اور بقدر ضرورت اس جگہ اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ فقط

الحمد للہ کہ مدارج النبوۃ کی جلد اوّل کا ترجمہ ختم ہوا

ہوتا ہے اگر واقعتہً اولیاء کرام کے لئے یہ صورت صحیح ہے تو اس کے احکام کا ترتب مثلاً وضو کا نہ ٹوٹنا اور دیگر احکام ان پر منتفی ہوں گے کیونکہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے سنا گیا ہے کہ عہد رسالت کے قریب زمانے میں بعض صوفیاء اپنی ولایت کے پندار میں خواب سے اٹھتے ہی بغیر وضو کئے نماز پڑھنے لگتے تھے اور اس مسئلہ میں ادعائے فقاہت بھی کرتے تھے کیونکہ علت مشترک ہے جو قیاس کو صحیح بناتا ہے حالانکہ یہ جہالت کی نشانی ہے اس لئے کہ قیاس کی شرط یہ ہے کہ منصوص علیہ کے حکم کے ساتھ مختص نہ ہو و باللہ التوفیق وہ اتنا نہیں جانتے کہ حدیث لا ینام قلبی پر لیلۃ التعریس میں سو جانے کی حدیث سے جو ایک وادی میں نماز صبح سے سورج نکلتے اور اس کے گرم ہونے تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور لشکریوں کا سوتے رہنا اور بیدار نہ ہونا ہے۔ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر بیدار رہتے تو سورج نکلنے کا پتہ کیوں نہ چلا۔ امام نودی نے اس اعتراض کے دو جواب دئے ہیں ایک یہ کہ قلب اپنے متعلقات کا ہی ادراک کرتا ہے لذات مسرت اور رنج والم وغیرہ محسوسات کا ادراک نہ کرتا یعنی اس کا نہیں جو آنکھیں دیکھتی ہیں اور طلوع وغروب کا ادراک آنکھ کا کام ہے اور آنکھ تو خود سو رہی تھی اگرچہ قلب بیدار تھا اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی بیدار تو ہے لیکن آنکھیں بند ہیں تو وہ طلوع آفتاب کو نہ جان سکے گا اگرچہ وہ خود بیدار ہو۔ دوسرا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حالتیں ہیں ایک یہ حالت کہ آپ کا قلب بیدار رہے اور یہ حالت حضور کی اکثر و بیشتر تھی اور دوسری حالت وہ ہے جبکہ دل بھی محو خواب ہوتا تھا۔ چنانچہ لیلۃ التعریس کا واقعہ اسی دوسری حالت کا ہے۔ امام نودی فرماتے ہیں کہ پہلا جواب ہی صحیح اور قابل اعتماد ہے اور دوسرا ضعیف ہے۔ مطلب یہ کہ مذہب مختار یہی ہے کہ حضور کا قلب اطہر ہمیشہ ہی بیدار رہتا تھا اور ہر حالت میں ثابت و برقرار رہتا تھا اور حدیث کی عبارت بھی اسی مفہوم و مطلب پر واقع ہے بعض لوگ اب بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اگرچہ طلوع کا تعلق آنکھ سے ہے اور قلب اس کا ادراک نہیں کرتا لیکن اتنا تو معلوم ہونا چاہئے کہ وقت بہت ہو گیا ہے اس لئے کہ طلوع فجر کی ابتدا سے آفتاب کے طلوع ہونے تک مدت طویل ہے یہ کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے بجز اس شخص کے جو نیند میں مستغرق ہو، فتح الباری میں کہا گیا ہے کہ یہ استحالہ اور استبعاد مردود ہے اس لئے کہ ممکن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب انور اس وقت وحی میں مستغرق ہو، اس سے خواب میں مستغرق ہونا لازم نہیں آتا جس طرح کی بیداری کی حالت میں القائے وحی کے وقت استغراق کا عالم ہوتا تھا اور حکمت، فعل کے ذریعہ شریعت اور حصول اتباع کا بیان تھا اور یہ بات آپ کے منصب رفیع کے لئے زیادہ صحیح ہے جس طرح کہ نماز میں سہوئے وقوع پر علماء کہتے ہیں اسی بنا پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ہوتے تھے تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیدار نہیں کرتے تھے اس لئے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں اور کس مقام میں ہیں لہٰذا حضور کی نیند، حضور کی نماز اور حضور کے نسیان کی وجہ یہی تھی۔ قلب انور کے سو جانے کے باعث نہ تھا بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت کی جانب متوجہ ہو جانے کے باعث تھا۔ یا اس سے بھی بلند تر مقام کے باعث تھا وہ یہ کہ تاکہ ہم لوگوں کیلئے سنت بن جائے جیسا کہ صاحب مواہت نے قاضی ابوبکر عربی مالکی سے نقل فرمایا ہے۔

بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ حضور کو اس ابتلا میں اس وجہ سے پڑنا پڑا کہ آپ نے اپنی تدبیر پر اعتماد کیا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس پر مقرر فرمایا اور رب تبارک وتعالیٰ کی تقدیر کے سپرد نہ فرمایا حالانکہ یہ بات بھی بالکل بودی اور کمزور ہے۔ اس لئے کہ یہ توثیق و توکیل اور تاکید و اہتمام حق سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کو بجالانے کے لئے تھا نہ کہ تدبیر پر بھروسہ کرنا۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: لا ینام کے معنی یہ ہیں کہ مجھ پر وضو ٹوٹنے کی حالت پوشیدہ نہیں رہتی ہے مطلب یہ کہ میں نیند میں اتنا مستغرق نہیں ہوتا ہوں کہ حدث کے وجود کا پتہ ہی نہ معلوم ہو۔ گویا کہ یہ قائل دل کی بیداری کو وضو کے ٹوٹنے کی حالت کے ادراک کے ساتھ مخصوص جانتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی بعید ہے اس لئے کہ حضور کا ارشاد ''میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل

بیدار رہتا ہے۔'' یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس سوال کے جواب میں ہے کہ انہوں نے عرض کیا تھا کہ یا رسول اللہ آپ وتر پڑھنے سے پہلے سو جاتے ہیں؟ حالانکہ یہ سوال، وضو کے ٹوٹنے کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا بلکہ مطلق سوال ہے جو وتر سے متعلق ہے۔ بغیر ایک حالت سے دوسری حالت کے ساتھ مقید کرنے کے۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ تم باتیں کرتے ہو میں سب سنتا ہوں اس کا حق جواب وہی ہے جو شیخ ابن حجر نے دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ کے بل اوندھے لیٹ کر سونے سے منع فرمایا ہے۔ سنن ابوداؤد میں مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص پر گزرے جو اپنے منہ کے بل اوندھا سو رہا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پائے اقدس سے ٹھوکر مار کر فرمایا ''اٹھ، بیٹھ جا، یہ جہنمیوں کا سونا ہے۔''

صاحب مواہب لدنیہ فرماتے ہیں کہ چت لیٹ کر سونا بہت برا ہے اور منہ کے بل اوندھے ہو کر سونا تو بہت ہی بدتر ہے۔ کہا گیا ہے کہ بغیر سونے کی غرض کے استراحت کے لئے چت لیٹنا نقصان دہ نہیں ہے۔

امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ سونے کی چار ہیئتیں ہیں۔ چت لیٹنا، معبروں کے لئے ہے جو آسمان اور اس کے ستاروں کو دیکھتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ اور داہنے پہلو سونا عابدوں اور شب بیداروں کے لئے ہے۔ اور بائیں پہلو پر سونا پرخوروں کے لئے ہے جو کھانے کی ہضم کے لئے راحت و آرام حاصل کرتے ہیں اور منہ کے بل اوندھے سونا بدبختوں اور احمقوں کے لئے ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی فرش پر اور کبھی چمڑے پر، کبھی ٹاٹ پر اور کبھی زمین پر سوتے تھے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرش یعنی بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی یہ وہ عادات کریمہ تھیں جو کھانے پینے اور لباس و نکاح اور خواب سے متعلق تھیں۔ جنہیں مواہب لدنیہ سے نقل کیا گیا ہے اور اس ضمن میں جزائیات، آداب اور ابواب وغیرہ بہت ہیں۔ جسے کتاب شرح سفر السعادہ اور شرح مشکوٰۃ وغیرہ میں بیان کر دیا گیا ہے اور بقدر ضرورت اس جگہ اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ فقط

الحمد للّٰہ که مدارج النبوۃ کی جلد اوّل کا ترجمه ختم هوا